اسلام کا نظامِ عدل

مؤلفہ: استاذ سیّد قطب

مترجمہ محمد نجات اللہ صدیقی

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی

دُنیا کے موجودہ حالات ایک ایسے ٹھوس اخلاقی انقلاب کا تقاضا کرتے ہیں جو حقیقی، امن و عافیت کا ضامن ہو!

انسان خدا کا بندہ ہے

اس لیے خدا کی بندگی اور ہر شعبۂ حیات میں اس کی کامل اطاعت ہی وہ واحد بنیاد ہے جس پر ایک ایسا تعمیری انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے

مکتبہ جماعت اسلامی کا پیش کردہ لٹریچر اسی حقیقت کی طرف آپ کی فکری، علمی، اور عملی رہنمائی کرتا

خود پڑھیے

اور

دوسروں کو پڑھوائیے

اسلام کا نظامِ عدل

مصنّفہ

استاذ سیّد قطب

مترجمہ

محمد نجات اللہ صدّیقی

شائع کردہ

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند محلہ کشن گنج دہلی ۶

باراوّل ـــــــــ ۱۰۰۰

جون ۱۹۶۰ء

قیمت مجلد مع گردپوش چھ روپے

مطبوعہ

کوہ نور پرنٹنگ پریس لال کنواں

دہلی

ناشر

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند محلہ کشن گنج دہلی ۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

استاذ سید قطب کی شخصیت ہمارے لئے اجنبی نہیں۔ آپ مصر کے ایک بڑے ادیب، الاخوان المسلمون کے چوٹی کے مفکر، اور عالم اسلامی کے ان چند مصنفین میں سے ہیں جن کی تصانیف تمام اسلامی ممالک میں قبول عام حاصل کرچکی ہیں۔ عربی میں آپ کی تصانیف ہندوستان کے مختلف علمی مراکز میں عرصہ ہوا پہونچ چکی ہیں۔ اور بعض مکتبے بھی انھیں فراہم کرتے رہے ہیں۔ اردو میں آپ کے بعض مقالات کے ترجمے متعدد رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ چونکہ یہ پہلی کتاب ہے جس کا مکمل ترجمہ اردو میں پیش کیا جارہا ہے لہذا قدرے تفصیلی تعارف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سید قطب ۱۹۰۶ء میں مصر کے ایک صوبہ (مدیریہ) اسیوط کے موشا نامی گاؤں میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے ہیں ان کے چھوٹے بھائی محمد قطب بھی صاحب تصانیف ہیں اور ان کی دو کتابیں — "الانسان بین المادیۃ والاسلام" اور "شبہات حول الاسلام" اچھے معیار کی حامل ہیں۔ ان کی بہن بھی سرگرم خادم اسلام اور صاحب قلم خاتون ہیں۔ ان کے اصلاحی اور معاشرتی افسانوں کا ایک مجموعہ "فی تیار الحیاۃ" نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔

والد کا پیشہ زراعت تھا۔ والدہ بڑی دیندار خاتون تھیں اور قرآن مجید سے بڑا شغف رکھتی تھیں۔ انکی آرزو تھی کہ ان کے بچے حافظ قرآن ہوں چنانچہ سید قطب نے بچپن ہی میں قرآن حفظ کرلیا تھا۔ اور اسی عمر میں ان کو قرآن کریم سے خصوصی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں ہوئی، ثانوی تعلیم "تجہیزیۃ دار العلوم" نامی اسکول میں ہوئی۔ جہاں ابتدائی کے فارغ طلبہ کو "دار العلوم کالج قاہرہ" میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ آکر اس کالج میں داخلہ لیا اور ۱۹۳۳ء میں یہاں سے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلوما اِن ایجوکیشن حاصل کیا۔ کالج میں ان کا شمار بڑے ذہین طلبہ میں ہوتا تھا لیکن اس دور میں ان کو شعر و ادب اور صحافت سے مناسبت پیدا ہوگئی اور یہ ذوق اکثر کالج سے غیر حاضری کا سبب بنتا رہا۔

تعلیم سے فارغ ہوکر وزارت تعلیم میں ملازمت کرلی اور انسپکٹر آف اسکولس کی حیثیت میں ۱۹۵۲ء تک ملازم رہے۔ ۱۹۴۹ء وزارت تعلیم کی جانب سے طریقۂ تعلیم اور نظام تربیت کے مطالعہ کیلئے امریکہ گئے اور دو سال قیام کرکے ۱۹۵۱ء میں واپس آئے

دوران تعلیم، اور اس کے بعد عرصہ تک اسلام سے گہرا اور عملی لگاؤ نہیں رہا بلکہ خالص ادبی رنگ غالب رہا شاعری کے علاوہ ان کا خاص موضوع تنقید ادب تھا اور یہ عقاد کے مکتب فکر کے ایک اہم رکن سمجھے جاتے تھے۔ اس دور کی شاعری کے کئی غیر مطبوعہ مجموعے موجود ہیں مگر سید قطب اب انھیں شائع کرانا پسند نہیں کرتے۔ اسی دور میں انہوں نے قرآن کریم پر ادبی اور فنی زاویہ سے نگاہ ڈالی اور اپنے مطالعہ کے نتائج "التصویر الفنی فی القرآن" اور "مشاھد القیامہ فی القرآن" نامی دو کتابوں میں پیش کئے۔ ان کتابوں کو دار المعارف مصر نے شائع کیا اور یہ ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئیں۔ قرآن کریم کا یہ مطالعہ اور ان دونوں کتابوں کی تصنیف سید قطب کی شخصیت میں ایک خوشگوار انقلاب کا ذریعہ ثابت ہوئیں عقلی اور جذباتی دونوں اعتبار سے اسلام سے دلچسپی اور وابستگی بڑھنے لگی۔ اور اب انکی توجہات زیادہ تر اسلام اور دور حاضر میں اسلام کے مسائل کے مطالعہ کی طرف مبذول ہو گئیں۔

شخصیت میں انقلاب کا یہ عمل ۱۹۴۵ء تک جاری رہا ۱۹۴۶ء میں جب انہوں نے "العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام" کی تصنیف شروع کی تو ان کے مزاج کی اسلامیت پختگی کو پہنچ چکی تھی۔ اور اب اس کام کی برکت سے اس میں مزید نکھار پیدا ہوا۔ یہ کتاب ۱۹۴۸ء میں مکمل ہوئی۔ اور اس کے بعد مصنف کو دو سال کیلئے امریکہ جانے کا موقع ملا۔ وہاں انہوں نے مغرب کی مادی تہذیب کا بچشم خود مشاہدہ کیا۔ اس مطالعہ سے ان کا یہ یقین اور پختہ ہو گیا کہ اسلام دین حق ہونے کے ساتھ انسانیت کو موجودہ تہذیبی بحران سے نجات دلا کر ایک متوازن نظام زندگی دینے کی بھی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ امریکہ سے واپس آکر انہوں نے اپنے ان تاثرات کو "امریکا التی رأیت" نامی کتاب میں پیش کیا لیکن یہ کتاب ابھی شائع نہیں ہو سکی ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح مصر بھی مغرب کی اندھی تقلید میں مبتلا تھا لہٰذا مغربی تہذیب کے براہ راست مطالعہ کا مصنف پر جو ردعمل ہوا اس نے خود مصر میں مغربی اثرات کے مقابلہ، ابنائے وطن کو مغربی نظاموں کی تقلید کے خطرات سے آگاہ کرنے اور اسلام کے متوازن نظام کی طرف دعوت دینے کا داعیہ پیدا کیا۔

امریکہ میں ان کا قیام تھوڑے تھوڑے عرصہ کیلئے مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں رہا۔ واشنگٹن میں ولسن ٹیچرس کالج، گریلی، کولوراڈو میں ٹیچرس کالج، اور کیلیفورنیا میں اسٹان فورڈ یونیورسٹی میں قیام رہا۔ اس کے علاوہ نیویارک، شکاگو، سان فرانسسکو، لاس اینجلز اور دوسرے شہروں میں جانے کا بھی موقع ملا۔ امریکہ سے واپسی کے دوران آپ نے انگلستان، اٹلی، اور سوئٹزرلینڈ میں بھی چند ہفتے گذارے۔

اسلام کی طرف توجہ اور مآخذ اسلام کے مطالعہ کے ساتھ ہی سید قطب کو الاخوان المسلمون سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی لیکن امریکہ جانے سے پہلے اخوان سے باضابطہ طور پر متعلق نہیں ہوئے تھے۔ ابتدا میں انھیں مرشد عام حسن البنا رحمۃ اللہ کی شخصیت سے خاصہ اختلاف بھی تھا امریکہ سے واپسی پر ان کا قلم اسلام کے لئے وقف ہو گیا، انہوں نے اخوان کے اخبارات و جرائد میں کثرت کے ساتھ لکھنا شروع کیا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہفت روزہ "الدعوۃ" کا کوئی شمارہ انکی نگارشات

سے خالی نہ ہوتا تھا۔ اخوان کے باضابطہ ممبر اواخر ۱۹۵۳ء میں بنے۔ اخوان نے انھیں اپنے مرکزی شعبۂ نشر و اشاعت کا سکریٹری بنا دیا۔ سید قطب نے اخوان کے لٹریچر کو فرانسیسی، انگریزی، انڈونیشیائی اور دوسری زبانوں میں منتقل کرانے اور نئی تصانیف سامنے لانے کا ایک جامع پروگرام بنایا، مگر ابھی اس پر عمل درآمد شروع ہی ہوا تھا کہ جماعت خلاف قانون قرار دیدی گئی اس سے پہلے آپ اخوان کی تنظیم کے سلسلہ میں پورے مصر کا دورہ کر چکے تھے۔ مصر کی الاخوان المسلمون کے ساتھ سید قطب عالمی اسلامی تحریک میں بھی حصہ لیتے تھے اور ایک زمانہ میں موتمر اسلامی برائے فلسطین کے سکریٹری بھی تھے اسی سلسلہ میں آپ نے ۱۹۵۲ء میں شام اور بیت المقدس کا سفر کیا تھا جب الاخوان المسلمون دوبارہ بحال ہوئی تو اس نے ایک ہفت روزہ "الاخوان المسلمون" نکالنے کا فیصلہ کیا اور اسکا اڈیٹر سید قطب کو بنایا۔

اخوان کے پہلی بار خلاف قانون قرار دیئے جانے کے ساتھ سید قطب کو بھی ۱۴ر جنوری ۱۹۵۴ء کو گرفتار کر لیا گیا۔ مارچ ۱۹۵۴ء میں ان کو رہا کر دیا گیا۔ اور اخوان کے عام ابتلاء کے ساتھ اکتوبر ۱۹۵۴ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا جس کے بعد سے اب تک انھیں رہا نہیں کیا گیا ہے۔ اس دوسرے دور اسارت میں ان پر جیل کے اندر جو بیمانہ مظالم ڈھائے گئے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں ...... یہ سختیاں اب باقی نہیں اور کچھ عرصہ سے انھیں جیل میں ہر طرح کا آرام اور مطالعہ و تصنیف کی آسانیاں میسر ہیں۔ آج کل وہ قاہرہ سے ۱۵ کیلومیٹر (تقریباً دس میل کے فاصلہ پر طرۃ نامی مقام پر محبوس ہیں۔ اور بخیریت ہیں۔ صحت بھی اچھی ہے۔ انہوں نے اپنی کئی تصانیف پر جیل ہی میں نظر ثانی کی ہے۔ اور "فی ظلال القرآن" نامی تفسیر بھی جیل ہی میں مکمل کی ہے۔

سید قطب کے خلاف فوجی عدالت میں جو مقدمہ چلایا گیا تھا اس کا ذکر مصری حکومت کے شائع کردہ کتابچہ "محکمۃ الشعب" میں آیا ہے۔ ایک معتبر راوی نے مجھے بتایا ہے کہ اس عدالت کے سامنے سید قطب نے یہ کہا تھا کہ اگر تمہیں ضرورت ہو تو میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر آیا ہوں"۔ اپنے بیان میں سید قطب نے یہ انکشاف کیا کہ حکومت کی جانب سے انھیں وزارت کا عہدہ پیش کیا گیا تھا مگر انہوں نے اسے ٹھکرا دیا۔ انہوں نے یہ کہا کہ اگر انھیں وزارت تعلیم دیجائے اور غیر مشروط طور پر ملک کے تعلیمی نظام کو اسلامی نظریات کے مطابق ڈھالنے کی آزادی دی جائے تو وہ اسے قبول کر لیں گے۔ مگر حکومت نے یہ شرط رد کر دی۔

یہاں مصنف کی ۲۱ تصانیف کا جو اسلامیات کے علاوہ شعر و افسانہ، تنقید، سفرنامہ وغیرہ اصناف سے بھی تعلق رکھتی ہیں تفصیلی تعارف ممکن نہیں۔ ذیل میں ہم صرف چند اہم تصانیف کا اجمالی تعارف کرائیں گے۔

امریکہ جانے سے پہلے ۹ کتابیں شائع ہو چکی تھیں۔ جن میں سے دو کے علاوہ باقی سب کا تعلق ادب سے تھا۔ بعد کی بارہ تصانیف میں سے زیادہ تر کتابوں کا موضوع اسلام ہے ان میں سے چار کتابیں ابھی شائع نہیں ہو سکی ہیں۔ بعض اہم تصانیف یہ ہیں۔

فی ظلال القرآن (قرآن کے زیر سایہ)، یہ تفسیر ۳۰ علیحدہ جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔ یہ اصطلاحی معنی میں کوئی تفسیر نہیں۔ مصنف نے وہ تاثرات قلمبند کر دیئے ہیں جو مطالعہ قرآن کے دوران اس پر طاری ہوئے۔ مصنف کے نزدیک اس کے ہم عصروں کے لئے اپنی ہی جیسے ایک جدید ذہن کے ان تاثرات کا مطالعہ ایک مخصوص افادیت کا حامل ہے۔ ہمارا مطالعہ مصنف کی اس رائے کی تائید کرتا ہے۔ تفسیر میں جذباتی اپیل اور دعوتی اسلوب نمایاں ہے قرآن کریم کے فنی محاسن کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ تفسیر کی مقبولیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا فارسی ترجمہ "در سایہ قرآن" کے نام سے ایران سے شائع ہوا ہے۔ (جس کی چند جلدیں ہم نے دیکھی ہیں)

التصویر الفنی فی القرآن۔ ہمارے نزدیک اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب ہے جس میں دور جدید کے ایک ادیب نے جدید فنون لطیفہ کے زاویہ نگاہ سے قرآن حکیم کی بلاغت کے ایک خاص موضوع کا مطالعہ کیا ہے یہ پہلو قرآن کی تمثیلات، تشابیہ اور استعاروں سے متعلق ہے۔ ابتدائی صفحات میں مصنف نے عبد القاہر جرجانیؒ کی "اسرار البلاغۃ" جیسی بلند پایہ کتاب پر تنقید کرتے ہوئے بلاغت قرآن کے باب میں اپنے ذوق اور مسلک کی وضاحت کی ہے۔ کتاب میں منظر کشی، اشارہ و تلمیح اور بلندی تخییل کے جدید معیاروں پر قرآن کریم کی تشابیہ اور استعاروں کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ قدیم عربی درسگاہوں کے فارغین کو شاید یہ انداز پسند نہ آئے۔ لیکن جو لوگ جدید لٹریچر اور آرٹ کے میدان میں فنی تنقید کے نئے معیاروں سے مناسبت رکھتے ہیں ان کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ اس سے قرآن کی عظمت کا ایک نیا پہلو سامنے آتا ہے اور اس کی کشش اور جاذبیت کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے۔ وللناس فیما یعشقون مذاھب۔

مشاھد القیامہ فی القرآن میں بھی یہی خصوصیات پائی جاتی ہیں (ہمیں یہ کتاب نہیں دستیاب ہو سکی) معرکۃ الاسلام والراسمالیہ (اسلام اور سرمایہ داری کی کشمکش) اور السلام العالمی والاسلام (اسلام اور عالمی امن)، اپنے موضوع پر اچھی کتابیں ہیں۔ اسلوب دعوتی اور خطیبانہ ہے۔ اور یہ مصنف کے مزاج کا خاصہ ہے۔

العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام (اسلام میں اجتماعی عدل جس کا ترجمہ "اسلام کا نظام عدل" کے نام سے پیش نگاہ ہے۔ مصنف کی سب سے بڑی تصنیف ہے۔ یہ کتاب زندگی کے بارے میں اسلام کے نقطۂ نظر اور سیاسی معاشی اور معاشرتی عدل کے بارے میں اس کے مزاج کی وضاحت میں پوری طرح کامیاب قرار دی جا سکتی ہے۔ سید قطب کے نزدیک اسلام کے قانونی ضوابط سے زیادہ اہم وہ روح اور مزاج ہے جس کا اسلامی نظام حامل ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے اسی اسپرٹ کی وضاحت کی طرف زیادہ توجہ کی ہے۔ کتاب کی ایک امتیازی خصوصیت روح اسلام کی کسوٹی پر مسلمانوں کی تاریخ کو پرکھنے اور یہ یقین پیدا کرنے کی کوشش ہے

کہ تاریخ اسلامی، جو اسی روح کے عمل کا نام ہے۔ ایک مسلسل عمل ہے جو آج بھی جاری ہے کتاب کے ساتویں باب میں مصنف نے قرن اول سے آج تک کی تاریخ سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جو روح اسلامی کے مظاہر اور اس کے بقار و تسلسل کا ثبوت ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ کتاب کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔ اس کے مطالعہ سے ہم میں یہ اعتماد پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی اسپرٹ صرف کتابوں کی زینت یا کسی خاص زمانہ کا طرۂ امتیاز بن کر نہیں رہ گئی بلکہ تاریخ اسلامی پر مسلسل اثر انداز ہوتی رہی۔

سید قطب کے نزدیک آج دنیا ایک تہذیبی بحران سے گذر رہی ہے۔ اور ہر طرف ایک متوازن نظام زندگی کی تلاش ہے۔ دنیا صدیوں کے طویل تجربات کے بعد مادی تہذیب سے بیزار ہو کر جس صالح عقیدہ اور عادلانہ نظام اجتماعی کی متلاشی ہے وہ اسے صرف اسلام کی آغوش میں مل سکتا ہے۔ یہ حقیقت دنیا کو بآسانی سمجھائی جا سکتی ہے اور وہ اسے تسلیم بھی کرے گی۔ لیکن اس کے لئے خود اسلامی سماج میں انقلاب حال ضروری ہے اس کی خاطر تحریک اسلامی کے کارکنوں کو بہت کچھ کرنا ہے۔ ان فکری اور عملی کاموں کی نشاندہی مصنف نے خاصی تفصیل کے ساتھ آٹھویں باب میں کی ہے۔ آپ نے علمی و فکری اور ادبی کام پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ جدید اسلامی قانون سازی کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے آپ نے اس سلسلہ میں چند متعین تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

فطری طور پر اس کتاب میں بالخصوص ساتویں باب میں مصنف نے بعض ایسی رائیں بھی ظاہر کی ہیں جن سے اتفاق کرنا کتاب کے ہر قاری کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ لیکن ایک صالح اور روشن مستقبل کی تعمیر کے لئے اپنے ماضی کا تنقیدی مطالعہ ناگزیر ہے۔ اور اس اہم ضرورت کے پس منظر میں مصنف کی ان رایوں کا مطالعہ بھی افادیت کا حامل ہے جن سے اکثر اصحاب فکر کو اتفاق نہ ہو۔

اس کتاب کا انگریزی ترجمہ "سوشل جسٹس اِن اسلام" کے نام سے امریکن کاؤنسل آف لرنڈ سوسائیٹیز واشنگٹن کی جانب سے ۱۹۵۳ء میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ ترجمہ کتاب کے پہلے ایڈیشن کے مطابق ہے اور ترجمانی، زبان، طباعت ہر اعتبار سے ناقص ہے۔ اپنے ترجمہ پر نظر ثانی کے دوران ہم نے بعض مقامات پر اس سے استفادہ چاہا تو غلط ترجمانی کی متعدد مثالیں سامنے آئیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کتاب کی تصنیف کا زمانہ ۱۹۴۶ء تا ۱۹۴۸ء ہے پہلا ایڈیشن غالباً ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا ہے اور اسکے بعد سے چار ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پانچواں ایڈیشن ۱۹۵۸ء میں شائع ہوا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں بہت سی اہم ترمیمات اور اضافے مصنف نے دوسرے ہی ایڈیشن میں کر دیئے تھے لیکن نظر ثانی کا عمل اس کے بعد بھی جاری رہا اور پانچویں ایڈیشن میں پھر بہت سے اہم حذف و اضافے پائے جاتے ہیں جن لوگوں نے اس کتاب کے ابتدائی ایڈیشنوں کا

مطالعہ کیا ہے انکے لئے یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ اس حذف و ترمیم کا اثر زیادہ تر کتاب کے ان صفحات پر پڑا ہے جن کا تعلـ
امیر معاویہؓ اور بنو امیہ، اور حضرت عثمان رضؓ کے دور خلافت سے ہے۔ ہم بڑی مسرت کے ساتھ یہ اطلاع بھی دینا چاہتے ہیں
کہ مترجم کی درخواست پر مصنف نے آخری مطبوعہ (پانچویں) ایڈیشن کے بعض مقامات پر پھر نظر ثانی کی ہے۔ اور مزید ترمیمـ
کی ہیں۔ یہ ترمیمات تمام تر امیر معاویہؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے متعلق ہیں۔

اس کتاب کا اردو ترجمہ اواخر ۱۹۵۳ء میں مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں شروع کیا گیا تھا اور ۱۹۵۵ء میں علیگڑھ میں
مکمل ہوگیا تھا۔ بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر اسکے منظر عام پر آنے میں خاصی تاخیر ہوگئی۔ لیکن یہ تاخیر اس اعتبار سے بڑی بابرکـ
ثابت ہوئی کہ ہمیں مصنف کی پے درپے نظر ثانی اور اہم ترمیمات سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل گیا۔

ساتویں اور آٹھویں باب میں ذیلی سرخیوں کے اضافہ کے علاوہ ابواب اور ان کی ترتیب میں اصل کتا
سے کوئی انحراف نہیں کیا گیا ہے۔

دوران ترجمہ میں نے مدرسۃ الاصلاح اور مرکز جماعت اسلامی ہند میں اپنے اساتذہ، بالخصوص مولانا جلیل احسـ
ندوی صاحب سے خاصا استفادہ کیا ہے جس کے لئے میں بہت مشکور ہوں۔ مصنف کے بعض حالات مجھے محمد مصطفیٰ الاعظمی
کی زبانی معلوم ہوئے ہیں جو ۱۹۵۴ء کے پرآشوب زمانہ میں قاہرہ میں مقیم تھے۔ اور مصنف کی صحبت سے استفادہ بھی کر چـ
ہیں تفصیلی حالات معلوم کرنے میں مصنف کے چھوٹے بھائی محمد قطب صاحب سے خط وکتابت بڑی مددگار ثابت ہو
کتاب کے تازہ ترین ایڈیشن کا ایک نسخہ بھی آپ ہی کے ذریعہ ملا۔ اپنے خاندان اور بھائی کی زندگی کے بارے میں تفصیـ
حالات سے آگاہ کرنے کے علاوہ آپ نے میری درخواست پر حال ہی میں مصنف سے ملاقات کرکے بعض ترمیمات
بھی کرائی ہیں جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کیا جائے کم ہوگا۔

مولانا ابو اللیث صاحب اور مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب کی ہمت افزائی اور قیمتی مشورے مختلف مراحل
پر میرے مددگار رہے ہیں۔ اللہ ان تمام حضرات کو جزائے خیر دے۔ اور ان متعدد ساتھیوں کو بھی جن کی دلچسپی، مشورو
اور رفاقت نے مجھے بڑا سہارا دیا ہے۔

سب سے زیادہ شکریہ مجھے خود استاذ سید قطب کا ادا کرنا ہے جنہوں نے کتاب کے اردو ترجمہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے
بڑی فراخ دلی سے ترجمہ اور اشاعت کی اجازت عطا فرمائی۔ اللہ ان کی مشکلات دور کرے، راہ حق کی صعوبتوں کو
ان کیلئے آسان بنائے، اسلام اور مسلمانوں کو ان کی خدمات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے اور ان کی اور ہمار
خطاؤں سے درگذر کرتے ہوئے ہماری مغفرت فرمائے۔ آمین!

محمد نجات اللہ صدیقی

آفتاب ہوسٹل۔ علی گڑھ
۱۴ مئی ۱۹۶۰ء

پہلا باب

مذہب اور سماج

اسلامی اور مسیحی نقطۂ نظر کا موازنہ

کوئی صاحبِ دولت اس وقت تک قرض نہیں لیتا جب تک وہ خود اپنی پونجی کا جائزہ لے کر یہ نہ دیکھ لے کہ وہ کافی ہے یا نہیں۔ اسی طرح کوئی حکومت اپنے اسٹاک، خام پیداوار اور قدرتی وسائل کا جائزہ لیے بغیر کوئی سامان نہیں درآمد کرتی۔ سوال یہ ہے کہ کیا روحانیت کے خزانہ، فکر و نظر کے ذخیرہ اور قلب و ضمیر کی پونجی کو اتنی اہمیت بھی حاصل نہیں جتنی اشیاءِ ضرورت اور سامانِ تجارت کو حاصل ہے؟ جواب ظاہر ہے، لیکن مصر اور سارے عالمِ اسلامی میں آج ہمارا حال یہ ہے کہ اپنے روحانی خزانہ اور فکری ورثہ کی طرف مڑ کر بھی دیکھے بغیر ہم نظریات و اصول اور قوانین و دستور، سب کچھ سات سمندر پار یا آہنی پردوں کے پیچھے سے درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔

ہم اپنے سماج پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کا حال بہت خراب نظر آتا ہے۔ ہمارے سامنے ایک ایسی اجتماعی فضا ہے جس کو عدل و انصاف سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اب ہماری نگاہیں یورپ امریکہ اور روس کی طرف اٹھتی ہیں اور جس طرح ہم ان سے سامانِ معیشت درآمد کرتے ہیں اسی طرح اپنی ان مشکلات کا حل بھی چاہتے ہیں۔ البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ اشیاءِ ضرورت درآمد کرتے وقت تو ہم اپنے اندوختہ ذخیروں کا جائزہ لیتے ہیں، بازار میں موجود سامان کو دیکھتے ہیں اور اپنی قوتِ پیداوار کا اندازہ لگاتے ہیں، لیکن بنیادی اصول، قوانینِ حکومت اور نظامِ زندگی اخذ کرتے وقت ہم اپنے فکری خزانوں کا جائزہ لینے کی زحمت بالکل

نہیں گوارا کرتے ۔ ہمارے حالات ، ہماری تاریخ اور ہماری مادّی ، فکری اور روحانی قدریں سات سمند
پار بسنے والوں یا آہنی پردے کے پیچھے رہنے والی قوموں کے حالات اور اقدار سے کتنی ہی مختلف کیوں نہ
ہم جمہوری ، اشتراکی یا اشتمالی اصولوں کے ذریعہ اپنے مسائل کا حل چاہنے میں کوئی حرج نہیں محسوس کرتے
ہم بہت آسانی سے اس کی خاطر اپنی تمام روحانی متاع اور فکری سرمایہ سے دستبردار ہو جاتے ہیں اور اپنے
مسائل کے ان حلوں کو بھی نظر انداز کر دیتے ہیں جو خود اپنے نظریات و اصول پر غور کرنے سے سامنے آئے
طرفہ تماشا یہ ہے کہ ہم نے اسلام کو اپنی مملکت کا سرکاری دین بھی قرار دے رکھا ہے ۔ اگر ہمیں اسلام کے
داعی اور علم بردار ہونے کا زعم نہیں تو بھی کم از کم خود کو مسلمان تو سمجھتے ہی ہیں ۔ لیکن اس دین کو ہم نے اپنی
عملی زندگی سے خارج کر رکھا ہے ۔ یہ وجدان کے گوشہ میں اس طرح خلوت نشیں ہے کہ زندگی پر حکم چلا سکے ، نہ
اس کے معاملات میں دخل دے اور نہ اس کی مشکلات کو حل کر سکے ..... ایسا کیوں ؟ اس لیے کہ عام خیال
کے بموجب دین بندے اور خدا کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے ، اور بس ــــ جہاں تک انسانی تعلقات
اجتماعی روابط ، زندگی کے عملی مسائل ، امور مملکت اور اقتصادی معاملات کا سوال ہے ، نہ تو دین کو ان میں
کچھ دخل ہے اور نہ ان کو دین سے کوئی واسطہ ۔ یہ تو ان لوگوں کا خیال ہے جو دین کے منکر نہیں ، رہے
دوسرے خیال کے لوگ تو وہ کہتے ہیں کہ " ہمارے سامنے دین کا ذکر ہی نہ کرو ۔ مذہب تو ایک افیون ہے
جسے ظالم حکمراں اور سرمایہ دار ، محنت کش عوام کو خواب غفلت میں مبتلا رکھنے اور بے روزگاروں کے احساس
وشعور کو مردہ ، اور ان کے ذہنوں کو ماؤف کر دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ "

اسلام کے مزاج اور اس کی تاریخ کے بارے میں ہم نے یہ انوکھی رائے کہاں سے اخذ کی ؟ دوسری
باتوں کی طرح اسے بھی ہم نے سمندر پار یا آہنی پردوں کے پیچھے سے درآمد کر لیا ہے ۔ اس لیے کہ تفریق دین دنیا
کا فسانہ نہ تو شرق اسلامی کی پیداوار ہے ، نہ ہی اسلام اس سے کبھی آشنا رہا ۔ یہ خیال بھی اسلام کے
زیر اثر نہیں پیدا ہوا کہ دین احساس وشعور کے لیے موت کا پیغام ہے ۔ اسلام کے مزاج سے یہ بات ذرا بھی
مناسبت نہیں رکھتی ۔ لیکن ہم اِن باتوں کو طوطے کی طرح رٹ کر دہرایا کرتے ہیں اور بندر کی طرح دوسروں
کی نقل اتارتے رہتے ہیں ۔ ہم نے اس بات کی زحمت کبھی نہیں گوارا کی کہ اس کی حقیقت معلوم کریں اور دیکھیں

کہ بات کہاں سے نکلی اور کس پر صادق آتی ہے۔ آئیے اب ہم یہ تحقیق کریں کہ یہ عجیب بات کہاں سے اور کس طرح نکلی ہے۔

مسیحیت رومن امپریلیزم کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے۔ اس وقت یہودیت جمود کا شکار ہو کر بے جان رسموں اور کھوکھلے بے روح مظاہر میں تبدیل ہو چکی تھی۔ رومن ایمپائر کے پاس اس کے وہ مشہور قوانین تھے جو آج بھی جدید یورپ کے قوانین کا منبع ہیں۔ رومن سماج اپنی مخصوص سماجی قدریں اور خود اپنا بنایا ہوا اجتماعی نظام رکھتا تھا۔ مسیحیت نے نہ تو اس کی ضرورت محسوس کی اور نہ وہ اس کی قدرت رکھتی تھی کہ مضبوط اجمی ہوئی رومن اسٹیٹ اور منضبط رومن سماج کے لیے ایک نیا نظام اور نئے قوانین وضوابط تجویز کرے، تاکہ سماج اور ریاست اس کی ہدایات کے سانچے میں ڈھل سکیں۔ اس نے یکسو ہو کر روحانی تزکیہ وتربیت اور وجدان کی تہذیب وتطہیر کی طرف توجہ کی۔ اس نے اسی کو زیادہ ضروری سمجھا اور اس سے زیادہ وہ کچھ کر بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے یہودیت کی جامد رسوم اور اس کے بے روح مظاہر پر تنقید کی اور مردہ اسرائیلی ضمیر کو از سر نو بیدار کر کے اُسے روح تازہ بخشنے کی کوشش کی۔

خود مسیح علیہ السلام بھی عفت وپاکبازی، زہد وصفا، رحم وکرم، اور رواداری کے داعی بن کر آئے تھے۔ معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے سلسلہ میں انھوں نے صرف ضمنی اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ البتہ ان کے اقوال واعمال سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لاوی کاہنوں اور علمائے یہود کی عائد کردہ جکڑ بندیوں کے قائل نہ تھے۔ یہ ظاہری اعمال تھے جب کہ ان کا مشن باطن اور روحانی پہلو سے متعلق تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے پیروؤں کے لیے بنی اسرائیل کا سبت مباح کر دیا اور منہ میں جانے والی تمام چیزوں کو ان کے لیے حلال قرار دیا، اس لیے کہ وہ نجس نہیں ہوتیں البتہ منہ سے "جو فحش کلامی اور دجل وفریب کی باتیں" نکلتی ہیں وہ ضرور نجس ہوتی ہیں۔ اس طرح انھوں نے یہود کے روزے بھی منسوخ کر دیے، ان کے پاس ایک زانیہ لائی گئی، اس نے اقبال جرم بھی کر لیا، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر اسے رجم کرنے سے انکار کر دیا کہ "جو لوگ شریعت موسوی کے مطابق اسے رجم کریں گے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو گناہ سے پاک ہو۔"

ان کا ایک قول یہ ہے کہ "تم سُن چکے ہو کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت، لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ شر سے دفاع ہی نہ کرو۔ بلکہ جو کوئی تمھارے داہنے گال پر

طمانچہ مارے دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دو۔ اگر کوئی تم سے جھگڑا کر کے تمہارا کرتا لینا چاہے تو چادر بھی اُسے لے لینے دو اور جو کوئی تم کو ایک میل بے گار میں لے جانا چاہے اس کے ساتھ دو میل چلے جاؤ۔" لہ

یہی اسپرٹ ان کے ان اقوال میں بھی جھلکتی ہے۔

"تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ خون نہ کرنا، اور جو کوئی خون کرے گا وہ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا۔ لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنے بھائی پر غصہ ہو گا عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو کوئی اپنے بھائی کو پاگل ٹہ کہے گا وہ صدرِ عدالت کی سزا کے لائق ہو گا اور جو کوئی اسے احمق کہے گا وہ جہنم کی آگ کا سزاوار ہو گا۔ پس اگر تو قربان گاہ پر اپنی نذر گزرانتا ہو اور وہاں تجھے یاد آئے کہ تیرے بھائی کا کوئی حق تجھ پر واجب ہے تو وہیں قربان گاہ کے آگے اپنی نذر چھوڑ دے اور جا کر پہلے اپنے بھائی سے ملاپ کر، تب آن کر اپنی نذر گزران۔ جب تک تو اپنے مدعی کے ساتھ راہ میں ہے اس سے صلح کرنے میں جلدی کر ...."

"تم سُن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ زنا نہ کرنا لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ جس کسی نے بُری خواہش سے کسی عورت پر نظر ڈالی وہ اپنے دل ہی میں اس کے ساتھ زنا کر چکا۔ پس اگر تیری داہنی آنکھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے نکال کر اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہے مگر تیرا سارا بدن جہنم میں نہ ڈالا جائے۔ اسی طرح اگر تیرا داہنا ہاتھ تجھے ٹھوکر کھلائے تو اسے کاٹ کر علیحدہ کر دے، کیونکہ تیرے لیے یہی بہتر ہے کہ تیرے اعضاء میں سے ایک جاتا رہے مگر تیرا سارا بدن جہنم میں نہ جائے ...."

"تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تھا کہ قسم کی خلاف ورزی نہ کرنا بلکہ اپنی قسمیں خداوند کے

لہ۔ انجیل متی۔ باب ۵ آیات ۳۸ تا ۴۱۔ ٹہ یہاں انجیل مقدس کے اردو ترجمہ میں حاشیہ پر یہ صراحت ہے کہ اصل یونانی لفظ راقہ ہے۔ مصنف نے اس لفظ کا عربی ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ متن کتاب میں اس کو برقرار رکھا ہے۔ اس لفظ پر مصنف کا یہ نوٹ ہے کہ "مجھے اس لفظ کی کوئی مناسب شرح نہ مل سکی غالباً یہ کوئی گالی یا جھڑکی ہے۔" "پاگل" کا ترجمہ انجیل کے اردو ترجمہ، شائع کردہ بائبل سوسائٹی لاہور سے لیا گیا ہے۔

لیے پوری کرنا، لیکن میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ بالکل قسم نہ کھانا، نہ تو آسمان کی، کیونکہ وہ خدا کا تخت ہے، نہ زمین کی کیونکہ وہ اس کے پاؤں کی چوکی ہے اور نہ یروشلم کی کیونکہ وہ بزرگ بادشاہ کا شہر ہے۔ اپنے سر کی قسم بھی نہ کھانا کیونکہ تم ایک بال کو بھی سفید یا سیاہ نہیں کر سکتے۔ تمہارا کلام ہاں ہاں یا نہیں، نہیں ہو کیونکہ جو اس سے زیادہ ہے وہ بدی سے ہے۔"[1]

اسی لیے مسیحیت نے "قیصر کا قیصر کے لیے اور اللہ کا اللہ کے لیے" چھوڑ دیا اور پوری یکسوئی کے ساتھ صفائے روحانی اور وجدان کی تطہیر میں لگ گئی۔ اس نے خود کو اپنے اس اصول کے مطابق ڈھالا کہ "دین بندے اور خدا کے درمیان تعلق کا نام ہے" اور قانون فرد اور حکومت کے مابین تعلق کا۔

یہ سب کچھ نتیجہ تھا اس بات کا کہ مسیحیت یہودی مذہب کے کافی عرصہ بعد ظاہر ہوئی، رومن ایمپائر کے زیر سایہ پروان چڑھی۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ صفائے روحانی، مادی علائق سے بے نیازی، اور صبر و تحمل کے سلسلہ میں مسیحیت منتہائے کمال کو جا پہنچی۔ اس نے انسان کی روحانی زندگی کے اس پہلو کے سلسلہ میں وہ سب کچھ کر دکھایا جو کسی مذہب کے لیے ممکن ہو سکتا ہے۔ اس نے روح و وجدان کو بلندی و پاکیزگی عطا کی، قلب و ضمیر کی تطہیر کی اور انسان کو خواہشات نفس پر اتنا قابو یافتہ بنا دیا کہ فکر آخرت دنیوی ضروریات پر بھی غالب ہو گئی اور ان کی اصل منزل عالم خیال کی مقدس تمنائیں قرار پائیں۔ اس کی خاطر اس نے اجتماعی زندگی کو حکومت وقت کے حوالہ کر دیا کہ وہ اپنے سیکولر قوانین کے ذریعہ اس کی تنظیم عمل میں لائے کیونکہ خود مسیحیت کی توجہ تمام تر قلب و ضمیر کی دنیا پر مرکوز تھی۔

جن مخصوص حالات میں مسیحیت پروان چڑھی تھی یہ پالیسی ان کا منطقی نتیجہ تھی۔ اس کا یہ مزاج اس یہودی قوم کی ضروریات کے بھی عین مطابق تھا جس کی طرف حضرت علیٰؑ بھیجے گئے تھے اور جو عظیم رومن ایمپائر میں صرف ایک اقلیت تھی۔ یہی مزاج اس محدود عرصۂ کار سے بھی مناسبت رکھتا تھا جو محض زمین ہموار کرنے کی خاطر اس وقت تک کے لیے مسیحیت کے سپرد کیا گیا تھا جب تک کہ آخری عالم گیر دین نہ آ جائے۔

پھر اللہ کی مشیت یہ ہوئی کہ مسیحیت اپنی نرمی و رواداری، پاکیزگی و ستھرائی، اور ترک علائق و بے نیازی سمیت سمندروں کو پار کرتی ہوئی یورپ میں داخل ہو۔ وہاں اسے یونان کی صنم پرستانہ مادی تہذیب کی وارث، رومن قوم

---

[1] ۔۔ باب ۵ آیات ۲۱ تا ۳۷۔

ملی۔ یورپ کے دوسرے اطراف وجوانب میں اسے ان قبائل سے سابقہ پڑا جو ابھی ابھی وحشت و بربریت کی زندگی سے نکلے تھے اور جن کی چھوٹے چھوٹے خطوں پر بسنے والی گھنی آبادیاں باہمی جنگ جدال اور خونریزی میں مصروف تھیں۔ یہ مزاج کے سخت سرکش تھے اور حرص وبخل ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ ایسے خطوں میں بسنے والوں کے لیے کچھ عرصہ بھی امن وچین کے ساتھ گذارنا یا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے ہتھیار رکھ دینا ممکن نہ تھا۔ یہ بات ان کے لیے اور زیادہ ناممکن تھی کہ اپنی عملی زندگی میں ان مسیحی نظریات کی طرف ذرا بھی مائل ہو سکیں جو نرمی اور رواداری کے مبالغہ آمیز تصور پر مشتمل تھے، مثلاً "جو تیرے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو اپنا بایاں رخسار بھی اس کے سامنے کر دے، اور جو کوئی تجھ سے جھگڑا کر کے تیرا کرتا لینا چاہے تو اپنی چادر بھی اُسے دے دے۔"

اِن وحشی اقوام نے جب یہ دیکھا کہ یہ مذہب عملی زندگی کے لیے کچھ زیادہ موزوں نہیں نظر آتا تو انھوں نے یہ نظریہ گھڑا کہ مذہب صرف خدا اور بندے کے درمیان ایک تعلق کا نام ہے۔ انھیں اس میں کوئی خاص زحمت نہیں نظر آئی کہ چند گھڑیاں چرچ میں مذہب کے زیر سایہ گذار لیں، یا ہیکل مقدس میں چند سانس اس کی فضا میں بھی لے لیں، اور پھر سماجی زندگی میں اپنے وہی وحشیانہ طور طریق اختیار کیے رہیں۔ دورِ وحشت کی طرح وہ اب بھی قاضی شمشیر کو حکمراں بناتے رہے، یا پھر متمدّن ہو جانے کے بعد اُنھوں نے قانون ملکی کو فیصلہ کن قرار دیا۔ چنانچہ مذہب ہمیشہ قلب وضمیر کی خلوتوں میں گوشہ گیر رہا اور کبھی بھی ہیکل مقدس یا کرسیٔ اعتراف سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اہلِ یورپ کی زندگی میں دین و دنیا کی تفریق یہاں سے پیدا ہوئی۔ یہ ساری باتیں ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ یورپ کبھی بھی ایک دن کے لیے بھی 'مسیحی' نہ تھا۔ جب سے دین نے اس سرزمین پر قدم رکھا تب سے آج تک ہمیشہ عملی زندگی کی تنظیم و تعمیر سے کنارہ کش رہا۔

لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر چرچ معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی سے کنارہ کش رہتا تو مذہبی افراد، مثلاً قسیس، کارڈینل اور پاپاؤں کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اپنے مادی مفادات کا تحفظ کر سکیں یا اپنے اثر و رسوخ کو قائم رکھ سکیں۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ چرچ امراء وسلاطین کی قوت کے مدمقابل ایک الگ قوت بن کر عام زندگی میں اپنے روحانی اقتدار سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔

بعض ادوار میں چرچ کے پاس اتنی جائدادیں اور فوجیں تھیں، اور اسے اس قدر غلبہ حاصل تھا، جو کسی طرح بھی

بادشاہوں کے غلبہ، ان کی فوجوں، اور ان کی جائدادوں سے کم نہ تھا۔ اس صورتِ حال کے قدرتی نتیجہ کے طور پر چرچ اور اسٹیٹ، پاپاؤں اور شہنشاہوں کے مابین کشمکش کا آغاز ہوا۔ اس کشمکش میں عوام نے زیادہ تر چرچ کا ساتھ دیا۔ پھر ان دونوں طاقتوں کے درمیان صلح ہو گئی جس کا منشا محض یہ تھا کہ دونوں اپنے وہ مفادات محفوظ رکھ سکیں جو لوگوں کو مسخر رکھنے اور عوام الناس کو لوٹنے سے وابستہ تھے۔ یہ مفادات تمام تر مالی اور مادی مفادات تھے اور یہ ساری نزاع دنیاوی اقتدار کے مسئلہ پر تھی۔

یہ ہے اصل صورت حال، اور کہا یہ گیا کہ "دین اہل اقتدار اور مذہبی طبقات کے ہاتھ میں عوام الناس کو مغلوب رکھنے کے لیے ایک آلۂ کار ہے" —— صرف اس لیے کہ یورپ والوں کے یہاں دین کی پوزیشن یہی تھی! چرچ ایک مقدس اتھارٹی بن کر لوگوں کی دنیا اور آخرت دونوں پر حکمرانی جتاتا رہا۔ وہ پروانہ ہائے مغفرت بیچتا اور فرامین محرومی جاری کرتا۔ عوام کے جذبات و احساسات اور ان کے افکار و خیالات دونوں پر وہ یکساں چھایا رہا۔ اس کی پشت پناہ وہ تحقیقاتی عدالتیں تھیں جو ہر اس شخص کو قتل کر دیتیں، یا آگ میں جلا دیتیں جو ذرا بھی سر اٹھاتا، یا جس پر الحاد و کج روی کی تہمت لگادی جاتی۔ نشاۃ ثانیہ تک یہی حال رہا، مگر یہ دور آیا تو چرچ کو سجھائی دیا کہ تاریکی کی صدیاں گذرنے کے بعد اب آنکھیں کھل رہی ہیں اور سوئے ہوئے جذبات انگڑائیاں لے رہے ہیں۔ جدید فکر اور زندگی سے گہرا تعلق رکھنے والی سائنس کے سامنے اتنی آسانی سے اپنے غلبہ سے دستبردار ہو جانا چرچ کو کبھی گوارا نہ تھا چنانچہ وہ جرأت مندوں کی زبان بندی کر نے، قدیم و فرسودہ نظریات کے مخالف نئے خیالات کو مٹا دینے پر تل گیا۔ اسی وقت سے آزادیٔ فکر اور چرچ کے درمیان شدید نزاع چلی آرہی ہے۔ چرچ نہ تو مسیحیت کی طرح صرف دین پر قانع ہو سکا اور نہ پاپائیت کی طرح صرف آخرت کے بارے میں حکم چلانے پر اکتفا کر سکا۔ زمین و آسمان اور مادّہ کے بارے میں چرچ کے نظریات سائنس کے ان نظریات سے ٹکرائے جو مطالعہ، تحقیق، اور تجربہ کی بنیادوں پر قائم تھے، تجربہ اور حقیقت واقعہ نے سائنس کے نظریات کی تائید کی اور سائنس کے کارناموں نے اس جدید طرز تحقیق کی عظمت میں شک شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہ رکھی۔ علماء اور مفکرین کی کئی کئی پشتیں ایسی پیدا ہوئیں جو چرچ کو نفرت اور حقارت کی نگاہوں سے دیکھتی تھیں، اور ان کے دل میں علمبرداران مذہب سے سخت دشمنی اور نفرت کے جذبات موج زن تھے۔

یہاں سے یورپ کی زندگی میں مذہب اور سائنس، اور چرچ اور فکر و نظر کے درمیان کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔

اب زندگی کی گاڑی آگے بڑھی، جدید علوم و فنون پھل پھول لائے اور ان کے طفیل ہی صنعتی دنیا میں بڑے پیمانہ پر سامان حیات کی تیاری کا طریقہ رائج ہوا۔ سرمایہ میں بے حد اضافہ ہو گیا اور دو مختلف کیمپ بن گئے سرمایہ داروں کا کیمپ اور مزدوروں کا کیمپ۔ دونوں کیمپوں کے مفادات و مصالح کے درمیان جو خلیج حائل تھی وہ بڑھتی چلی گئی۔ اقتدار عملاً حکومت کے ہاتھوں سے نکل کر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا۔ چرچ کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ رہا کہ اقتدار وقت کا کاسہ لیس بن کر رہے اور وہ سرمایہ دار کیمپ سے جا ملا!

یورپین چرچ کے تمام افراد کو مطعون قرار دینا صریح ظلم ہوگا۔ ان میں مفاد پرست بھی ہیں جو ہمیشہ طاقت و اقتدار کے مرکز سے وابستہ رہتے اور مذہب کو محنت کش عوام کو جمود و غفلت میں مبتلا رکھنے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ان کو اپنے حقوق کی خاطر جدّ و جہد کرنے اور دنیا میں انصاف چاہنے سے روک کر یہ لوگ اُن کو صرف آخرت کے اچھے بدلے کی تمناؤں سے بہلاتے رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ان میں ایسے افراد بھی لازماً رہے ہوں گے جو پورے خلوص کے ساتھ اس بات کی تلقین کرتے ہوں۔ کیونکہ اُن کے نزدیک مسیحیت کی روح یہی تھی ا مسیحیت اپنی اصل اور روح کے اعتبار سے زہد اور دنیا سے بے رغبتی ہی کا نام ہے۔ جولانیٔ حیات کو سرد کرنا، زندگی کے مادّی اسباب سے بے نیازی سکھانا، ظاہری زندگی کو حقیر جاننا اور خیالی دُنیا میں بلندیوں کی طرف پرواز اس کے مزاج میں شامل ہے۔

بہر حال، جب محنت کش طبقات نے جو اب اپنے حقوق کی خاطر ٹکر لینے پر آمادہ تھے، یہ محسوس کیا کہ مذہب اس کشمکش میں ان کا ساتھ نہیں دے سکتا بلکہ چرچ اسے اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہے تو اُنھوں نے مذہب کے خلاف کھُلّم کھُلّا اعلان بغاوت کر دیا اور اسے عوام کے لیے "افیون" قرار دیا۔ اس طرح مذہب اور کمیونزم کے درمیان اس علانیہ دشمنی کا آغاز ہوا جس کے کمیونسٹ قائل ہیں۔ لیکن ہم سے ان باتوں کا کیا تعلق، جب کہ ہماری تاریخ اور اسلام کا مزاج دونوں اس طرح کی باتوں سے کوسوں دور رہے ہیں! اسلام آزاد ممالک میں پروان چڑھا جن پر کسی شہنشاہ یا کسی ایمپائر کا تسلط نہیں تھا۔ اس کی نشو و نما ایک ایسے معاشرہ میں ہوئی جو پختگی کو نہیں پہنچا تھا۔ لہٰذا اس معاشرہ کی تنظیم کے لیے قانون سازی، اور اس کی نشو و ارتقاء کے لیے

مختلف تدابیر کو روبکار لانا یہ سب پوری طرح اس کے ہاتھ میں رہا۔ اس کو اس بات کا موقع ملا کہ انسان کے قلب وضمیر اور اس کے معاملات زندگی دونوں پر بیک وقت چھایا رہے اور اپنی قانون سازی اور ہدایات میں دین ودُنیا دونوں کو سامنے رکھے۔ چنانچہ اسلام نے انسان کے عالم نفسی میں ارضی وسماوی دونوں جانوں کو جمع کر دیا۔ وہ فرد کے ضمیر اور جماعت کی عملی زندگی دونوں کی روح رواں بن کر رہا۔ اس کے نظام میں عملی سرگرمیاں کبھی بھی اس دینی حس سے جدا نہیں ہوتیں جو برائیوں کے خلاف سب سے بڑی روک ہے۔ چاہے وہ کتنے نت نئے روپ دھارے اور اچھوتے پیرایہ میں سامنے آئے لیکن اس کا اصل جوہر ہمیشہ اپنی صحیح شکل میں باقی رہتا ہے اور کبھی رنگ نہیں بدلتا۔

اس انداز پر نشو نما پانے اور اس مخصوص طریق کار کا حامل ہونے کی وجہ سے اسلام کے لیے عملی زندگی سے کنارہ کش ہو کر صرف وجدان وضمیر کی دنیا میں محصور ہو جانا کبھی ممکن نہ تھا۔ وہ کسی بادشاہ یا ایمپائر کے ڈر سے اپنا دائرہ عمل محدود کر لینے پر بھی مجبور نہ تھا، وہ اپنا فرماں روا آپ ہے اور اس کا میدان عمل پوری انسانی زندگی ہے، روحانی بھی اور مادّی بھی، دینی بھی اور دنیاوی بھی۔

سماج سے کٹ کر یہ دین اپنا صحیح مزاج برقرار ہی نہیں رکھ سکتا، خواہ اس سماج کے افراد ایسے "مسلمان" ہی کیوں نہ ہوں جو اپنے اجتماعی، اقتصادی اور قانونی نظام میں اسلام کو حَکَم، نہ بنانتے ہوں۔ جن لوگوں نے اسلامی احکام کو اپنے اجتماعی نظم اور قوانین سے دور رکھا ہو اور صرف عبادات ومراسم کی حد تک اس سے تعلق رکھتے ہوں ان کا سماج کبھی اسلامی سماج نہیں قرار دیا جا سکتا۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ، ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا۔

(النساء: ۶۵)

نہیں، اے محمد تمہارے رب کی قسم یہ کبھی صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں اور سر بسر تسلیم کر لیں۔

وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ، وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا۔ (حشر: ۷)

جو کچھ تم کو رسول دے اسے مان لو، اور جس چیز سے بھی وہ روکے اس سے رک جاؤ۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (مائدہ : ۴۴)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔

اس پالیسی کی تعیین میں جو چیز فیصلہ کن رہی ہے وہ اس دین کا ایک ناقابل تقسیم اکائی ہونا ہے۔ اس کی عبادات ومعاملات، اس کے قوانین اور اس کی ہدایات، سب مل کر ایک کل بناتے ہیں جو ناقابلِ تجزیہ ہے یہاں مراسمِ عبودیت مزاج اور مقاصد کے اعتبار سے معاملات زندگی اور نظام حیات سے جدا نہیں۔ چنانچہ نماز جو اہم عبادات میں سے ہے، جہاں اس کا منشا یہ ہے کہ فرد وجماعت دونوں ایک صاحبِ قدرت وجبروت الٰہ کی طرف متوجہ ہوں، صرف اسی کے آگے سب کی گردنیں جھکیں، اور یکسو ہوکر ہر طرح کی کجی اور بے راہ روی سے بچتے ہوئے سب ایک ہی قبلہ کی طرف متوجہ ہوں وہیں ایک طرح کی مساوات اور ایک جزاء وسزا کا اختیار رکھنے والی ہستی کی نظر میں برابری کا احساس دلانا بھی اس کا منشاء ہے۔ سب اس کے بندے ہیں اور سب اس کے آگے برابر ہیں لا الٰہ الا اللہ کا اہم ترین عقیدہ بھی ضمیرِ انسانی کو بندوں کی بندگی کے ہر شائبہ سے پاک دیکھنا چاہتا ہے یہی آزادیٔ ضمیر ایک صالح اور پاکیزہ سماج کی تعمیر میں پہلا قدم ہے، ایسا سماج جس میں سب کا درجہ مساوی ہو

اس دین کا مطالعہ کرنے والے کو اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اجتماعیت اس کے مذہبی آداب ومراسم اور نظام زندگی دونوں میں سرایت کیے ہوئے ہے، یہ ایک طاقت ور بنیادی فکر بن کر اس کے پورے نظام میں جاری وساری ہے۔ اب اگر کسی دور میں لوگ عبادات کے پہلو پر زیادہ زور دینے لگیں اور دین کو اجتماعی زندگی سے یا اجتماعی زندگی کو دین سے کاٹ کر علیحدہ کرنا چاہیں تو یہ اس دور کی آفت ہے نہ کہ اس دین کی کمزوری۔

اسلام کے بارے میں ہماری یہ رائے اپنی گھڑی ہوئی نہیں اور نہ ہی یہ کوئی نئی تاویل ہے۔ یہ وہی اسلام ہے اور اسی طرح سے پیش کیا جارہا ہے جس طرح کہ اسے اس کے اولین حامل، محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا اور سمجھایا تھا۔ اسلام کے اصل منبع سے قریب رہنے والے مخلصین صحابۂ کرام نے بھی یہی سمجھا تھا۔

قرآن کریم فرماتا ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ

اے ایمان لانے والو جمعہ کے دن جب نماز کے لیے پکارا جائے

مِنۡ یَّوۡمِ الۡجُمُعَۃِ فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الۡبَیۡعَ ۔ ذٰلِکُمۡ خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۔ فَاِذَا قُضِیَتِ الصَّلٰوۃُ فَانۡتَشِرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ وَابۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِ اللّٰہِ (الجمعہ : ۹ و ۱۰)

تو کاروبار ترک کر کے اللہ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو۔ یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے اگر تم واقعی علم رکھتے ہو۔ جب نماز ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔

ہر شخص جانتا ہے کہ فرض نماز دن بھر میں کتنا وقت گھیرتی ہے۔ اس کے بعد جو وقت بچتا ہے۔ وہ سعی و عمل اور رہِ حیات میں جدّ وجہد کے لیے فارغ ہے۔ پوری زندگی میں نماز کتنا تھوڑا سا وقت لیتی ہے! رات دن کے بقیہ سارے ہی اوقات سماج اور عملی زندگی کے تقاضے پورا کرنے کے لیے خالی ہیں۔ قرآن ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے :۔

وَجَعَلۡنَا الَّیۡلَ لِبَاسًا وَّجَعَلۡنَا النَّہَارَ مَعَاشًا (النباء : ۱۰ - ۱۱)

ہم نے شب کو پردہ پوش اور دن کو کسب معاش کا موقع قرار دیا۔

اس لیے کہ دن میں زیادہ تر وقت معاش میں صرف ہوتا ہے نہ کہ عبادات مفروضہ میں!

اسلام میں عبادات محض مراسم بجا لانے کا نام نہیں۔ ہر اجتماعی خدمت اور ہر بھلا کام یہاں عبادت شمار کیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

الساعی علی الارملۃ والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ او القائم اللیل، الصائم النہار (مسلم۔ بخاری۔ ترمذی)

غریبوں اور بیواؤں کی خدمت کرنے والا وہی درجہ رکھتا ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کا، یا رات بھر نماز پڑھنے اور دن بھر روزہ رکھنے والے کا ہے۔

اسلام کی روح صاحب اسلام ــــــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ــــ کے فہم کے مطابق کیا تھی، ذیل کے دو واقعے اس طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

حضرت انس رضؓ روایت فرماتے ہیں کہ "ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ سفر میں تھے۔ کچھ لوگ روزہ سے تھے۔ اور کچھ لوگ روزہ سے نہیں تھے۔" ان کا کہنا ہے کہ "اس حال میں ہم نے ایک سخت گرمی والے دن ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ ہم میں سب سے زیادہ سایہ اس کو میسّر تھا جس کے پاس چادر تھی، ورنہ بعض لوگ تو ہاتھوں ہی کے

ذریعہ دھوپ سے بچاؤ کی کوشش کر رہے تھے۔" پھر وہ کہتے ہیں کہ " اب روزہ دار لوگ تو آرام کرنے لگے اور جو روزے سے نہیں تھے انھوں نے اٹھ کر خیمے نصب کیے اور سواری کے جانوروں کو پانی پلایا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" آج سارا اجر وہ لوگ لے گئے جو روزہ سے نہیں تھے " [1]

حضرت انسؓ ہی سے یہ بھی مروی ہے کہ تین آدمی ازواج مطہرات کے گھروں پر ان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت گذاری کا حال معلوم کرنے آئے۔ جب انھیں صورت حال بتائی گئی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے اس کو اپنے اندازہ سے بہت کم پایا۔ وہ بولے" کہاں ہم، کہاں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔ آپ کے تو اگلے اور پچھلے سارے گناہ معاف کیے جا چکے ہیں"! ایک نے کہا " میں تو راتیں نماز میں گذارتا ہوں"، دوسرا بولا" میں مسلسل روزے رکھتا ہوں اور کبھی ناغہ نہیں کرتا"، تیسرے صاحب نے کہا " میں عورتوں سے پرہیز کرتا ہوں اور کبھی نکاح نہ کروں گا"۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف تشریف لائے اور فرمایا۔ " تم ہی لوگ ہو جنھوں نے ایسا ایسا خیال ظاہر کیا ہے؟ خدا کی قسم میں تقویٰ اور اللہ سے ڈرنے کے معاملہ میں تم سے کہیں آگے ہوں، لیکن میں روزے بھی رکھتا ہوں اور بغیر روزے بھی کچھ دن گذارتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ اب جو شخص میری سنت سے علٰحدہ کوئی روش اختیار کرے اس کو مجھ سے کوئی واسطہ نہیں"۔ [2]

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے لائے ہوئے دین کو خوب اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ ان کا یہ ارشاد فرمانا کسی طرح بھی نماز روزے کی اہمیت نہیں گھٹاتا بلکہ اس دین کے اصل مزاج کی وضاحت کرتا ہے۔ یہ وہ دین ہے جو عقیدہ کے تقاضے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ عملی زندگی کے تقاضے بھی پورا کرتا ہے اور عقیدہ کو عملی زندگی کی رگ رگ میں اتار دیتا ہے۔ وہ عقیدہ کو لے کر ضمیر کی خلوت میں گوشہ گیر نہیں ہو جاتا۔

ذیل کے دو واقعے گواہ ہیں کہ حضرت عمرؓ نے بھی دین کو ایسا ہی سمجھا تھا۔ آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ تقشف اور عبادت و ریاضت میں گھلے جانے کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ آپ نے اسے ایک درہ رسید کیا اور فرمایا " اللہ تیرا برا کرے، ہمارے دین کو مردہ بنا کر نہ پیش کر"۔ اسی طرح ایک بار ایک شخص آپ کے پاس گواہ کی حیثیت میں

---

[1] یہ حدیث صحاح ستہ سے منقول ہے [2] مسلم۔ بخاری۔ نسائی۔

آیا۔ آپ نے اس سے کہا کہ کسی ایسے شخص کو بلاؤ جو تم کو جانتا ہو، چنانچہ وہ ایک شخص کو بلا لایا جس نے آکر اس کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے دریافت کیا "کیا تم اس کے قریبی پڑوسی ہو اور اس کی اندر باہر کی زندگی سے اچھی طرح واقف ہو۔" اس نے نفی میں جواب دیا۔ آپ نے کہا۔ تو پھر کیا تم سفر میں اس کے ساتھ رہ چکے ہو، کہ سفر میں کسی کی اخلاقی حالت کا بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے" اس کا جواب بھی نفی میں تھا۔ آپ نے فرمایا "کیا تم نے اس شخص کے ساتھ کبھی درہم و دینار کا معاملہ کیا ہے کیونکہ اس معاملہ میں انسان کے ورع و تقویٰ کی حقیقت کھل جاتی ہے۔" اس نے اس سے بھی انکار کیا۔ اب آپ نے فرمایا "تب میرا خیال ہے کہ تم نے اسے مسجد میں کھڑے قرآن پڑھتے، کبھی سر جھکاتے اور کبھی اوپر اٹھاتے دیکھا ہے" اس نے اقرار کیا، آپ نے کہا "چلے جاؤ، تم اس کو خاک نہیں جانتے" اور اس آدمی کو حکم دیا کہ پھر جائے اور کسی ایسے شخص کو لائے جو اسے واقعی جانتا ہو۔

اوپر ہم نبی کریمؐ کا تصورِ دین سامنے لا چکے ہیں اور حضرت عمرؓ کا فہم بھی سامنے ہے، یہی اس دین کی حقیقت کا صحیح فہم اور عبادت و سلوک، قلب و ضمیر میں چھپے ہوئے عقیدہ اور نظروں کے سامنے آنے والے ظاہری اعمال کے بارے میں اس کی صحیح رائے ہے۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (القصص: ۷۷)	اللہ نے تجھے جو کچھ عطا کیا ہے اس کے ذریعہ آخرت (کی بھلائی) طلب کر اور دنیا میں سے تیرا جو حصہ ہے اس سے بھی غافل نہ ہو۔
مَنْ رَأَى مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ ..... (مسلم۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ نسائی)	تم میں سے جو کوئی کسی "منکر" کو دیکھے اس کے ازالہ کی کوشش اس پر لازم ہے .....
وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا۔ (الحج: ۴۰)	اللہ اگر بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ہاتھوں مٹاتا نہ رہتا تو صومعے معابد اور مساجد، جن میں اللہ کا خوب ذکر ہوا کرتا ہے، سب کے سب ڈھا دیئے گئے ہوتے۔
وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا، إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ۔ (البقرہ: ۱۹۰)	اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَ آتَى الْمَالَ ـــ عَلٰى حُبِّهٖ ـــ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتَامٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ، وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا، وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ.....

(البقرہ : ۱۷۷)

نیکی یہ نہیں کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ کو اور یوم آخر کو ملائکہ کو اور اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب اور اس کے پیغمبروں کو دل سے مانے، اور اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر، مسکینوں اور مسافروں پر، مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے نیک لوگ وہ ہیں کہ جب عہد کریں تو اسے وفا کریں اور تنگی و مصیبت کے وقت میں اور حق و باطل کی جنگ میں صبر کریں۔

یہ ہے اعتقاد و عمل کے بارے میں اسلام کا اصل نقطۂ نظر ـــ یہاں دین و دنیا اور عقیدہ و سماج کے مابین مسیحیت کے ابتدائی دور کی طرح سے کوئی خلیج نہیں حائل ہے۔

اسلام میں نہ تو پجاریوں اور پادریوں کا کوئی نظام ہے نہ یہ صرف خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ کا نام ہے۔ زمین کے کسی گوشہ میں بسنے والا، یا سمندر کی لہروں پر سفر کرتا ہوا کوئی مسلمان تنِ تنہا خود، پروہت یا پادری کے واسطہ بغیر، اپنے رب سے تعلق جوڑ سکتا ہے۔ اسلامی نظام میں حکمراں اپنا اقتدار نہ تو کسی نظام پاپائیت سے حاصل کرتا ہے نہ براہ راست خدا سے۔ اس کے اقتدار و اختیار کا منبع "اسلامی جماعت" ہے۔ اسی طرح اس کے احکام و قوانین کا منبع شریعت ہے جس کے فہم و تطبیق میں سب برابر ہیں، اور سب یکساں طور پر اس کو اپیل کر سکتے ہیں۔

اب یہ بات واضح ہوگئی کہ اسلام میں مذہبی طبقات کو عام مسلمانوں پر کوئی اثر و اقتدار نہیں بخشا گیا ہے اور اسی طرح حاکم کا بھی سارا اقتدار بس شریعت سے مستنبط قوانین کے نفاذ تک محدود ہے۔ جہاں تک آخرت کا سوال ہے ہر ایک کو اُسی خدائے واحد کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

وَكُلُّهُمْ آتِيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَرْدًا (مریم : ۹۵)

ہر ایک کو قیامت کے دن اللہ کے حضور تنہا ہی حاضر ہونا ہے۔

عوام پر اثر و اقتدار یا ان کے مال و دولت کے سلسلہ میں مذہبی طبقات اور ارباب حکومت کے درمیان کسی کشمکش کا سوال نہیں، یہاں کوئی مادّی یا غیر مادی مفادات ایسے ہیں ہی نہیں کہ ان کے سلسلہ میں ان کو کشمکش کرنی پڑے۔ یہاں سیکولر اقتدار اور مذہبی و روحانی اقتدار کی ایسی تقسیم ہی نہیں جس کے باعث کشمکش کی نوبت آئے جیسا کہ پاپاؤں اور بادشاہوں کے درمیان ہوتا رہا ہے۔

اسلام نہ تو علم کا دشمن ہے نہ علماء کا بلکہ وہ طلب علم کو دینی فرائض میں داخل ایک مقدس فریضہ قرار دیتا ہے۔

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ)	علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم ہے۔
مَنْ سَلَكَ سَبِيْلًا يَطْلُبُ فِيْهِ عِلْمًا سَهَّلَ اللّٰهُ لَهٗ طَرِيْقًا اِلَى الْجَنَّةِ (مسلم۔ ابوداؤد، ترمذی، نسائی)	جس نے طلب علم کی خاطر کوئی رستہ طے کیا اللہ اس کے لیے جنت کی راہ آسان کرے گا۔

تاریخ اسلامی اہل فکر و نظر پر اس طرح کے منظم اور نامعقول مظالم اور سخت سزاؤں سے بھی ناآشنا ہے جو یورپ کی تحقیقاتی عدالتوں (Inquisitions) کا شعار رہا ہے۔ ایسے واقعات کہ کچھ افراد کو ان کے مخصوص فکر کی بنا پر سزا دی گئی ہے اسلامی تاریخ میں معدودے چند ہیں، اور وہ بھی اتفاقات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر ان واقعات کا کوئی خاص سیاسی پس منظر رہا ہے اور کسی گروہی تعصب یا نزاع نے ان کو جنم دیا ہے۔ اسلامی زندگی کے عام مزاج سے یہ بات ہمیشہ دور رہی ہے اور ایسے افراد اس کے مرتکب ہوئے ہیں جن کو اسلام کا صحیح فہم بھی نہیں حاصل تھا۔

جس دین نے صرف معجزات و خوارق پر بھروسہ کر لیا ہو اور جو محض غیب کی باتوں پر نہ قائم ہو بلکہ کائنات میں چار سو بکھری ہوئی آیات کے مشاہدہ اور ان پر غور و فکر کو اپنی اساس قرار دیتا ہو، اُس سے اسی مزاج کی توقع کی جا سکتی تھی۔

اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ	جو لوگ عقل سے کام لیتے ہیں ان کے لیے آسمانوں اور زمین کی ساخت میں، رات اور دن کے پیہم ایک دوسرے کے بعد آنے میں، ان کشتیوں میں جو انسان کے نفع کی چیزیں لیے ہوئے

مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّةٍ ، وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۔

(البقرۃ : ۱۶۴)

دریاؤں اور سمندروں میں چلتی پھرتی ہیں ، بارش کے اس پانی میں جسے اللہ اوپر سے برساتا ہے پھر اس کے ذریعہ زمین کو زندگی بخشتا ہے اور اپنے اس انتظام کی بدولت زمین میں ہر قسم کی جاندار مخلوق کو پھیلاتا ہے ہواؤں کی گردش میں ، اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان تابع فرمان بنا کر رکھے گئے ہیں ، بے شمار نشانیاں ہیں ۔

یُخۡرِجُ الۡحَیَّ مِنَ الۡمَیِّتِ وَیُخۡرِجُ الۡمَیِّتَ مِنَ الۡحَیِّ ، وَیُحۡیِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ، وَکَذٰلِكَ تُخۡرَجُوۡنَ ، وَمِنۡ اٰیٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَکُمۡ مِّنۡ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَاۤ اَنۡتُمۡ بَشَرٌ تَنۡتَشِرُوۡنَ ، وَمِنۡ اٰیٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡکُنُوۡۤا اِلَیۡهَا وَجَعَلَ بَیۡنَکُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ، اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ۔ وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ خَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافُ اَلۡسِنَتِکُمۡ وَاَلۡوَانِکُمۡ ، اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّلۡعٰلِمِیۡنَ ۔ وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ مَنَامُکُمۡ بِالَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَابۡتِغَآؤُکُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ، اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّسۡمَعُوۡنَ ۔ وَمِنۡ اٰیٰتِهٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّطَمَعًا ، وَّیُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحۡیٖ بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا ، اِنَّ فِیۡ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ (الروم : ۱۹ تا ۲۴)

"وہ مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو نکالتا ہے اور زمین کو مردہ (خشک اور بنجر) ہو جانے کے بعد از سر نو زندگی بخشتا ہے اسی طرح تم بھی (دوبارہ) نکالے جاؤ گے ۔ اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کہ تم کو مٹی سے پیدا کیا ، پھر تم ہر چہار طرف پھیلے ہوئے انسان بن گئے ۔ اس کی نشانیوں میں سے یہ بھی ہے کہ تمہارے لیے تمہاری ہی طرح کے جوڑے بنا دئیے تاکہ ان کے پاس جا کر سکون حاصل کر سکو نیز اس نے تمہارے درمیان (فطری طور پر) محبت اور الفت کا رشتہ رکھا ۔ ان باتوں میں سوچنے والوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں ۔ آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق اور تمہارے رنگوں اور تمہاری بولیوں کا فرق بھی اسی کی (قدرت کی) نشانی ہے ۔ سوچنے سمجھنے والوں کے لیے ان باتوں میں کافی اشارے موجود ہیں

تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کی تلاش کرنا بھی
اس کی ایک نشانی ہے۔ ان باتوں میں سننے والوں کے لیے
متعدد علامتیں موجود ہیں۔ اسی کی ایک نشانی یہ بھی ہے کہ وہ تمہیں
بجلی دکھاتا ہے جسے تم خوف اور امید (کے ملے جلے جذبات)
کے ساتھ دیکھتے ہو۔ وہی آسمان سے پانی اتارتا ہے اور اس سے
زمین کو زندہ کرتا ہے بعد اس کے کہ اس پر مردنی چھا چکی تھی، ان
چیزوں میں سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہی نشانیاں ہیں۔"

ایک ایسے دین کی پالیسی یہی ہو سکتی تھی جو علم اور تقویٰ کے درمیان علت اور معلول کا رشتہ بتاتا ہو اور علم کو معرفت خداوندی اور خشیت الٰہی کا ذریعہ قرار دیتا ہو۔

اِنَّمَا یخشی اللہ من عبادہ العلماءُ (فاطر: ۲۸) — اللہ سے کماحقہ، خشیت اس کے بندوں میں سے اصحاب علم ہی کرتے ہیں۔

جو اہل علم کو جاہلوں سے برتر گردانتا ہو۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ (زمر: ۹) — کہو کیا اہلِ علم اور علم سے بے بہرہ لوگ برابر ہو سکتے ہیں؟

فَضْلُ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ (ابو داؤد، ترمذی، ابن حبان، بیہقی) — صاحب علم کا مرتبہ عبادت گذار سے اتنا ہی بلند ہے جتنا چاند کا دوسرے ستاروں سے۔

پس اسلام اور تاریخ اسلامی سائنس اور مذہب کے درمیان اس طرح کے عناد و دشمنی سے بالکل بری ہے جس طرح کی دشمنی نشاۃ ثانیہ کے دور میں چرچ اور آزادی فکر کے علمبرداروں اور سائنس دانوں کے درمیان پیدا ہو گئی تھی۔

رہی یہ بات کہ دینی طبقات نے ارباب اقتدار اور اہل دولت کا ساتھ دیا اور غریب محنت کش عوام کو خاموش کرنے اور غافل رکھنے کے لیے مذہب کو آلۂ کار بنایا تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلامی تاریخ کے بعض ادوار میں ایسا ہوا ہے ——— لیکن دین کی حقیقی روح اِن لوگوں کو یہ موقف اختیار کرنے پر ملامت کرتی ہے، مادی مفادات کی خاطر اللہ کی آیات کی اس تجارت پر دین ان کو سخت سزا اور دردناک عذاب کی دھمکی دیتا ہے۔ ان لوگوں کے پہلو بہ پہلو تاریخ ایک بالکل دوسرے کردار کے حامل دین داروں کو بھی سامنے لاتی ہے کسی کی لعنت ملامت

ان کو حق بات کے اعلان سے نہ روک سکی، انھوں نے حق اللہ اور فقراء و مساکین کے حقوق کی حمایت میں سرمایہ داروں اور ارباب اقتدار سے ٹکر لی۔ حق داروں میں یہ احساس ابھارا کہ ان کو اپنے حق کے لیے جدّوجہد کرنی ہے، اور اس کے نتیجہ میں حکومتوں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ بسا اوقات تو ان کو سخت سزائیں بھی جھیلنی پڑیں اور جلا وطنی اختیار کرنی پڑی۔

اسلام کا مخصوص مزاج اور اس کی تاریخ دونوں میں سے کوئی بھی اس دین کو سماج سے علیحدہ رکھنے کے لیے کوئی وجہ جواز فراہم نہیں کرتا۔ یہاں ان اسباب میں سے کوئی سبب بھی موجود نہیں جو یورپ میں مسیحیت سے وابستہ ہو گئے اور جن کے نتیجہ میں مسیحیت نے دین کو دنیا سے کنارہ کش کر لیا۔ دین کو صفائے باطن اور تطہیر نفس تک محدود رکھا اور سماجی زندگی کی باگ ڈور خود ساختہ قوانین کے حوالہ کر دی۔ اسی طرح کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور اجتماعی عدل کے قیام کی جدّوجہد میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے۔

عیسائیت اور اشتراکیت کی کشمکش میں ایسے اسباب ضرور کارفرما تھے، مگر اسلام تو خود اجتماعی عدل کے لیے اصول و ضوابط تجویز کرتا ہے، مال داروں کی دولت میں فقراء کا حق متعین کرتا ہے اور حکومت و اقتصاد کے لیے عدل و انصاف پر مبنی نظام دیتا ہے۔ نہ اس نے عوام کو افیون میں مبتلا کیا اور نہ انھیں یہ تعلیم دی کہ دنیا میں اپنے حقوق سے دستبردار ہو کر صرف عقبیٰ میں ان کی بازیافت کے متوقع رہیں...... برعکس اس کے اسلام نے اپنے فطری حقوق سے یوں ہی دستبردار ہو جانے والوں کو، خواہ وہ کسی دباؤ کے تحت ہی ایسا کریں، آخرت میں عذاب شدید کی دھمکی دی اور آپ اپنے اوپر ظلم کرنے والا قرار دیا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِکَةُ ظَالِمِیْٓ اَنْفُسِهِمْ، قَالُوْا، فِیْمَ کُنْتُمْ؟ قَالُوْا: کُنَّا مُسْتَضْعَفِیْنَ فِی الْاَرْضِ۔ قَالُوْا۔ اَلَمْ تَکُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِیْهَا؟ فَاُولٰٓئِکَ مَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا۔

(نساء: ۹۷)

جو لوگ اپنے آپ پر ظلم کر رہے تھے ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو اُن سے پوچھا کہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور و مجبور تھے فرشتوں نے کہا۔ کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنّم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے۔

ایسے لوگوں کو وہ اپنے حقوق کے لیے جنگ کرنے پر اکساتا ہے۔

مَن قُتِلَ دون مظلمتہٖ فھو شہید
جو کوئی اپنے اوپر کیے جانے والے کسی ظلم سے بچاؤ کرتا ہوا مارا جائے وہ شہید ہے۔ (نسائی)

اب اگر یورپ مذہب کو عملی زندگی سے دور رکھنے پر مجبور ہوا تو ہم کو اس معاملہ میں اس کے نقش قدم پر چلنے کی کوئی ضرورت نہیں اسی طرح اگر اشتراکیت مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مذہب دشمنی پر مجبور ہوئی تو ہم اس ضرورت سے بھی بے نیاز ہیں۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ اس کی کیا ضمانت کہ جس نظام کو اسلام نے ایک خاص دور میں قائم کیا تھا اس میں نشوونما کی اور نئے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی صلاحیت بھی پائی جاتی ہے؟ کیا یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ تاریخ کے ایک بالکل دوسرے دور میں بھی کامیابی کے ساتھ چل سکے، جب کہ یہ دور اپنے حالات اور اپنی سماجی اقدار کے اعتبار سے اسلام کے ظہور و عروج کے زمانہ سے بہت کچھ مختلف واقع ہوا ہے؟

یہ ایک اہم بنیادی سوال ہے۔ اس کا پورا جواب ہم اس مرحلہ پر نہ دے سکیں گے۔ آئندہ صفحات میں ہم اسلامی نظام کو واضح طور پر پیش کریں گے، اس کے اصول سامنے لائیں گے اور ان اصولوں کے حدود عمل متعین کریں گے، اور پھر یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ عملی زندگی میں اس نظام کو کس طرح اپنایا جاسکتا ہے۔ اس سوال کا قدرے تفصیلی جواب اس مطالعہ کے بعد ہی سامنے آسکے گا۔

یہاں ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے زمانی تغیرات اور ان کے زیر اثر معاشرت، معیشت اور نظریات وافکار کی دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی ہے۔ اس نے بنیادی اصول متعین کردیے ہیں اور ایک اصولی خاکہ مرتب کردیا ہے۔ رہا ان اصولوں کا عملی انطباق تو یہ تغیراتِ زمانہ اور ضروریات ومصالح کے حوالہ ہے۔ یہ کام مقررہ اصولوں اور متعین حدود کے اندر انجام پاتا رہے گا۔ جزئی اور تفصیلی قوانین زندگی کے صرف ان شعبوں کے لیے دیئے گئے ہیں جو ان تبدیلیوں سے بنیادی طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ ان امور کی حد تک اسلامی قوانین ہر زمانہ اور ہر ماحول میں پوری افادیت اور موزونیت کے ساتھ قابلِ عمل رہتے ہیں۔ اپنی جامعیت اور لچک کے سبب اسلامی قوانین زمانہ کی ترقی کے ساتھ نمو اور تجدد کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس دین کے علماء قانون نے قیاس و تفریع اور قوانین کو عملی حالات پر منطبق کرنے کے سلسلہ میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت سماج پر اسلامی قوانین کی حکمرانی تھی اور انہی فقہاء کی کوششوں کی بدولت اسلامی احکام سماج کے نت نئے مسائل کا پوری طرح ساتھ دیتے رہے ...... پھر ایک طویل عرصہ تک یہ کام معطل رہا چنانچہ فقہ اسلامی کا نشو ونما اسی مقام پر رک گیا۔ اب اس صدی کے آغاز میں سارے عالم اسلامی میں زندگی کی نئی لہریں نمودار ہوئی ہیں اور ان کے پہلو بہ پہلو اسلامی قانون میں بھی از سر نو جان پیدا ہو رہی ہے۔

اس صورت حال کا علاج یہ نہیں کہ شریعت سے ماخوذ اسلامی قوانین کی تدوین کے چھوٹے ہوئے سلسلہ کو از سر نو شروع کرنے سے قبل ہم فرانسیسی قوانین سے اپنی قانون سازی میں رہنمائی حاصل کرنے لگیں یا اشتراکی نظریات سے اپنا اجتماعی نظام اخذ کر لیں۔ جن قوانین کی اساس پر ماضی میں ہماری سماجی زندگی قائم تھی، اب جدید سوسائٹی کی تشکیل و تعمیر میں ان کی صلاحیت و افادیت سے مایوس ہوئے بغیر مذہب کو محض عبادات تک محدود کر دینا بڑی زیادتی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی ماحول کے لیے وہی نظام موزوں ہوتا ہے جس نے خود اسی ماحول کے اندر فطری طور پر ارتقاء کے مراحل طے کیے ہوں۔ کسی اجنبی ماحول کے نظام کو جس نے اس مخصوص فضا میں ارتقاء کے فطری مراحل نہ طے کیے ہوں، لا کر اس پر مسلط کر دینا کبھی سازگار نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنا نہ صرف اس دین کی حقیقت سے ناواقف ہونے، بلکہ خود انسانی زندگی اور انسانی سماج کے نفسیات سے جہالت کا ثبوت ہے کہ یہ اندھی تقلید ہے تفریق دین و دنیا کے اس رجحان کی جو سراسر یورپ کا پروردہ ہے۔ یورپ والوں کے دین کا مزاج خود ان سے اس تفریق کا مطالبہ کرتا ہے جب کہ اسلام کا مزاج اس سے کوسوں دور ہے۔ اور ہم نے تاریخی تجزیہ کر کے واضح کیا ہے کہ ان کے یہاں مذہب و سائنس اور چرچ اور اسٹیٹ کے درمیان کشمکش کیوں ہوئی، اور کس طرح اسلامی تاریخ کا حال اس سے بالکل مختلف واقع ہوا ہے۔ ان کی مخصوص تاریخ تھی جس نے اس رجحان کو جنم دیا، ہمیں اس سے کیا واسطہ !

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم فکری، روحانی اور سماجی طور پر انسانیت کے دائرہ سے کٹ جانے کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہرگز نہیں، اسلام اس طرح کی کنارہ کشی کا بالکل قائل نہیں، اور یہ بھی کس طرح سکتا ہے، جب وہ خود ایک عالمگیر پیغام کی حیثیت میں سامنے آتا ہے ...... ہم صرف اس پر زور دینا چاہتے ہیں کہ کسی کی تقلید سے پہلے

ہمیں خود اپنے سرمایہ کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ ہمیں پہلے اپنے اصول کا مطالعہ کرنا چاہیے اور اس بات کا صحیح اندازہ لگانا چاہیے کہ وہ زمانہ کا ساتھ دینے اور ہمیشہ قابل عمل رہنے کی صلاحیت کس حد تک رکھتا ہے۔ ہماری روایات اور ہماری تاریخ کو اس طرح کی اندھی تقلید سے ذرا بھی مناسبت نہیں۔ اس میں جنس کر ہم اپنا امتیازی وجود کھو بیٹھیں گے۔ ہمیں مقلد بن کر انسانیت کے قافلہ میں پیچھے پیچھے چلنا ہوگا، جب کہ ہمارا دین ہمیں ہمیشہ آگے رہنے پر ابھارتا ہے۔

کنتم خیر امۃ اُخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر . . . .

(آل عمران : ۱۱۰)

دنیا میں تم ہی وہ بہترین گروہ ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو . . . .

اپنے قیمتی سرمایہ پر ایک نگاہ ڈالتے ہی یہ بات ہم پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ہمارے ہی پاس وہ نسخۂ شفا ہے جو اس آفت کی ماری مصیبت زدہ اور خستہ حال دنیا کے درد کا درماں بن سکتا ہے جسے یہ روحانیت سے عاری مادی تہذیب چوتھائی صدی کے مختصر سے عرصہ میں دو عالم گیر جنگوں میں جھونک چکی ہے اور اب بھی اسی گمرہی میں مست، ایک تیسری عالم گیر جنگ کی طرف بڑھ رہی ہے جس میں اس کے سارے تمدن کی بربادی مضمر ہے۔

اب ہم اس تمہید کو ختم کرتے ہیں۔ مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ موجودہ سماج کے لیے اس دین کی موزونیت کے سوال پر شروع ہی میں کوئی فیصلہ کر دیا جائے ایسا کرنے سے پہلے ہم انسانی زندگی کی نسبت سے اس دین کا موقف موجودہ مشکلات کے لیے اس کے تجویز کردہ حل، اور اس کتاب کے موضوع کی مناسبت سے اجتماعی عدل کے سلسلہ میں اسلامی پروگرام تفصیل کے ساتھ سامنے لانے کی کوشش کریں گے۔

دوسرا باب

اسلام میں اجتماعی عدل کا مزاج

اسلام میں اجتماعی عدل کے مزاج سے ہم صحیح طور پر اسی وقت آشنا ہو سکتے ہیں جب کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں اسلام کا موقف اچھی طرح سمجھ لیں۔ کیونکہ اجتماعی عدل کا اسلامی نظریہ اسی اصولی اور بنیادی فکر کی ایک فرع ہے جو اسلام کی تمام تعلیمات کا مرجع و منبع ہے۔

اسلام کے پیش نظر پوری انسانی زندگی کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنے کا کام تھا، اس لیے نہ تو اس کی اصلاحی کوششیں اٹکل ٹپا رہی ہیں، اور نہ اس نے ہر ہر مسئلہ کے لیے الگ الگ علاج تجویز کیے ہیں۔ اس کے پاس کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک جامع تصور اور ایک مستحکم نظریہ ہے۔ اس کی تمام فروع اور جزئیات اس نظریہ سے نکلی ہیں۔ اس کے نظریات و قوانین، اس کی متعین کردہ حدود، اور عبادات و معاملات کے باب میں اس کی ہدایات سبھی اس اصل سے گہرا ربط رکھتی ہیں اسی جامع اور مکمل فکر کی روشنی میں اس کی عملی پالیسی بھی ملتی ہے۔ یہ طریقہ اسلامی مزاج کے بالکل منافی ہے کہ ہر نئی صورت حال کے لیے ایک نئی اور آزاد پالیسی وضع کر لی جائے جو دوسرے امور میں اختیار کی ہوئی پالیسی سے کوئی ربط نہ رکھتی ہو، یا ہر مسئلہ کے لیے علیحدہ حل تلاش کیے جائیں۔

اس بنیادی فکر کا صحیح فہم ایک محقق کے لیے اسلامی اصول وضوابط کا سمجھنا آسان کر دیتا ہے۔ اس کی روشنی میں وہ بآسانی اسلام کے تفصیلی احکام کو اس کے اصولوں سے ہم آہنگ دیکھ سکتا ہے۔ اسلامی طرز زندگی کا دلچسپی کے ساتھ گہرا مطالعہ بھی اس فہم کے بعد ہی ممکن ہے۔ اسی کے فیض سے محقق اس نتیجہ تک پہنچ سکے گا کہ اسلام ایک ناقابل تقسیم کل ہے جس کا ہر جزء دوسرے اجزا سے گہرے طور پر مربوط ہے، اور حیات انسانی کے لیے یہ نظام اسی وقت

نفع بخش ہو سکتا ہے جب اسے پورا کا پورا اپنایا جائے۔

اسلام کا مطالعہ کرنے والے کے لیے صحیح ترتیب یہی ہے کہ سیاسیات و اقتصاد، یا افراد و اقوام، کے باہمی تعلقات کے ضمن میں اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے پہلے کائنات، حیات، اور انسان کے بارے میں اسلام کا بنیادی فکر معلوم کرلے۔ اس لیے کہ یہ سب درحقیقت شاخیں ہیں جو اسی بنیادی فکر سے نکلی ہیں، اسے سمجھے بغیر ان کو پوری صحت اور گہرائی کے ساتھ سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔

حقیقی اسلامی فلسفہ ابن سینا، ابن رشد، فارابی یا ان جیسے اُن دوسرے فلاسفہ کے یہاں نہیں ملے گا جن کو دُنیا "فلاسفۂ اسلام" کا نام دیتی ہے، ان کا فلسفہ یونانی فلسفہ کا چربہ ہے جو اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کے لیے بالکل اجنبی واقع ہوا ہے۔ اسلام کے پاس اپنا حقیقی اور مکمل فکر موجود ہے جو اس کے فکری مآخذ قرآن، حدیث رسول خدا کی سیرت پاک اور آپ کے طرزِ عمل سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے جس بنیادی فکر سے اس کی بقیہ ساری تعلیمات — بہ شکل قوانین، عبادات اور معاملات — نکلتی ہیں اس کو پالینے کے لیے یہ مآخذ ہر بالغ نظر محقق کے لیے کافی ہیں۔

اسلام نے خالق اور مخلوق، انسان، حیات، اور کائنات، انسان اور اس کی اپنی ذات، فرد اور جماعت، فرد اور ریاست، بحیثیت مجموعی اقوام انسانی، اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت اور مزاج سے بحث کی ہے۔ اس نے اس میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں اپنے اصولی موقف اور تفصیلی نظریات کی بنیاد ایک جامع اور ہمہ گیر فکر پر رکھی ہے .... یہی اسلام کا فلسفہ ہے .... اور میں اسے "اسلام کا فکر" کہنا زیادہ پسند کروں گا۔

اس بنیادی فکر پر تفصیلی گفتگو اس کتاب کا موضوع نہیں۔ میں اس پر علیحدہ سے بحث کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں اور خدا سے دعا ہے کہ وہ اس ارادہ کو جلد عملی جامہ پہنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ یہاں ہم صرف اصولی اور اہم باتوں کی طرف اشارہ کریں گے، تاکہ یہ اشارات اسلام میں اجتماعی عدل پر گفتگو کے لیے تمہید کا کام کر سکیں۔

انسانیت عرصۂ دراز تک کائنات اور خالق کائنات، اور کائنات، حیات، اور انسان کے بارے میں کسی جامع تصور تک نہ پہنچ سکی۔ کیونکہ وہ اس وقت تک اس جامع اور ہمہ گیر تصور کے ادراک کے قابل ہوئی ہی نہ تھی —

تا آنکہ اسلام نمودار ہوا۔

خالق اور مخلوق (کائنات، حیات، اور انسان) کا تعلق ایک کلمہ کی قوت میں مضمر ہے جو دراصل عبارت ہے اس ارادہ سے جس سے تمام مخلوقات عالم کا وجود ہوا۔

انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہٗ کن فیکون (یٰس : ۸۲)

اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے "ہو جا" پس وہ چیز ہو جاتی ہے۔

خالق اور مخلوق کے درمیان کوئی واسطہ حائل نہیں۔ نہ قوت کا واسطہ نہ مادہ کا، بلکہ مخلوقات اس کے ارادۂ مطلق کے براہ راست نتیجہ کے طور پر بلا کسی تاخیر وجود میں آتی ہیں۔ اسی کے مطلق اور کامل ارادہ سے مخلوقات کا تحفظ ان کا انتظام اور ان کی تدبیر وابستہ ہے۔

یدبر الامر یفصل الآیات (الرعد : ۲)

معاملات کی تدبیر کرتا ہے۔ آیات کی تفصیل سامنے لاتا ہے

یمسک السماء ان تقع علی الارض الا باذنہ (الحج : ۶۵)

وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے، الا یہ کہ اللہ کا اذن ہو جائے۔

لا الشمس ینبغی لھا ان تدرک القمر ولا الیل سابق النھار۔ وکل فی فلک یسبحون۔ (یٰس : ۴۰)

سورج کے بس میں نہیں کہ چاند کو پالے، نہ رات دن سے پہلے آسکتی ہے، ہر ایک اپنے دائرہ کار میں رواں دواں ہے

تبارک الذی بیدہ الملک وھو علی کل شیئ قدیر (الملک : ۱)

بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھوں میں سارا اقتدار ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

ایک ارادۂ مطلق سے صادر ہونے والا یہ وجود ایک مکمل وحدت ہے، جس کا ہر جز اس طرح بنایا گیا ہے کہ وہ دوسرے تمام اجزا سے مناسبت رکھتا ہے۔ یہاں ہر جز میں ایک خاص حکمت پوشیدہ ہے جو ہم آہنگی و تناسب کے اس نظام کامل سے گہرا ربط رکھتی ہے۔

الذی خلق سبع سموٰت طباقًا۔ ما تری فی خلق الرحمن من تفٰوت۔ فارجع البصر ھل تری من فطور۔ ثم ارجع البصر کرتین ینقلب

وہی ہے جس نے تلے اوپر سات آسمان بنائے۔ تم رحمٰن کے خلق میں ذرہ برابر بھی فرق (بے ضابطگی) محسوس نہ کرو گے۔ تم نظر ڈال کر دیکھو۔ کیا تم کسی قسم کا نقص محسوس

إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝
(ملک : ۳-۴)

کرتے ہو۔ پھر تم دوسری بار نظر ڈالو۔ نظر تمہاری طرف ذلیل ہو کر درماندہ لوٹ آئے گی۔

وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَ بَارَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا (فصلت ۱۰)

اللہ نے زمین پر پہاڑ قائم کیے اور اس میں برکت رکھی۔ اور اس میں روزی کا اہتمام کیا۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ۔ (روم - ۴۸)

اللہ ہی ہے جو ہوائیں چلاتا ہے، پھر وہ ہوائیں بادل اٹھاتی ہیں اور اللہ اس بادل کو آسمان میں جس طرح چاہتا ہے پھیلاتا ہے۔ وہ ان کو تہ بہ تہ رکھتا ہے، پھر تو دیکھتا ہے کہ ان کے درمیان سے مینہ نکلتا ہے پھر جب وہ اس سے اپنے بندوں میں سے جنھیں چاہتا ہے نوازتا ہے، تو وہ خوش خوش نظر آنے لگتے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہر موجود شے کی ایک حکمت ہے جو مقصدِ کائنات سے ہم آہنگ ہے اور یہ کہ جو ارادہ کائنات کا موجد ہے، اور جو پھر اس کی تنظیم و تدبیر اور دیکھ بھال کرتا ہے، وہی ارادہ ہر شے میں اس امر کی رعایت بھی ملحوظ رکھتا ہے کہ وہ وجودِ کلی کے لیے نفعِ کلی کی حامل اور اس سے ہم آہنگ ہو۔

وجود چونکہ ایک ہی مطلق اور کامل ارادہ سے براہِ راست صادر ہونے کے باعث ایک ایسی وحدت ہے جس کے اجزاء باہم مربوط و ہم آہنگ ہیں، اس لیے وہ زندگی، اور خاص طور پر زندگی کے اعلیٰ ترین مظہر، اخلاقی زندگی کے لیے سازگار اور موافق بلکہ مددگار اور معاون واقع ہوا ہے۔

چنانچہ کائنات نہ تو زندگی کی دشمن ہے، نہ انسان کی۔ ہماری جدید ترین تحقیقات بھی بتاتی ہیں کہ قدرت انسان کی دشمن نہیں کہ ہر وقت اس سے دست بگریباں رہے بلکہ وہ ایک دوست ہے، جس کی سمت سفر وہی ہے جو حیات اور انسان کی سمت سفر ہے۔ زندگی گذارنے والوں کا کام یہ نہیں کہ وہ قدرت سے پنجہ آزمائی کریں۔ کیونکہ انھوں نے اسی کے آغوش میں پرورش پائی ہے اور وہ اور قدرت دونوں اسی کائنات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور ساری کائنات ایک ہی ارادے سے صادر ہوئی ہے۔ انسان ایک مانوس اور موافق

فضا میں ایسی موجودات کے درمیان رہتا ہے جو اس کی مونس و غم خوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب زمین بنائی تو

جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ مِن فَوْقِهَا وَبَارَكَ فِيهَا وَقَدَّرَ فِيهَا أَقْوَاتَهَا (حم السجدہ - ۱۰)

اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے۔ اس میں برکت ڈالی اور خوراکوں کا اہتمام کیا۔

وَأَلْقَىٰ فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَن تَمِيدَ بِكُمْ۔ (نحل :- ۱۵)

اور اس نے زمین میں پہاڑ گاڑ دیے۔ تاکہ وہ تم کو لے کر جھک نہ پڑے۔

وَالْأَرْضَ وَضَعَهَا لِلْأَنَامِ (الرحمن - ۱۰)

اور زمین کو اس نے مخلوق کے لیے مہیا کیا۔

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ (ملک :- ۱۵)

یہ اللہ کی ذات ہے کہ جس نے زمین کو تمہارے لیے مطیع بنایا۔ پس تم اس پر چلو، اور اللہ کے عطا کردہ رزق کو کھاؤ۔

خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا (بقرہ - ۲۹)

زمین کی ساری چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں۔

۔ آسمان اپنے حسین تاروں سمیت کائنات کا ایک جزء ہے، جو بقیہ دوسرے اجزاء سے مل کر اپنی تکمیل کو پہنچتا ہے۔ اس طرح جو کچھ بھی آسمانوں اور زمینوں میں ہے، وہ کائنات کے دوسرے اجزاء کا ہم سفر اور رفیق راہ ہے، اُن سے ہم آہنگ ہے، ان کا ممد و معاون ہے۔

وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ (ملک ۵)

اور ہم نے آسمان دنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا۔

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ مِهَادًا وَالْجِبَالَ أَوْتَادًا وَخَلَقْنَاكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاسًا وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَهَّاجًا وَأَنزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَاءً ثَجَّاجًا لِّنُخْرِجَ بِهِ حَبًّا وَنَبَاتًا وَجَنَّاتٍ أَلْفَافًا (النباء :- ۶ تا ۱۶)

کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں کر دیا، اور پہاڑوں کو میخ نہیں بنایا۔ اور ہم نے تم کو جوڑا جوڑا پیدا کیا، اور ہم نے تمہاری نیند کو ذریعۂ آرام بنایا، اور رات کو پردہ پوش کیا اور دن کو روزی کمانے کا وقت بنایا، اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے، اور ہم نے چراغ روشن کیا، اور ہم نے برسنے والے بادلوں سے بہت سا پانی نازل کیا۔ تاکہ ہم اس کے ذریعے سے اناج، سبزیاں اور گنجان باغ اگائیں۔

باوجود اس کے، ایسا نہیں کہ خالق نے انسان اور دوسری ذی روح موجودات کو اس سازگار کائنات کے حوالے کرکے ان کو خود اپنی براہِ راست توجہ اور نگرانی سے محروم ہی رکھا ہو۔ اس کا براہِ راست ارادہ بیک وقت پوری کائنات، اور اس کے ہر فرد کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَودعها۔ (ہود: ۶)

زمین میں کوئی ایسا حیوان نہیں جس کا رزق اللہ نہ فراہم کرتا ہو۔ اللہ ان تمام جانداروں کی جائے قرار اور ان کی آخری منزل سے باخبر ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنعلم مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نفسهٗ وَنَحْنُ اقرب اليه من حبلِ الورید۔ (قٓ: ۱۶)

ہم نے انسان کی تخلیق کی ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کیا کیا سکھاتا ہے۔ ہم تو اس سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔

وقال ربکم: اُدعونی اَستجب لکُم (غافر: ۶۰)

تمہارے رب نے کہا: مجھے پکارو میں تمہاری پکار سنوں گا۔

ولا تقتلوا اولادکُم مِن املاق...
.....نحنُ نرزقکم وایاھم (الانعام: ۱۵۱)

قلتِ رزق کے اندیشہ سے اپنی اولاد کو نہ قتل کرو۔
...... ہم تمہیں اور انہیں دونوں کو رزق فراہم کریں گے۔

شانِ وحدت کی حامل یہ کائنات ایک ہی ارادہ کا فیض ہے، انسان اسی کائنات کا ایک جزء ہے جو دوسرے اجزاء سے مربوط اور ہم آہنگ بھی ہے۔ فرداً فرداً نظامِ کائنات سے ہم آہنگ و مربوط ہونے کا لازمی تقاضا ہے کہ افرادِ انسانی باہم بھی ہم آہنگ و مربوط ہو کر رہیں۔ اسی بنا پر اسلام وحدتِ انسانیت کے نظریہ کا قائل ہے، کہ اس وحدت کے اجزاء اگر مختلف ہیں تو یہ بھی اتفاق و اتحاد ہی کی خاطر، اور متفرق ہیں تو اسی لیے کہ مجتمع ہو سکیں۔ وہ مختلف راہیں اختیار کرکے بھی بالآخر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں کیوں کہ وحدتِ کائنات کے ساتھ تعاون و ہم آہنگی سب کی منزل مقصود ہے۔

یا اَیُّھا النّاس اِنّا خلقنٰکم شعوبًا وقبائل لِتعارفُوا (الحجرات: ۱۳)

اے لوگو! ہم نے تم کو مختلف قوموں اور قبیلوں میں اسی لیے تقسیم کر رکھا ہے کہ تم کو ایک دوسرے کے تعارف میں آسانی ہو۔

انسانی زندگی کا نظم اس وقت تک درست نہ ہو سکے گا جب تک کہ یہ تعاون وہم آہنگی تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے اس کی تکمیل اس قدر ضروری ہے کہ اس راہ سے ہٹنے والوں کو واپس لانے کے لیے طاقت کا استعمال بھی مباح ہے۔

إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا أَوْ يُصَلَّبُوا أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ مِنْ خِلَافٍ أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ

(المائدہ:۔ ۳۳)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں، اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں، یا وہ جلا وطن کر دیے جائیں۔

وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۖ فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ ۚ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا۔

(الحجرات:۔ ۹)

اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو۔ اگر ان میں سے ایک کی زیادتی ہو تو اس گروہ سے مقاتلہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ پھر جب وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو، اور قسط پر قائم رہو۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ (البقرہ:۔ ۲۵۱)

اگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ ہٹاتا نہ رہتا، تو زمین کا نظام بگڑ جاتا۔

لہٰذا جس چیز کو اصل قرار دیا جائے گا وہ تعاون، ہم آہنگی اور ربط باہم ہے۔ جو اس اصل کو چھوڑے اس کو واپس لانے کے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ جو روش کائنات کی کلّی مصلحت کا تقاضا ہو اس کی اتباع بہرحال افراد اور گروہوں کی خواہشات کی پیروی سے زیادہ اہم ہے۔ باہمی تعاون و ہمدردی ہی وہ روش ہے، جو مقصد کائنات اور اس طور پر خالقِ کائنات کے ارادہ و منشاء سے ہم آہنگ ہے۔

انسان بحیثیتِ نوع بھی ایک وحدت ہے اور بحیثیت فرد بھی۔ اس وحدت کی بظاہر مختلف قوتیں

درحقیقت ہم منزل و ہم سفر ہیں۔ اس بارے میں انسان کا حال کائنات ہی جیسا ہے کہ اصل قوت ایک ہی ہے مگر اس کے مظاہر بے شمار۔

زمانہ دراز تک انسانیت، انسان اور کائنات کی قوتوں کے بارے میں کسی جامع نظریہ تک نہ پہنچ سکی، روحانی اور مادی قوتوں کے درمیان تقسیم کی گئی۔ کبھی ایک کو ثابت کرنے کے لیے دوسری کا انکار کیا، کبھی دونوں میں تضاد اور کشمکش کا تعلق تسلیم کیا۔ اس نے اپنی تعلیمات کی بنیاد اس نظریہ پر رکھی کہ روح و مادہ میں بنیادی طور پر تضاد ہے۔ ایک کا پلڑا بھاری ہوگا تو دوسرا لازماً ہلکا ہو جائے گا۔ دونوں میں سے کسی ایک کو ترجیح دیئے بغیر چارہ نہیں۔ اس نظریہ کی رو سے تضاد کائنات اور انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ اس نظریہ کی سب سے نمایاں مثال مسیحیت ہے اس معاملہ میں وہ کسی حد تک ہندو مذہب اور بدھ مت کے ساتھ ہے ـــــ اگرچہ خود ان دو مذاہب کا نقطہ نظر بھی باہم مختلف ہے۔ انکے نزدیک روح کی نجات جسم کو تکلیفیں پہنچانے، اسے گھلا ڈالنے، بلکہ فنا کر دینے یا کم سے کم اس کی طرف سے بے نیاز ہو جانے اور جسمانی لذتوں سے ہاتھ کھینچ لینے میں مضمر ہے۔

مسیحیت اور اس سے ملتے جلتے دوسرے مذاہب کے اس اصول کا اثر انسانی زندگی اور اس کے مختلف مسائل کے بارے میں ان کے نقطہ نظر پر بہت گہرا پڑا ہے۔ فرد و جماعت کے طرز عمل، اور انسان میں پنہاں قوتوں اور صلاحیتوں کے سلسلہ میں ان کے نظریات اس کی روشنی میں مرتب ہوئے ہیں۔

ان دونوں قوتوں کے درمیان کشمکش جاری رہی۔ اس کھینچ تان میں انسان کی دھجیاں اڑ گئیں۔ وہ کرب و اضطراب کے عالم میں حیران و سرگرداں رہا لیکن اسے امن و سکون کی دولت نہ نصیب ہو سکی۔ ...... تا آنکہ اسلام آیا اور ایک مکمل، ہر طرح کی کجی، انتشار اور تضاد سے پاک، ٹھوس اور مربوط نظریہ لے کر آیا۔ تمام مختلف قوتوں اور صلاحیتوں کو متحد کر دینا اور سارے رجحانات و میلانات کو ایک سمت میں لگا دینا اس کا مقصد تھا۔ انسان، حیات اور کائنات میں اصلاً جو اتحاد و یکسانیت موجود ہے اسے عملاً برپا کر دکھانا اس کا مشن تھا۔ وہ اس لیے آیا تھا کہ نظام کائنات میں زمین و آسمان کو، نظام دین میں دنیا و آخرت کو، نظام انسانی میں جسم و روح کو اور نظام عمل میں کاروبار اور عبادت کو یکجا کر دکھائے، اور یہ سب ایک راہ پر سرگرم سفر نظر آنے لگیں ـــــ وہ راہ جو خدا کی طرف جاتی ہے!

کائنات ایک اکائی ہے، جو شہود و معلوم ظاہر، اور نظروں سے اوجھل، لامعلوم غائب سے مرکب ہے، حیات

ایک وحدت ہے جو مادی اور روحانی قوتوں کے سنجوگ کا نتیجہ ہے۔ جہاں یہ قوتیں ایک دوسرے سے الگ ہوئیں انتشار اور خلل پیدا ہوا۔ اسی طرح انسان بھی ایک اکائی ہے جو آسمان کی طرف مائل روحانی ذوق و شوق، اور زمین سے وابستہ جسمانی تقاضوں اور مادی میلانات سے مرکب ہے۔ فطرت انسانی دونوں کے مابین کسی دوری یا کشمکش سے بری ہے کیونکہ نظام کائنات میں زمین و آسمان، اور معلوم و مجہول کے درمیان کوئی کشمکش یا ٹکراؤ نہیں، نہ ہی نظام دین میں دنیا و آخرت، اور کاروبار و عبادت میں کوئی تعارض یا تضاد ہے۔

اِن سب کی پشت پر ایک ازلی اور ابدی قوت کارفرما ہے۔ اس کی نہ کوئی ابتدا ہے کہ ہم اسے جان سکیں نہ کوئی انتہا کہ وہ احاطۂ بیان میں لائی جا سکے۔ یہی قوت کمالِ ہمہ گیری کے ساتھ کائنات، حیات اور انسان پر چھائی ہوئی ہے۔ .... یہ قوت اللہ کی قوت ہے۔

فرد فانی اس دائمی قوت سے ربط قائم کر سکتا ہے۔ یہ زندگی میں اس کی رہنمائی کرتی ہے اور فرد مصیبت کے وقت اس سے مدد کا طالب ہوتا ہے، اور اس وقت بھی جب انسان اپنی معاش کی خاطر زمین پر کاروبار میں مشغول ہو۔

فرد ہر حال میں آخرت کی بھلائی کے کام کر سکتا ہے۔ وہ روزہ رکھے اور جسم کو ہر طرح کے لذائذ سے محروم کر دے، یا روزہ سے نہ ہو اور زندگی کی ہر پاکیزہ نعمت سے لطف اٹھائے، دونوں حال میں اس کا عمل آخرت کے لیے مفید ہے اگر وہ دل سے اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اسی کی خاطر عمل کرے۔ آخرت کی واحد راہ یہی دنیا کی زندگی ہے جس میں نماز بھی ہے اور کاروبار بھی، کامیابی بھی ہے اور ناکامی بھی اور آخرت کی اس منزل میں جنت و جہنم اور خوشنودی و عتاب دونوں کا اہتمام ہے۔

کائنات کی مختلف قوتوں اور اجزا، یا انسان کی مختلف صلاحیتوں کی وحدت کا راز اسی قوت میں پوشیدہ ہے۔ یہی قوت ہے جو انسان اور اس کی اپنی ذات کو، اور اس کی زندگی کے واقعی پہلو اور خواب و تخیل کو ایک اکائی بنائے رکھتی ہے۔

کائنات و حیات، حیات اور صاحب حیات موجودات، فرد و جماعت اور خود فرد کے مختلف رجحانات و میلانات میں توازن و ہم آہنگی بھی اسی قوت کی مرہون منت ہے۔ یہی قوت دنیا اور دین، اور زمین اور آسمان کے

درمیان ایک خوش گوار ربط اور پائدار رفاقت کی ضامن ہے۔

اس توازن کی خاطر نہ تو جسم کا مفاد مجروح ہوتا ہے نہ روح کا۔ ہر ایک کو پوری سرگرمی کا موقع ملتا ہے تاکہ قوت ان سرگرمیوں کو خیر و فلاح اور ترویج و ترقی کا ذریعہ بنا سکے۔ اس قوت کو یہ بھی منظور نہیں کہ اس ہم آہنگی کی خاطر فرد کو زیادہ پابند کر دے یا جماعت کو کسی حد تک نظر انداز کرے۔ یہ ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر، یا ایک نسل کو دوسری نسلوں پر بھی بے جا ترجیح نہیں دیتی۔ بلکہ ہر ایک کے حقوق و فرائض عدل و مساوات کی روشنی میں واضح طور پر متعین ہیں۔

ایک ہی قانون ہے جو فرد و جماعت، طبقات و اقوام اور مختلف نسلوں پر یکساں لاگو ہوتا ہے۔ ایک ہی مقصد ہے جو ہر جگہ اس کے سامنے رہتا ہے، یعنی یہ کہ بلا کسی تصادم اور کشمکش کے فرد اور جماعت کو پوری پوری سرگرمی دکھانے کا موقع ملے۔ ہر نسل زندگی کی تعمیر و ترقی کے لیے جد و جہد کرے اور اس کو اپنے خالق کی طرف متوجہ رکھے۔

اسلام بلاشبہ دینِ توحید ہے کیونکہ وہ کائنات کی ساری قوتوں کے درمیان وحدت و یک جہتی کا قائل ہے۔ اس کے یہاں خدا ایک ہے، اللہ کے دین کی شکل میں سارے مذاہب کو ایک قرار دیا گیا ہے، اور آغاز حیات سے اسی دین واحد کے پیغام بر ہونے کی حیثیت سے سارے انبیاء بھی ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ [۱]

ان ھذہٖ امتکم امۃ واحدۃ و انا ربکم فاعبدون (الانبیاء: ۹۲)

بیشک تمہاری یہ امت ایک ہی جماعت ہے اور میں تم سب کا پروردگار ہوں لہٰذا تم سب میری ہی عبادت کرو۔

اسلام عبادت اور کاروبار، عقیدہ اور عمل، روحانیت اور مادیت، معاشی قدروں اور معنوی قدروں، دنیا اور آخرت اور زمین و آسمان سب کے درمیان وحدت کا قائل ہے۔

اسی عظیم وحدت سے اسلام کے فرائض و قوانین، ہدایات و حدود اور سیاسی اور معاشی امور میں اس کی رہنمائی ابھرتی ہیں۔ اس کی روشنی میں وہ حقوق فرائض متعین کرتا اور نفع و نقصان کی تقسیم عمل میں لاتا ہے۔ الغرض اس کے سارے اجزاء اور تمام تفصیلات اسی اصلِ اصول میں پنہاں ہیں۔ کائنات، حیات، اور انسان کے بارے میں اسلامی طرز فکر کی یہ اساس اگر ہماری سمجھ میں پوری طرح آجائے تو اسلام میں اجتماعی عدل کے بنیادی خطوط خود بخود واضح ہو جاتے ہیں۔

---

[۱] مصنف کی کتاب "التصویر الفنی فی القرآن" کا باب "القصۃ" ملاحظہ ہو۔

اجتماعی عدل کے اسلامی تصور کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ محدود معنی میں کسی معاشی عدل کا نام نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر اور جامع انسانی عدل ہے۔ زندگی کے تمام مظاہر اور ہر طرح کی سرگرمیاں اس کے دائرہ میں داخل ہیں۔ وہ فکر اور عمل، ضمیر اور وجدان سب پر چھایا ہوا ہے۔ اس کا انحصار معاشی قدروں پر نہیں۔ وہ وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے ساری مادّی قدروں تک بھی محدود نہیں۔ وہ مادّی، معنوی، اور روحانی تمام طرح کی اقدار کے ایک خوش گوار امتزاج کا نام ہے۔

مسیحیت انسان کو صرف اس کے روحانی میلانات کے زاویۂ نگاہ سے دیکھتی ہے اور اس کے جسمانی تقاضوں کو ان میلانات کی خاطر کچل دینا چاہتی ہے۔ اشتراکیت صرف انسان کی مادی ضروریات کو اہمیت دیتی ہے۔ وہ انسانیت بلکہ ساری کائنات کو مادّی اعتبار سے نظر ڈالتی ہے۔ اسلام ان دونوں کے برعکس انسان کو ایک ایسی وحدت تصور کرتا ہے جس کے روحانی میلانات اور جسمانی تقاضوں میں تفریق نہیں کی جاسکتی۔ نہ اس کی مادّی ضروریات اور غیر مادّی ضروریات کو الگ الگ کیا جاسکتا ہے۔ کائنات وحیات کا یہ جامع تصور کسی تفریق و تقسیم کا قائل نہیں ...... اسلام اور اشتراکیت و مسیحیت کی راہیں یہیں آکر مختلف ہو جاتی ہیں۔

اسلام کی نظر میں زندگی تعاون و ہم آہنگی اور ہمدردی و مواساۃ کا نام ہے ـــــ مسلمانوں کے درمیان خصوصاً اور عام انسانوں میں عموماً۔ اشتراکیت اسے طبقاتی کشمکش کا میدان سمجھتی ہے تاکہ ایک طبقہ کے دوسرے طبقہ پر غلبہ کی شکل میں اشتراکیت کی عظیم تمنا پوری ہو سکے۔ اسلام انسانیت کے ازلی خواب کی عملی تعبیر ہے، اور اشتراکیت ایک مخصوص دور کے انسانوں کے جذبۂ حسد کا دوسرا نام ـ

اسلام اجتماعی عدل کے قیام میں انہی دو بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتا ہے۔ متوازن باہم مربوط اور مکمل وحدت، اور افراد اور جماعتوں کے درمیان تعاون و دست گیری کی اسپرٹ۔ اس عدل کے قیام میں اسلام انسانی فطرت کے بنیادی عناصر کا لحاظ رکھتا ہے اور انسان کی صلاحیتوں کو بھی پوری طرح سامنے رکھتا ہے۔

قرآن کریم انسان کی بابتہ فرماتا ہے:-

وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَیْرِ لَشَدِیْدٌ (العادیات: ۸) بے شک وہ مال کی محبت میں بہت آگے بڑھا ہوا ہے۔

مال و دولت کی محبت خود اس کی خاطر، اور ان چیزوں کی خاطر جن کا حصول ان سے وابستہ ہے۔ انسان کو فطری اور طبعی طور پر بخیل قرار دیتے ہوئے قرآن کہتا ہے۔

وَاُحضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ (النساء: ۱۲۸) نفس تنگ دلی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

یہ خصلت انسان میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ قرآن میں انسان کی اس خصلت کو ایک حسین اور اچھوتی مثال کے ذریعہ واضح کیا گیا ہے۔

قُل لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّیْ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا (الاسراء: ۱۰۰)

اے محمدؐ ان سے کہو اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضہ میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشہ سے ان کو بھی ضرور روک رکھتے۔ واقعی انسان بڑا تنگ دل واقع ہوا ہے۔

یہ نہ بھولیے کہ اللہ کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ ایک طرف اس کی یہ وسعت بے پایاں اور دوسری طرف انسان کا یہ بخل! اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کو نا تربیت یافتہ چھوڑ دیا جائے تو اس کا بخل کس حد تک پہنچ جاتا ہے۔

اسلام نظام زندگی کی ترتیب، یا قانون سازی اور ہدایت و تلقین میں، ایک لمحہ کے لیے بھی اس فطری حب ذات اور خود غرضی کو نظر انداز نہیں کرتا جس کی جڑیں فطرت انسانی میں اتنی گہری ہیں۔ وہ وعظ و نصیحت اور قانونی پابندیوں کے ذریعہ خود غرضی اور بخل کا علاج کرتا ہے۔ وہ فرد پر اس کی قوّتِ برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، ساتھ ہی جماعت کی ضروریات و مصالح کا بھی پورا لحاظ رکھتا ہے، اس کے پیش نظر فرد و جماعت دونوں کی زندگی کے وہ بلند مقاصد ہیں جو ہر نسل اور ہر زمانہ کے لیے یکساں ہیں۔

جس طرح فرد کی حرص و ہوس کا مفاد جماعت کو پامال کرنا، نامناسب ہی نہیں کھلی بے انصافی اور صریح ظلم ہے، اسی طرح یہ بھی ظلم ہے کہ جماعت فرد کی قوّت برداشت کا لحاظ نہ کرے اور اس کی طبیعت پر بے جا بوجھ ڈالے۔ ایسا کرنا صرف ایک فرد پر ظلم نہیں بلکہ پوری جماعت پر ظلم ہے۔ فرد کے رجحانات کو کچلنے اور اس کے میلانات کو دبانے کا اثر صرف اس کی ذات تک محدود نہیں رہتا بلکہ خود جماعت کے لیے، اس فرد کی صلاحیتوں اور خدمات سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے مواقع بھی ختم ہو جاتے ہیں۔ سماجی نظام کو فرد کی صلاحیتوں اور قوتوں میں سے جماعت کا حق حاصل کرنے کے لیے فرد کی آزادی اور اس کے رجحانات کو کچھ حدود کا پابند کرنا چاہیے، لیکن ساتھ ہی اسے فرد کے حقوق سے بھی غفلت نہیں برتنی چاہیے۔ انفرادی رجحانات کو اس حد تک پوری آزادی ملنی چاہیے، جس حد تک کہ وہ زندگی کے بلند تر مقاصد سے نہ ٹکراتے اور مفاد جماعت کو نہ مجروح کرتے ہوں۔ زندگی اسلام کے نزدیک تعاون و توافق کا نام ہے نہ کہ کشمکش اور

جنگ وجدل کا۔ زندگی کا راز انفرادی اور اجتماعی قوتوں کی آزادی اور نشو نما میں مضمر ہے نہ کہ ان پر پابندیوں اور جکڑ بندیوں میں۔ ہر وہ چیز مباح ہے جو حرام نہیں قرار دی گئی اور وہ چیز جسے باطل نہیں ٹھہرایا گیا حق ہے۔ انسان کو ہر اس عمل اور ہر اس سرگرمی کا اچھا بدلہ ملتا ہے جس میں وہ اللہ کی مرضی کو اپنا نصب العین بنائے اور زندگی کے بلند تر مقاصد کے حصول کی کوشش کرے۔

سماج میں عدل وانصاف اور توازن وہم آہنگی پیدا کرنا اسلام کے لیے نسبتاً زیادہ آسان ہے کیونکہ انسانی زندگی کے بارے میں اس کا نقطۂ نظر جامع بھی ہے اور وسیع بھی۔ وہ مادّی اور معاشی قدروں پر آکر رک نہیں جاتا بلکہ آگے بڑھ کر ان تمام قدروں کو اپناتا ہے جن سے انسانیت کی فلاح وابستہ ہے۔ اسلام عدل کے اس محدود تصوّر سے بلند ہے جو اشتراکیت میں ملتا ہے۔ اشتراکیت کے نزدیک عدل معاوضوں میں ایسی مساوات کا نام ہے کہ معاشی تفاوت اور اونچ نیچ کا خاتمہ ہو سکے۔ اگرچہ حقائق کی دنیا میں عملی زحمتوں نے اس اصول پر عمل نہ کرنے دیا اور اشتراکیت اپنے سماج میں اسے نافذ کرنے سے یکسر قاصر رہی۔ اسلام کی نظر میں عدل انسانی مساوات کا نام ہے جس میں تمام اقدار حیات کی متوازن وہم آہنگ تحصیل عمل میں آتی ہے۔ ان اقدار میں خالص معاشی قدریں بھی شامل ہیں۔

چونکہ اسلام کے پیش نظر اقدار کثیر التعداد اور باہم مربوط ہیں لہٰذا ان کے مجموعے کے ذریعہ عدل کا قیام اس کے لیے زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسے محدود معنیٰ میں معاشی مساوات کو اپنانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مساوات کا یہ محدود تصوّر انسانی فطرت سے ٹکراتا ہے۔ افراد کی صلاحیتوں میں پیدائشی طور پر پایا جانے والا تفاوت بھی اس کے خلاف جاتا ہے۔ یہ اصول اعلیٰ صلاحیتوں کو معمولی اور ادنیٰ صلاحیتوں کے برابر قرار دے کر ان کی ہمت شکنی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل افراد نہ تو ان صلاحیتوں کو خود اپنی بھلائی کے لیے استعمال کر پاتے ہیں نہ قوم کی بھلائی کے لیے۔ قوم اور پوری انسانیت ان خداداد صلاحیتوں کے فیض سے محروم رہ جاتی ہے۔

فطری صلاحیتوں میں عدم مساوات ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ چھپی ہوئی صلاحیتوں کا انکار بھی اگرچہ حقائق و واقعات کی دنیا میں ناممکن ہے لیکن ان سے قطع نظر، دوسری ظاہری خصوصیات کا معاملہ تو بالکل واضح ہے۔ بعض افراد صحت، قوت برداشت، اور جسمانی و ذہنی کمال تک پہنچنے کی استعداد پیدائشی

طور پر ساتھ لاتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ مرض وکمزوری اور دوسری خامیوں کے جراثیم لیے ہوئے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں میں فطری طور پر خوبصورتی، خوش سلیقگی اور بات چیت کا ایسا اچھا انداز ہوتا ہے کہ مقبولیت اور کامیابی ہر آن ان کے قدم چومتی ہے، اور ترقی کی راہیں ان کی خاطر خود بخود نکلتی چلی آتی ہیں۔ جب کہ دوسرے جو ان صفات سے محروم ہوتے ہیں ان راہوں کو بہت دشوار گذار پاتے ہیں۔

غیر معمولی اور بلند ذہنی نفسیاتی اور روحانی صلاحیتوں کے وجود سے انکار محض لغویت ہے۔ ہمیں ان کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھنی چاہیے۔ انھیں اس بات کا پورا موقع ملنا چاہیے کہ اپنے ثمرات سامنے لاسکیں۔ ان ثمرات میں سے اجتماعی مفاد کی خاطر جن چیزوں کی ضرورت ہو انھیں حاصل کیا جا سکتا ہے مگر ان صلاحیتوں کی راہ روک کر ان کے پھل پھول لانے کے امکانات ختم کر دینا کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنا ان صلاحیتوں پر بھی ظلم ہوگا اور سماج اور انسانیت پر بھی۔

سماجی عدل اور انسانی مساوات کے خطوط واضح کر دینے کے بعد اسلام نے سعی وجہد کے ذریعہ ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے کھلے مواقع فراہم کیے ہیں۔ اس مسابقت میں اقتصادی اقدار کے علاوہ دوسری قدروں کو بھی اہمیت دی گئی ہے اور عمل کی ترازو میں ان کا وزن بھی پوری طرح تسلیم کیا گیا ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

اللہ کے نزدیک تم میں سے بزرگ ترین وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔

يَرْفَعِ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَالَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ (مجادلہ: ۱)

تم میں سے جو لوگ صاحب ایمان ہیں اور جنھیں علم عطا ہوا ہے، اللہ ان کو بلند مراتب سے سرفراز فرمائے گا۔

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا ۔ (کہف: ٦)

یہ مال اور اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے۔ باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجہ کے اعتبار سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

ان آیات کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ خالص معاشی اقدار کے علاوہ دوسری اقدار بھی وجود رکھتی ہیں اور اسلام ان کو اہمیت دیتا ہے۔ ان قدروں کو بھی وہ عدل ومساوات کے قیام کا ذریعہ بناتا ہے۔

مال ودولت کے اعتبار سے انسانوں میں کافی تفاوت موجود ہے۔ اس تفاوت کے معقول وجوہ ہیں۔

فطری صلاحیتوں اور انفرادی کوششوں اور محنت میں فرق ہوتا ہے جو اس تفاوت کا ذمہ دار ہے۔ رہا بے جا تفاوت جو غلط ذرائع سے پیدا کیا جائے اور عدم مساوات اور بے جا امتیاز کی خاطر مطلوب ہو، تو اسے اسلام نہ تو تسلیم کرتا ہے نہ کسی حال میں گوارا کر سکتا ہے (تفصیل آگے اقتصادی پالیسی کے ضمن میں آئے گی۔)

ہم اوپر واضح کر چکے ہیں کہ اسلام محدود معنیٰ میں معاشی مساوات کا قائل نہیں۔ مال و دولت کا کسب ایسی صلاحیتوں پر مبنی ہے جو سب کو برابر نہیں ملی ہیں۔ عدل کا تقاضا ہے کہ لوگوں میں یک گونہ معاشی تفاوت موجود رہے۔ اور کچھ لوگ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ مال دار ہوں۔ البتہ انسانی مساوات کو بہر حال برقرار رہنا چاہیے۔ اس کی لازمی شرط یہ ہے کہ سب کو یکساں مواقع حاصل ہوں، کسی شخص کی راہ میں حسب و نسب، یا سعی وجہد پر پانی پھیر دینے والی کوئی بھی چیز روڑا نہ بنے۔ ہر طرح کی اقدار کو مناسب وزن حاصل ہو۔ اور ضمیر انسانی کو نری مادّی اور معاشی قدروں کی اندھی غلامی سے آزاد کر دیا جائے۔ مادّی اور معاشی اقدار کو ان کے صحیح مقام پر رکھنا بہت ضروری ہے۔ ایسے سماج موجود ہیں جن میں غیر مادّی اقدار کا شعور اور ان کی اہمیّت کا احساس یا تو ناپید ہے یا بہت ہلکا ہے۔ ان کے نزدیک مال و دولت ہی بنیادی قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ مادّی اقدار کو غیر معمولی اہمیّت دے کر ایک بہت اونچا مقام دے دینا بالکل غیر فطری اور غیر معقول ہے۔

مال و دولت کو قدرِ اعلیٰ یا قدرِ کل قرار دینا اسلام کے نزدیک ناقابلِ تصوّر ہے۔ اسے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ زندگی روٹی کے ایک ٹکڑے، چند سکّوں یا کسی جسمانی خواہش میں گھر کر رہ جائے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ فقر و فاقہ اور حاجتمندی کا ازالہ بھی ضروری سمجھتا ہے۔ وہ ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی تکمیل بلکہ بسا اوقات اس سے زیادہ کی ضمانت دیتا ہے۔ اسلام ایسی عیش کوشی کی راہیں بھی مسدود کر دیتا ہے جس میں شہوات و خواہشات کو کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور ایک دوسرے سے بہت زیادہ فرق و تفاوت رکھنے والے طبقات وجود میں آتے ہیں۔ اسلام دولت کے سلسلہ میں مال داروں پر غریبوں کا ایک حق واجب کر دیتا ہے۔ اس حق کی مقدار ان کی ضروریات اور سوسائٹی کے مفادات و مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے اس مقصد کے پیشِ نظر متعین کی جاتی ہے کہ سماج میں عدل قائم ہو، ایک حد تک مساوات برپا ہو، اور ترقی اور نشو و نما کے لیے سازگار فضا پیدا ہو۔ اس طور پر اسلام

زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا وہ مادّی اور معنوی، اور دینی، اور دنیوی، تمام پہلوؤں کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے تاکہ یہ سب گھُل مِل کر ایک کل کی شکل اختیار کر لیں ـــــ ایک ایسا مرتب اور منضبط اور اتنا موزوں امتزاج رکھنے والا کُل جس کے باہم دگر پیوستہ عناصر میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہ رہ جائے اور جس کی وحدت عظیم و وسیع کائنات اور حیات و انسان کی وحدت سے ہم آہنگ ہو جائے۔

تیسرا باب

اسلام میں اجتماعی عدل کی بنیادیں

اسلام اس اجتماعی عدل کو، جس کے مزاج پر گذشتہ ابواب میں کچھ روشنی ڈالی گئی ہے مضبوط و مستحکم بنیادوں پر قائم کرتا ہے۔ اسے ایک اجمالی دعوت یا مبہم سی بات بنا کر چھوڑ دینے کی بجائے وہ ان مقاصد کے حصول کے لیے متعین ذرائع و وسائل بھی فراہم کرتا ہے۔ اسلام ایک عملی دین ہے، کوئی ایسا مذہب نہیں جو محض تصورات کی دنیا میں تعلیم و تلقین تک محدود ہو کر رہ جائے۔

یہ بات اجمالاً سامنے لائی جا چکی ہے کہ اسلام کائنات، حیات اور انسان کی بابت ایک بنیادی نظریہ رکھتا ہے۔ اجتماعی عدل کا تصوّر اسی بنیادی فکر کا پرتو ہے، یہ نظریہ اسلامی عدل کو ایسا وسیع اور جامع انسانی عدل بنا کر پیش کرتا ہے جو مادّی امور یا معاشی مسائل تک محدود نہیں۔ اس کے نزدیک زندگی کی حقیقی قدریں بہ یک وقت مادّی بھی ہیں اور معنوی بھی، دونوں میں تفریق صحیح نہیں، انسانیت ایک جامع وحدت ہے جس کے مختلف عناصر باہم مربوط و ہم آہنگ، اور ذمہ داریوں میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ یہ باہم نفرت اور دشمنی رکھنے والے مختلف گروہوں کا مجموعہ نہیں۔ کبھی کبھی ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ حقیقت واقعہ اسلام کے اس بنیادی فکر کے خلاف ہے، لہٰذا سب سے پہلے خود حقیقت واقعہ کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔

اسلام جس چیز کو حقیقت واقعہ کا درجہ دیتا ہے وہ کسی ایک فرد، قوم یا نسل کی تاریخ نہیں کیونکہ ایسی تاریخ زمان و مکان کی پابند، ایک محدود سی صورت واقعہ کا نام ہے۔ فانی انسانوں کا کوتاہ بیں فہم ازل سے ابد تک پھیلی ہوئی انسانی زندگی سے ابھرتے والے عظیم حقائق کو بھول کر انہی تاریخوں کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے۔

اسلام اس کوتاہ بینی کا قائل نہیں۔ وہ تمام گوشوں پر نگاہ ڈالتا ہے، ہر طرح کے مصالح کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے اور ایسے مقاصد کو اپنا ہدف بناتا ہے جن سے ازل تا ابد ساری انسانیت کو یکساں تعلّق ہے۔ چنانچہ ایک بات جو چند مخصوص حالات میں حقیقت کے خلاف نظر آتی ہے وہی جب ساری انسانی تاریخ اور پوری انسانی زندگی کے اس وسیع پس منظر میں رکھ کر دیکھی جاتی ہے جو افراد و اقوام یا نسلوں کا پابند نہیں تو سارا تعارض رفع ہو جاتا ہے۔

یہی دور رس، بنیادی اور کُلّی فکر جو عدل اجتماعی کے اعلیٰ مقاصد کا ضامن ہے اسلام کے تفصیلی احکام و ضوابط کے سمجھنے میں بھی ہماری مدد کرتا ہے۔ جن ضوابط کی علیحدہ علیحدہ توجیہ مشکل نظر آتی ہے وہ اس اصل کی روشنی میں حکمتوں سے پُر نظر آنے لگتے ہیں۔ اِن جزوی احکام پر اگر ایک گروہ کے کسی فرد، ایک قوم کے کسی گروہ، ایک نسل کی کسی مخصوص قوم یا مختلف نسلوں میں سے کسی نسل کے مفاد و مصالح کی روشنی میں غور کیا جائے تو ان کا صحیح فہم حاصل کرنا مشکل ہوگا۔ ان کو سمجھنے کے لیے اس بنیادی فکر کی رہنمائی ضروری ہے۔ انفرادی ملکیت کا نظام، وراثت کے قوانین، زکوٰۃ کا ضابطہ، عدالتی نظام اور قوانین تجارت، غرض کہ انفرادی یا اجتماعی امور سے متعلّق سارے اسلامی قوانین و ضوابط کی حقیقت اسی بنیادی فکر کی روشنی میں سمجھی جاسکتی ہے۔

اِس کتاب میں ان تمام موضوعات پر تفصیلی گفتگو نہیں کرنی ہے۔ اسلام کے کُلّی فکر کے دائرے میں رہتے ہوئے صرف ان عمومی بنیادوں سے تعرّض کرنا ہے جن پر عدل اجتماعی کا اسلامی نظام مبنی ہے۔ ہمارا مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ اسلام نے فرد کے اندر جسم و روح اور زندگی میں مادّی اور معنوی قدروں کے درمیان وحدت برقرار رکھی ہے، اور اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ فرد اور جماعت کے مقاصد ایک ہوں، ایک ہی قوم کے مختلف گروہوں کے مفاد و مصالح میں ہم آہنگی رہے اور انسانی برادری کی مختلف قوموں کے درمیان چھوٹے چھوٹے اور محدود مصالح میں اختلاف کے باوجود مقصد کے اعتبار سے اتحاد و یک جہتی برقرار ہے۔

عدل اجتماعی کا اسلامی نظام تین بنیادی اصولوں پر مبنی ہے۔

- مطلق اور مکمّل آزادیٔ ضمیر۔
- کامل انسانی مساوات۔
- ٹھوس اور پائدار اجتماعی تکافل۔

آئندہ صفحات میں انہی بنیادوں کے مزاج و مقصد کی وضاحت کی گئی ہے۔

آزادیٔ ضمیر

اجتماعی عدل کا کوئی تصوّر اس وقت تک پوری طرح شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا، نہ اسے اس وقت تک قیام و بقا نصیب ہو سکتا، جب تک کہ اس کی پشت پر اس عدل کی اجتماعی ضرورت کا شدید احساس اور انفرادی استحقاق کا گہرا شعور نہ موجود ہو۔ پھر یہ یقین بھی ضروری ہے کہ اسی طرح ایک اعلیٰ انسانی مقصد تک پہنچنا ممکن ہو سکے گا۔ ساتھ ہی مادّی حالات ایسے ہونے چاہئیں کہ فرد اس نظامِ عدل سے وابستہ رہنے، اس کی حفاظت کرنے اور اس کی خاطر تکلیفیں برداشت کرنے پر آمادہ ہو جائے۔ فرد کو اس ضرورت کا احساس نہ ہو اور وہ اس شعور کو ہمیشہ تازہ رکھنے کا عملاً اہتمام نہ کرے تو محض قانون سازی کے ذریعہ اس طرح کا عدل قائم کرنا مشکل ہے۔ ایسی قانون سازی اگر عمل میں بھی آجائے تو سماج ان قوانین کے برقرار رکھنے اور انھیں پوری طرح نافذ کرنے پر قادر نہ ہو سکے گا۔ ضروری ہے کہ افراد کے داخل میں ایسے عقائد موجود ہوں جو اس اجتماعی عدل کی تائید کریں اور خارجی حالات بھی ایسے ہوں کہ اس کا قیام عملاً ممکن ہو سکے۔ اس نکتہ کو اسلام اوّل دن سے سمجھتا ہے اور اسے اس نے اپنی قانون سازی اور ہدایت و تلقین دونوں میں ہمیشہ سامنے رکھا ہے۔

عیسائیت کے نزدیک دنیوی زندگی کے لذائذ و مرغوبات سے بے نیازی، اللہ کے کرشموں سے پُر آسمانی دنیا کی طرف توجہ، اور ترکِ دنیا انسان کو آزادی عطا کرنے اور فلاح و سعادت سے بہرہ یاب کرنے کے لیے کافی ہے...... بات سچی ہے لیکن ایک حد تک، کیونکہ زندگی کے تقاضوں کو ہر حال میں پس پشت ڈال دینا ممکن نہیں ہوتا، نہ ہی ضروریاتِ زندگی کو ہمیشہ دبائے رکھنا ممکن ہے انسان اِن ضروریات کا دباؤ محسوس کرنے اور اکثر ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور رہے۔ زندگی کے تقاضوں کو دبانا کچلنا ہمیشہ اچھا ہی نہیں ہوتا۔ خالقِ حیات نے انھیں عبث نہیں بنایا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتا کہ انسان اُن کو معطل رکھ کر ہر طرح کے نشو و ارتقاء سے محروم کر دے۔ ضروریات سے بے نیازی اور بلندی کا مطلب یہ نہیں کہ خود زندگی کو ناکارہ بنا کر چھوڑ دیا جائے۔

موزوں اور معقول صورت وہ ہوگی جس میں انسان کی قوتوں اور صلاحیتوں کو نشو و نما کا پورا موقع ملے اور ساتھ ہی وہ ضروریات کی توہین آمیز حد تک غلامی سے بھی بچا رہے۔ اسلام کو ایسی ہی شکل مطلوب تھی اور

اس نے جسمانی ضروریات اور روحانی میلانات دونوں کے لیے ایک ایسا ہی نظام تجویز کیا ہے۔ اس نے آزادیٔ ضمیر کی خاطر داخل میں شعور و احساس بھی پیدا کیا اور خارجی حالات کو بھی سازگار بنایا۔ اس کے برعکس اشتراکیت کا نظریہ یہ ہے کہ آزادیٔ ضمیر کی واحد ضامن معاشی آزادی ہے۔ فرد کو نظری قوانین عدل و مساوات کی جو ضمانتیں عموماً دیتے ہیں ان سے بھی وہ معاشی دباؤ کے سبب محروم ہی رہ جاتا ہے۔ یہ بات بھی ایک حد تک سچائی کی حامل ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سماج میں معاشی آزادی کی ضمانت فکر و شعور کی ایسی آزادی کے بغیر نہیں دی جا سکتی جس کی جڑیں قلب و ضمیر میں گہری اُتر چکی ہوں۔ انسان پر ضروریات، صلاحیتوں اور رجحانات کا جو دباؤ پڑتا ہے اس کا مقابلہ صرف قانون کے ذریعہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فرد جو پیدائشی طور پر کمزور ہونے کی وجہ سے پیدائش دولت اور ترقی کی دوڑ میں دوسروں کے ساتھ نہیں چل سکتا کچھ عرصہ تو شیخی بگھار سکتا ہے لیکن بالآخر احساس کمتری کا شکار ہو کر پیچھے رہ جائے گا۔ پھر وہ اس مساوات کا طالب بھی نہ رہ جائے گا جس کی ضمانت بالعموم اسے قانوناً حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح جو فرد غیر معمولی قوت کار اور اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہوگا وہ ایک دن مساواتِ مطلق کے ضابطے توڑتا ہوا آگے نکل جائے گا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکا تو اپنے دل میں قانون کے خلاف غیظ و غضب کی پرورش کرے گا۔ آخر کار وہ یا تو سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہو جائے گا یا اس کی صلاحیتیں مردہ اور قوت کار مفلوج ہو جائے گی اور اس کے نتائج کار بہت گر جائیں گے۔

اگر مساوات کی پشت پر احساس حرّیت بھی کارفرما ہو، اور قانون کی تائید بھی حاصل رہے، تو اس کا احساس کمزور و طاقتور دونوں میں یکساں اجاگر رہتا ہے۔ کمزور میں مساوات کا یہ تصوّر جذبۂ علو بن کر نمودار ہوتا ہے اور طاقتور میں انکسار و تواضع بن کر ظاہر ہوتا ہے۔

مساوات کا یہ تصوّر انسانی ذہن میں جاگزیں ہوتے ہی دوسرے بنیادی تصوّرات سے مربوط ہو جاتا ہے۔ اللہ پر ایمان، اُمّت کی وحدت اور اس کے افراد میں ذمہ داریوں کے اشتراک کا تصوّر، اور آگے بڑھ کر ساری انسانیت کی وحدت اور اس میں کفالت باہمی کا اصول اس مساوات سے گہری طرح مربوط نظر آنے لگتا ہے۔ ... اسلام کو یہی کیفیت مطلوب ہے، اسی کی خاطر اس نے پہلے تو داخلی اور خارجی دونوں طرح کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے ہر فرد کو بنیادی ضروریات کی تکمیل کی ضمانت دی، پھر اُسے کامل آزادیٔ ضمیر بھی عطا کی۔

اِسلام کا نقطۂ آغاز ضمیر انسانی کو غیر اللہ کی عبادت اور اطاعت و فرمانبرداری سے آزاد کراتا ہے اللہ

کے سوا کسی دوسرے کو انسان پر کوئی اقتدار نہیں حاصل ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اسے مارتا اور جلاتا ہو کوئی دوسرا نفع یا نقصان پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ آسمان و زمین میں بس وہی ایک ذات ہے جو انسان کو رزق عطا کرتی ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان کوئی واسطہ حائل نہیں، نہ کسی سفارشی کی حاجت۔ صاحب قدرت صرف ایک اللہ کی ذات ہے، اس کے ماسوا سب بندے ہیں جو نہ خود اپنے لیے کچھ کر سکتے نہ دوسرے کے لیے۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔

کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ خود جنا گیا اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔

جب اللہ ایک ہے تو اس کی عبادت بھی یکساں ہوگی۔ سب کے سب لوگ اسی کی طرف متوجہ ہوں گے، کسی دوسرے کی عبادت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر کسی انسان کو اس کا بھی حق نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا رب قرار دے کسی کو کسی پر اگر کوئی برتری حاصل ہو سکتی ہے تو صرف نیک عمل اور تقوے کی بنا پر۔

قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔

(آل عمران : ۶۴)

کہو! اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو تمہارے اور ہمارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں نہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔

اپنی اس تعلیم کو اسلام بڑی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مختلف امور کے سلسلہ میں اسی اصل کا سہارا لیتا ہے۔ اندیشہ ہو سکتا تھا کہ لوگ انبیاء کرام کی بزرگی کے سبب ان کی عبادت و پرستش کرنے یا اسی قبیل کے کچھ آداب و مراسم بجالانے کی طرف مائل ہوں لہٰذا اسلام نے انسانی ضمیر کو اس سے آزاد رکھنے کا خصوصی اہتمام کیا۔

اللہ تعالیٰ محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بابت فرماتا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ، قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ

(آل عمران : ۱۴۴)

محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں ان سے پہلے اور رسول بھی گذر چکے ہیں۔ پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔

اور ان کو مخاطب کرتے ہوئے صاف صاف سناتا ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ

(اے پیغمبر) فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں

اَوْ یُعَذِّبَھُمْ ......(آل عمران ۱۲۸) اللہ کو اختیار ہے چاہے انھیں معاف کرے چاہے سزا دے۔

اِسی طرح ایک دوسرے موقع پر کچھ تنبیہ کے سے انداز میں کہتا ہے۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَیْھِمْ شَیْئًا قَلِیْلًا۔ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ، ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا۔ (الاسراء ۷۴، ۷۵)

اور بعید نہ تھا کہ اگر ہم تجھے مضبوط نہ رکھتے تو تو ان کی طرف کچھ نہ کچھ جھک جاتا لیکن اگر تو ایسا کرتا تو ہم تجھے دنیا میں بھی دہرے عذاب کا مزا چکھاتے اور آخرت میں بھی دہرے عذاب کا۔ پھر ہمارے مقابلے میں تو کوئی مددگار نہ پاتا۔

وہ ان کو حکم دیتا ہے کہ اپنا حقیقی موقف علانیہ سامنے رکھ دیں۔

قُلْ: اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا قُلْ: اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا قُلْ: اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ، وَلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا (جن ۲۰ تا ۲۲)

کہو: میں صرف اپنے رب کو پکارتا ہوں اور کسی کو بھی اس کا شریک نہیں ٹھہراتا۔ کہو: نہ تمہیں ضرر پہنچانا میرے ہاتھ میں ہے نہ راہ پر لانا۔ کہو: مجھے اللہ سے کوئی نہ بچا سکے گا اور نہ اس کے سوا مجھے کوئی جائے پناہ مل سکے گی۔

عیسٰی ابن مریم کو خدا بنا لینے والوں کا ذکر کرتا ہے تو انھیں ذلّت پسندی اور کفر شعاری کا مجرم گردانتا ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ۔ قُلْ: فَمَنْ یَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَیْئًا اِنْ اَرَادَ اَنْ یُّهْلِكَ الْمَسِیْحَ ابْنَ مَرْیَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا (المائدہ: ۱۷)

یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے۔ اے محمد! ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس کے اس ارادے سے باز رکھ سکے؟

حضرت مسیح کی بابت ایک دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَیْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ (الزخرف - ۵۹)

وہ صرف ایک بندے ہیں جن پر ہم نے انعام فرمایا اور جنھیں ہم نے بنی اسرائیل کے لیے ایک مثل بنایا۔

قیامت کا ایک منظر سامنے لاتا ہے جس میں اللہ تعالےٰ عیسٰی ابن مریم سے لوگوں کے اس زعم کے سلسلہ میں جواب طلب فرمائے گا کہ عیسٰیؑ خدا بن کر آئے تھے، اور پھر ایک نہایت موثر، زوردار اور دل میں گھر کر جانے والے انداز میں حضرت عیسٰیؑ کو اس تہمت سے بری فرمائے گا جس سے ان کا دامن بالکل پاک تھا۔

وَاِذْ قَالَ اللّٰہُ : یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَاُمِّیَ اِلٰہَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ ؟ قَالَ سُبْحٰنَکَ ! مَا یَکُوْنُ لِیْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَیْسَ لِیْ بِحَقٍّ - اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ - تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِکَ - اِنَّکَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُیُوْبِ مَا قُلْتُ لَھُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِیْ بِہٖ : اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ وَکُنْتُ عَلَیْھِمْ شَھِیْدًا مَّا دُمْتُ فِیْھِمْ فَلَمَّا تَوَفَّیْتَنِیْ کُنْتَ اَنْتَ الرَّقِیْبَ عَلَیْھِمْ وَاَنْتَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدٌ ۔ اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ ، وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ العزیز الحکیم -

(المائدہ ۱۱۶ و ۱۱۷)

جب اللہ فرمائے گا کہ "اے عیسیٰ ابن مریم! کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کے سوا مجھے اور میری ماں کو بھی خدا بنا لو؟ تو وہ جواب میں عرض کرے گا، "سبحان اللہ" میرا یہ کام نہ تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا ، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو آپ کو ضرور علم ہوتا ، آپ جانتے ہیں جو کچھ میرے دل میں ہے ، اور میں نہیں جانتا جو کچھ آپ کے دل میں ہے ، آپ تو ساری پوشیدہ حقیقتوں کے عالم ہیں ---- میں نے ان سے اس کے سوا کچھ نہیں کہا جس کا آپ نے حکم دیا تھا - یہ کہ اللہ کی بندگی کرو وہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی ، میں اسی وقت تک ان کا نگراں تھا جب تک کہ میں ان کے درمیان تھا - جب آپ نے مجھے واپس بلالیا تو آپ ان پر نگراں تھے اور آپ ساری ہی چیزوں پر نگراں ہیں - اب اگر آپ انہیں سزا دیں تو وہ آپ کے بندے ہیں - اور اگر معاف کردیں تو آپ غالب اور دانا ہیں -

اسی طرح قرآن اس عقیدہ کو ذہنوں میں جماتا اور اس کی تشریح و توضیح کرتا رہتا ہے ، تاکہ انسانی ضمیر الوہیت اور تقدس میں کسی کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کی غلطی سے محفوظ کرلے کہ شرک ضمیر کو کچلتا اور وجدان کو دباتا ہے ، اور بالآخر اسے اللہ کے بندوں ہی میں سے کسی کا بندہ بنا کر رکھ دیتا ہے - کوئی اگر خدا کا نبی یا رسول ہو تو بھی وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہی رہتا ہے خدا نہیں ہوجاتا !

جب اس بات کی نفی ہوگئی کہ اللہ کے سامنے کوئی بندہ کسی دوسرے بندہ سے بحیثیت بندہ کے کسی امتیاز کا حامل ہے تو اسی سے اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان واسطوں اور وسیلوں کی بھی آپ سے آپ نفی ہوگئی اب کہانت یا توسل کا کوئی سوال نہیں باقی رہا بلکہ ہر فرد اپنے خالق سے براہ راست تعلق جوڑے گا ---- اس کی کمزور

اور فانی ذات ازل و ابد کی بے پایاں قوّت سے تعلق جوڑے گی تاکہ اس سے طاقت وعزت اور جرأت و ہمت حاصل کرے، اس کے رحم وکرم اور لطف وعنایت کی چاشنی پائے اور اس کی روحانیت میں بھی اضافہ ہو۔

اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ یہ تعلق مضبوط ہو اور فرد کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ رات کی گھڑیوں اور دن کے اوقات میں، ہر وقت، اس عظیم و بے پایاں قوّت سے مدد چاہ سکتا ہے!

اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ (الشوریٰ - ۱۹)

اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ۔

(البقرہ : ۱۸۶)

اور اے نبی، میرے بندے اگر میرے متعلق تم سے پوچھیں تو انھیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں، پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔ لہٰذا انھیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں۔ یہ بات تم انھیں سنادو، شاید کہ وہ راست پالیں۔

وَلَا تَیْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ۔ اِنَّہٗ لَا یَیْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ۔ (یوسف ۸۷)

اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اس کی رحمت سے تو بس کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰۤی اَنْفُسِھِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ، اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا۔ (الزمر: ۵۳)

کہہ دیجیے کہ اے میرے وہ بندو جنھوں نے اپنے ساتھ ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، اللہ گناہوں کو اکٹھا معاف کر دیتا ہے۔

اسلام نے پانچ نمازیں فرض قرار دی ہیں، جن میں بندہ روزانہ چند متعیّن اوقات میں اپنے رب کے حضور کھڑا ہوتا ہے، جس میں مخلوق اپنے خالق سے تعلق جوڑتا ہے، وہ اوقات اس کے علاوہ ہیں جب خود اس کا جی چاہے کہ اپنے آقا کے حضور کھڑا ہو، اس کی طرف متوجہ ہو، دعا کرے اور اس سے لو لگائے رہے۔ نماز یا دعا کا مطلب صرف مخصوص الفاظ و حرکات کی ادائیگی نہیں بلکہ اصل یہ ہے کہ بیک وقت دل، دماغ اور جسم سمیت پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو —— اسلام کے اس کلی اور بنیادی فکر سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے کہ انسان ساخت و پرداخت میں اور خالق کائنات اپنی الوہیت میں ایک ہے۔

فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ

تباہی ہے ایسے نمازیوں کے لیے جو اپنی نمازوں سے

سَاهُوْنَ (الماعون : ۴ و ۵) غفلت برتتے ہیں۔

ضمیر انسانی بندوں کی غلامی سے آزاد اور تعلق باللہ کے ہمہ دم بیدار شعور سے معمور ہوتے ہی جان، مال اور عزّ و جاہ کے سلسلہ میں ہر طرح کے خطرات اور اندیشوں سے بلند ہو جاتا ہے ـــــ حقیقت یہ ہے کہ یہ اندیشے اور خطرات بڑے ہی مہلک ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی خودداری کو مجروح کر دیتے ہیں اور بسا اوقات تو اسے ذلّت گوارا کرنے، بہت سے حقوق سے دست بردار ہو جانے اور بڑی حد تک اپنے عزّ و شرف سے ہاتھ دھو لینے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ اسلام اس بات کو بڑی اہمیت دیتا ہے کہ لوگوں کی عزّت و آبرو اور ان کے شرف و جاہ کے تحفّظ کی ضمانت دی جائے۔ ان میں صحیح قسم کی خودداری اور عزّتِ نفس پرورش پائے اور وہ عدل و انصاف کے قیام کے نگراں و محافظ بن کر رہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ اس طرح قانون کے علاوہ ان باتوں کے ذریعہ بھی وہ ایک مکمّل اور مطلق اجتماعی عدل کے قیام کی ضمانت دے جس میں کوئی انسان اپنی حد سے تجاوز نہ کرے۔ ..... ان اغراض و مقاصد کے پیشِ نظر اسلام کو اس بات کی خصوصی فکر ہے کہ انسان اپنی جان، پیٹ بھرنے کے لیے غذا اور زندگی میں اپنی حیثیت ان تمام کے سلسلہ میں ہر طرح کے خوف و خطر سے آزاد رہے۔ زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کسی مخلوق میں اتنی قدرت نہیں کہ وہ اس کی مدّتِ عمر میں سے ایک گھڑی یا اس سے کم کے بقدر بھی کمی بیشی کر سکے، کوئی مخلوق زندگی میں سے ایک سانس بھی نہیں کم کر سکتا نہ ہی ذرہ برابر نقصان پہنچانے کی سکت رکھتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران : ۱۴۵)

کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا ..... (التوبہ : ۵۱)

کہو: ہمیں ہرگز کوئی (برائی یا بھلائی) نہیں پہنچتی مگر وہ جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا مولا ہے۔ ....

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (یونس : ۴۹)

ہر امّت کے لیے مہلت کی ایک مدّت ہے، جب یہ مدّت پوری ہو جاتی ہے تو گھڑی بھر کی تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہوتی۔

یہاں بزدلی اور بزدلوں کی گنجائش نہیں، کیونکہ زندگی اور موت اور نفع و نقصان، سب کچھ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ

کہو: کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا سرپرست بنا لوں

وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ؟ (الانعام : ۱۴)

دریں حالیکہ وہی ارض و سما کا خالق ہے اور وہی (سب کو) روزی دیتا ہے ، روزی لیتا نہیں ہے ۔

اَللّٰهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ وَيَقْدِرُ ۔ (الرعد : ۲۶)

اللہ جس کو چاہتا ہے رزق کی فراخی بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تُلا رزق دیتا ہے ۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ، اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۔ (العنکبوت : ۶۰)

کتنے ہی جانور ایسے ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اللہ ہی انھیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی ۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؟ مَنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ ؟ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ ، وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ؟ مَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؟ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۔ (یونس : ۳۱)

ان لوگوں سے پوچھو کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے یہ سماعت اور بینائی کی قوتیں کس کے اختیار میں ہیں ؟ کون بے جان میں سے جان دار کو اور جان دار میں سے بے جان کو نکالتا ہے ۔ کون اس نظمِ عالم کی تدبیر کر رہا ہے ؟ وہ ضرور کہیں گے اللہ ۔

يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللّٰهِ يَرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ؟ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ؟ (فاطر : ۳)

اے لوگو اپنے اوپر اللہ کی نعمتیں یاد کرو ۔ کیا اُس خدا کے سوا کوئی اور خالق بھی ہے جو آسمان و زمین سے تم کو روزی فراہم کر رہا ہے ۔ بجز اس کے کوئی الٰہ نہیں پھر تم کہاں بہکے جا رہے ہو ۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۔ (انعام ۔ ۱۵۱)

اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے ۔

اِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَآءَ (التوبہ : ۲۸)

اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کر دے ۔

قرآن بتاتا ہے کہ فقر و فاقہ کا خوف دراصل شیطانی وسوسہ کا نتیجہ ہے جو اس طور پر ہماری طبیعت کو ر بنا کر ہم سے خود اعتمادی اور اعتماد علی اللہ کی قیمتی صفات چھین لینا چاہتا ہے ۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ

شیطان تمہیں مفلسی سے ڈراتا ہے اور شرمناک طرزِ عمل کی

وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (البقرہ: ۲۶۸)

ترغیب دیتا ہے، مگر اللہ تمہیں اپنی بخشش اور فضل کی امید دلاتا ہے۔ اللہ بڑا فراخ دست اور دانا ہے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ بات کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی کہ حصول معاش لوگوں کو سر جھکانے پر مجبور کر دے۔ ان کی روزی دراصل صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، بندوں میں سے حقیر و ضعیف بندوں میں سے، کسی کو اتنی قدرت نہیں حاصل کہ کسی آدمی کو روزی دے یا اس میں کچھ تنگی ڈال سکے۔ اس بات سے اسباب و وسائل کی نفی نہیں ہوتی البتہ یہ خیال دل کو مضبوط بناتا ہے، ضمیر کو قوت بخشتا ہے اور مفلس طالبِ معاش کو پوری قوت و ہمت کے ساتھ اُن سے آنکھیں چار کرنے کے قابل بناتا ہے جن کے ہاتھ میں بظاہر اس کے رزق کی کنجی ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب خطرات و اندیشے اسے اپنی خودداری اور عزت نفس کو قائم رکھنے اور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کرنے سے نہیں روک سکتے اور نہ اس بات پر آمادہ کر سکتے ہیں کہ روزی پر آنچ نہ آنے دینے کی خاطر وہ اپنی واقعی اجرت یا اپنی عزت و شرافت سے دستبردار ہو جائے۔

قرآن کی ہدایات اور اسلام کے مزاج کو اسی انداز سے سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ حقیقی فہم ہے جو قانون سازی اور تلقین و ہدایت کے سلسلہ میں اسلام کے بنیادی اور عمومی فلسفہ سے ہم آہنگ سا ہے۔

مقام و منزلت کے چھن جانے کا خوف بھی موت اور مصیبت اور فقر و فاقہ کے خوف کا ہم پلّہ ہو جاتا ہے اسی لیے اسلام چاہتا ہے کہ فرد کو اس خوف سے بھی نجات دلائی جائے کہ اس معاملہ میں بھی کوئی بندہ کسی بندہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔ (آل عمران: ۲۶)

کہو! خدایا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔ جسے چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

قُلْ: مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ، وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ ۔۔۔۔۔ اِنْ كُنْتُمْ

کہو ساری موجودات کی شاہنشاہی کس کے ہاتھ میں ہے اور کون ہے جو پناہ دیتا ہے لیکن

تعلمون ـــــــ سیقولون للّٰہ قل: فأنّٰی تسحرون ؟ (المومنون: ۸۸ و ۸۹)

جس کے مجرم کو پناہ دینے والا کوئی نہیں - اگر تم جانتے ہو (تو اس کا جواب دو) وہ جواب دیں گے کہ اللہ - کہو پھر کس جادو کے پیچھے (حق سے دور) چلے جا رہے ہو -

اِن ینصرکم اللّٰہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ ؟ (آل عمران: ۱۶۰)

اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے -

من کان یرید العزّۃ فللّٰہ العزّۃ جمیعًا - (فاطر: ۱۰)

جسے عزت کی طلب ہو وہ جان لے کہ عزت ساری کی ساری صرف خدا کے قبضہ قدرت میں ہے -

وللّٰہ العزّۃ ولرسولہ وللمومنین - (المنافقون: ۸)

عزت اللہ کو سزاوار ہے اور (پھر اس کے ذریعہ) اس کے رسول اور مومنین کے لیے -

پس اس پہلو سے بھی اندیشہ وخطرہ کا کوئی سوال نہیں باقی رہا، کہ قدرت وطاقت صرف اللہ واحد کی ذات کو میسّر ہے، اور عزت ساری صرف اُسی کے حصّہ میں آئی ہے -

وھو القاھر فوق عبادہ وھو الحکیم الخبیر - (الانعام: ۱۸)

وہ ہر چیز پر قادر ہے - وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے اور دانا اور باخبر ہے -

تقدس سے مرعوبیت یا جان و مال اور مقام و منزلت کے بارے میں اندیشوں اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونیوالی غلامانہ ذہنیت سے تو انسان جلد آزاد ہو جاتا ہے لیکن اِن اجتماعی قدروں کی پرستش سے بچنا بڑا مشکل ہے جو مال و دولت، جاہ و حشمت، اور حسب و نسب پر مبنی ہوتی ہیں - خواہ وہ انسان کو نہ فائدہ پہنچا سکتی ہوں نہ نقصان - چنانچہ جب وجدان ان اقدار میں سے کسی سے مرعوب ومتاثر ہو جاتا ہے تو اُسی تاثر کی حد تک اس کی آزادی بھی چھن جاتی ہے اور جن لوگوں کو یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان کے سامنے وہ حقیقی مساوات کے شعور سے محروم ہو جاتا ہے - یہاں اسلام

آگے بڑھتا ہے اور بلا کسی افراط و تفریط کے ان تمام اقدار کو ان کے اس مقام پر رکھتا ہے جو انہیں زندگی میں واقعتہً حاصل ہونا چاہیے وہ حقیقی قدروں کو ان معنوی اور قائم بالذات، مطلق اور غیر اضافی معیاروں پر کستا ہے جو وہیں کہیں انسان کے اندر، اس کے ذہن کے کسی گوشے میں مستور رہوتے ہیں یا اس کے عمل میں نمایاں اور ظاہر ہوتے ہیں اس کے نتیجہ میں اُن مادی اقدار کا اثر کم ہو جاتا ہے، ان کا نفسیاتی اثر کمزور ہو جاتا ہے اور یہ چیز بھی اسلام کی دی ہوئی اقتصادی اور قانونی ضمانتوں کے پہلو بہ پہلو کامل آزادیٔ ضمیر کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ۔ (الحجرات: ۱۳)

اللہ کے نزدیک تم میں سب سے معزز وہ لوگ ہیں جو سب سے زیادہ متقی ہوں۔

اور ظاہر ہے کہ صحیح معنی میں معزز وہی ہے جو اللہ کے نزدیک بھی معزز قرار پا سکے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں "کسی عربی کو اگر کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہو سکتی ہے تو تقویٰ کی بنا پر" باری تعالےٰ فرماتا ہے۔

قُلْ: اِنَّ رَبِّيْ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ، وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓي، اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ جَزَاۗءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا، وَهُمْ فِي الْغُرُفٰتِ اٰمِنُوْنَ ۔ (السبا: ۳۵-۳۷)

کہو: میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے روزی میں فراخی پیدا کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی۔ لیکن اکثر لوگ ناسمجھ ہیں۔ تمہارے اموال و اولاد تمہیں اللہ سے قریب کرنے والی چیزیں نہیں۔ البتہ جو ایمان لائے اور اعمال صالحہ بجا لائے تو ایسے لوگوں کے لیے ان کے عمل کی بدولت کئی گنا اجر ہوگا اور وہ بالا خانوں میں سکون کے ساتھ استراحت پذیر ہوں گے۔

مال و دولت کے اعتبار سے کوئی بڑھ چڑھ کر ہے تو ہوا کرے۔ ان چیزوں کو اتنی قدر و قیمت نہیں حاصل کہ اس کو کوئی امتیاز یا بلندی عطا کر دیں۔ "اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا" اس لیے کہ معیار کا کام صرف دو بنیادی حقیقی قدریں کرتی ہیں، 'ایمان' جو ایک داخلی قدر ہے اور 'عمل صالح' جو عملی زندگی میں نمایاں اور ظاہر ہے۔

ساتھ ہی ایسا بھی نہیں کہ اسلام مال و اولاد کی واقعی قدر و قیمت میں کوئی کمی کرتا ہو "المال والبنون زینۃ الحیاۃ الدنیا" (مال و دولت اور بیٹے دنیا کی زندگی کی زینت ہیں محض زینت) اس سے آگے بڑھا کر ان کو

ان قدروں میں سے نہیں شمار کیا جاسکتا جو انسان کی بلندی و پستی کا اصل معیار ہیں۔ وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا - (باقی رہ جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجہ کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں۔ الکہف: ۴۹)

قرآن نے مادی اور معنوی قدروں کی حقیقت دو آدمیوں کی نفسیات کی عکاسی کرکے اس طرح واضح کر دی ہے کہ اس کے بعد ان قدروں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کی کوئی گنجائش ہی نہیں باقی رہ جاتی۔ اس نے ایک مومن کی نفسیات اور اس کے ذہن میں مختلف اقدار کو جو مقام حاصل ہوتا ہے اس کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ - جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ، وَحَفَفْنَاهُمَا بِنَخْلٍ، وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا، كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ آتَتْ أُكُلَهَا، وَلَمْ تَظْلِمْ مِنْهُ شَيْئًا، وَفَجَّرْنَا خِلَالَهُمَا نَهَرًا - وَكَانَ لَهُ ثَمَرٌ، فَقَالَ لِصَاحِبِهِ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ: أَنَا أَكْثَرُ مِنكَ مَالًا وَأَعَزُّ نَفَرًا - وَدَخَلَ جَنَّتَهُ ـــ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ ـــ قَالَ: مَا أَظُنُّ أَن تَبِيدَ هَٰذِهِ أَبَدًا، وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِن رُّدِدتُّ إِلَىٰ رَبِّي لَأَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنقَلَبًا ۰ قَالَ لَهُ صَاحِبُهُ وَهُوَ يُحَاوِرُهُ: أَكَفَرْتَ بِالَّذِي خَلَقَكَ مِن تُرَابٍ، ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ، ثُمَّ سَوَّاكَ رَجُلًا؟ لَّٰكِنَّا هُوَ اللَّهُ رَبِّي، وَلَا أُشْرِكُ بِرَبِّي أَحَدًا - وَلَوْلَا إِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَاءَ اللَّهُ لَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ

اے محمد، ان کے سامنے ایک مثال پیش کرو۔ دو شخص تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے اور ان کے گرد کھجور کے درختوں کی باڑھ لگائی اور ان کے درمیان کاشت کی زمین رکھی۔ دونوں باغ خوب پھلے پھولے اور بار آور ہونے میں انھوں نے ذرا سی کسر بھی نہ چھوڑی۔ اُن باغوں کے اندر ہم نے ایک نہر جاری کر دی اور اُسے خوب نفع حاصل ہوا۔ یہ کچھ پاکر ایک دن وہ اپنے ہمسائے سے بات کرتے ہوئے بولا "میں تجھ سے زیادہ مال دار ہوں اور تجھ سے زیادہ طاقت ور نفر کا رکھتا ہوں"۔ پھر وہ اپنی جنت میں داخل ہوا اور اپنے نفس کے حق میں ظالم بن کر کہنے لگا "میں نہیں سمجھتا کہ یہ دولت کبھی فنا ہو جائے گی، اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی کبھی آئے گی۔ تاہم اگر مجھے کبھی اپنے... رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے بھی زیادہ شاندار جگہ پاؤں گا"۔

اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ،
فَعَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ
وَیُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ
صَعِیْدًا زَلَقًا ، اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا ، فَلَنْ
تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا - وَاُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ ، فَاَصْبَحَ
یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ عَلٰی مَآ اَنْفَقَ فِیْهَا ـــــ وَهِیَ
خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ـــــ وَیَقُوْلُ :
یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْٓ اَحَدًا - وَلَمْ تَكُنْ
لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ،
وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا -

(الکہف : ۳۲ - ۴۳)

اس کے ہمسایہ نے گفتگو کرتے ہوئے اس سے کہا: کیا تو کفر کرتا ہے اس ذات سے جس نے تجھے مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا اور تجھے ایک پورا آدمی بنا کھڑا کیا؟ رہا میں تو میرا رب تو وہی اللہ ہے اور میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتا، اور جب تو اپنی جنت میں داخل ہو رہا تھا تو اس وقت تیری زبان سے یہ کیوں نہ نکلا کہ ماشاء اللہ، لاقوۃ الا باللہ[ل] - اگر تو مجھے مال اور اولاد میں اپنے سے کم تر پا رہا ہے تو بعید نہیں کہ میرا رب مجھے تیری جنت سے بہتر عطا فرما دے اور تیری جنت پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس سے وہ صاف میدان بن کر رہ جائے - یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے اور پھر تو اسے کسی طرح نہ نکال سکے۔" آخر کار ہوا یہ کہ اس کا سارا ثمرہ مارا گیا - اور وہ اپنے انگوروں کے باغ کو ٹٹیوں پر الٹا پڑا دیکھ کر اپنی لگائی ہوئی لاگت پر ہاتھ ملتا رہ گیا اور کہنے لگا کہ "کاش میں نے اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہوتا" ـــــ نہ ہوا اللہ کو چھوڑ کر اس کے پاس کوئی جتھا کہ اس کی مدد کرتا، اور نہ کر سکا وہ آپ ہی اس آفت کا مقابلہ ـــــ "

اس طرح مردِ مومن کا اپنے ایمان ہی کو عزت کا مدار سمجھنا اور اس کا ان مادی اقدار کو حقیر جاننا واضح طور پر سامنے آجاتا ہے جن کو اس کے بحث کرنے والے ساتھی نے اپنی عزّت کا مدار سمجھا تھا۔

مثال میں ایک جاذبِ توجہ مقام یہ بھی ہے کہ گو باغ کو اپنی عزّت کا مدار بنانے والے ساتھی نے باقاعدہ شرک باللہ کا اظہار نہیں کیا تھا پھر بھی قرآن نے اسے مشرک ہی قرار دیا اور آگے چل کر اس سے بھی اپنے شرک کا اعتراف کرایا - درحقیقت اصل بات یہ تھی کہ اس نے ایک خالص مادی قدر کو شریک ٹھہرایا اور اسے ذہن و شعور میں وہ مرتبہ دیا

[ل] یعنی جو کچھ اللہ چاہے گا وہی ہوگا - میرا اور کسی کا کچھ زور نہیں ہمارا اگر کچھ بس چل سکتا ہے تو اللہ ہی کی توفیق و تائید سے چل سکتا ہے۔

جو صرف اس ذات واحد کے لیے مخصوص ہے! حالانکہ سچا مومن کسی چیز کو بھی اللہ کا شریک نہیں ٹھہراتا۔

قارون کے قصہ میں بھی قرآن نے مال و دولت کے سلسلہ میں دو مختلف طرز فکر کے حامل لوگوں کے ذہن کی عکاسی کی ہے۔ ایک تصویر ان لوگوں کی ہے جن کی آنکھوں کو یہ مادی قدریں خیرہ کر دیتی ہیں اور وہ احساس کمتری میں مبتلا ہو کر مال داروں کے سامنے خود کو حقیر و ضعیف جاننے لگتے ہیں۔ دوسری تصویر ان مومن ذہنوں کی ہے جن کے اندر قوت و عزت اور وقار کا شعور ہمیشہ بیدار رہتا ہے جو کہیں کمزوری نہیں محسوس کرتے نہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں۔

إِنَّ قَارُونَ كَانَ مِنْ قَوْمِ مُوسَىٰ فَبَغَىٰ عَلَيْهِمْ وَآتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ - إِذْ قَالَ لَهُ قَوْمُهُ: لَا تَفْرَحْ - إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْفَرِحِينَ - وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا، وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ - إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ - قَالَ: إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي أَوَلَمْ يَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ قَدْ أَهْلَكَ مِنْ قَبْلِهِ مِنَ الْقُرُونِ مَنْ هُوَ أَشَدُّ مِنْهُ قُوَّةً وَأَكْثَرُ جَمْعًا؟ وَلَا يُسْأَلُ عَنْ ذُنُوبِهِمُ الْمُجْرِمُونَ فَخَرَجَ عَلَىٰ قَوْمِهِ فِي زِينَتِهِ - قَالَ الَّذِينَ يُرِيدُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا: يَا لَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَا أُوتِيَ قَارُونُ إِنَّهُ لَذُو حَظٍّ عَظِيمٍ - وَقَالَ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللَّهِ خَيْرٌ لِمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُونَ فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ

قارون موسیٰ کی قوم کا ہی ایک فرد تھا مگر وہ ان کے برخلاف راہ پر چل پڑا ہم نے اس کو اتنے خزانے دیئے کہ جن کی کنجیاں اٹھانا طاقت ور آدمیوں کے ایک گروہ پر بھی بار ہوتا۔ جب اس سے اس کی قوم نے کہا کہ اترا مت، اللہ کو اترانے والے نہیں بھاتے۔ جو کچھ تجھے اللہ نے دے رکھا ہے اس کے ذریعہ آخرت کا ٹھکانا بنانے کی کوشش کر اور دنیا میں سے جو کچھ تیرے حصے میں آیا ہے اسے بھول نہ جا۔ اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اسی طرح تو بھی لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اختیار کر۔ زمین میں فساد نہ مچا، اللہ فسادی لوگوں کو نہیں پسند کرتا۔ (قارون نے) کہا کہ یہ (مال و دولت) تو مجھے میرے ہنر کے سبب ملا ہے۔ کیا قارون کو اس حقیقت کا احساس نہ ہوا کہ اس سے پہلے اللہ ایسی ایسی قوموں کو ہلاکت کے گھاٹ اتار چکا ہے جو قوت بازو اور تعداد دونوں میں اس سے بڑھ چڑھ کر تھیں اور (قیامت کے دن جب حساب کتاب ہوگا تو) ایسے مجرموں سے ان کے گناہ کے بارے میں پوچھ گچھ بھی نہیں ہوگی اب قارون ہر طرح کے ساز و سامان کے ساتھ قوم کے سامنے آیا

الارض - فما كان له من فئة ينصرونه من دون الله وما كان من المنتصرين. واصبح الذين تمنوا مكانه بالامس يقولون: ويكأن الله يبسط الرزق لمن يشاء من عباده ويقدر، لولا ان من الله علينا لخسف بنا - ويكأنه لا يفلح الكافرون -

(القصص: ٧٦ - ٨٢)

حیات دنیا کے طلبگار پکار اٹھے کہ کاش ہم کو بھی قارون جیسا نصیبہ ملا ہوتا، یہ تو بڑی اچھی قسمت والا ہے۔ سمجھ بوجھ رکھنے والوں نے کہا بدبختو ایمان لانے اور عمل صالح کرنے والوں کے لیے اللہ کی عطا کردہ اخروی جزا ہی بہتر ہے۔ البتہ یہ صرف صابرین کے ہاتھ آسکے گی۔ چنانچہ ہم نے قارون کو اس کے گھر سمیت زمین میں دھنسا دیا۔ اللہ سے بچانے کے لئے نہ کوئی گروہ تھا جو اس کے کام آسکتا نہ وہ کہیں اور سے کسی طرح کی مدد حاصل کر سکا۔ کل جن لوگوں نے اس کی پوزیشن کی تمنا کی تھی وہ کہنے لگے: آہ (اب یہ تلخ حقیقت سامنے آئی کہ) درحقیقت اللہ ہی اپنے بندوں میں سے جس کو مناسب سمجھتا ہے رزق میں کشادگی عطا کرتا ہے اور (جس کے لیے مناسب سمجھتا ہے) تنگی پیدا کرتا ہے۔ اللہ نے اگر ہم پر کرم نہ کیا ہوتا تو ہمیں بھی زمین میں دھنسا دیا ہوتا۔ آہ، حقیقت یہی ہے کہ کفر کی روش اختیار کرنے والے فلاح نہیں پا سکتے۔

اسلام اپنے اس فکر پر مختلف نتائج ترتیب دیتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حباب بر آب مال و متاع کو کسی قدر و قیمت کا حامل قرار دینے سے منع کرتا ہے جو بعض لوگوں کے لیے مایۂ ناز اور باعث افتخار رہے۔

ولا تمدن عينيك ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحياة الدنيا لنفتنهم فيه ورزق ربك خير وابقى -

(طٰہٰ: ۱۳۱)

ان لوگوں (اہل دنیا) کو ہم نے جو مال و متاع دے رکھا ہے اس کی طرف للچائی نظریں نہ اٹھائیے یہ دنیاوی زندگی کی آب و تاب ہے جس کے ذریعہ ہم ان لوگوں کو آزماتے ہیں، تیرے رب کے پاس جو رزق ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اور اس طرح کی آیتیں غریبوں کو اپنی حالت پر قناعت کرنے اور امراء کو ان کی امارت و

ثروت میں مست چھوڑ دینے کی دعوت دیتی ہیں۔ یہ سراسر غلط استنباط ہے۔ اس آیت کی یہ تفسیر اسلام کی روح سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ دراصل یہ ان پیشہ ور دینداروں کی تفسیر ہے جن کی غرض ہی یہ رہی ہے کہ ملوکیت اور استبداد کے دور میں عوام کے شعور و احساس کو مردہ و بے جان کر کے اُنھیں اجتماعی عدل کے مطالبہ سے باز رکھیں۔ ان کا جرم ان کے سر ہے۔ اسلام ان کی اس توڑ مروڑ سے بری ہے۔ فی الحقیقت یہ اور اس طرح کی دوسری آیات اس لیے آئی ہیں کہ انسانی قدروں کو ان کا کھویا ہوا مقام واپس دلائیں اور غریبوں کے ذہن و شعور کو اس کمزوری اور بے ہمتی سے نکالیں جس میں وہ مال و متاع جیسی خالص مادی قدروں سے مرعوب ہو کر مبتلا ہو جایا کرتے ہیں۔

ہماری اس توجیہ کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو تلقین فرمائی کہ ان قدروں کو کوئی اہمیت نہ دیں اور نہ ہی ان کو معیار بنا کر لوگوں کا مقام متعیّن کریں۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ ۖ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۖ وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا۔

(الکہف : ۲۸)

اور اپنے دل کو ان لوگوں کی معیت پر مطمئن کرو جو اپنے رب کی رضا کے طلب گار بن کر صبح و شام اُسے پکارتے ہیں، اور اُن سے ہرگز نگاہ نہ پھیرو۔ کیا تم دنیا کی زینت پسند کرتے ہو؟ کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جو اپنی خواہشِ نفس پر چلتا ہے جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہے۔

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُم بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ۔

(التوبہ : ۵۵)

ان کے مال و دولت اور ان کی کثرت اولاد کو دیکھ کر دھوکا نہ کھاؤ، اللہ تو ان چیزوں کے ذریعہ سے ان کو دنیا کی زندگی ہی میں مبتلائے عذاب کرنے والا ہے اور یہ جان بھی دیں گے تو انکارِ حق ہی کی حالت میں دیں گے۔

اس سلسلہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابن اُمِ مکتوم نامی نابینا اور سردار قوم ولید بن مغیرہ کے ساتھ پیش آنے والا واقعہ قابلِ ذکر ہے ــــ وہ واقعہ جس میں اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی پر بڑا سخت عتاب نازل فرمایا۔

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ۔ وَمَا يُدْرِيكَ

اندھے کے آنے پر تیوری چڑھائی اور منہ پھیر لیا، تجھے کیا علم

لَعَلَّهٗ يَزَّكّٰىٓ ۔ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى ؟ اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰى ، فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدّٰى وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ، وَهُوَ يَخْشٰى ، فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ! كَلَّآ ! اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ، فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ ۔

(عبس : ۱ — ۱۲)

کہ وہ تزکیہ حاصل کرتا یا اسے تذکر ہوتا اور یہ یاد دہانی اس کے لیے نفع بخش ثابت ہوتی جو استغنا برتتا ہے تو تو اس کے پیچھے پڑتا ہے اور جو خود سے دوڑ کر تمہارے پاس آتا ہے اور اس کے اندر خشیتِ (الٰہی) موجود ہوتی ہے تو اس سے تم بے توجہی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں (یہ رویہ غلط ہے) یہ تذکرہ ہے پس جو چاہے اس سے یاد دہانی حاصل کرے۔

یہ لمحہ انسانی حرص کا ایک لمحہ تھا جو محمد —— صلی اللہ علیہ وسلم —— پر آپ کی اس فکر میں گذر گیا کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ ولید کو اسلام کی طرف مائل کر دے۔ چنانچہ جب ابنِ اُمِّ مکتوم کچھ قرآن سیکھنے آپ کے پاس آئے تو آپ ولید سے گفتگو میں مصروف تھے، اب یہ آپ کو پکارے جا رہے ہیں اور آپ ہیں کہ ولید ہی کے سلسلہ میں مصروف رہے اور ان کی اس بات کو برا مانا یہاں تک کہ آپ کے چہرہ پر بھی شکن آ گئی۔ اس پر آقا نے اتنا شدید عتاب فرمایا جو جھڑکی کی سرحدیں چھو رہا ہے۔ یہ کیوں ؟ تاکہ جن قدروں پر اسلام کی عزت و سربلندی کا مدار ہے وہ اپنی صحیح اہمیت کے ساتھ واضح ہو جائیں اور آزادیٔ ضمیر کے سلسلہ میں اس کا موزوں رجحان اور مناسب طریقہ عملاً متحقق ہو سکے۔

انسان تقدس اور بزرگی سے مرعوبیت اور اس کی پرستش کے پھندے سے جلد نکل آتا ہے اور ، الّا ماشاء اللہ ، بڑی حد تک موت ، دوسرے مصائب ، فقر و فاقہ اور ذلت و خواری کے خوف سے بھی نجات حاصل کر لیتا ہے۔ وہ دوسری سماجی قدروں اور تمام خارجی معیاروں کے دباؤ سے بھی آزاد ہو جاتا ہے لیکن نفس کے لیے خود اپنی غلامی سے نکلنا بڑا دشوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی مرغوبات اور خواہشات کا غلام بنا رہتا ہے ، اپنی اغراض و اہوا کے چکر سے نہیں نکل پاتا۔ خارج سے آزادی پانے کے بعد انسان داخل کے بندھنوں میں بندھ جاتا ہے اور ایسی شکل میں وہ شعور و وجدان کی اس مکمل آزادی تک نہیں پہنچ سکتا جس تک اسلام اس کو عظیم الشان اور ہمہ گیر انسانی عدلِ اجتماعی کے قیام کی خاطر پہنچانا چاہتا ہے۔

آزادیٔ ضمیر اور حریت وجدان کے لیے اس پوشیدہ مگر زبردست خطرہ سے اسلام غافل نہیں بلکہ اس کی طرف بڑی گہری توجہ کرتا ہے۔ اور یہ توجہ گواہ ہے کہ اسلام انسان کے داخل کو سنوارنے کا بڑا اہتمام کرتا ہے۔ اس سے ہم

اس بات کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس طرح اسلام نفس انسانی کے ہر پہلو کی داشت و پرداخت کرتا اور اس کے ہر ہر گوشہ کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں مسیحیت نے جو کچھ سمجھا اور جسے اس نے اپنی آخری منزل قرار دیا وہ سب اسلام کے سامنے بھی ہے۔

قل: إن كان آباؤكم، وأبناؤكم، وإخوانكم وأزواجكم، وعشيرتكم، وأموال اقترفتموها، وتجارة تخشون كسادها ومساكن ترضونها، أحب إليكم من الله ورسوله، وجهاد في سبيله فتربصوا حتى يأتي الله بأمره، والله لا يهدي القوم الفاسقين۔

(التوبہ ۲۴)

اے نبی! کہدو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں ۔ اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑجانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔

یہاں اسلام نے ایک ہی آیت میں ہر طرح کے لذائذ و مرغوبات گنا دیئے ہیں اور نفس انسانی کے تمام کمزور پہلوؤں کی نشاندہی کر دی ہے تاکہ ایک پلڑے میں ان سب کو اور دوسرے میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت اور اس کی راہ میں جہاد کی تڑپ کو رکھ کر انسان اچھی طرح موازنہ کر کے فیصلہ کرے..... تاکہ اس کے بعد قربانی و ایثار بھی تکمیل کو پہنچے اور شہوات کے پھندوں سے آزادی بھی مکمل ہو جائے۔ اسلام کو وہی "نفس" مطلوب ہے جو ان تمام پھندوں سے آزاد ہو چکا ہو اور ان تمام بندھنوں کو توڑ چکا ہو۔ وہ دعوت دیتا ہے کہ نفس کو اس سانچہ میں ڈھالا جائے تاکہ وہ حقیر ضروریات سے بلند ہو جائے، آپ اپنے قابو میں رہے اور عارضی اور حقیر مرغوبات کی بجائے ان چیزوں کی طرف لپکے جو بلند تر اور وسیع تر ہوں۔ اسی طرح اسلام کہتا ہے کہ:-

زين للناس حب الشهوات من النساء والبنين، والقناطير المقنطرة من الذهب والفضة، والخيل المسومة والأنعام والحرث

لوگوں کے لیے مرغوبات نفس۔ عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں۔ بڑی خوش آئند بنا دی گئی ہیں۔ مگر یہ سب چند روزہ زندگی

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ۔ قُلْ: اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ؟ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا، وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ، وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ۔

(آل عمران ۱۵۰)

کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانا ہے وہ تو اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔

یہ تلقین نہ تو غفلت و جمود میں مبتلا رکھنے کی کوشش ہے نہ ہی ترکِ دُنیا اور پاکیزہ و حلال چیزوں سے پرہیز کی دعوت، جیسا کہ بعض مفسرین نے اپنے ذوق کی مناسبت سے سمجھا ہے، یا جیسا کہ مخالفین اسلام کو بدنام کرنے کے لیے اس کے سر تھوپتے ہیں۔ یہ تو طبیعت اور خواہش کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی دعوت ہے۔ اگر انسان زندگی اور اس کی مسرّتوں اور لذّتوں کا غلام بننے کی بجائے انھیں قابو میں رکھے رہے تو ان سے لطف اندوز ہونے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

قُلْ: مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

(اعراف: ۳۲)

کہیے: اللہ نے جو زینت اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ان کو اور کھانے پینے کی اشیاء میں سے پاکیزہ چیزوں کو کس نے حرام ٹھہرایا؟

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔

(قصص۔ ۷۷)

دنیا میں سے اپنا حصہ (حاصل کرنا) نہ بھول جانا[1]

اسی سلسلہ کی ایک کڑی روزہ کی فرضیت بھی ہے تاکہ کچھ عرصہ نفس طبیعت کے شدید تقاضوں اور بنیادی ضرورتوں سے بھی بلند رہے اور نتیجۃً اس کے ارادہ میں مزید قوّت اور بلندی پیدا ہو، اور اس طرح اپنی ضروریات سے

---

[1] مصنّف نے آیت کو متعدد جگہ انہی معنی میں پیش کیا ہے جو ہمارے ترجمہ اور موقعِ استعمال سے ظاہر ہیں۔ لیکن محققین اس مفہوم سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ آیت حیاتِ دنیا کے چند روزہ ہونے کی حقیقت یاد دلاتی ہے۔ لیکن اس اختلاف کا اثر مصنّف کی اصل بات پر نہیں پڑتا۔ (مترجم)

بلند ہونے کے بعد اسی نفس کو لیے ہوئے انسان اپنی ذات سے بھی بلند ہو جائے ۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اسلام مختلف طریقے اختیار کرتا ہے اور انہی طریقوں میں سے ایک طریقہ فتنۂ مال و اولاد کی طرف سے چوکنا رہنے کی تلقین بھی ہے ۔

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۔ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد ہیں در اصل تمہارے لیے سامان آزمائش ہیں ۔

مال و اولاد کی محبت ، اور اس سلسلہ میں اپنی فطری کمزوری کے اتباع میں جو خطرات ہیں ان سے اسلام انسان کو آگاہ کرتا اور خود کو محفوظ رکھنے کا جذبہ ابھارتا ہے ۔ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان پر مال و اولاد کے اندر اس کے انہماک و دلچسپی کی راہ سے حملہ ہوتا ہے ایسی صورت میں وہ کچھ بھی قبول کر لیتا ہے جو کسی دوسرے طریقہ سے نہ مانتا ایسے ایسے موقعوں پر گھٹنا ٹیک دیتا ہے جہاں وہ بصورت دیگر کبھی نہ سر جھکاتا اور وہ کچھ کر گذرتا ہے جو کسی دوسرے سلسلہ میں اُس سے کبھی نہ سرزد ہوتا ۔ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی صاحبزادی کے دونوں بیٹوں میں سے ایک کو گود میں لیے نکلے اور آپ کی زبان پر یہ جملہ تھا ۔

اِنَّكُمْ لَتُبَخِّلُوْنَ وَتُجَبِّنُوْنَ وَتُجَهِّلُوْنَ ۔ (ترمذی) (اولاد کو مخاطب کر کے فرمایا) تم ہی بخیل بھی بنا نے ہو اور بزدل بھی ، اور تم ہی جہالت میں مبتلا کر دیتے ہو ۔

انسان ان تمام چیزوں سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے جو اس کے عزّ و شرف پر کھلے بندوں حملہ آور ہوتی ہوں ۔ لیکن یہی انسان کبھی حاجت مند بھی ہوتا ہے —— کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ ایک لقمہ کا محتاج ہو —— بس یہاں آکر وہ ذلیل ہو جاتا ہے اس لیے کہ ذلت و خواری کی طرف لے جانے میں ضرورت سب سے آگے آگے ہے ۔ خالی پیٹ کو اونچی باتیں نہیں سوجھتیں ۔ انسان کبھی دستِ سوال دراز کرنے پر بھی مجبور ہوتا ہے اور یہ چیز اس کی عزّتِ نفس کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے ۔ یہاں اسلام آگے بڑھتا ہے اور معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے ۔ وہ اس مسئلہ کو ایسے قوانین بنا کر حل کرتا ہے جو ایک طرف تو فقر و حاجت مندی پیدا کرنے والے اسباب کا سدّ باب کرتے ہیں دوسری طرف اگر یہ خرابی پیدا ہی ہو جائے تو اس کا ازالہ کرتے ہیں ۔ چنانچہ قوم کے ذی استطاعت لوگوں اور ریاست پر فرد کا حق بقدر کفایت لازم قرار دیا گیا ہے اور اسے

ایک ایسا فرض قرار دیا گیا ہے جس کے ترک کرنے پر ترک کرنے والے سے دنیا میں جنگ کی جائے گی اور آخرت میں اس کے لیے شدید عذاب ہوگا! (تفصیل آگے " اسلام کا اقتصادی نظام " میں آتی ہے) پھر اسلام دستِ سوال دراز کرنے سے منع کرتا ہے، چنانچہ مسلمانوں کے ایک ایسے گروہ کی تعریف کرتے ہوئے جو اللہ کی راہ کے کاموں میں کچھ ایسا مشغول ہوگئے ہیں کہ چل پھر کر روزی نہیں کما سکتے، فرماتا ہے کہ یہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ (لا یسئلون الناس الحافا) نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم ایک سائل کو ایک درہم عنایت فرماتے ہیں اور پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ " یہ بات کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی رسی سنبھالے اور جا کر جلانے کی لکڑیوں کا ایک گٹھر چن کے اسے اپنی پیٹھ پر اٹھا لائے اور فروخت کرے اور اس طرح اللہ اس کی آبرو سلامت رکھے، اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے کہ لوگوں کا جی چاہے تو اسے کچھ دے دیں ورنہ نہ دیں۔

(لان یاخذ احدکم حبلہ فیاتی بحزمۃ حطب علی ظہرہ، فیبیعہا، فیکف اللہ بہا وجہہ، خیرٌ من ان یسأل الناس، اعطوہ او منعوہ۔ بخاری۔ مسلم)

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہے (الید العلیا خیرٌ من الید السفلی (بخاری مسلم) نیز آپ نے سوال کے علاوہ اکتساب مال کے دوسرے شرمناک طریقوں سے بھی بچنے کی تاکید کی ہے، کیونکہ سوال اسلام کی نظر میں ایک ایسی برائی ہے جسے صرف شدید ضرورت جائز بنا سکتی ہے، رہی زکوٰۃ، تو وہ ایک قانونی حق ہے جو بہر حال وصول کیا جائے گا نہ کہ کوئی بخشش اور احسان۔

وَفِيٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (ذاریات: ۱۹)	ان کے اموال میں سوال کرنے والے اور محروم لوگوں کے لیے ایک متعین حصہ ہے۔

یہ ایک واجب الادا حق ہے جسے حکومت وصول کر کے مسلمانوں کی مادی ضروریات کی تکمیل، ان کی عزت نفس اور خودداری اور ان کے ضمیر واحساس کی پاکیزگی وبلندی کی حفاظت اور ضمانت، غرض کہ ان کے جملہ مصالح ومفاد کے سلسلہ میں صرف کرتی ہے، ان امور کے لیے اگر زکوٰۃ کا مال کفایت نہ کرے تو ذی استطاعت اور صاحب ثروت لوگوں سے اس حد تک مزید ٹیکس وصول کرے گی کہ جس سے کمزور اور غریب حاجتمندوں کی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔

غرض یہ کہ اسلام معاملہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھتا ہے اور اس کے ہر گوشہ کی طرف توجہ کر کے شعور و وجدان کو ایسی مکمل آزادی کی ضمانت دیتا ہے جو نہ تو صرف تصورات اور نظری قدروں پر مبنی ہے نہ ہی اس کا واحد سہارا اقتصادی اور مادی انتظامات ہیں بلکہ وہ بیک وقت اِن دونوں بنیادوں پر قائم ہے۔ وہ زندگی کے عملی حقائق اور نفس انسانی کی قوت برداشت دونوں کو سامنے رکھتا اور ان کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے، وہ انسان کے پاکیزہ ترین رجحانات کو اکساتا ہے، اس کی اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور قوتوں کو بیدار کرتا ہے اور بالآخر اُسے وجدان و شعور کی مکمل اور بے آمیز آزادی تک پہنچا دیتا ہے کیونکہ بلا مکمل آزادی کے وہ کبھی کمزوری و کمتری کے احساس اور غلامانہ ذہنیت سے نجات نہیں حاصل کر سکتا نہ اجتماعی عدل میں سے اپنا حصہ وصول کر سکتا ہے۔ اور نہ اس کے ملنے کے بعد اس کی مشقتوں کو سہ کر اس کی ذمہ داریوں کو نباہ سکتا ہے۔

اسلام میں اجتماعی عدل کی عمارت جن بنیادوں پر قائم ہے یہ آزادی انہی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد ہے، بلکہ یہی وہ اولین بنیاد ہے جس پر دوسری بنیادیں قائم ہیں۔

انسانی مساوات

حقیقی مساوات کے سارے لوازم ایک ایک کر کے اکٹھا ہو گئے۔ انسان کا ضمیر و وجدان پوری طرح آزاد ہو گیا اور غلامانہ ذہنیت کے ہر شائبہ سے بری ہوا۔ انسان غربت و ذلت، تکلیف و مصیبت اور موت کے اندیشوں سے یہ سمجھ کر بے نیاز ہو گیا کہ کوئی بات اذن خداوندی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ سماجی اور اقتصادی قدروں کے دباؤ سے بھی نکل آیا اور دستِ سوال دراز کرنے کی ذلت سے بھی بچ گیا۔ خود اپنی خواہشات و اہواء سے بھی بلند ہو کر اس یکتا اور منفرد خالق کی طرف متوجہ ہوا جس کی طرف بلا تمیز بندہ و آقا سارے انسان رُخ کرتے ہیں۔ ان باتوں کے پہلو بہ پہلو ہر فرد کو بقدر کفایت ضروریات زندگی بھی میسّر آگئیں۔ اب حقیقی مساوات کے سارے لوازم مہیا ہو گئے اور مساوات انسان کی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ انسانی ضمیر اب اس کا محتاج نہیں رہا کہ کوئی اس کے لیے مساوات کے لفظی نعرے بھی بلند کرے۔ کیونکہ ایسا مزاج بن جانے کے بعد اب وہ ان امتیازات کو برداشت کرنے سے انکار کر دے گا جو صرف معاشرتی اور معاشی بنیادوں پر قائم ہیں۔ مساوات کے اس تصوّر کے تحت اب وہ اپنے حقوق کا طالب بن کر اٹھے گا اور جب ان حقوق کو حاصل کرلے گا تو ان کے تحفظ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھے گا۔ اسے یہ حقوق عزیز ہوں گے۔ وہ ان کے لیے قربانیاں دے گا، مصیبتیں سہے گا اور ہر اس حملے کا جم کر مقابلہ کرے گا جو اس کے اِن حقوق پر کیا جائے۔

اس مساوات کا تصوّر ہر ہر دل میں گھر کر چکا ہو گا۔ اس کی پشت پر ہر فرد کو بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کی قانونی ضمانت بھی حاصل ہو گی۔ اس لیے اس کے طالب و حامی صرف کمزور اور غریب لوگ نہ ہوں گے بلکہ وہ اصحاب ثروت بھی اس کی پشت پناہی کریں گے جن کے دل اسلامی تعلیمات سے منور ہوں —— چودہ صدی قبل اسلامی سماج میں عملاً یہی ہوا تھا —— جس کی تفصیل آئندہ مناسب موقع پر سامنے آئے گی۔

ان باتوں کے باوجود اسلام نے آزادیٔ ضمیر سے ضمنی طور پر مستنبط ہونے والے مفہومات پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اصول مساوات کی لفظاً اور منصوص طور پر صراحت کر دی تاکہ بات بالکل متعیّن اور صاف ہو کر سامنے آجائے دنیا میں جب اسلام کی دعوت بلند کی گئی تو انسانیت لفظ مساوات سے نا آشنا تھی۔ کوئی اس بات کا دعویٰ دا

تھا کہ وہ دیوتاؤں کی نسل سے ہے، اور اس دعویٰ کی تائید کرنے والے بھی موجود تھے۔ کوئی اس زعم میں مبتلا تھا کہ اس کی رگوں میں عام لوگوں کی طرح کا معمولی خون نہیں بلکہ صاف، خالص اور شاہانہ خون رواں ہے، اور اس زعم پر بھی سرِ تسلیم خم کیے جاتے تھے، ایک قوم انسانوں کو مختلف طبقات میں تقسیم کر کے کسی طبقہ کو خدا کے سر سے تخلیق کیے جانے کے سبب معزز اور کسی دوسرے طبقہ کو خدا کے قدموں سے بنے ہونے کے سبب پست و ذلیل قرار دیتی تھی۔ عورتوں کے بارے میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ ان کے جسم میں روح بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ آقاؤں کے لیے بالکل جائز تھا کہ غلاموں کو دردناک سزائیں دیں، یا قتل کر ڈالیں، کیونکہ آقاؤں سے الگ ایک دوسری نوع سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے حالات میں اسلام آیا اور اس نے مساوات کا درس دیا، اس نے مبداء و معاد اور موت و زندگی میں، حقوق و فرائض کے باب میں، قانون کے سامنے اور اللہ کے حضور، دنیا اور آخرت میں، غرض ہر جگہ ہر حیثیت سے تمام انسانوں کو مساوی قرار دیا۔ بتایا کہ عمل صالح کے سوا فضیلت و امتیاز کا کوئی اور معیار نہیں، عزت و شرف اگر ہے تو ان کے لیے جو زیادہ متقی اور پاک باز ہوں۔

یہ انسانیت کی ایک ایسی جست تھی جس کی تاریخ میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی اور اب بھی یہ وہ چوٹی ہے جس کی بلندیوں کو انسان کبھی نہ چھو سکا کیونکہ انقلاب فرانس اور مابعد کے دور میں انسانی قوانین نے نظری طور پر جو اصولِ حریت مرتب کیے اسلام ان کو چودہ سو سال پہلے عملاً قائم کر کے دکھا چکا تھا۔

کسی انسان کے اللہ کا بیٹا ہونے کا خیال بالکل لغو ہے۔ اللہ نے کوئی نسل نہیں چلائی۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ، وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ۔	کہو اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس نے کسی کو جنا نہ وہ خود جنا گیا، اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔
وَقَالُوا: اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا۔ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا، وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا۔ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ	وہ کہتے ہیں کہ رحمان نے کسی کو بیٹا بنایا ہے۔ سخت بیہودہ بات ہے جو تم لوگ گھڑ لائے ہو۔ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ گر جائیں، اس بات پر کہ لوگوں نے رحمان کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ۔ رحمان کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ زمین و آسمان کے

عبدًا ، لقد احصاھم و عدّھم عدًّا ، وکلّھم آتیہ یوم القیامۃ فردًا ۔

(مریم : ۸۵)

اندر جو بھی ہیں سب اس کے حضور بندوں کی حیثیت سے پیش ہونے والے ہیں۔ سب پر وہ محیط ہے، اور اس نے ان کا شمار کر رکھا ہے۔ سب قیامت کے روز فرداً فرداً اس کے سامنے حاضر ہوں گے ۔

شاہانہ خون کا دعویٰ بھی باطل ہے۔ شاہانہ خون اور عامی خون کی تقسیم محض ایک افسانہ ہے اور اسی طرح یہ بات کہ کسی کو سر سے پیدا کیا اور کسی کو پیر سے ....

اَلَمْ نَخْلُقْکُّمْ مِنْ مَّاءٍ مَّھِیْنٍ فَجَعَلْنٰہُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ، اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ فَقَدَرْنَا فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ٥

(المرسلات : ۲۰-۲۳)

کیا ہم نے تم سب کو ایک حقیر پانی سے نہیں بنایا؟ پھر ہم نے اسے ایک جائے قرار میں ایک متعیّن مدت تک رکھا، پھر ہم نے (مزید) تعیّن کی اور ہم بہت صحیح تعیّن کرنے والے ہیں ۔

فَلْیَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ، خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ ، یَّخْرُجُ مِنْ بَیْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۔

(الطارق : ۵ - ۷)

انسان کو چاہیے کہ وہ غور کرے کہ اس کی تخلیق کس چیز سے ہوئی، وہ ایک اچھلتے ہوئے پانی سے بنایا گیا ۔ جو پسلیوں اور ریڑھ کی ہڈی کے درمیان سے نکلتا ہے

وَاللّٰہُ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ، ثُمَّ مِنْ نُّطْفَۃٍ ثُمَّ جَعَلَکُمْ اَزْوَاجًا ، وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰی وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِہٖ ، وَمَا یُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا یُنْقَصُ مِنْ عُمُرِہٖٓ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ ، اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۔

(فاطر : ۱۱)

اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا اور پھر نطفہ (کے ذریعہ تخلیق کو تکمیل تک پہنچایا) پھر اس نے تم کو جوڑے جوڑے بنایا (تاکہ سلسلہ نسل آگے چل سکے) اور کوئی مادہ نہ تو اس کے علم کے بغیر حاملہ ہوتی ہے نہ بچہ جنتی ہے ۔ کوئی ذی حیات نہ تو ایک خاص عمر پاتا ہے اور نہ اس کی عمر میں کمی ہوتی ہے مگر یہ کہ ساری باتیں ایک رجسٹر میں درج ہیں۔ یہ سب کچھ اللہ کے لیے بہت آسان ہے ۔

قرآن اس بات کو بار بار دہراتا ہے کہ پوری جنسِ انسانی مٹی سے بنی ہے اور بلا استثناء ہر فرد ایک

حقیر پانی سے وجود میں آیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ سارے انسانوں کے ایک ہی اصل سے ہونے، ایک طرح سے پیدا ہونے اور ایک ہی طرح نشو و نما پانے کی حقیقت دلوں میں جاگزیں ہو جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد ارشادات کے ذریعہ یہ بات کھول کھول کر سمجھا دی ہے، فرمایا کہ "تم سب آدم کی نسل سے ہو، اور آدم مٹی سے بنائے گئے تھے۔ کُلُّکُم بَنُوا آدم، وآدمُ من تراب۔ (مسلم، ابو داؤد)

جب یہ واضح ہو گیا کہ کوئی فرد بالذات کسی دوسرے فرد سے افضل نہیں تو کسی قوم یا نسل کا اپنے حسب نسب کے اعتبار سے دوسری نسلوں اور قوموں پر فضیلت کا دعویٰ بھی باطل ٹھہرا ـــــ یہ وہی دعویٰ ہے جس کا آج بھی بعض اقوام گلا پھاڑ پھاڑ کر اعلان کر رہی ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَّنِسَاءً۔ (النساء: ۱)

لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم سب کو ایک ہی جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا۔ اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت (پیدا کر کے) دنیا میں پھیلا دیے۔

ایک ہی جان تھی، اور اسی جیسا اس کا ایک جوڑا تھا۔ تمام مرد اور عورتیں انہی دونوں سے پیدا ہو کر پھیلی ہیں۔ سب ایک ہی نسل سے ہیں۔ سارے افراد انسانی نسبی طور پر بھائی بھائی، اور حسب کے اعتبار سے ایک دوسرے کے برابر ہیں:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَّأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (الحجرات: ۱۳)

اے انسانو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہیں مختلف گروہوں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں تر وہی لوگ ہیں جو زیادہ تقویٰ شعار ہوں۔

قوموں اور قبیلوں کا یہ اختلاف اس لیے نہیں تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے مقابلہ میں فخر کریں اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالیں۔ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ باہمی تعارف میں آسانی ہو اور لوگ ایک دوسرے سے ربط و تعلق پیدا کریں۔ اللہ کے نزدیک یہ ساری قومیں اور قبائل برابر ہیں۔ کسی کو کسی سے برتر قرار دیا جا سکتا ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر، اور یہ ایک ایسی صفت ہے جسے حسب و نسب سے کوئی تعلق نہیں۔

یہ مساوات ایک خالص انسانی نظریہ پر قائم ہے جو تمام عصبیتوں یہاں تک کہ مذہبی تعصّب سے بھی بلند ہے
چنانچہ خون کے معاملہ میں اسلام نے مشرکین کو مسلمانوں کے برابر حقوق دیے ہیں - اس وقت تک جب تک کہ
ان کے اور مسلمانوں کے مابین معاہدہ صلح قائم ہو -

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ ــــــ إِلَّا أَنْ يَصَّدَّقُوا ــــــ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ، وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ (النساء: ۹۲)

جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے ورثاء کو خوں بہا ادا کرے الّا یہ کہ وہ خوں بہا معاف کریں - لیکن اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے تھا جس سے تمہاری دشمنی ہو تو اس کا کفّارہ ایک غلام آزاد کرنا ہے اور اگر وہ کسی ایسی غیر مسلم قوم کا فرد تھا جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اُس کے وارثوں کو خوں بہا دیا جائے گا اور مومن غلام کو آزاد کرنا ہو گا -

گو یا جن مشرکین سے معاہدہ ہو ان کے مقتول کا کفّارہ بعینہ وہی ہو گا جو مسلمان مقتول کا ہے - برابر برابر
یہاں یہ بات نوٹ کر لینے کے قابل ہے کہ اسلام نے قتل خطأ کا کفارہ ایک غلام آزاد کرنا رکھا ہے - یہ
اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام غلام آزاد کرنے کو ایک انسان کے زندہ کرنے کا ہم معنٰی قرار دیتا ہے - اس طرح
گو یا اِس جان کا بدل میسّر آجاتا ہے جسے قتل خطأ نے ضائع کر دیا تھا - پس اسلام کی نظر میں غلامی موت، یا
کم از کم موت کے مانند ہے، اور آزاد کرنا زندگی، یا زندگی کے مثل ہے -

جہاں تک قتل عمد، قطع اعضا، یا شکل بگاڑنے اور مسخ کرنے کا سوال ہے "النفس بالنفس" کا
اصول جاری ہو گا - اس سلسلہ میں امیر و حقیر، یا آقا و غلام کے درمیان کوئی امتیاز نہ کیا جائے گا رسول صلّی اللہ علیہ
وسلم ارشاد فرماتے ہیں -

مَنْ قَتَلَ عَبْدَهٗ قَتَلْنَاهُ، وَمَنْ جَدَعَ عَبْدَهٗ جَدَعْنَاهُ، وَمَنْ أَخْصَىٰ عَبْدَهٗ أَخْصَيْنَاهُ (بخاری - ابو داؤد - ترمذی - نسائی)

جو اپنے غلام کو قتل کرے گا اسے ہم قتل کر دیں گے - جو اس کی ناک تراشے گا اس کی ناک تراش لی جائے گی، اور جو اسے خصّی کرے گا ہم اسے خصّی کر دیں گے -

اب اس حقیقت سے کسے انکار ہو گا کہ اسلام قبیلہ و نسل اور مذہب و مسلک ہر طرح کے تعصبات سے

رہی ہے، اور اس سلسلہ میں اتنے بلند مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں پہنچنا مغربی تہذیب کو آج تک نہیں نصیب ہو سکا۔ اس تہذیب کا پروردہ امریکی ضمیر اس بات کو جائز سمجھتا ہے کہ علی الاعلان ریڈ انڈین نسل کو مٹا دینے کی منظم کوشش کرے جنوبی افریقہ میں مارشل اسمٹس کے لیے ہندوستانیوں کے خلاف دن دہاڑے نسلی امتیاز کے قوانین وضع کرنا بھی درست اور روسی حکومت کے لیے مسلمانوں کا قلع قمع کر دینا مباح ہے۔

امتیاز و برتری جہاں جس شکل میں بھی پایا جاسکتا ہے اسلام اس کا سراغ لگاتا اور اسے مٹا دینے کے درپے ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مثال لے لیجیے .... قرآن بار بار اس حقیقت پر زور دیتا ہے کہ وہ بھی تمام دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں۔ خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس بات کو بار بار دہراتے رہتے ہیں، کیونکہ آپ نبی تھے قوم کے چہیتے تھے۔ اور قوم کے دل میں آپ کی عزت و عظمت جاگزیں تھی، اندیشہ تھا کہ یہ محبت و تعظیم غیر معمولی فضیلت و برتری دے دینے کی شکل نہ اختیار کر لے۔ اسی اندیشہ کے تحت آپ قوم کو نصیحت فرماتے ہیں۔

لا تطروني كما اطرت النصارى عيسى ابن مريم، فانما انا عبد الله ورسوله۔ (بخاری)	میری تعریف میں اس طرح کا غلو نہ کرنا جس کا غلو نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کی تعریف میں کیا تھا، کیونکہ میں صرف اللہ کا بندہ اور پیغامبر ہوں۔

ایک دفعہ آپ کچھ لوگوں کے پاس گئے وہ تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ آپ نے فرمایا۔

من سرّہ ان یتمثل له الرجال قیاماً فلیتبوأ مقعده من النّار۔ (ابو داؤد۔ ترمذی)	جسے اس بات سے بڑی خوشی ہوتی ہو کہ لوگ اس کے احترام میں سرو قد کھڑے ہو جایا کریں وہ جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالے۔

اسی طرح چونکہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کا حد سے زیادہ احترام کرنے لگیں اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں صاف طور پر آگاہ کر دیا کہ وہ اللہ کے آگے ان کی حمایت کرنے نہیں کھڑے ہو سکیں گے۔

یا معشر قریش، لا اغنی عنکم من اللہ شیئاً یا بنی عبد مناف، لا اغنی عنکم	اے اہل قریش، میں خدا کے آگے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے بنی عبد مناف میں خدا کے آگے تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا یَا عَبَّاسُ ابْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لَا اُغْنِیْ عَنْکَ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَیَا صَفِیَّۃُ عَمَّۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ لَا اُغْنِیْ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔ (متفق علیہ)

اے عباس ابن عبد المطلب میں خدا کے آگے تیرے کچھ کام نہ آسکوں گا۔ اے اللہ کے رسول کی پھوپھی صفیہ میں اللہ کے آگے تیرے کچھ کام نہ آسکوں گا۔"

جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا لمحہ گذرا کہ آپ میں (اپنے مقصد کی ترویج کی خاطر) ایک طرح کی حرص سی اُبھر آئی — کہ آپ بھی انسان ہی تھے — اور آپ بجائے غریب اُمِّ مکتوم کے سردار قوم ولید ابن مغیرہ کی طرف ہی متوجہ رہے تو اللہ نے ان پر ایسا شدید عتاب فرمایا جو جھڑکی سے جا ملتا ہے — کیوں؟ محض اس لیے کہ مساوات مطلق اپنے مکمل اور حقیقی معیار کے ساتھ متحقق ہو سکے۔

اسی طرح بعض صاحب ثروت اور اعلیٰ حسب و نسب کے لوگ چونکہ غریب مردوں اور عورتوں سے شادی بیاہ کے تعلقات قائم کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے تھے لہٰذا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا۔

وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَائِکُمْ، اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَاءَ یُغْنِھِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ۔ (النور - ۳۲)

اپنی بیوہ عورتوں اور صالح غلام اور لونڈیوں کا نکاح کرو اگر یہ لوگ مفلس ہوں تو اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی بنا دے گا، اللہ صاحبِ علم اور بڑی وسعتوں کا مالک ہے۔

جہاں تک دونوں صنفوں کا تعلق ہے۔ اسلام نے عورت کو بحیثیت ایک صنف کے پوری طرح مردوں کی صنف کے مساوی قرار دیا ہے۔ اس نے صرف ایسی برتری کو روا رکھا ہے جس کی بنا فطری استعداد و استطاعت اور ذمہ داری و مہارت ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا نفسِ جنسی اختلاف سے کوئی تعلق نہیں، جہاں بھی فطری استعداد، ذمہ داری اور مہارت یکساں ہو وہاں دونوں کو مساوی مقام دیا گیا ہے۔ فرق صرف وہاں اور اسی حد تک پیدا ہوتا ہے جہاں ان میں سے کوئی چیز کسی حد تک مختلف ہو۔ چنانچہ رُوحانی اور دینی اعتبار سے دونوں برابر ہیں۔

وَمَنْ یَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِکَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّۃَ وَلَا یُظْلَمُوْنَ نَقِیْرًا۔ (النساء: ۱۲۴)

جو نیک عمل کرے گا، خواہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، تو ایسے ہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان کی ذرہ برابر حق تلفی نہ ہونے پائے گی۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی وَھُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْیِیَنَّہٗ حَیٰوۃً طَیِّبَۃً وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَجْرَھُمْ

جو شخص بھی نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ ہو وہ مومن، اسے ہم دنیا میں پاکیزہ زندگی بسر

بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (نحل: ۹۷)

کرائیں گے اور (آخرت میں) ایسے لوگوں کو ان کے اجر ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ۔ (آل عمران: ۱۹۵)

جواب میں ان کے رب نے فرمایا: میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں۔ خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔"

اسی طرح حق ملکیت کی اہلیت اور مالی تصرفات کا مجاز ہونے کے اعتبار سے بھی دونوں برابر ہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ (النساء: ۷)

مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔ اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو۔

لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء: ۳۲)

جو کچھ مردوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے، اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس کے مطابق ان کا حصہ ہے۔

رہا مرد کو میراث میں عورت کا دوگنا حصہ دیا جانا تو اس کی وجہ ذمہ داریوں کا وہ بوجھ اور وہ مشقتیں ہیں جو مرد کو میدانِ حیات میں اٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ کسی عورت سے شادی کرتا پھر اس کی اور اس سے پیدا ہونے والے بچوں کی کفالت کا بار برداشت کرتا ہے، خاندان کے پورے نظام کا بار بھی اسی پر ہوتا ہے۔ یہی ایک وجہ اسے اس بات کا حق دار قرار دینے کے لیے کافی ہے کہ اس کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہو، خاص کر اس شکل میں کہ عورت کے لیے شادی کرنے اور نہ کرنے یا بیوہ ہو جانے ہر شکل میں خوراک اور دیگر ضروریات کی کفالت کا انتظام کیا ہوا ہے۔ شادی کرنے کی شکل میں تو مرد اس کے نفقہ کا ذمہ دار ہے، اور اگر گھر بیٹھی رہتی ہے یا بیوہ ہو جاتی ہے تو ورثہ میں ملا ہوا مال کام آتا ہے لہٰذا اصل مسئلہ ذمہ داریوں کے فرق کا ہے جو وراثت میں فرق کا باعث بنتا ہے۔

رہی یہ بات کہ مرد کو عورت پر قوام بنایا گیا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ۔ (النساء۔ ۳۴)

مرد عورتوں پر قوام ہیں، اس بنا پر کہ اللہ نے اُن میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔

تو اس برتری کی وجہ وہ استعداد اور مہارت ہے جو کارِ قوامیت کے لیے درکار ہے۔ چنانچہ مرد مادرانہ ذمہ داریوں سے آزاد ہونے کی وجہ سے سماجی کاموں میں نسبتاً زیادہ عرصہ صرف کرتا ہے اور اس میں اپنی پوری فکری قوت لگاتا ہے جب کہ یہ ذمہ داریاں ایک معتد بہ عرصہ کے لیے عورت کی راہ روکے رہتی ہیں۔

اس پر مستزاد یہ کہ مادرانہ ذمہ داریاں عورت کے انفعالی اور جذباتی عنصر کو زیادہ ابھارے رکھتی ہیں جبکہ مردوں میں غور و فکر اور تامل و تدبر کا پہلو زیادہ غالب رہتا ہے۔ اب اگر اسے عورت پر قوام بنایا گیا ہے تو اسی لیے کہ وہ اس منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری صلاحیتوں کا حامل ہے اور ان شرائط کو پورا کرتا ہے جو اس ذمہ داری کے سونپے جانے کے لیے درکار ہیں۔ پھر یہ کہ مرد ہی خرچ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہے اور مالی پہلو کا قوامیت سے جو گہرا ربط ہے وہ ظاہر ہے، اس طور پر یہ ایک فرض کے مقابلے میں ملنے والا ایک حق ہوا جو اپنی اصل کے اعتبار سے میدانِ حیات میں دونوں صنفوں کے مابین حقوق و فرائض کی کامل مساوات پر منتج ہوتا ہے۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔

(البقرہ : ۲۲۸)

عورتوں کے لیے بھی معروف طریقہ پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے کہ مردوں کے حقوق ان کے اوپر ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ حاصل ہے۔

یہ درجہ وہی قوامیت کا درجہ ہے جس کی تشریح ہم اوپر کر چکے ہیں۔

عملی ذمہ داریوں سے صرف نظر کرتے ہوئے خالص انسانی اعتبار سے دیکھا جائے تو عورت کو مرد سے کہیں زیادہ اس بات کا حق ہے کہ اس کی نگرانی و خدمت کی جائے، یہ حق مرد کے حق قوامیت کا مقابل ہے ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر کہا۔ اے رسول اللہ، میرے حسنِ صحبت کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟ آپ نے فرمایا "تیری ماں" اس نے پھر پوچھا، اس کے بعد کون ہے، آپ نے فرمایا "تیری ماں" سائل نے پھر دریافت کیا اس کے بعد کس کا نمبر ہے، آپ نے جواب دیا "تیری ماں" اس نے کہا "پھر کون" آپ نے فرمایا "تیرا باپ"[1]

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ گواہی کے مسئلہ میں بھی ایک صنف کو دوسری پر ترجیح دے دی گئی ہے۔

---

[1] بخاری و مسلم۔

وَاسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِن رِّجَالِكُمْ فَإِن لَّمْ يَكُونَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّن تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ، أَن تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ۔ (البقرۃ: ۲۸۲)

اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔

حالانکہ اس کا سبب آیت کے اندر خود ہی موجود ہے یعنی جیسا کہ ہم اوپر بیان بھی کر چکے، وظائف مادریت کی فطرت کے عین تقاضے کے طور پر عورت کے اندر جذباتی اور انفعالی کیفیت اتنی ہی زوردار رہتی ہے جتنی کہ مرد کے اندر فکر و تأمل کی عادت۔ اسی لیے اس کا اہتمام کیا گیا کہ اگر ایک عورت پر نسیان طاری ہو جائے یا وہ انفعال کی شکار ہو جائے تو دوسری اس کو یاد دلانے کے لیے موجود رہے۔ پس یہاں بھی اصل مسئلہ زندگی کی ایک ٹھوس حقیقت کا سامنا کرنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کا مسئلہ ہے۔

اسلام کے لیے یہ کارنامے کیا کم ہیں کہ اس نے عورت کو دین کے معاملہ میں برابر کا درجہ دیا، کسب مال اور ملکیت میں اُسے مساوات عطا فرمائی پھر اُس نے اس کو اس بات کی ضمانت دی کہ نکاح اس کے اِذن اور اس کی مرضی ہی سے ہو سکے گا، نہ تو اُسے مجبور کیا جا سکے گا نہ نظر انداز۔

لا تنکح الثیب حتی تستأمر ولا تنکح البکر حتی تستأذن واذنها الصموت۔

(بخاری و مسلم)

بیوہ کا نکاح بلا اس سے صاف اجازت حاصل کیے نہ کیا جائے اور کنواری کا نکاح بھی اس کا اِذن حاصل کیے بغیر نہ کیا جائے۔ اس کا اذن خاموشی ہے۔

اسی طرح اس نے مہر اور نکاح میں، یا طلاق کے بعد پیدا ہونے والے دوسرے حقوق زوجیت کا تحفظ کیا۔

فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً (النساء: ۲۴)

ان کے مہر بطور فرض کے ادا کرو۔

فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا۔

(البقرہ: ۲۳۱)

یا تو بھلے طریقے سے ان کو روک لو یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو، محض ستانے کی خاطر انہیں نہ روکے رہنا کہ یہ زیادتی ہوگی۔

وعاشروهن بالمعروف (النساء: ۱۹)

ان کے ساتھ بھلے طریقے سے زندگی بسر کرو۔

واضح رہے کہ اسلام نے عورت کو یہ تمام حقوق اور ضمانتیں خالص انسانی جذبہ کے تحت عطا کی ہیں۔ اس نے

ایسا کسی طرح کے مادّی یا معاشی دباؤ کے تحت نہیں کیا ہے۔ اس نے اس ذہنیت کے خلاف اعلان جنگ کیا کہ عورت ایک معاشی بوجھ ہے جس کے پیدا ہوتے ہی اس سے نجات حاصل کر لینا بہتر ہے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے کا یہ رواج جو عرب کے بعض قبائل کی زندگی میں معروف کا درجہ حاصل کر چکا تھا، اس کے خلاف جہاد میں اسلام نے کسی طرح کی نرمی نہیں برتی، اُس نے اس رواج کو بھی اُسی انسانی اسپرٹ کے تحت ختم کیا جس کی روشنی میں وہ انسان کو دیکھتا ہے۔ چنانچہ اُس نے پہلے تو بلا کسی استثناء کے قتل نفس سے منع کیا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (الانعام: ۱۵۱)

اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہو ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ۔

پھر خاص طور سے قتل اولاد سے روکا، یہ واضح رہے کہ صرف لڑکیوں ہی کے قتل کا رواج تھا، لڑکوں کا نہیں۔

وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ..... (الاسراء: ۳۱)

اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو، ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمہیں بھی ....

دیکھیے اس آیت میں اولاد کو روزی دینے کا ذکر مقدم رکھا گیا ہے اس لیے کہ یہی مسئلہ فاقہ کشی اور مفلسی کے اندیشے پیدا کرنے کا باعث بنتا تھا۔ ایسا اِس لیے کیا گیا کہ باپ کا دل اِس اطمینان سے بھر جائے کہ اللہ ہی روزی رساں ہے اور بچّوں کے رزق کی ذمہ داری اس نے بجائے باپ کے خود اپنے سر لے لی ہے ..... پھر قیامت کا بیان کرتے ہوئے عدل اور رحمت کے جذبات کو یوں ابھارا گیا ہے۔

وَاِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ ۔ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۔ (التکویر: ۹)

جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس گناہ کے بدلے قتل کی گئی تھی؟

—— گویا اِس بات کو اس ہولناک اور مہیب دن مخصوص طور پر جواب طلبی کے قابل گردانا گیا ہے۔ پس واضح ہو گیا کہ اسلام عورت کو اس کے مادّی و روحانی حقوق عطا کرتے وقت در اصل اس کے انسان ہونے کی صفت کو سامنے رکھتا ہے اور اسی طرح وہ اپنے "وحدت انسان" کے نظریہ کا پورا پورا حق ادا کرتا ہے۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا (الاعراف: ۱۸۹)

اللہ نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے

اسلام کا منشاء درحقیقت عورت کے درجہ کو اس مرتبہ تک بلند کر دیتا ہے کہ وہ "نفسِ واحدہ" کا نصف بن کر رہے۔

اسلام کے حق میں یہ باتیں سامنے لانے کے ساتھ یہ بتانا ضروری ہے کہ مادہ پرست مغرب نے عورت کو جو آزادی دی ہے اس کا چشمہ خالص اور پاک انسانی منبع سے نہیں پھوٹتا اور نہ اس کی پشت پر وہ بے لوث اور مخلصانہ محرکات رہے ہیں جو اسلام میں حریت و مساوات عطا کرنے کے باعث بنے۔ ہمیں نہ تو تاریخ کو بھولنا ہے نہ حقائق و واقعات پر آج جو نظر فریب خول چڑھ گئے ہیں ان سے دھوکا کھانا ہے۔ اچھی طرح یاد رہے کہ مغرب نے عورت کو گھر سے اس لیے نکالا کہ وہ محنت و مزدوری کر کے کسبِ معاش کرے کیونکہ وہاں پر مرد نے عورت کی کفالت اور پرورش سے انکار کر دیا تھا اِلّا یہ کہ وہ عورت سے اس کی عصمت و عفت کی شکل میں وصول کر لے۔ ایسی صورتِ حال تھی جس کے باعث بے چاری عورت کسبِ معاش کے لیے محنت کرنے پر مجبور ہوئی۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ جب عورت مجبور ہو کر محنت مزدوری کرنے کے لیے گھر سے باہر نکلی تو مادہ پرست مغرب نے اس کی ضرورت مندی کو غنیمت شمار کیا اور جنس محنت کی فراوانی کو تخفیف اجرت کا بہانہ بنا لیا تاکہ مستاجرین کم اجرت والی عورتوں کو مزدور رکھ کر ان مزدوروں سے مستغنی ہو جائیں جو اب سر اٹھانے لگے تھے اور "مناسب معاوضہ" کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اب اگر عورت نے وہاں مساوات کا مطالبہ کیا تو اس کا مطلب اجرتوں میں مساوات کا مطالبہ تھا تاکہ پیٹ بھرنے اور زندگی گزارنے کا بندوبست ہو سکے جب اسے یہ مساوات نہ مل سکی تو اس نے ووٹ دینے کا حق طلب کیا تاکہ اُسے حق جتانے اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے آواز اٹھانے کا موقع مل سکے۔ پھر اس نے پارلیمنٹ میں نمائندگی کا حق چاہا تاکہ وہ اس مساوات کو بجا ثابت کرنے اور اسے تسلیم کرانے کے لیے مثبت طور پر آواز بلند کر سکے۔

اِسی طرح ہمیں ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ اسلام کے برعکس فرانس نے آج تک عورتوں کو اپنے اموال میں آزادانہ تصرف کا حق نہیں دیا ہے۔ اس نے عورت کے حق تصرف کو ولی کی اجازت سے مشروط رکھا ہے۔ درین حالیکہ اُس نے عورت کو بے حیائی اور فحاشی کا پورا پورا حق دے رکھا ہے، علانیہ اور خفیہ ہر طریقے سے۔!

بس یہی آخری "حق" وہ واحد "حق" ہے جس سے اسلام نے عورت کو محروم رکھا ہے، اس لیے کہ اس نے مرد کو بھی اس سے محروم رکھا ہے ــــ انسان کے شعور و احساس، اس کی عزتِ نفس اور اس کی شرافت کے

عین تقاضے کے طور پر - اور اس لیے بھی کہ جنسی تعلّقات کو اس سطح سے بلند کیا جا سکے کہ وہ محض دو جسموں کا اتصال ہو کر رہ جائیں جس کو نہ خاندان بنانے سے تعلق نہ گھر بسانے سے واسطہ -

یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ مادہ پرست مغرب بعض کاموں کے سلسلہ میں عورتوں کو مرد پر ترجیح دیتا ہے، خاص کر تجارتی اداروں، سفارت خانوں، قونصل خانوں، خبر رسانی اور صحافت وغیرہ میں ...... تو ہمیں ہرگز اس مکروہ اور گندہ ذہنیت کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے جو اس ترجیح کی پشت پر کار فرما ہے - یہ بجز عنبر و لوبان کی خوشبوؤں اور افیون کی مہک سے بسی ہوئی فضا میں غلامی اور بندگی کی ایک شکل کے اور کچھ نہیں -

اسے ان سادہ لوحوں کی جنسی حس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے چنانچہ کاروباری ادارہ کا مالک یا وہ ریاست جو کہ عورت کو سفارت خانوں اور قونصل خانوں میں عہدے دیتی ہے اور اسی طرح وہ مالکِ اخبار جو عورت کو خبریں لانے اور نامہ نگاری کرنے پر مامور کرتا ہے، ان میں سے ہر ایک خوب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ وہ عورت کو درحقیقت کس غرض کے لیے استعمال کر رہا ہے اور عورت ان میدانوں میں کس طرح بآسانی کامیابی حاصل کر لیتی ہے - اور یہ کہ وہ اس کامیابی کی خاطر کیا کچھ قربانی کرتی ہے - بفرض محال اگر وہ خود سے کچھ نہ "قربان" کرے تو بھی یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ بھوکی شہوتیں اور حریص نگاہیں اس کی بات چیت اور اس کے جسم کے گرد جمع ہو کر رہیں گی، یہ لوگ اپنی نفع اندوزی اور معمولی سی کامیابی کی خاطر اسی بھوک سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اس لیے کہ اعلیٰ انسانی تصوّرات ان سے دور ہیں، بہت دور -

اشتراکیت کے پاس مساوات مرد و زن کے سلسلہ میں بڑے بلند بانگ دعوے ہیں - حالانکہ اس کی مساوات صرف کام اور اجرت کی مساوات تک محدود ہے، محنت اور اجرت کی مساوات کے بعد عورت پوری طرح آزاد ہے اور اسے بھی مرد کی طرح اباحیت شعاری کی کھلی چھٹی حاصل ہے اشتراکیت کی نظر میں اصل مسئلہ پیسے کا مسئلہ ہے اس کے ماوراء کچھ بھی نہیں، سارے انسانی محرّکات اور تمام انسانی تصوّرات زندگی کے مختلف عناصر میں سے کھنچ کر بس اسی ایک عنصر کے اندر سما گیے ہیں -

تہہ میں اتریے تو اس کا اصل سبب بھی یہی نظر آئے گا کہ مرد عورت کی کفالت سے بچنا چاہتا ہے لہذا عورت مجبور ہے کہ اپنے گذارے کے لیے مرد ہی کی طرح بلکہ اُسی کے حلقۂ کار میں کام کرے کمیونزم دراصل مادہ پرست مغربی طرز فکر کا نقطۂ عروج ہے جو نیکی کے محرکات اور احسان کے دواعی سے خالی اور انسانی زندگی میں روحانی تصوّرات سے عاری ہے -

یہ ہیں وہ باتیں جن کو سامنے رکھے بغیر ہماری نظریں اس جھوٹی چمک دمک سے دھوکا کھا سکتی ہیں - کیونکہ اسلام

نے آج چودہ سو سال پہلے سے عورت کو وہ حقوق دے رکھے ہیں جو فرانس اسے آج تک نہیں دے سکا، نیز اس نے عورت کو محنت مزدوری اور کسب معاش کا وہ حق بھی دے رکھا ہے جو اشتراکیت اُسے آج دے رہی ہے، لیکن ساتھ ہی اسلام نے اس کے لیے خاندان میں نگہداشت اور سرپرستی کا حق بھی بدستور باقی رکھا ہے اس لیے کہ اس کی نظر میں زندگی جان و مال سے زیادہ قیمتی ہے، اور اس کے مقاصد محض کھانے پینے سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہیں۔ وہ زندگی پر اس کے مختلف زاویوں سے نظر ڈالتا ہے۔ اس کے نزدیک مختلف افراد کے لیے جدا جدا کام تو ہیں لیکن سب ایک دوسرے کے سہارے ہی انجام پذیر ہو سکتے ہیں سب ایک دوسرے سے ہم آہنگ اور مربوط ہیں، اسی نظر سے وہ عورت اور مرد کے فرائض کو بھی دیکھتا ہے اور سب سے پہلے دونوں پر اپنے اصل کام کی انجام دہی لازم قرار دیتا ہے تاکہ زندگی پھولے پھلے اور ترقی کر سکے۔ وہ دونوں میں سے ہر ایک کو وہ حقوق عطا کرتا ہے جو اس مشترکہ انسانی مقصد تک پہنچانے کے ضامن ہیں۔

پوری نوعِ انسانیت کو ایک خاص طرح کا شرف بخشا گیا ہے جس کو پامال کرنا صحیح نہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ، وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ، وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَى كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۔ (الاسراء: ۷۰)

ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انھیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

"ہم نے انھیں معزز ٹھہرایا" پوری نوع کو بحیثیت نوع کے، نہ کہ افراد، قبائل، یا نسلوں کو اُن کی انفرادی حیثیتوں میں۔ پس عزت و بزرگی علی الاطلاق سب کے لیے مساوی طور پر ہے کہ سب کے سب آدم سے ہیں۔ چونکہ آدم مٹی سے تھے اور اسی آدم کو معزز ٹھہرایا گیا تھا لہٰذا ان کے بیٹے سب برابر ہیں —— یہاں بھی اور وہاں (آخرت میں) بھی۔

تمام لوگ عزّو شرف کے مالک ہیں اور یہ کسی طرح روا نہیں کہ اس عزّو شرف کو ہدف تعریض بنایا جائے یا کوئی اس کا مذاق اڑائے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ عَسَى أَنْ يَكُونُوا خَيْرًا مِنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِنْ نِسَاءٍ عَسَى أَنْ يَكُنَّ خَيْرًا مِنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوقُ بَعْدَ الْإِيمَانِ وَمَنْ لَمْ يَتُبْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ (الحجرات: ۱۱)

اے اہل ایمان یہ بات مناسب نہیں کہ کچھ لوگ دوسروں کا مذاق اڑائیں۔ عین ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اسی طرح کسی عورت کو بھی کسی عورت کا مذاق نہیں اڑانا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ وہ عورتیں ان (مذاق اڑانے والیوں) سے بہتر ہوں۔ اپنے آپ کو ہدف تعریض نہ بناؤ،

نہ ہی ان کو بُرے ناموں سے پکارو۔ ایمان لانے کے بعد بُرا کلمہ بہت ہی بری بات ہے۔ اب جو لوگ (ایسی حرکتوں سے) تائب نہ ہوں وہ صحیح معنیٰ میں ظالم ہیں۔

یہ گہری اور حسین تعبیر کہ "اپنے آپ کو ہدفِ تعریض نہ بناؤ"، ایک لطیف اشارہ کی حامل ہے اور وہ یہ کہ ایک انسان کا دوسرے انسان کو ہدفِ تعریض بنانا در اصل خود اپنے کو ہدفِ تعریض بنانا ہے کیونکہ تمام انسان ایک ہی جان سے ہیں۔

ہر ایک صاحبِ عزّت و ناموس ہے اور اُس کا ناموس واجب الاحترام ہے:

یا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتاً غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰی اَھْلِھَا ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ، فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْھَا اَحَداً فَلَا تَدْخُلُوْھَا حَتّٰی یُؤْذَنَ لَکُمْ، وَاِنْ قِیْلَ لَکُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا ھُوَ اَزْکٰی لَکُمْ، وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ۔

(النور: ۲۷ و ۲۸)

اے اہلِ ایمان اپنے ذاتی گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں بلا اجازت لیے اور گھر والوں پر سلام بھیجے نہ داخل ہو۔ اگر تم میں نصیحت حاصل کرنے کی صلاحیت ہو تو (سمجھ لوگے) کہ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتری کا ضامن ہے۔ اگر تم کو گھر میں کوئی نہ نظر آئے تو بھی اس وقت تک داخل ہو جب تک اجازت نہ دی جائے۔ اگر تم سے واپس چلے جانے کو کہا جائے تو واپس ہو جاؤ۔ یہ روش تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہوگی۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بخوبی واقف رہتا ہے۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضاً۔

(الحجرات: ۱۲)

ایک دوسرے کی برائیوں کا کھوج نہ لگاؤ اور نہ تم میں سے ایک دوسرے کی غیبت کرے۔

اس قرارداد کی قدر و قیمت اس میں مضمر ہے کہ یہ ہر فرد میں یہ احساس پیدا کرتی ہے کہ وہ صاحبِ عزّت و آبرو ہے اور ایک طرح کا ناموس رکھتا ہے جس پر حملہ کرنا دوسروں کے لیے جائز نہیں نہ کسی فرد کی حرمت دوسرے فرد سے کم تر ہے۔ سب اس معاملہ میں برابر ہیں اور سب کے سب ایک دوسرے کی طرف سے امن میں ہیں۔

اسی طرح اسلام زندگی کے ہر پہلو کو لیتا ہے، اجتماعی شعبوں کو بھی اور ضمیر و وجدان کے گوشوں کو بھی اور ہر جگہ پوری پوری مساوات قائم کرتا ہے۔ ضمیرِ انسانی کو ہر طرح کی احتیاج، خالی خولی مظاہر اور مصنوعی سماجی اقدار سے

دباؤ سے آزاد کر کے مساوات کو اصولی طور پر متحقق کر دینے کے بعد اس امر کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی کہ اسلام الفاظ میں اور ظاہری شکلوں کی تعیین کے ساتھ بھی مساوات کا اعلان کرے۔ لیکن اس نے یہ بھی کیا، کیونکہ مساوات اسے بہت عزیز ہے۔ وہ اسے نسل و قبیلہ اور خاندان و مقام کی تنگیوں سے آزاد، مکمل انسانی شکل میں قائم دیکھنا چاہتا ہے کہ مغرب کے مادہ پرست نظاموں کی طرح اس مساوات کا دائرہ صرف اقتصادی امور تک محدود نہ ہو جائے بلکہ زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہو۔

اجتماعی کفالت باہمی

ایسی زندگی کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی جس میں ہر فرد بے قید آزادی کے ساتھ ہاتھ دھو کر نفع اندوزی اور لذت طلبی کے پیچھے پڑ جائے اور جب اس آزادی کی پشت پر مساوات مطلق کا تصور بھی موجود ہو تو نتائج اور مہلک ہوں گے اور فرد و سماج دونوں تباہ و برباد ہو کر رہ جائیں گے۔ ہر سماج کی ایک کلی مصلحت ہوتی ہے جسے انفرادی آزادیوں کی حد سمجھنا چاہیے۔ خود فرد کی اپنی بھلائی بھی اس میں مضمر ہوتی ہے کہ اپنی آزادی سے فائدہ اٹھانے میں وہ بعض حدود پر آ کر رک جائے اور ان سے تجاوز نہ کرے۔ ورنہ لذت طلبی اور اہواء و خواہشات اسے ہلاکت کے گھاٹ اتار دیں گے، یا اس کی آزادی دوسرے افراد کی آزادی سے ٹکرا جائے گی اور ایسے ایسے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوں گے جو پھر ختم ہونے کا نام نہ لیں گے، ایسی آزادی ایک وبال جان بن کر رہ جائے گی۔ زندگی کی ترقی اور بلندی و کمال کی جانب اس کا اقدام عارضی اور حقیر ذاتی مفادات کی حدود پر آ کر رک جائے گا۔

اسلام انفرادی آزادی کو اس کی بہترین شکل میں عطا کرتا اور اعلیٰ ترین معنی میں انسانی مساوات برپا کرتا ہے لیکن ان دونوں کو بے قید و بے لگام نہیں چھوڑتا۔ ایک طرف سماج کا مفاد اور اس کا حق ہے، دوسری طرف انسانیت کے مصالح اور اس کے تقاضوں کا پاس و لحاظ ہے اور ساتھ ہی دین کے بلند تر مفاد کی قدر و قیمت بھی سامنے ہے۔ اس لیے اسلام انفرادی آزادی کے بالمقابل انفرادی ذمہ داری کا اصول پیش کرتا ہے اور اس کے پہلو میں اجتماعی ذمہ داری کو جگہ دیتا ہے...... جس کا بار فرد اور جماعت دونوں پر ہے۔ اسی

ذمہ داری کو ہم "اجتماعی تکافل" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اسلام نے اجتماعی تکافل کا اصول پوری تفصیل کے ساتھ سامنے رکھا ہے۔ فرد اور اس کی ذات، فرد اور اس کا قریبی خاندان، فرد اور جماعت، ایک قوم اور دوسری قوموں، ایک نسل اور آگے آنے والی نسلوں سب کے مابین اجتماعی تکافل کا یہ اصول کارفرما ہے۔

ذمہ داریوں کا یہ اشتراک فرد اور اُس کی اپنی ذات کے درمیان بھی مطلوب ہے، فرد اس بات کا مکلّف ہے کہ نفس کو اس کی بے لگام خواہشات سے باز رکھے، اسے ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کر کے اس کا تزکیہ کرے، اُسے لے کر صلاح و کامرانی اور نجات کی راہ پر پیش قدمی کرے اور اُسے ہلاکت کے مُنہ میں نہ جھونک دے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَآثَرَ الْحَیَاۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ (النازعات - ۳۷ - ۴۱)

جس نے سرکشی کی روش اختیار کی اور حیات دنیا کو ترجیح دی اس کا ٹھکانا جہنّم ہے اور جو اپنے رب کے حضور حاضری (اور جواب دہی) سے ڈرتا رہا اور اپنے نفس کو ہوا و ہوس سے باز رکھا اس کا مسکن جنت ہے۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰھَا، فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا۔

(الشمس : ۷ - ۱۰)

قسم ہے نفس کی اور اس بات کی کہ اسے درست بنایا گیا اور اس میں فجور و تقوی کی پہچان پیدا کی گئی جس نے اس (نفس) کو پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے گندگیوں سے آلودہ کیا وہ ناکام رہا۔

وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (البقرہ : ۱۹۵)

اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

ساتھ ہی وہ اس بات کا بھی مکلّف ہے کہ نفس کو اس حد تک اس کے مرغوبات ضرور بہم پہنچائے جہاں تک کہ اُس کی فطرت پر بُرے اثرات پڑنے کا اندیشہ نہ ہو اور اس کے لیے اس کے حق کے بموجب کام اور آرام دونوں کے مواقع فراہم کرے نہ یہ کہ کام کا بوجھ ڈال کے اُسے گُھلا مارے۔

وَابْتَغِ فِیْ مَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا

اللہ نے تجھے جو کچھ عطا کیا ہے اُس میں اُخروی زندگی کو اپنا

تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا۔ (القصص: ۷۷)

مطمعِ نظر بنا اور یہ نہ بھول جا کہ دنیا (کی زندگی) میں تیرا حصہ کتنا (حقیر اور عارضی) ہے۔

یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ وَّکُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ۔ (الاعراف: ۳۱)

اے آدم کے بیٹو اپنی زینتیں ہر نماز کے وقت زیرِ استعمال رکھو کھاؤ پیو اور حد سے آگے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ "تیرے بدن کا بھی تجھ پر کچھ حق ہے" (اِنَّ لبدنک علیک حقًّا)

یہ انفرادی ذمہ داری اپنی جگہ مکمل ہے۔ ہر انسان کا سابقہ اپنے عمل سے ہے، اچھا برا نیک و بد جو کچھ بھی وہ کرے گا اس کا اثر اُسی پر پڑتا ہے۔ دنیا ہو یا آخرت کہیں بھی اس سلسلہ میں کوئی اس کے کام نہ آسکے گا۔

کُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا کَسَبَتْ رَهِیْنَةٌ (المدثر: ۳۸)

ہر فرد اپنے اعمال میں گرفتار و مقید ہے۔

اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی وَاِبْرٰهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰٓی، اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی وَاَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی، وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی۔ (النجم: ۳۶-۴۱)

کیا اسے خبر نہیں ملی کہ موسیٰ اور ابراہیم کے صحیفوں میں بیان ہوا تھا۔۔ وہ ابراہیم جنھوں نے (بندگی کا) پورا پورا حق ادا کر دیا۔ یہ کہ کوئی فرد کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھا سکے گا اور یہ کہ انسان کے کام آنے والی چیز بس وہی ہے جس کی وہ کوشش (اس دنیا میں) کر گذرے اور یہ کہ اس کی کوششوں کا ثمرہ جلد ہی اس کے سامنے لایا جائے گا اور پھر اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

لَهَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْهَا مَا اکْتَسَبَتْ۔ (البقرہ: ۲۸۶)

ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے، اس کا پھل اسی کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے، اس کا وبال اسی پر ہے۔

فَمَنِ اهْتَدٰی فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا، وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِوَکِیْلٍ۔ (الزمر: ۴۱)

اب جو راہ یاب ہوتا ہے تو اس کا اپنا فائدہ ہے اور جو گمراہ ہوتا ہے وہ گمراہ ہو کر اپنا ہی برا کرتا ہے، آپ ان سب کے ٹھیکہ دار نہیں۔

وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ۔ (النساء: ۱۱۱)

اور جو شخص کوئی برائی کمائے تو اس کی یہ کمائی اسی کے لیے وبال ہوگی۔

ان اصولوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے نفس کا آپ ہی نگراں بن جاتا ہے۔ نفس گمراہی کی طرف بڑھے تو یہی اُس کو راہ راست پر لاتا ہے اور ساتھ ہی اس کے واجبی حقوق ہمیشہ ادا کرتا رہتا ہے۔ نفس سے لغزش ہو تو اس کا محاسبہ کرتا ہے اور اگر خود غفلت برتے تو اس کا خمیازہ بھی خود ہی بھگتتا ہے۔

اس طرح فرد کو مکمل آزادیٔ ضمیر اور کامل انسانی مساوات عطا کرنے کے ساتھ ہی اسلام ہر فرد میں دو شخصیتیں پیدا کر دیتا ہے جو ہمہ دم ایک دوسرے پر نظر رکھتی ہیں اور بھلائی برائی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے یا ہاتھ پکڑنے کا فرض بھی ادا کرتی ہیں، پس آزادی اور ذمہ داری دونوں برابر ہیں اور ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔

فرد اور اس کے خاندان کے قریبی رشتہ داروں کے مابین بھی تکافل کا اصول کار فرما ہے۔

وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۔ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَا اَوْ كِلٰهُمَا ، فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا ۔ وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۔

(الاسراء: ۲۳ و ۲۴)

والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو، اگر تمہارے پاس ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو، نہ انھیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو، اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو اور دعا کیا کرو کہ "پروردگار، ان پر رحم فرما جس طرح انھوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ ، حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ ، وَّفِصَالُهٗ فِيْ عَامَيْنِ اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ ۔

(لقمان: ۱۴)

ہم نے انسان کو والدین کے ساتھ حسن سلوک کی وصیت کی ۔ کہ اس کی ماں اس کا بار جانے کتنی راتوں کو اٹھائے رہی اور پھر دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا گیا (لہٰذا) وہ میرا اور اپنے والدین کا شکر گذار ہو۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (الاحزاب: ۶)

رحمی قرابت رکھنے والوں میں سے بعض اللہ کے فرمان میں بعض سے زیادہ قریب اور مقدم قرار دیے گئے ہیں۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ	جو باپ چاہتے ہوں کہ ان کی اولاد پوری مدتِ رضاعت
كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ، وَ	تک دودھ پیئے، تو مائیں اپنے بچوں کو کامل دو سال دودھ پلائیں
عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ	اس صورت میں بچے کے باپ کو معروف طریقے سے
(البقرہ: ۲۳۳)	انھیں کھانا کپڑا دینا ہوگا۔

خاندان میں کفالت باہمی کی اہمیت کے بارے میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہی اس ادارہ کی شیرازہ بندی کرنے والا اصول ہے۔ خاندان سماج کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہے، اُس کی قدر وقیمت کے اعتراف سے مفر نہیں۔ یہ ادارہ فطرت انسانی میں گہری جڑیں رکھنے والے میلانات ورجحانات، رحمت ومودّت کے پاکیزہ جذبات اور ضرورت ومصلحت کے تقاضوں کی تکمیل پر قائم ہے۔ پھر یہی وہ گہوارہ ہے جس میں اخلاق و آداب پرورش پاتے ہیں، جو انسانیت کا خاصّہ ہیں، اور درحقیقت یہی اُس سماج کے آداب ہیں جو جانوروں کی سی اباحیت مطلقہ اور وحشیانہ انارکی سے بلند ہو چکا ہو۔

کمیونزم نے چاہا تھا کہ نظامِ خاندان کو یکسر ختم کر دے۔ دلیل یہ تھی کہ خاندان انفرادی ملکیت اور ترجیح ذات کے جذبات کی پرورش کرتا اور دولت کی اجتماعی ملکیت نیز افراد کے ریاست کی تحویل میں لے لیے جانے کی راہ میں روڑا بنتا ہے۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں کمیونزم کو منھ کی کھانی پڑی اس لیے کہ آج کا روسی سماج خاندانی نظام پر ہی مبنی ہے اور اس کے ذہن اور اس کی تاریخ میں خاندان کا ادارہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔ مزید برآں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ خاندان صرف ایک اجتماعی ادارہ نہیں بلکہ ایک نفسیاتی اور حیاتیاتی نظام بھی ہے۔ چنانچہ ایک عورت کو ایک ہی مرد کے لیے خاص کر دینا حیاتیاتی اعتبار سے زیادہ موزوں اور اچھی اولاد پیدا کرنے کی زیادہ کامیاب شکل ہے۔ یہ بات مشاہدہ کی روشنی میں ثابت ہو چکی ہے کہ جو عورت یکے بعد دیگرے کئی مردوں کے تحت رہتی ہے وہ ایک متعیّن عرصہ بعد بانجھ ہو جاتی ہے یا پھر اس کے بچے صحت مند نہیں رہتے۔ رہا معاملہ کا نفسیاتی پہلو تو محبّت ورحمت کے جذبات کسی دوسرے نظام کی بہ نسبت خاندانی نظام میں زیادہ بہتر طور پر نشو ونما پاتے ہیں۔ اس طرح شخصیت کی تعمیر بھی اس ادارہ میں دوسرے نظاموں کی بہ نسبت زیادہ بہتر اور مکمل طور پر ہوتی ہے۔

گذشتہ جنگِ عظیم میں پرورشِ اطفال کے مراکز میں پرورش پانے والے بچوں پر کیے گئے تجربات نے ثابت کر دیا ہے کہ جس بچے کی پرورش یکے بعد دیگرے کئی دائیاں کرتی ہیں اس کی شخصیت اضطراب و انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر محبت اور تعاون کے جذبات کو پوراًنشوونما نہیں نصیب ہوتا، اسی طرح بلا باپ کا بچہ احساس کمتری میں بھی مبتلا رہتا ہے اور ایک ایسا خیالی باپ گھڑ کر اِس حقیقت سے فرار کی شکل نکالتا ہے جس کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہوتا۔ وہ بس عالمِ خیال میں اس سے تعلق جوڑے رہتا ہے اور اس کی خیال آرائیاں اِسے طرح طرح کی شکلیں دیتی رہتی ہیں۔ [۱]

نظامِ خاندانی کو وجود و استحکام بخشنے میں صرف حیاتیاتی اور نفسیاتی عوامل ہی کو دخل نہیں، ضرورت اور مصلحت کے بھی کچھ تقاضے ہیں جو ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان تعلق پیدا کر کے ایک گھرانے کی تشکیل کرنے اور بچوں کی نگہداشت کا ایک نظام بناتے ہیں۔ اس کے بعد ان رشتوں اور تعلقات کا نمبر آتا ہے جو ایک ہی خاندان کے مختلف افراد کو باہم جوڑتے اور ان سب کو ملا کر ایک وحدت بناتے ہیں جو نسلاً بعد نسلٍ اچھے بُرے میں ایک دوسرے کے ساتھی اور جو کچھ آن پڑے یا ہاتھ لگے اس میں ایک دوسرے کے شریک رہتے چلے آتے ہیں۔

اسلام میں خاندانی کفالت باہمی کے مظاہر میں سے ایک اہم مظہر دولت کا وہ توارث ہے جس کی تفصیل ذیل کی دو آیتیں پیش کرتی ہیں۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ، فَإِنْ كُنَّ نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ، وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۔	تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہو، اگر (میت کے وارث) دو سے زائد لڑکیاں ہوں تو انہیں ترکے کا دو تہائی دیا جائے، اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو آدھا ترکہ اس کا ہے
وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ ۔ إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۔ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ	اگر میت صاحب اولاد ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو ترکے کا چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر وہ

[۱] از عربی ترجمہ "بلا خاندان کے بچے"، مصنفہ۔

Anna Freud and Dorothy Burlingham

(مترجمہ بدران و رمزی لبسی)

وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗۤ اَبَوٰهُ فَلِاُمِّهِ الثُّلُثُ ۔ فَاِنْ كَانَ لَهٗۤ اِخْوَةٌ فَلِاُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۔ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۔ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۔

صاحب اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ دیا جائے۔ اور اگر میت کے بھائی بہن ہوں تو ماں چھٹے حصے کی حق دار ہوگی۔

یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جب کہ وصیت جو میت نے کی ہو پوری کر دی جائے اور قرض جو اس پر ہو ادا کر دیا جائے۔ تم نہیں جانتے کہ تمہارے ماں باپ اور تمہاری اولاد میں سے کون بلحاظ نفع تم سے قریب تر ہے۔ یہ حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں اور اللہ یقیناً سب حقیقتوں سے واقف اور ساری مصلحتوں کا جاننے والا ہے۔

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ اَزْوَاجُكُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ، فَاِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوْصِيْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ، وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ، فَاِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوْصُوْنَ بِهَاۤ اَوْ دَيْنٍ ۔

(النساء ۱۱-۱۲)

اور تمہاری بیویوں نے جو کچھ چھوڑا ہو اس کا آدھا حصہ تمہیں ملے گا اگر وہ بے اولاد ہوں، ورنہ اولاد ہونے کی صورت میں ترکہ کا ایک چوتھائی حصہ تمہارا ہے جب کہ وصیت جو انھوں نے کی ہو پوری کر دی جائے، اور قرض جو انھوں نے چھوڑا ہو ادا کر دیا جائے۔ اور وہ تمہارے ترکہ میں سے چوتھائی کی حقدار ہوں گی اگر تم بے اولاد ہو ورنہ صاحب اولاد ہونے کی صورت میں ان کا حصہ آٹھواں ہوگا، بعد اس کے کہ جو وصیت تم نے کی ہو وہ پوری کر دی جائے اور جو قرض تم نے چھوڑا ہو وہ ادا کر دیا جائے۔

يَسْتَفْتُوْنَكَ ۔ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۔ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗۤ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ، وَهُوَ يَرِثُهَاۤ اِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۔ فَاِنْ

لوگ تم سے کلالہ کے معاملہ میں فتویٰ پوچھتے ہیں۔ کہو اللہ تمہیں فتویٰ دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص بے اولاد مر جائے اور اس کی ایک بہن ہو تو وہ اس کے ترکہ میں سے نصف پائے گی اور اگر بہن بے اولاد مرے تو بھائی اس کا وارث ہوگا۔ اگر

كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثَانِ مِمَّا تَرَكَ ، وَإِنْ كَانُوا إِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَاءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۔ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ أَنْ تَضِلُّوا ۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۔ (النساء : ۱۷۶)

میت کی وارث دو بہنیں ہوں تو وہ ترکہ میں سے دو تہائی کی حق دار ہوں گی اور اگر کئی بھائی بہن ہوں تو عورت کا اکہرا اور مردوں کا دوہرا حصہ ہوگا ۔ اللہ تمہارے لیے احکام کی توضیح کرتا ہے تاکہ تم بھٹکتے نہ پھرو ۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے ۔

اوپر کی آیات میں جس وصیت کا ذکر آیا ہے اس کی تشریح اللہ تعالے نے اپنے اس قول کے ذریعہ فرما دی ہے ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ ، إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ـــ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۔ (البقرہ ـ ۱۸۰)

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے معروف طریقے سے وصیت کرے ۔ یہ حق ہے متقی لوگوں پر ۔

یہ وصیت ترکہ سے قرض ادا کرنے کے بعد بقیہ کے ایک تہائی سے آگے نہیں بڑھ سکتی اور نہ ہی ورثہ پانے والوں میں سے کسی کے حق میں کی جا سکتی ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ "کسی وارث کے حق میں وصیت (درست) نہیں" (لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ[1]) دراصل وصیت کی گنجائش ایسے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے رکھی گئی ہے جس میں کہ خاندان کا کوئی ایسا فرد ورثہ سے محروم رہ جائے جس کے ساتھ حسن سلوک کرنا اور بہتر تعلقات قائم رکھنا خاندانی تعلقات کا تقاضا ہو ۔ ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ترکہ میں سے دوسرے کارہائے خیر پر کچھ صرف کرنے کا موقع بھی حاصل رہے ۔

اسلام کا بنایا ہوا یہ نظام ایک خاندان کے مختلف افراد اور یکے بعد دیگرے آنے والی مختلف پشتوں کے درمیان تکافل کا ایک اہم مظہر ہے ۔ علاوہ ازیں یہ ضابطہ دولت کو مسلسل تقسیم کرتا رہتا ہے اور اس کو ایک جگہ اتنا زیادہ نہیں جمع ہونے دیتا کہ یہ اجتماع سماج کے لیے ایک خطرہ بن جائے ۔ (آگے چل کر، اقتصادی پالیسی میں ہم اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کریں گے) یہاں ہم صرف اتنا کہنے پر اکتفا کریں گے کہ اسلام کا نظام وراثت خاندان کی فضا میں

[1] مصابیح السنۃ کے مرتب نے یہ حدیث نقل کی ہے اور اسے حسن قرار دیا ہے ۔

محنت ومعاوضہ اور حقوق و فرائض کے باہمی توازن کا ذریعہ بنتا ہے۔ ہر باپ یہی سمجھ کر محنت کرتا ہے کہ اس کی محنت کا پھل اس کی مختصر سی زندگی تک محدود نہ رہے گا اس کے بعد بھی باقی رہ کر اس کے بیٹوں، پوتوں کو بھی فائدہ پہنچائے گا جس کو بجا طور پر اسی کی زندگی کے آگے کی طرف پھیلاؤ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اسی طرح وہ اپنی پوری کوشش صرف کر کے زیادہ سے زیادہ پیدا کرتا ہے، کہ اس میں اس کا بھی بھلا ہے اور پوری انسانیت نیز اس کے ملک کا بھی۔ پھر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی طرح اُس کی صرف کی ہوئی محنت اور اس کو ملنے والے بدلہ میں یک گونہ برابری بھی پیدا ہوتی ہے کیونکہ اُس کے بچے درحقیقت اُسی کا ایک "جزء" ہیں اور ان کی بقاء میں اسے خود اپنی زندگی کی بقا اور اس کا تسلسل نظر آتا ہے۔

یہ عین تقاضائے انصاف ہے کہ اولاد اپنے ماں باپ کی مساعی سے مستفید ہو، کیونکہ اگر مالی وراثت کا رشتہ کاٹ دیا جائے تو بھی والدین اور اولاد کا تعلق ختم نہیں ہو جاتا۔ ماں باپ اولاد کی ذہنی اور جسمانی ساخت میں وراثت کے ذریعہ بہت سے صفات و استعدادات منتقل کرتے ہیں جو زندگی بھر اُن سے جدا نہیں ہوتیں اور ان کے آئندہ حالات کو بڑی حد تک متعین کر دیتی ہیں، یہ حالات اچھے بھی ہوتے ہیں اور خراب بھی۔ یہ بات اولاد کے بس سے باہر ہے کہ موروثہ صفات میں کسی کو قبول کرنے سے انکار کر دے یا اُن میں کچھ ردّ و بدل کر سکے۔ ریاست یا سماج کتنا ہی ایڑی چوٹی کا زور لگا دے لیکن جس بچے کو اس کے ماں باپ نے ایک بدصورت چہرہ کا وارث بنا دیا ہے اُسے ایک حسین و جمیل چہرہ نہیں عطا کر سکتے۔ نہ ہی اُس کو مزاج کا اعتدال اور اعصاب کی صحت و سلامتی بخش سکتے ہیں جب کہ اسے ورثہ میں غیر مستقل مزاجی اور بے ہنگم پن ہی ملا ہو۔ اسی طرح اگر ماں باپ نے دوامی المریض رہنے اور جلد بوڑھے اور ناکارہ ہو جانے کا مواد منتقل کیا ہو تو یہ اس کو لمبی عمر اور فراواں صحت کبھی نہیں دے سکتے۔ جب اُس کو یہ سب کچھ بلا کسی ارادہ و اختیار کے مجبوراً قبول ہی کر لینا تھا تو اجتماعی عدل کا عین تقاضا ٹھہرا کہ اسے اپنے ماں باپ کی محنتوں کے مادّی ثمرات بھی ملیں تاکہ نفع نقصان کسی حد تک برابر ہو جائے۔

قرآن نے اولاد اور آباء کے درمیان تکافل کو موسیٰ اور اُس بندۂ خدا کے قصہ میں ایک مثل کے ذریعہ واضح کیا ہے جس کو بقول اللہ تعالیٰ "ہم نے اپنی جناب خاص سے رحمت عطا فرمائی تھی اور ایک مخصوص علم سکھایا تھا"، (آتَيْنَاهُ رَحْمَةً مِنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا)

فَانْطَلَقَا حَتّٰی اِذَا اَتَیَا اَهْلَ قَرْیَةٍ اِسْتَطْعَمَا اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ یُّضَیِّفُوْهُمَا ، فَوَجَدَا فِیْهَا جِدَارًا یُّرِیْدُ اَنْ یَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۔

(کہف : ۷۶)

پھر وہ آگے چلے ، یہاں تک ایک بستی میں پہنچے اور وہاں کے لوگوں سے کھانا مانگا ، مگر انھوں نے ان دونوں کی ضیافت سے انکار کر دیا ۔ وہاں انھوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی ۔ اس شخص نے اس دیوار کو پھر قائم کر دیا ۔

اس پر حضرت موسیٰ کو یہ اعتراض تھا کہ جب تک بستی والے ان کو کھانا کھلانے سے انکاری رہیں یا ان سے اس کی اجرت طلب کر سکتے تھے (لَوْ شِئْتَ لَاتَّخَذْتَ عَلَیْهِ اَجْرًا[1]) اس پر انھوں نے اس دیوار کی مرمت کرنے کی اصل وجہ کا انکشاف ان الفاظ میں کیا ۔

وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَیْنِ یَتِیْمَیْنِ فِی الْمَدِیْنَةِ ، وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ، فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَیَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ، رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ۔

(کہف : ۸۲)

اس دیوار کا معاملہ یہ ہے کہ یہ دو یتیم لڑکوں کی ہے جو اس شہر میں رہتے ہیں اس دیوار کے نیچے ان بچوں کے لیے ایک خزانہ مدفون ہے ، اور ان کا باپ ایک نیک آدمی تھا ۔ اس لیے تمہارے رب نے چاہا کہ یہ دونوں بچے بالغ ہوں اور اپنا خزانہ نکال لیں ۔ یہ تمہارے رب کی رحمت کی بنا پر کیا گیا ہے ۔ میں نے اپنی رائے سے نہیں کیا ۔

اس طور پر دونوں لڑکوں کو باپ کی نیک چلنی سے فائدہ پہنچا اور جو مال و دولت اور نیکی و سعادت وہ ان کے لیے اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے یہ اس کے وارث ہوئے ۔ اس کا مبنی برحق و انصاف ہونا بالکل واضح ہے ۔

اس کے باوجود بھی جب دولت کے کسی خاص دائرہ میں گھر کر رہ جانے کا اندیشہ ہو تو ریاست اصلاح حال کے لیے مناسب اقدامات کی مجاز ہے ۔ اسلام اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص ذرائع سے کام لے کر اصلاح حال کرے گا جیسا کہ آگے "اقتصادی پالیسی" اور "اسلام کا حال اور مستقبل" کے ابواب میں آتا ہے ۔ فرد و جماعت اور جماعت و فرد کے درمیان بھی تکافل کا یہ اصول کام کرتا ہے ۔ یہ اصول ان دونوں پر کچھ ذمہ داریاں ڈالتا ہے اور دونوں کو کچھ حقوق عطا کرتا ہے ۔ اس سلسلہ میں اسلام دونوں کے مصالح کو بالآخر

---

[1] ۔ سورۂ کہف : ۷۷ ۔

ایک دوسرے سے جوڑ کر ایک کر دیتا ہے اور دونوں میں سے جو بھی زندگی کے مادّی یا اصولی اور معنوی کسی بھی پہلو سے متعلق فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے اس کو سزا دیتا ہے۔

چنانچہ ہر فرد سب سے پہلے اس بات کا مکلف ہے کہ اس کے ذمہ جو کام ہو اُسے بحسن وخوبی انجام دے۔ کیونکہ اس کی محنت کا پھل درحقیقت جماعت کی ملکیت ہے اور بالآخر اس کا اچھا یا بُرا اثر جماعت ہی پر مترتب ہوتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهٗ وَالْمُؤْمِنُونَ۔ (التوبہ: ۱۰۵)

اے نبی ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم عمل کرو، اللہ اور اس کا رسول اور مومنین سب دیکھیں گے کہ تمہارا طرز عمل کیا رہتا ہے۔

ہر شخص کو جماعت کے مصالح کی نگرانی اس طرح ملحوظ رکھنی ہے کہ جیسے اُسی کو اُن کا محافظ و نگراں بنا دیا گیا ہو!

مثل القائم علیٰ حدود اللہ والواقع فیھا کمثل قوم استھموا فی سفینۃٍ فاصاب بعضھم اعلاھا وبعضھم اسفلھا، فکان الذین فی اسفلھا اذا استقوا مرّوا علیٰ من فوقھم، فقالوا، لو انا خرقنا فی نصیبنا خرقاً ولم نؤذ من فوقنا! فان ترکوھم وما ارادوا ھلکوا، وان اخذوا علیٰ ایدیھم نجوا ونجوا جمیعاً۔ (البخاری والترمذی، واللفظ للبخاری)

اللہ کی کھینچی ہوئی حدود کا پاس رکھنے والے اور ان سے تجاوز کرنے والے کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کچھ لوگ تھے جنھوں نے باہم شریک ہو کر ایک کشتی حاصل کی۔ کچھ لوگوں کو اوپر کا حصہ ملا اور کچھ کو نیچے کا۔ جو لوگ نیچے کے حصے میں رہتے تھے ان کو پانی پینے کے لیے اوپر والوں کے پاس سے ہو کر گذرنا پڑتا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ کیا اچھا ہوتا اگر ہم اپنے حصہ ہی میں (پانی تک پہنچ حاصل کرنے کے لیے) ایک سوراخ کرلیں اور اوپر والوں کو تکلیف دینے سے بچ جائیں۔ اگر لوگ ان (نیچے والوں) کو ان کا ارادہ پورا کرنے دیں تو خود بھی ہلاک ہوں اور اگر ان کا ہاتھ پکڑلیں تو وہ بھی بچ جائیں اور سب کے سب نجات پا جائیں۔

افراد کے مفادات و مصالح کے باہم مربوط اور ایک دوسرے پر منحصر ہونے کی یہ بڑی اچھوتی تصویر ہے جو اس انفرادیت پسندانہ طرز فکر کے مقابلے میں پیش کی گئی ہے جو اصول و نظریات کے ظاہری اور سطحی معنی کا سہارا لیتی اور عملی حقائق کی گہرائی میں اترنے اور واقعات کے عملی نتائج پر غور کرنے سے کتراتی ہے۔ ساتھ ہی یہ تمثیل

بڑی باریک بینی کے ساتھ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ فرد اور جماعت دونوں کے اوپر ایسے حالات میں کیا ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

مصالح عامہ کی رعایت ملحوظ رکھنے کی ذمہ داری سے کوئی فرد بھی بری نہیں، کہ سماج میں ہر فرد بیک وقت نگراں بھی ہے اور زیر نگرانی بھی۔

کلکم راعٍ، وکلکم مسئول عن رعیتہ (مسلم وبخاری)

تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور اس سے اس کی نگرانی میں دیے ہوئے لوگوں کی بابت باز پرس بھی ہونی ہے۔

سماج کے افراد کے درمیان نیکی اور معروف کی حدود میں رہتے ہوئے باہم تعاون سماج کی مصلحت کا عین تقاضا اور ایک لازمی فریضہ ہے۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى، وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ: ۲)

جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو، اور جو گناہ کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (آل عمران: ۱۰۴)

تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔

امر بالمعروف کے سلسلہ میں ہر شخص سے الگ الگ پرسش ہوگی اور اگر اس نے یہ فریضہ نہ انجام دیا ہوگا۔ تو مجرم قرار پائے گا اور اسے اس جرم کی سزا ملے گی۔

خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ، ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ۔ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ لَّا يَاْكُلُهٗۤ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ۔ (الحاقہ: ۳۰-۳۷)

اس کو پکڑو اور اس کے گلے میں طوق ڈالو، پھر اس کو جہنم میں داخل کرو اور پھر اسے ستر گز لمبی زنجیر میں جکڑ دو، بیشک یہ وہ ہے جو خدائے عظیم و جلیل پر ایمان نہ لایا تھا اور نہ یہ محتاجوں کو کھلانے کی ترغیب دیتا تھا تو آج یہاں کوئی اس کا دوست نہیں اور نہ اس کے لیے یہاں کوئی غذا ہے زخموں کے دھوون کے سوا یہ غذا انہیں لوگوں کے لیے ہے جو گنہگار ہیں۔

مسکین کو کھانا کھلانے پر دوسروں کو نہ ابھارنا بھی کفر اور تکذیب دین کی صریح علامت شمار کی جاتی ہے۔

أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذَٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ (الماعون: ۱-۳)

تم نے اُس شخص کو دیکھا جو جزا و سزا کا منکر ہے؟ یہی ہے جو یتیموں کو دھکّے دے کر نکال دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تلقین نہیں کرتا۔

ہر فرد اس بات کا مکلّف ہے کہ جو منکر بھی دیکھے اسے مٹا دے۔

مَنْ رَأَىٰ مِنْكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهِ فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهِ فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهِ، وَهُوَ أَضْعَفُ الْإِيمَانِ۔ (مسلم - ابوداؤد - ترمذی - نسائی)

تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اسے چاہیے کہ اسے بزور بازو مٹا دے، جس سے یہ نہ ہو سکے وہ زبان سے ہی اس کو دور کرنے کی کوشش کرے، جس سے یہ بھی نہ بن پڑے وہ دل ہی میں اس کے خلاف جذبہ رکھے، اور یہ ایمان کا سب سے نچلا درجہ ہے۔

اس طور پر ہر فرد ہر اس منکر کے بارے میں جواب دہ قرار پاتا ہے جو جماعت میں رونما ہو، خواہ وہ اس میں خود نہ شریک رہا ہو۔ کیونکہ جماعت ایک اکائی ہے جس کے لیے منکر بڑا اذیّت بخش ہے اور جماعت کو خطرات سے محفوظ رکھنا ہر فرد کا فرض ہے۔ اسی طرح جماعت بھی اگر اپنے افراد کی طرف سے منکر کے صدور پر چشم پوشی سے کام لے تو اس سے مواخذہ ہوگا اور اس کی سزا وہ دُنیا اور آخرت دونوں جگہ بھگتے گی، کیونکہ یہ اس کی براہِ راست ذمہ داری میں داخل ہے کہ اپنے ہر ہر فرد کی نگراں و سرپرست بن کر رہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔ (الاسراء: ۱۶)

اور جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اُسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

چاہے اس میں بہت سے افراد خود فسق سے دور رہے ہوں، نگراں کا اس فسق کے وجود کو ٹھنڈے ٹھنڈے برداشت کرتے رہنا ہی اُن کو تباہ و برباد کیے جانے کے لائق ٹھہراتا ہے۔

وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا

بچو اس فتنے سے جس کی شامت مخصوص طور پر صرف انہی لوگوں تک

مِنكُم خَاصَّةً ۔ (الانفال: ۲۵) محدود نہ رہے گی جنھوں نے تم میں سے گناہ کیا ہو۔

اور اس میں ظلم کی کوئی بات نہیں، اس لیے کہ جب قوم میں فواحش پھیل رہے ہوں اور منکر کا ارتکاب علی الاعلان جاری ہو لیکن وہ اسے مٹانے کی طرف توجہ نہ کرے، اُس قوم کا شیرازہ بکھر کر رہتا ہے وہ ضرور گرتی اور زوال سے دوچار ہوتی ہے، جو تباہی اُسے یوں نصیب ہوئی وہ ایک قدرتی اور لازمی نتیجہ ہے اس روش کا جو اس نے اختیار کی۔

مُنکر سے باز نہ آنے اور اُسے مٹانے کی کوشش نہ کرنے کے سبب ہی بنی اسرائیل کو اپنے انبیاء کی زبان سے لعنت سننی پڑی، ان کی ہوا اکھڑ گئی اور ان کا عروج زوال سے بدل گیا۔

لُعِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَىٰ لِسَانِ دَاوُودَ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ۝ كَانُوا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُنْكَرٍ فَعَلُوهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

(المائدہ: ۷۸ - ۷۹)

بنی اسرائیل میں جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیونکہ وہ سرکش ہو گئے تھے اور زیادتیاں کرتے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کو بُرے افعال کے ارتکاب سے روکنا چھوڑ دیا تھا۔ برا طرز عمل تھا جو انھوں نے اختیار کیا۔

حدیث میں آیا ہے کہ :۔

لما وقعت بنو اسرائیل فی المعاصی نھتھم علماء ھم فلم ینتھوا، فجالسوھم فی مجالسھم و واکلوھم وشاربوھم، فضرب اللّٰہ قلوبھم بعضھم ببعض، ولعنھم علیٰ لسان داؤد وعیسی ابن مریم ۔

(ابو داؤد ۔ ترمذی)

جب بنی اسرائیل میں گناہوں کا بازار گرم ہوا تو ان کے علماء نے انھیں روکا لیکن وہ نہیں رکے۔ ان کے علماء نے مجالس میں ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان کے ساتھ کھانا، پینا سب کچھ جاری رکھا۔ اس پر اللہ نے ان میں سے بعض (یعنی علماء) کے دلوں کو بعض دوسروں (یعنی عوام) کے دلوں کے مانند کر دیا اور ان پر عیسیٰ ابن مریم اور داؤد کی زبان سے لعنت بھیجی ۔

رہے سچے مسلمان تو یہی لوگ ہیں جن کی بابتہ قرآن یہ فرماتا ہے ۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے

يَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (التوبہ ۷۱)

رفیق و دمساز ہیں۔ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔

ایک بار کچھ لوگوں نے آیت:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ۔ (المائدہ - ۱۰۵)

اے ایمان لانے والو! اپنی فکر کرو، کسی دوسرے کی گمراہی سے تمہارا کچھ نہیں بگڑتا۔ اگر تم خود راہ راست پر ہو۔

سے یہ مفہوم نکالا کہ منکر کو مٹانے اور مردود قرار دینے کی طرف سے خاموشی اختیار کر لینے کو جائز قرار دیتی ہے تو اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اُن کی کوتہ فہمی یہ کہہ کر واضح کی۔

یا ایھا الناس انکم تقرأون ھذہ الآیۃ، وانکم تضعونھا علیٰ غیر موضعھا وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول: ان الناس اذا رأوا الظالم فلم یاخذوا علیٰ یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ تعالیٰ بعقاب، وانی سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول "مامن قوم یعمل فیھم بالمعاصی ثم یقدرون علیٰ ان یغیروا فلم یغیروا الا یوشک ان یعمھم اللہ بعقاب" (ابوداؤد والترمذی)

لوگو تم اس آیت کو پڑھتے ہو اور اس کی غلط تاویل کرتے ہو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ "لوگوں کا حال جب یہ ہو جائے کہ وہ ظالم کو دیکھیں مگر اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکیں تو پھر اللہ کو ان پر عام عذاب بھیجتے دیر نہیں لگتی"۔ اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے سنا ہے کہ کوئی قوم ایسی ہو جس میں گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہو اور لوگ اس حالت کے بدلنے پر قادر بھی ہوں لیکن پھر بھی نہ بدلیں تو ان پر اللہ کی طرف سے سزائے عام نازل ہوتے دیر نہیں لگتی۔"

دراصل یہی اس آیت کی وہ صحیح تفسیر ہے جو اسلام کے مقاصد سے میل کھاتی ہے۔ آیت میں تو صرف فردکی ذمہ داری کا بیان ہے اور یہ کہ ایسی منفی گمراہی جس کا ثبت طور پر کوئی اثر مرتب نہ ہو اس شخص کا اپنا معاملہ ہے دوسروں پر صرف اتنی ذمہ داری ہے کہ اسے راہ راست پر لانے کی اپنی سی کوشش کر دیکھیں لیکن اگر وہ نہیں مانتا تو وہ جانے

اور اس کا عمل، اپنے کیے کا پھل اُسے مل ہی جائے گا۔

جماعت اپنے کمزوروں کی حفاظت اور ان کے مصالح کی دیکھ بھال کے بارے میں بھی جواب دہ ہے۔ چنانچہ اگر ناگزیر ہو تو اُسے ان کی حفاظت کی خاطر جنگ کرنا بھی ضروری ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ ؟ .... (النساء : ۷۵)

آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اُن بے بس مردوں، عورتوں، اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں؟ ......

اسی طرح یہ ذمہ داری بھی اُسی پر ہے کہ جب تک وہ سنِ رُشد کو نہ پہنچیں اُن کے اموال کی حفاظت کرے۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا ۔ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۔

(النساء : ٦)

اور یتیموں کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم اُن کے اندر اہلیت پاؤ تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ ایسا کبھی نہ کرنا کہ حدِ انصاف سے تجاوز کر کے اِس خوف سے ان کے مال جلدی جلدی کھا جاؤ کہ وہ بڑے ہو کر اپنے حق کا مطالبہ کریں گے۔ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو وہ پرہیزگاری سے کام لے اور جو غریب ہو وہ معروف طریقے سے کھائے۔ پھر جب اُن کے مال اُن کے حوالے کرنے لگو تو لوگوں کو اس پر گواہ بنا لو اور حساب لینے کے لیے اللہ کافی ہے۔

حدیث میں ہے کہ:

الساعی علی الارملة والمسکین کالمجاھد فی سبیل اللہ، وکالذی یقوم اللیل ویصوم النھار (مسلم، بخاری، ترمذی، نسائی)

بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا (اپنے کارنامے کے اعتبار سے) مجاہد فی سبیل اللہ کے مانند اور اس شخص کی طرح ہے جو دن بھر روزے رکھتا ہو اور رات بھر نمازیں پڑھتا ہو۔

جماعت اپنے غرباء اور فقراء کی ضروریات پوری کرنے کی ذمہ دار ہے۔ وہ زکوٰۃ وصول کر کے اُسے اس کے مستحقین

مصارف میں خرچ کرے گی، اگر یہ اس غرض کے لیے کفایت نہ کرے تو ذی استطاعت لوگوں پر اس حد تک ٹیکس لگایا جائے گا جس سے ضرورتمندوں کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ اس ضرورت کی تکمیل کے سوا ٹیکس لگانے میں کوئی دوسری چیز قابل لحاظ نہیں کہ اُس کی رعایت اس کی راہ روک سکے، کیونکہ اگر قوم کا ایک فرد بھی کسی شب بھوکا سو رہا تو ساری قوم مجرم و گنہگار شمار کی جائے گی تاآنکہ لوگ ایک دوسرے کو بھوکوں کے کھانا کھلانے پر نہ اُبھاریں۔

كَلَّا بَل لَّا تُكْرِمُونَ الْيَتِيمَ وَلَا تَحَاضُّونَ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ، وَتَأْكُلُونَ التُّرَاثَ أَكْلًا لَّمًّا وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا - كَلَّا إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا، وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا وَجِيءَ يَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ يَتَذَكَّرُ الْإِنسَانُ وَأَنَّىٰ لَهُ الذِّكْرَىٰ، يَقُولُ يَا لَيْتَنِي قَدَّمْتُ لِحَيَاتِي! فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهُ أَحَدٌ وَلَا يُوثِقُ وَثَاقَهُ أَحَدٌ - يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي، وَادْخُلِي جَنَّتِي -

(الفجر: ۱۴-۲۶)

کوئی نہیں، بلکہ تم یتیموں کی عزت نہیں کرتے اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو محتاجوں کے کھانا کھلانے پر ابھارتے ہو تم مرنے کی میراث سمیٹ کر ساری کی ساری خود کھا جاتے ہو اور مال سے نہایت محبت کرتے ہو، کوئی نہیں، جب زمین کوٹ کوٹ کر پست کر دی جائے اور تیرا رب اور فرشتے قطار در قطار آئیں اور اس دن جہنم کو (میدان حشر میں) لایا جائے، اس دن انسان اپنی غفلت کو یاد کرے گا اور اب سوچنے سمجھنے کا موقع ہی کہاں رہا! وہ کہے گا کاش میں نے اپنی زندگی میں آج کے لیے کچھ بھیجا ہوتا۔ پھر اس دن خدا کی طرح نہ کوئی عذاب دے گا اور نہ اس کی طرح کوئی قید میں ڈالے گا اے وہ روح جو (اپنی دنیاوی زندگی میں) مطمئن ہو گئی تھی اب اپنے رب کی طرف رجوع کر بایں حال کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے خوش تو میرے بندوں میں شامل ہو اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

حدیث میں آتا ہے کہ:

أَيُّمَا أَهْلُ عَرْصَةٍ أَصْبَحَ فِيهِمُ امْرُؤٌ جَائِعًا فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُمْ ذِمَّةُ اللهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَىٰ۔ (مسند امام احمد بن حنبل نشر کردہ استاذ احمد محمد شاکر حدیث نمبر ۴۸۸۰)

جس بستی میں کوئی شخص صبح کو اس حال میں اٹھے کہ وہ رات بھر بھوکا رہا ہو تو پھر اللہ تبارک تعالیٰ پر اس بستی کے بقاء و تحفظ کی کوئی ذمہ داری نہیں رہ جاتی۔

اور یہ کہ:-

من کان معہ فضل ظہر فلیعد بہ علیٰ
من لاظہر لہ، ومن کان لہ فضلُ زادٍ فلیعد بہ
من لازاد لہ - (مسلم - ابوداؤد)

جس کے پاس زائد سواری ہو وہ اُسے اُس کو دے دے
جس کے پاس سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد زادِ راہ ہو
وہ اُسے اُس کے حوالہ کردے جس کے پاس زادراہ نہ ہو -

من کان عندہ طعام اثنین
فلیذہب بثالث ......
وان اربع فخامسٍ اوسادسٍ (متفق علیہ)

جس کے پاس دو آدمیوں کا کھانا ہو وہ تیسرے آدمی
کو (مہمان بناکر) لے جائے ......
اور اگر چار کا ہو تو پانچویں یا چھٹے کو -

اُمت اسلامیہ جسد واحد کے مانند ہے، کہ یہاں سے وہاں تک ایک ہی احساس کام کرتا ہے - ایک عضو کو جو تکلیف پہنچتی ہے تمام اعضا اس کے درد کی ٹیس محسوس کرتے ہیں - امت اسلامیہ کی یہ تعبیر بڑی ہی دلکش اور موثر ہے - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے -

مثل المومنین فی توادھم، وتراحمھم،
وتعاطفھم، کمثل الجسد، اذا اشتکی منہ
عضوٌ تداعی لہ سائر الجسد بالسھر والحمّیٰ
(متفق علیہ)

باہم لطف وکرم اور انس ومحبت میں مسلمانوں کا
حال جسم کا سا ہے کہ جب ایک عضو کو کوئی تکلیف ہوتی ہے
تو بدن کا عضو عضو بے خوابی اور بخار کے ذریعہ اس کا
شریک غم بن جاتا ہے -

اسی طرح آپ نے ایک مومن اور دوسرے مومن کے درمیان تعاون وتکافل کی ایک اور لطیف اور معنی خیز تصویر کھینچی ہے -

المومن للمومن کالبنیان یشدُّ بعضہ
بعضاً - (مسلم وبخاری)

ایک مومن دوسرے مومن کے لیے عمارت (کی اینٹوں)
کے مانند ہے کہ اُن میں سے ہر ایک دوسرے کو تھامے اور سنبھالے رہتی ہے -

تعاون وتکافل کا یہ وہ اعلیٰ ترین معیار ہے جس تک ہمارا تخیّل پرواز کرسکتا ہے -

یہی اصول ہے جس کے تحت اجتماعی جرائم کے لیے سزائیں مقرر کی گئی ہیں اور انھیں سخت رکھا گیا ہے، اس لیے کہ جب تک ہر فرد کی جان ومال اور اس کی عزت وآبرو کو محفوظ نہ کردیا جائے تعاون باہمی کا اصول عملاً متحقق نہیں ہوسکتا -

كلّ المسلم على المسلم حرام: دمه وعرضه ومالہ - (مسلم وبخاری)

ایک مسلمان کا سب کچھ دوسرے مسلمان پر حرام ہے۔ اس کا خون اس کی عزت و آبرو اور اس کا مال -

اسی لیے اسلام نے قتل اور زخموں کے معاملہ میں برابر کے بدلے کا قانون بنایا -

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی - (البقرہ ۱۷۸)

آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو اس آزاد سے بدلہ لیا جائے۔ غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا جائے اور عورت اس جرم کی مرتکب ہو تو اس عورت ہی سے قصاص لیا جائے۔

قتل کے جُرم کو سزا کے معاملہ میں کفر کے برابر قرار دیا -

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا - (النساء: ۹۳)

اور جو شخص کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ، وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا (الاسراء: ۳۳)

قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو جسے اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے ساتھ اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم نے قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے -

وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ (المائدہ: ۴۵)

توراۃ میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت، اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ ہے -

اور قصاص پر اُبھارتے ہوئے اُس نے اس کو جماعت کے لیے حیات بخش قرار دیا -

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ - (البقرہ: ۱۷۹)

عقل و خرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے - امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے -

بلاشبہ اس میں زندگی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ قتل سے روک کر گویا زندگی کو محفوظ کر دیا گیا ہے اور

جماعت کے وجود و بقا، نیز اس کے شیرازہ کو منتشر ہونے سے بچانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ زنا کی سزا بہت سخت رکھی گئی ہے کیونکہ یہ عزت و آبرو پر حملہ بے جا اور عصمت و عفت کی بے حرمتی ہے۔ اس سے جماعت میں فحاشی کی اشاعت بھی ہوتی ہے جس کے ذریعہ تھوڑے ہی عرصہ میں نظم جماعت کا پارہ پارہ ہوجانا یقینی ہے۔ پھر اس سے رشتے گڑبڑ ہوتے ہیں اور یہی بناوٹی ولدیت کے ذریعہ باپوں کے رحم و کرم اور ان کی شفقت کی چوری کا باعث بھی بنتا ہے۔

اسلام نے اس سزا کو سخت رکھا ہے۔ چنانچہ اس نے شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے حتی الموت سنگساری، اور غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے کوڑے لگانے کی سزا مقرر کی ہے، جو اکثر مہلک ثابت ہوتے ہیں۔

اَلزَّانِیَةُ وَالزَّانِی فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِیْ دِیْنِ اللّٰهِ۔ (النور: ۲)

زنا کے مرتکب ہونے والے مرد اور عورت ہر ایک کو سو سو کوڑے مارو اور ان دونوں پر اللہ کا قانون نافذ کرنے میں تم نرمی یا رحم سے مطلق نہ کام لینا۔

جو لوگ بھولی بھالی شادی شدہ مومنات پر افتراء پردازی کرتے ہوئے زنا کی تہمت لگاتے ہیں اور اس طرح بالکل جھوٹ .... ان کی عزت و آبرو پر حرف رکھتے ہیں ان کی سزا اس نے اسی کوڑے رکھی ہے اس لیے کہ تہمت طرازی کا یہ جرم نیک نامی اور آبرو پر حملہ بے جا اور بغض و عناد کی جڑ ہونے کے باعث زنا کا ہم پلہ ہے پھر اس کے چرچے سے فحاشی اور زیادہ پھیلتی ہے۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا۔ (النور: ۴)

جو لوگ شادی شدہ شریف اور آزاد عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور پھر اس پر چار گواہ نہ پیش کر سکیں اُن کو اسی کوڑوں کی سزا دو، اور آئندہ کبھی ان کی گواہی نہ قبول کرو۔

چوری بھی چونکہ دوسروں کی ملکیت میں بے جا زیادتی ہے۔ لہذا اسلام نے یہاں بھی سختی برتی اور اس کی سزا قطع ید قرار دی اور دوبارہ چوری کرنے پر دوسرا ہاتھ بھی کاٹ لینے کا حکم دیا۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (المائدہ: ۳۸)

اور چور، خواہ عورت ہو یا مرد، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اور اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔

آج بعض حضرات جب اس سزا کا ایک شخص کے کچھ مال کی چوری سے مقابلہ کرتے ہیں تو انھیں یہ بہت سخت اور بے رحمانہ نظر آتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سزا کے تعین میں اسلام نے جماعت کے امن وتحفظ اور اس کی سلامتی کو سامنے رکھا ہے نیز اس کے پیش نظر اس جرم کی مخصوص نوعیت بھی رہی ہے۔ یہ چوری چھپے کیا جانے والا جُرم ہے اور چھپا کر کیے جانے والے جرائم اپنی عین فطرت کے اعتبار سے سخت سزائیں چاہتے ہیں۔ تاکہ لوگ اُن سے باز رہیں یا اس سخت سزا کے خوف اور اس کے اندیشے میں طاری ہونے والی بوکھلاہٹ کے نتیجہ میں کوئی نہ کوئی علامت چھوڑ جائیں یا کوئی ایسی حرکت کر جائیں جو ان کا سراغ لگانے میں مدد دے سکے۔

واضح رہے کہ اگر چور نے خود اپنی یا اپنی اولاد کی بھوک کی شدت سے تنگ آکر مجبوراً چوری کی ہو تو ایسے حالات میں یہ سخت سزا نافذ نہیں کی جائے گی کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ "مجبور پر کوئی تنگی نہیں"۔

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ۔ (البقرہ۔ ۱۷۳)

جو شخص مجبوری کی حالت میں وہ ان میں سے کوئی چیز کھالے بغیر اس کے کہ وہ قانون شکنی کا ارادہ رکھتا ہو یا ضرورت کی حد سے تجاوز کرے، تو اس پر کچھ گناہ نہیں۔

جیسا کہ آگے آتا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت میں اسی اصول پر عمل کیا تھا۔[1]

جو لوگ امن عامہ کے لیے مستقل خطرہ بن جائیں اور بدامنی اور فساد مچانے پر اتر آئیں، ان کی سزا قتل، سولی یا ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنا یا جلاوطنی قرار دی گئی ہے۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لیے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں، یا سولی پر چڑھائے جائیں، یا

[1] استاذ محمد قطب کی کتاب الانسان بین المادیۃ والاسلام کا باب "جرم اور سزا" ملاحظہ ہو۔

مِنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ۔ (المائدہ : ۳۳)

اُن کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں ۔

اس لیے کہ فساد مچانے اور فتنہ برپا کرنے کی سازش اور اس سلسلہ میں گٹھ جوڑ انفرادی جرائم سے کہیں زیادہ گھناؤنا جرم ہے اور اس کے سلسلہ میں سخت سزاؤں اور قلع قمع کرنے کی تدابیر کی نسبتاً کہیں زیادہ ضرورت ہے ۔

اس طور پر اسلام اجتماعی تکافل کو اس کی تمام ممکن شکلوں کے ساتھ قائم کرتا ہے ۔ اس کوشش میں ہر آن یہ اصول اس کے سامنے رہتا ہے کہ فرد اور جماعت دونوں کے کلّی مقاصد ایک ہی ہوں ۔ زندگی کے سارے پہلو ایک دوسرے سے ہم آہنگ رہیں اور ایک دوسرے کی تکمیل کریں ، چنانچہ وہ فرد کو اس حد تک مکمّل آزادی عطا کرتا ہے جہاں تک وہ نہ خود اس کے لیے مضر ہے اور نہ جماعت کی راہ میں روڑا بنتی ہے ۔ وہ جماعت کو بھی اُس کے حقوق پورے کے پورے دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو ان حقوق کے مقابلہ میں بہت سی ذمّہ داریوں کا مکلّف بھی ٹہراتا ہے تاکہ زندگی اپنی سیدھی ہموار راہ پر بے کھٹکے آگے بڑھی چلے اور بالآخر اِن بلند مقاصد تک جا پہنچے ، جن کے طلب گار اور جن کے لیے کوشاں جماعت اور فرد دونوں یکساں طور پر ہیں ۔

مکمّل آزادئ ضمیر ، کامل انسانی مساوات اور ٹھوس اور پائدار اجتماعی تکافل ، انہی تین بنیادوں پر اجتماعی عدل کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور انسانی عدل کا نظریہ عمل کا جامہ پہنتا ہے ۔

———— ✕ ————

چوتھا باب

اسلام میں اجتماعی عدل کے قیام کے ذرائع

اسلام اپنے کام کا آغاز خارج سے نہیں، داخل سے کرتا ہے اور اپنی اصلاحی کوششوں کو سطح تک محدود رکھنے کے بجائے قلب وضمیر کی گہرائیوں کو ان کا اصلی ہدف قرار دیتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی وہ کبھی بھی زندگی کی واقعی صورتِ حال سے غفلت نہیں برتتا۔ وہ نہ تو نفسِ انسانی کی حقیقت اور اس پر طاری ہونے والی مدّوجزر اور قبض وبسط کی مختلف کیفیات کو نظر انداز کرتا ہے نہ اس حقیقت کو کہ ایک طرف بلند پرواز نیک ارادے اور جذباتِ عالیہ ہیں تو دوسری طرف پاؤں میں ضروریات کی زنجیر بھی ہے انسان کی پرواز کتنی ہی بلند ہو، یہ جان ناتواں کمال مطلق تک پہنچنے سے قاصر ہی رہتی ہے۔

نفسِ انسانی کی گہرائیوں کی بابت اپنے اتھاہ علم کی رہنمائی میں اسلام قانون بھی بناتا ہے، اور ترغیب وتلقین کا فرض بھی انجام دیتا ہے۔ اسی کے مطابق وہ کچھ کاموں کا حکم دیتا اور کچھ چیزوں سے روکتا ہے انفسانی نفسیات کے اسی علم کی روشنی میں وہ حدود وضع کرتا اور ان کو نافذ کرتا ہے یہ سب کچھ کرنے کے بعد وہ ضمیرِ انسانی کو اس بات پر اُبھارتا ہے کہ قوانین وضوابط کی حدود تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اور بھی جتنا بلند ہو سکے ہو، اور جتنا اونچا معیار قائم کر سکے کرے!

اِس دین نے انسانی زندگی کے لیے جو قوانین بنائے ہیں ان کو نافذ کر دینے سے بھی زندگی کی گاڑی نہ صرف یہ کہ چل پڑتی ہے بلکہ انسانی زندگی میں موزونیت وصالحیت بھی آجاتی ہے، لیکن کمال کے اُس

درجہ تک، جو اسلام کا اصل مقصود ہے، زندگی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک کہ طبیعت کے علو، قلب و نظر کی وسعت اور نیکی کے کاموں میں مسابقت کی اس اسپرٹ کو نہ اپنایا جائے جس کے لیے اسلام انسانی ضمیر کو اُبھارتا ہے۔ اس دین میں قلب و ضمیر کو مخاطب کرنے والی تلقینات اور ہدایات ہی وہ چیزیں ہیں جو قوانین کو درجہ کمال تک پہنچاتی ہیں، پھر یہی ہدایات قانونی فرائض کی برضا و رغبت انجام دہی کی بھی ضامن ہیں اور یہی انسانی زندگی کو اس کا وہ حقیقی جوہر عطا کرتی ہیں جو قوانین و ضوابط کی محدود حدوں سے بلند ہوتا ہے، جو اس کا محتاج نہیں ہوتا کہ قوانین و ضوابط کے ذریعہ دھکیل دھکیل کر اُسے راہ پر لگایا جائے۔

اسلام کے پیش نظر چونکہ کامل اجتماعی عدل کا قیام تھا لہٰذا اس نے یہ گوارا نہ کیا کہ محض اقتصادی عدل کا محدود نظام بن کر رہ جائے اور یہ بھی مناسب نہیں سمجھا کہ قانون ہی اس عدل کے قیام کا واحد سہارا ہو۔ چنانچہ اسلام نے اس نظامِ عدل کو ایک وسیع اور ہمہ گیر انسانی نظامِ عدل کی شکل دی اور اسے دو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ فرد کے داخل میں انسانی ضمیر اور سماج کی خارجی دنیا میں قانونی ضابطہ بندی۔ اس نے ان دونوں کو باہم اچھی طرح مربوط رکھا۔ ان دونوں سے کام لیتے ہوئے ایک طرف تو وہ آدمی کے وجدان میں راسخ تاثرات اور جذبات کو اُبھارتا ہے،

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ ۝ (ق : ۳۷)	اس میں اس شخص کے لیے بڑی یاد دہانی ہے۔ جس کے پاس ایک قلبِ سلیم ہو یا (کم از کم) دلی توجہ کے ساتھ کان لگا کر بات سنتا ہو۔

دوسری طرف وہ انسان کی فطری کمزوری سے بھی غافل نہیں رہتا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ انسان خارج میں ایک ایسی قوت کا شدت سے محتاج ہے جو اُسے غلط روی سے باز رکھ سکے۔ جیسا کہ حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں: اللہ تعالےٰ صاحبِ امر کے ذریعہ اس سے زیادہ صلاح و درستگی کر دیتا ہے جتنی قرآن کے ذریعہ کرتا ہے۔ (یَزَعُ اللّٰہُ بِالسُّلْطَانِ اَکْثَرَ مِمَّا یَزَعُ بِالْقُرْآنِ)

جو شخص بھی اس دین پر تحقیق کی خاطر انصاف کی نظر ڈالے گا یہ محسوس کرلے گا کہ اس نے تہذیب نفس کا بہت زیادہ اہتمام کیا ہے اور ہر پہلو سے اور ہر معاملہ میں نفس کی اصلاح و درستگی کی بہت زیادہ کوشش

صرف کی ہیں چنانچہ اس دین نے اپنے نبیؐ کی جو سب سے اونچی تعریف کی وہ یہ ہے، "کہ واقعی آپ بلند ترین اخلاق کے حامل ہیں۔" (وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝ - القلم) کیونکہ حُسنِ اخلاق ہی دراصل ٹھوس اور پائدار سماج کی عمارت کا پہلا ستون ہے - اسی پر اس فانی اور محدود انسان کے ضمیر میں زمین کے آسمان سے تعلق جوڑنے اور فنا کے خلود سے رشتہ قائم کرنے کا انحصار ہے۔

انسانی ضمیر کی تربیت کر لینے کے بعد اس پر اعتماد کرنے میں اسلام نے بخل سے نہیں کام لیا ہے، چنانچہ اس نے اسی کو سارے قوانین کے نفاذ پر نگراں و محافظ بنا دیا ہے - ان قوانین میں سے اکثر کے نافذ کرنے کا کام تو اس نے بالکل اسی کے حوالہ کر دیا ہے - چنانچہ گواہی اکثر حالات میں اقامتِ حدود کی بنا قرار دی گئی ہے - اسی طرح حقوق کے ثابت کرنے میں بھی اکثر اسی کو فیصلہ کن مانا گیا ہے گواہی کے معاملہ میں معلوم ہے کہ اس کا انحصار فرد کے ضمیر اور اس عقیدہ پر ہے کہ اللہ انسانی ضمیر کا نگراں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ ۝ (النور - ۴)

جو لوگ شریف عورتوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور پھر اپنے اس دعوے پر چار گواہ نہ لا سکیں تو ان کو اسی کوڑے مارو، اور ہمیشہ کے لیے ان کی گواہی قبول کرنا چھوڑ دو یہ لوگ "پکے فاسق ہیں۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَاءُ اِلَّا اَنْفُسُهُمْ، فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ، وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكَاذِبِيْنَ - وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهَادَاتٍ بِاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكَاذِبِيْنَ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَا اِنْ كَانَ

جو لوگ اپنی بیویوں پر زنا کی تہمت لگائیں اور ان کے پاس اپنے علاوہ دوسرے گواہ نہ ہوں تو ایسے افراد میں کسی ایک فرد کی شہادت اس طور پر لی جائیگی کہ وہ چار بار اللہ کو گواہ بنا کر یہ بیان دے کہ وہ اپنے دعوے میں سچا ہے، اور پانچویں بار یہ کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی پھٹکار پڑے - جس عورت پر الزام لگایا گیا ہے اُس کے سر سے سزا ٹل جائے گی اگر وہ چار بار اللہ کو گواہ بنا کر یہ بیان دے کہ مرد اپنے دعوی

مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۔ (النور : ٦ - ٩)

میں جھوٹا ہے، پانچویں بار اسے یہ کہنا ہوگا کہ اگر مرد سچا ہو تو خود مجھ پر اللہ کا غضب نازل ہو۔

یہاں تک کہ جن امور میں وہ دستاویز لکھنے کا حکم دیتا ہے وہاں بھی گواہی کو ضروری قرار دیتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۚ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ ۚ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ۚ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۚ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى

(البقرة : ٢٨٢)

اے ایمان لانے والو! جب کسی مقرر مدت کے لیے تم آپس میں قرض کا لین دین کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ جسے اللہ نے لکھنے پڑھنے کی قابلیت بخشی ہو، اسے لکھنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ وہ لکھے اور املا وہ شخص کرائے جس پر حق آتا ہے (یعنی قرض لینے والا) اور اسے اللہ اپنے رب سے ڈرنا چاہیے کہ جو معاملہ طے ہوا ہو اُس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ لیکن اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو، تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے۔ پھر اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلائے۔ یہ گواہ ایسے لوگ ہونے چاہئیں جن کی گواہی تمہارے درمیان مقبول ہو۔

گواہ بننا معاملہ ہوتے وقت بھی فرض ہے۔

وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا (البقرہ : ٢٨٢)

گواہوں کو جب گواہ بننے کے لیے کہا جائے تو انہیں انکار نہ کرنا چاہیے۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ

(البقرہ : ٢٨٣)

اور شہادت ہرگز نہ چھپاؤ۔ جو شہادت چھپاتا ہے اس کا دل گناہ میں آلودہ ہے۔

اسلام انسانی ضمیر پر اُن حدود کے سلسلہ میں بھی اعتماد کر لیتا ہے جن میں سزا کوڑوں اور سنگساری تک جا پہنچتی ہے، یہی حال مالی حقوق کا بھی ہے۔ انسان کو عزّ و شرف بخشنے اور اسے مطلوبہ سطح تک بلند کرنے کے لیے اس پر اتنا اعتماد کرنا ضروری بھی تھا۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ جس ضمیر کے سر اسلام نے اتنی بھاری ذمہ داریاں ڈال رکھی ہوں، جسے وہ نفاذِ قانون کا نگراں بناتا، اور قانونی حدود سے بھی بلند و برتر معیار اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہو، اُسے اُس نے آزاد چھوڑ رکھا ہو —— نہیں بلکہ اس نے اللہ کی خشیت کو اس کا نگراں بنا کر کھڑا کیا اور اُس کے سامنے اللہ کی ہمہ دم نگرانی کا نقشہ دلکش، اچھوتے اور مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

مایکون من نجوی ثلاثۃٍ الا ھو رابعھم ولا خمسۃ الا ھو سادسھم ولا ادنیٰ من ذٰلک ولا اکثر الا ھو معھم اینما کانوا ثم ینبئھم بما عملوا یوم القیامۃ ان اللہ بکل شیئٍ علیم ○

(المجادلہ : ۷)

کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جہاں چوتھا (اللہ) خود نہ ہو، اور نہ ہی یہ ہوتا ہے کہ پانچ آدمی محو سرگوشی ہوں اور چھٹا (اللہ) خود نہ ہو۔ اسی طرح جب بھی اس سے کم یا زیادہ تعداد میں جمع ہو کر لوگ سرگوشیاں کرتے ہیں تو اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے خواہ وہ کہیں پر بھی ہوں۔ پھر قیامت کے دن اللہ ان سب کو ان کے کرتوت سے آگاہ کرے گا، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہر بات کا پورا پورا علم رکھتا ہے۔

ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید ○ اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید ○ ما یلفظ من قولٍ الا لدیہ رقیب عتید ○

(قٓ : ۱۶ - ۱۸)

ہم نے ہی تو انسان کو بنایا ہے، ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس کا نفس اسے کیا سکھاتا پڑھاتا رہتا ہے اور ہم اس سے اس کی شہ رگ کی بہ نسبت بھی زیادہ قریب ہیں۔ جب کہ اس کے دائیں اور بائیں بیٹھے دو نوٹ کرنے والے اس کی ساری باتیں نوٹ کرتے رہتے ہیں ... وہ منہ سے کوئی لفظ بھی نہیں نکالتا مگر یہ کہ ایک نگراں کار مستعد و تیار اس کے پاس (اس بات کو نوٹ کر لینے کے لیے) کھڑا رہتا ہے۔

انہ یعلم السرّ واخفیٰ (طٰہٰ - ۷)

وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ اس سے مخفی تر بات بھی جانتا ہے۔

غرض یہ کہ اسلام نے انسان کو حسنِ عمل پر حسنِ انجام کی بشارت بھی دی، اسے بداعمالیوں کے انجام بد سے ڈرایا بھی، اور اس پر اچھی طرح واضح کر دیا، کہ اُسے اپنے ہر عمل کا دُنیا و آخرت میں حساب دینا ہوگا، وہ نہ تو اپنے اعمال کے نتائج سے بچ سکتا ہے اور نہ جزا و سزا سے۔

ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ فلا تظلم نفس شیئًا، وان کان مثقال حبۃ من خردلٍ اتینا بھا، وکفیٰ بنا حاسبین ۝

(الانبیاء: ۴۷)

قیامت کے دن ہم میزانِ عدل قائم کریں گے اور اس ترازو کی تول میں کسی پر کوئی زیادتی نہ ہوگی، پھر اگر کسی کا کوئی عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہوا تو ہم اس کو لا موجود کریں گے، اور ہم حساب لینے کو بالکل کافی ہیں۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝

(الزلزلۃ: ۱-۸)

جب زمین زلزلے کے مسلسل جھٹکوں سے ہچکولے کھا رہی ہوگی، جب زمین اپنے (پیٹ کا سارا) بوجھ سامنے لا ڈالے گی اور انسان (دانتوں تلے انگلی دبا کر) کہے گا۔ "ارے! آج اسے یہ کیا ہو گیا ہے؟ جب یہ دن آئے گا تب زمین اپنے آقا کا حکم بجا لاتی ہوئی اپنی ساری خبریں نشر کرنا شروع کرے گی، اور یہی دن ہے جب کہ لوگ (اپنے اعمال و کردار کے اعتبار سے) مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹے ہوئے میدانِ حشر کو چلیں گے تاکہ انھیں ان کا کیا کرایا دکھلایا جا سکے، تو جو شخص ذرہ برابر بھی بھلائی کرے گا وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور جو ذرہ برابر بھی برائی کا مرتکب ہوگا تو وہ برائی بھی اُس کی نظروں کے سامنے آ کر رہے گی۔

اس طرح کے صاف صاف فرمودات کے ذریعہ اسلام نے ضمیر کی نگرانی کے لیے خشیت و تقویٰ کی چوکی بٹھا دی ہے اور اس طور پر اس کو حدودِ دین کے قیام کی ذمہ داری اور قوانینِ شرعی کے نفاذ کی دیکھ بھال کے عظیم منصب سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تیار کیا ہے۔ اجتماعی عدل کے قیام میں اسلام نے ایک طرف تو اسی تربیت یافتہ

انسانی ضمیر پر اعتماد کیا ہے اور دوسری طرف قوانینِ شریعت پر۔ انہی دو بنیادوں پر اس نے ایک ہم آہنگ متوازن اور موزوں انسانی سماج کی تشکیل کی ہے۔ جس کی ہلکی سی جھلک ہم آئندہ کسی باب میں دکھلائیں گے۔ فی الحال ہم قانون سازی اور ہدایت و تلقین کے اس طریقہ کے کچھ نمونے سامنے لانے پر اکتفا کریں گے، اس غرض کے لیے ہم زکوٰۃ اور صدقہ کا موضوع منتخب کرتے ہیں جو اس کتاب کے موضوع سے گہری مناسبت بھی رکھتا ہے۔

اسلام نے زکوٰۃ کو صاحبِ استطاعت لوگوں کے مال میں ضرورت مند لوگوں کے حق کے طور پر فرض قرار دیا ہے۔ اس نے اس حق کو قانوناً واجب الوصول قرار دیا ہے جسے ریاست بجبر وصول کرسکتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس نے اس حق کی ادائیگی پر انسانی شعور و وجدان کو بھی ابھارا اور داخل میں یہ تحریک پیدا کی کہ اصحابِ استطاعت خود ہی بطوع و رغبت اس کی ادائیگی میں پیش قدمی کریں۔

چنانچہ اس نے واضح کیا کہ زکوٰۃ عمارتِ اسلام کے ستونوں میں سے ایک اہم ستون اور ضروریات ایمان میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ۝ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ۝ (المومنون ۱-۴)

ایسے مومنین کی کامیابی یقینی ہے جو اپنی نمازوں میں خشوع اختیار کرتے ہیں، غلط اعمال و اقوال سے دور رہتے اور زکوٰۃ ادا کرتے رہتے ہیں۔

تِلْكَ آيَاتُ الْقُرْآنِ وَكِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ هُدًى وَبُشْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ ۝ (نمل: ۱-۳)

یہ قرآن کی آیات ہیں، جو ایک واضح کتاب ہے۔ اور ان مومنین کے لیے سراپا ہدایت و بشارت جو نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور آخرت پر پختہ یقین رکھتے ہیں۔

اور یہ کہ زکوٰۃ نہ دینا دراصل ان مشرکوں کا رویہ ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔

وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِينَ ۝ الَّذِينَ لَا يُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُم بِالْآخِرَةِ هُمْ كَافِرُونَ ۝ (فصلت ۶-۷)

تباہی ہو مشرکین کی جو زکوٰۃ نہیں ادا کرتے اور جو آخرت کے بھی منکر ہیں۔

پھر یہ کہ زکوٰۃ دینا رحمتِ الٰہی کے حصول کا بہترین ذریعہ ہے۔

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ (النور : ۵۶)

نماز قائم کیا کرو، زکوٰۃ دیا کرو اور (سارے ہی معاملات میں) رسولِ خدا کی اطاعت کیا کرو، توقع ہے کہ اس طرح تم رحم کیے جانے کے لائق قرار پاؤ گے۔

اللہ کی مدد صرف انہی کے حصے میں آتی ہے جو اس حق کو ادا کرتے اور اپنی سماجی ذمہ داریوں کو بحسن و کمال پورا کرتے اور اس طرح اس بات کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ وہ فی الحقیقت اس قابل ہیں کہ ان کو زمین میں غلبہ و اقتدار عطا فرمایا جائے۔

وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰہُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَہَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ (الحج - ۴۰-۴۱)

اللہ یقیناً اس کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کو اٹھ کھڑا ہو، اللہ بڑا طاقت والا اور زبردست ہے (یہ مستحقِ نصرتِ الٰہی لوگ وہ ہیں کہ) اگر ہم انھیں زمین میں غلبہ و تمکن عطا فرمائیں تو یہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکیں۔

زکوٰۃ انسانوں کے لیے ایک دائمی ضابطہ ہے جو تمام انبیاء کی تعلیمات کا لازمی جزو رہا ہے چنانچہ کبھی دینِ حق اس اجتماعی فریضہ کے بغیر نہیں پایا گیا۔

وَاذْکُرْ فِی الْکِتٰبِ اِسْمٰعِیْلَ ؗ اِنَّہٗ کَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَکَانَ رَسُوْلًا نَّبِیًّا ۝ وَکَانَ یَاْمُرُ اَہْلَہٗ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ ۪ وَکَانَ عِنْدَ رَبِّہٖ مَرْضِیًّا (مریم ۵۴-۵۵)

اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو، وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ انسان تھا۔

حضرت ابراہیمؑ کی بابت ارشاد ہوتا ہے۔

وَوَہَبْنَا لَہٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَیَعْقُوْبَ نَافِلَۃً ؕ وَکُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِیْنَ ۝ وَجَعَلْنٰہُمْ اَئِمَّۃً یَّہْدُوْنَ

اور ہم نے انھیں اسحٰق (جیسا فرزند) دیا اور پھر مزید انعام کے طور پر یعقوب (جیسا پوتا) عطا کیا

بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۝

(الانبیاء : ۷۲-۷۳)

ان سب کو ہم نے صالح و نیکو کار بنایا اور ہم نے ان کو ہادی و رہنما بنایا کہ یہ ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے ہم نے ان کو بھلے کام کرنے، نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی تلقین کی، اور یہ سب ہمارے عبادت گذار بندے تھے۔

پس بُرا ہو اُن کا جو اس لازمی فریضہ کو نہیں ادا کرتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من آتاه الله مالاً فلم يؤد زكاته مثل له يوم القيامة شجاعاً اقرع له زبيبتان، يطوقه يوم القيامة ثم يأخذ بلهزميه يعني بشدقيه ثم يقول: "انا مالك، انا كنزك"

(بخاری و نسائی)

جسے اللہ تعالیٰ نے مال عطا فرمایا اور اس نے مال کی زکوٰۃ نہ ادا کی تو قیامت کے دن اللہ اس مال کو ایک خوفناک سانپ کی شکل میں ظاہر کرے گا جس کے سر پر بال کھڑے ہوں گے اور جس کی آنکھوں کے اوپر دو سیاہ نقطے[1] ہوں گے یہ سانپ اس کے گلے کا ہار بنایا جائے گا، اور سانپ اس کے دونوں جبڑوں کو پکڑ رکھے گا، پھر کہے گا "میں ہوں تیرا مال! میں ہوں تیرا خزانہ!"

کتنا ہولناک اور بھیانک ہے یہ منظر!!

زکوٰۃ ایک قانونی فریضہ ہے جو ایک متعین شرح کے مطابق مال پر عائد ہوتا ہے۔ اس کے پہلو بہ پہلو صدقہ ہے جس کی کوئی حد یا شرح نہیں مقرر کی گئی ہے۔ بلکہ اسے فرد کے ضمیر پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ فی الحقیقت وجدان و شعور کی آواز ہے اور اس اخوت اور باہم رحم و کرم کا نتیجہ ہے جس کی تعلیم پر اسلام نے بہت زور دیا ہے۔ فرد کا احساسِ فرض اور رحم و کرم کی طرف اس کا نفسیاتی میلان دونوں ہی اس کا ذریعہ بنتے ہیں اور اس طرح بیک وقت دو اہم مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ وجدان کی گہری تربیت بھی ہوتی ہے اور خالص انسانی مزاج رکھنے والا ٹھوس اور پائدار اجتماعی تکافل بھی وجود میں آتا ہے۔ اسلام باہم رحم و کرم کی اس صفت کو خالص انسانی بنیادوں پر استوار کرتا ہے اور اسے اُخوتِ دینی کا پابند بھی نہیں بناتا۔ چنانچہ

---

[1] سانپ کی یہ قسم بہت زہریلی اور خطرناک ہوتی ہے۔ مترجم۔

قرآن کہتا ہے :-

لَا یَنْهٰىكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِیَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْۤا اِلَیْهِمْ۔ (الممتحنہ ۸)

اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ احسان کا برتاؤ رکھنے اور انصاف کا سلوک کرنے سے نہیں روکتا جنھوں نے نہ تو تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :-

ارحموا اھل الارض یرحمکم من فی السماء (ابوداؤد، ترمذی)

زمین میں بسنے والوں پر تم رحم کرو تو جو آسمان پر ہے وہ تم پر رحم کرے گا۔

اس طرح آپ نے باہم رحم وکرم کا ایک ایسا معیار سامنے لا رکھا ہے جو اپنے مزاج کے اعتبار سے خالص انسانی اور دینی عصبیت سے بھی بلند ہے۔

اسلام اسی حد پر رک نہیں جاتا بلکہ ایک قدم ——— ایک عظیم قدم اور اٹھاتا اور تمام ذی روح مخلوقات کو اپنے دامانِ رحمت سے ڈھانپ لیتا ہے۔ اسلام کے سراپا رحم وکرم نبیؐ نے فرمایا۔

بینما رجل یمشی بطریقہ اشتدّ علیہ العطش فوجد بئرا فنزل فیھا فشرب ثم خرج فاذا کلب یلھث یاکل الثری من العطش فقال الرجل لقد بلغ ھذا الکلب من العطش مثل الذی کان بلغ منّی فنزل البئر فملأ خفّہ ماءً ثم امسکہ بفیہ حتّی رقی فسقی الکلب فشکر اللہ فغفر لہٗ۔

ایک بار ایک آدمی اپنی راہ پر چلا جا رہا تھا کہ اُسے سخت پیاس لگی۔ اتنے میں ایک کنواں نظر آیا تو اس میں اتر پڑا۔ پانی پی کر باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک کتا پیاس کے مارے ہانپ رہا ہے اور کیچڑ چاٹ رہا ہے اس نے سوچا کہ کتا بھی پیاس سے اتنا ہی پریشان نظر آتا ہے جتنا پریشان میں خود ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ کنوئیں میں اترا اور اپنا چرمی موزہ پانی سے بھر لیا۔ وہ اسے منھ سے پکڑے رہا یہاں تک کہ اوپر چڑھ آیا اور آکر کتے کو جی بھر پانی پلایا تو اللہ نے اس کے اس عمل کی بڑی قدر کی اور اسے بخش دیا۔

اس پر لوگوں نے پوچھا۔ "اللہ کے رسول! کیا حیوانوں کے ساتھ حسن سلوک کا بھی بدلہ ملے گا؟" آپ نے فرمایا:
ہاں! ہر ذی حیات کے ساتھ حسنِ سلوک میں اجر ہے۔ فی کلّ کبدٍ رطبۃٍ اجرٌ" (بخاری و مسلم)

آپ نے یہ بھی بتایا ہے کہ:۔

دَخَلَتْ امرأۃٌ النّارَ فی ھرۃ ربطتھا، فلم تطعمھا، ولم تدعھا تاکل من خشاش الارض (بخاری)

ایک عورت دوزخ میں اس لیے (جھونک دی) گئی کہ اس نے ایک بلّی کو باندھے رکھا، نہ تو خود اسے کچھ کھلایا نہ چھوڑ دیا کہ زمین کے کیڑے مکوڑے کھا کر پیٹ بھرے۔

پس اسلام میں رحم و کرم ایمان کی بنیاد اور اس کی پہچان ہے۔ کیونکہ یہ ضمیر کے دین سے متاثر ہونے، ضمیر میں دینی روح کے سرایت کر جانے کی دلیل ہے اور ساتھ ہی یہ آدمی میں انسانیت کی اس روح کے وجود کی علامت ہے جو نہ ہو تو اسلام کے نزدیک دین ہی مفقود سمجھا جائے گا۔

اسلام اسی بنیاد پر انسان کو صدقہ اور حسن سلوک کی ترغیب دیتا ہے۔ اور انفاقِ مال کو اس کے لیے محبوب بنا دیتا ہے، اسلام چاہتا ہے کہ طلب اجر کی نیت سے، دنیا میں خوش نودی رب اور اچھے بدلے کی خاطر انفاق کیا جائے۔ اور اسی کے ذریعہ آخرت میں ثواب کا حصول اور اللہ کے عذاب سے نجات چاہی جائے۔

اُن مخلص پکّے مطیع اور فرمانبردار بندوں کے لیے جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنے مال صرف کرتے ہیں، اسلام ایک عظیم خوش خبری لایا ہے۔

وبشّر المخبتین، الّذین إذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم، والصابرین علی ما اصابھم والمقیمی الصّلوٰۃ، وممّا رزقنٰھم ینفقون۔

(الحج: ۳۴، ۳۵)

مخبتین (سرفگندہ لوگوں) کو بشارت دے دیجیے۔ ان لوگوں کو جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ کا ذکر آتا ہے تو فرطِ خشیت سے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں، اور جب ان پر کوئی مصیبت آن پڑتی ہے تو اس پر صبر کرتے ہیں، یہ نماز قائم کرنے والے لوگ ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔

وجدان پر کتنا گہرا اثر چھوڑ جانے والی تصویر ہے! قرآن اسی نقش کو ایک دوسرے انداز میں پھر تازہ کرتا ہے۔

إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ ۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَا أُخْفِيَ لَهُمْ مِنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۔

(السجدہ : ۱۵ - ۱۷)

ہماری آیات پر ایمان تو بس وہ لوگ لاتے ہیں کہ جب ان آیات کے ذریعہ ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو وہ سجدہ ریز ہو جاتے ہیں اور اپنے پروردگار کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور سرکشی و کبر کا رویہ اختیار نہیں کرتے ۔ ان کے پہلو خوابگاہوں سے علٰحدہ رہتے ہیں اور یہ خوف و امید کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں اور ہم نے انھیں جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے یہ اللہ واسطے خرچ کرتے ہیں ۔ کوئی بھی نہیں جانتا کہ خزانۂ غیب میں ایسے لوگوں کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک کا کیا کیا سامان پوشیدہ رکھا گیا ہے اُن اعمال کے بدلے میں جو انھوں نے دنیا میں کیے ۔

اسی طرح ایثار کی ایک اور حسین اور دلکش تصویر ان اہل مدینہ کو سامنے لاکر کھینچی گئی ہے جنھوں نے مہاجرین کو خوش آمدید کہا، پوری فراخ دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ ان کو ٹھکانا دیا اور اپنے گھر بار اور مال و دولت میں ان کو حصہ دار بنا لیا ۔

وَالَّذِينَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ ، وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ــــ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ــــ وَمَنْ يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۔

(الحشر : ۹)

(نیز اس فے میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے) جو ان مہاجرین کی آمد سے قبل ہی سے دارالاسلام میں آباد ہیں، اور ایمان لا چکے ہیں، اب جو لوگ ہجرت کرکے ان کی طرف آئے ہیں یہ ان کو محبوب رکھتے ہیں اور جو کچھ ان مہاجرین کو دیا جائے اس کے لیے اپنے اندر کوئی طلب نہیں پاتے یہ تو خود اپنے مفاد پر ان کے مفاد کو ترجیح دیتے ہیں ــــ خواہ خود انتہائی تنگدستی و فاقہ مستی کے عالم میں کیوں نہ ہوں ــــ

حقیقت یہ ہے کہ جو اپنے طبیعت کے حرص و بخل سے محفوظ رکھ لیا گیا اس کی کامیابی یقینی ہے ۔

یہ اعلیٰ ترین انسانیت کی بہترین اور سب سے اچھوتی تصویر ہے کچھ اور بندگانِ خدا کی ایک تصویر اور بھی ہے جو حسن و دل کشی میں اور تاثیر میں اس سے کم نہیں - بعض روایات کے مطابق یہ لوگ حضرت علیؓ آپ کی بیوی فاطمہ بنت رسول اللہ اور ان کے گھر والے ہیں، رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ -

يُوفُونَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا ۝ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۝ مُّتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا زَمْهَرِيرًا ۝ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ۝ وَيُطَافُ عَلَيْهِم بِآنِيَةٍ مِّن فِضَّةٍ وَأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ۝ قَوَارِيرَ مِن فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا تَقْدِيرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا

ان ابرار کا طرزِ عمل یہ ہے کہ یہ اپنی نذریں پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ہر دم ڈرتے رہتے ہیں جس کے شدائد و مصائب کی ہیبت ہولناکی چار سو چھا جائے گی (اس خوفِ آخرت کے نتیجے میں) یہ لوگ مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں ـــــ حالانکہ اپنا مال انھیں بھی عزیز ہوتا ہے - مگر ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ گویا کہہ رہے ہوں کہ "ہم تم کو خالصۃً لوجہ اللہ کھلا رہے ہیں - نہ تم سے کوئی بدلہ چاہتے اور نہ ہمیں اس کی خواہش ہے کہ تم شکریہ ادا کرو یا احسان مندی کا اظہار کرو - ہمارا محرک تو صرف وہ خوف ہے جو اس مہیب و پرہول دن کی جانب سے ہمیں ہر آن لاحق رہتا ہے"..... (ان کی یہی ذہنیت اور ان کا یہی طرزِ عمل تھا جس کی بنا پر) اللہ تعالیٰ نے انھیں اس خوفناک دن کے آفات و مصائب سے بالکل محفوظ رکھا اور ان کو فرحت و مسرت اور اطمینان و سکون کی نعمتوں سے نوازا، پھر ان کے صبر کے بدلے انھیں رہنے کو آراستہ چمن دیا اور ریشمی خلعتیں پہنائیں ـــــ باغات میں مزین و آراستہ تختوں پر گاؤ تکیے لگائے فروکش، نہ تمازتِ آفتاب سے سابقہ نہ سردی کی شدت سے واسطہ، بلکہ ان باغات کے ہرے بھرے درخت ہر آن ان کے سروں پر سایہ فگن، اور ان کے پھل ان کے ہاتھوں کی براہ راست پہنچ میں ہیں - ساقی ہر آن چاندی کے جام و سبو لیے ان کے اشارہ چشم کا منتظر ہے ـــــ جام و سبو چاندی کے مگر شفاف ایسے کہ شیشہ معلوم ہوتے ہیں اور شیشہ بھی

كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ○ عَيْنًا فِيهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِيلًا ○ وَيَطُوفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُخَلَّدُونَ ○ إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَنْثُورًا ○ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ رَأَيْتَ نَعِيمًا وَمُلْكًا كَبِيرًا ○ عَالِيَهُمْ ثِيَابُ سُنْدُسٍ خُضْرٌ وَإِسْتَبْرَقٌ ○ وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ○ إِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَكَانَ سَعْيُكُمْ مَشْكُورًا ○ (الدهر: ۷-۲۲)

وہ جو چاندی کا بنا ہو، اور ماہرین فن نے اس میں اپنی فن کاری کا کمال دکھلاتے ہوئے اسے ان کے لیے تیار کیا ہو۔ اس محفل میں ایسے جام نوش کرتے ہیں جن کا مزاز نجبیل آمیز ہے جس کا ایک چشمہ جنت میں جاری ہے جسے اہل جنت سلسبیل کے نام سے جانتے ہیں (خدمت کے لیے) ان کے حضور ایسے لڑکے حاضری دینے رہتے ہیں جن کا عنفوان شباب دائمی اور لازوال ہے۔ (ان کے حسن وجمال کی تصویر کوئی کیا کھینچے گا بس) نظر پڑے تو ایسا معلوم ہو کہ گویا موتی بکھیر دیئے گئے ہیں۔ المختصر یہ کہ جب بھی ان مناظر کا جائزہ لیجیے یہی نظر آئے گا کہ نعمتیں بے حد وحساب ہیں اور اس سلطنت کی بے پایانی کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ ان جنتیوں کے زیب تن باریک ہرے ریشمی کپڑے اور دبیز ریشمی عبائیں ہوں گی، اور ان کے ہاتھ چاندی کے کنگنوں سے آراستہ ہوں گے، ان کا آقا ان کو پاک شراب کے جام پلائے گا اور کہے گا "یہ تمہارا بدلہ ہے (یہ اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ) حسن کردار کے سلسلے میں تمہاری مساعی کی پوری پوری قدر کی گئی۔

صدقہ اللہ کو دیا جانے والا قرض ہے جس کی ادائیگی کی ضمانت دی گئی ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ۔ (الحدید: ۱۱)

کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو پھر اللہ اس کو کئی گنا کرکے لوٹائے اور مزید برآں اسے معقول بدلہ بھی ملے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقَاتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (الحدید: ۱۸)

صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں، جنھوں نے اللہ کو قرض حسن دیا اس کو وہ کئی گناہ کرکے ادا کریگا نیز ان کے لیے اس نیکی کا مناسب اجر الگ سے ہوگا۔

یا پھر یہ ایک نفع بخش تجارت ہے جس کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ، وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ لِيُوَفِّيَهُمْ اُجُوْرَهُمْ وَيَزِيْدَهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ، اِنَّهٗ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ ۔

(فاطر: ۲۹ - ۳۰)

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں نیز جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اس میں سے کھلے چھپے راہ خیر میں خرچ کرتے رہتے ہیں وہ ایک ایسی تجارت کر رہے ہیں جس میں گھاٹے کا کوئی امکان نہیں۔ ان کے ان اعمال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اللہ ان کو پورا پورا بدلہ دے اور اپنی خصوصی مہربانی سے ان کو اس کے علاوہ مزید انعام سے بھی سرفراز فرمائے۔ درحقیقت وہ خطاؤں کو بخش دینے والا اور بڑا قدر شناس ہے۔

یہ صدقہ ہر حال میں کچھ نہ کچھ نفع دے جانے والی تجارت ہے، اس میں حق تلفی یا خسارے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۔

(البقرہ: ۲-۲)

اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ تو جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے، اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہوگی۔

آخرت کی جنت انفاق کرنے والوں کے لیے ایک مناسب و موزوں انعام ہے۔

وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ ، وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۔

(آل عمران: ۱۳۳-۱۳۴)

اور دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لیے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بدحال ہوں یا خوشحال جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور کو معاف کر دیتے ہیں ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔

صدقہ سے نفس کی بھی تطہیر ہوتی ہے اور مال کی بھی کچھ خطاکار توبہ و اعتراف کی طرف مائل ہوئے تو رسول کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا کہ ان کی تطہیر و تزکیہ کی خاطر ان کے مال کا ایک حصّہ ان سے لے کر بھلائی کے کاموں میں صرف کیا جائے۔

وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَنْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ. خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهِ، وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ وَأَنَّ اللَّهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔ (التوبہ ۱۰۲، ۱۰۳)

کچھ اور لوگ ہیں جنھوں نے اپنے قصوروں کا اعتراف کر لیا ہے ان کا عمل مخلوط ہے، کچھ نیک اور کچھ بد۔ امید ہے کہ اللہ ان پر پھر مہربان ہو جائے بیشک وہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ اے نبی! تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انھیں پاک کرو اور (نیکی کی راہ میں) انھیں بڑھاؤ، اور ان کے حق میں دعائے رحمت کرو، کیونکہ تمھاری دعا ان کے لیے وجہ تسکین ہوگی اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ کیا لوگوں کو معلوم نہیں کہ وہ اللہ ہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کی خیرات کو شرف قبولیت عطا فرماتا ہے، اور یہ کہ اللہ بہت معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔

انفاق کا جذبہ اللہ سے کیے ہوئے عہد و پیمان کی تکمیل کرنے، اس کی خشیت میں ڈوبے رہنے اور برے انجام سے ڈرتے رہنے کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے یہ فہم و تدبّر کی دلیل بھی ہے عقل کو صحیح سوجھ بوجھ سکھاتا ہے۔ اس سے دست کشی کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے جسے جوڑنے کا حکم دیا ہے اسے کاٹا جائے، یہ دست کشی ایک طرح کا نقض عہد اور زمین میں فساد مچانے کے ہم معنٰی ہے۔

انما يتذكر اولوا الالباب: الذين يوفون بعهد الله ولا ينقضون الميثاق، والذين يصلون ما امر الله به ان يوصل ويخشون ربهم ويخافون سوء الحساب والذين صبروا ابتغاء وجه ربهم و

نصیحت دانشمند لوگ ہی قبول کیا کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں اسے مضبوط باندھنے کے بعد توڑ نہیں ڈالتے۔ ان کی روش یہ ہوتی ہے کہ اللہ نے جن روابط کو قائم کرنے کا حکم دیا ہے انھیں قائم کرتے ہیں، اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور اسی بات کا خوف رکھتے ہیں کہ کہیں اُن کا حساب بُرا حساب نہ ہو، ان کا

أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ۔ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيَّاتِهِمْ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِمْ مِنْ كُلِّ بَابٍ، سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ۔ وَالَّذِينَ يَنْقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مِيثَاقِهِ، وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ أُولَٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ۔

(الرعد : ۱۹ - ۲۵)

حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ آخرت کا گھر انہی لوگوں کے لیے ہے یعنی ایسے باغ جوان کی ابدی قیام گاہ ہوں گے، وہ خود بھی ان میں داخل ہوں گے، اور ان کے آبا و اجداد اور ان کی بیویوں اور ان کی اولاد میں سے جو جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے۔ ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے۔ اور ان سے کہیں گے "تم پر سلامتی ہے تم نے دنیا میں جس طرح صبر سے کام لیا اس کی بدولت آج تم اس کے مستحق ہوئے ہو" دیکھو کیا اچھا ہے یہ آخرت کا گھر۔ لیکن وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنھیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یہ لوگ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانا ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ سے دست کشی ہلاکت کے ہم معنی ہے۔

وانفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ۔ (البقرہ: ۱۹۵)

اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو۔

اس روش میں فرد کی ہلاکت مضمر ہے کیونکہ فرد اس کو اختیار کر کے خود کو عذابِ آخرت کا مستحق، اور دنیا میں لوگوں کی ملامت کا سزاوار ٹھہراتا ہے اور پھر عدم انفاق کی وجہ سے سماج میں ظلم شقاوت، حسد و کینہ، فتنہ و فساد اور کمزوری و انتشار پیدا ہوتا ہے اس لیے اس میں اجتماعی ہلاکت بھی ہے۔ دولت سے غریبوں کو محروم کرنا صریح زیادتی ہے۔

أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ، مَنَّاعٍ

ایسے سرکش اور دشمن حق کو جہنم میں جھونک دو جو غریبوں

لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيبٍ (قٓ: ۲۴-۲۵)

کو دولت سے محروم کرنے والا، زیادتی کرنے والا اور دین کی حقانیت کے بارے میں شک وشبہ میں مبتلا ہے۔

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ -

(القلم ۱۰ - ۱۲)

بہت بڑھ بڑھ کر قسمیں کھانے والے بے وقعت کمینہ طینت انسان کی بات نہ مانو، جو غیبت کرنے والا اور چغل خور ہے نیز دولت سے غریبوں کو محروم کرنے والا، زیادتی کرنے والا اور حق تلفی کرنے والا ہے

یہ زیادتی اللہ کے حق پر بھی زیادتی ہے اور جماعت کے حق پر بھی۔ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت سے ایسا شخص خود اپنے اوپر بھی زیادتی کرتا ہے۔ پھر نیکی اور حسن سلوک جنت میں ٹھکانا لاتی ہے اور نیکوکار کو وہ گھاٹی پار کراتی ہے جو جنت اور اس کے درمیان حائل ہے۔ یہ گھاٹی دراصل گردنوں کو چھڑانا، نیز بھوک اور مفلسی کے دنوں میں کھانا کھلانا ہے۔

وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ؟ فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ أَوْ مِسْكِينًا ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد: ۱۲ - ۱۶)

جانتے ہو یہ گھاٹی کیا ہے؟ (کسی غلام یا قیدی کی) گردن چھڑانا یا کسی قرابت دار یتیم یا مفلس و قلاش مسکین کو فاقے کے دنوں میں کھانا کھلا دینا۔

ان کاموں سے جان چرانا انسان کو جہنم کے حوالہ کرتا اور صفِ کفار میں جا کھڑا کرتا ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ؟ قَالُوا: لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ، وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ، وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ، وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ، حَتَّىٰ أَتَانَا الْيَقِينُ -

(المدثر: ۴۲ - ۴۷)

تم کو کس بات نے جہنم میں داخل کرا دیا؟ وہ بولے ہم نمازی نہ تھے اور نہ ہی ہم مسکینوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ ہم آیاتِ الٰہی کے ساتھ کھیلنے والوں میں شامل ہو کر اس جرم کے مرتکب بھی ہوتے تھے اور بدلے کے دن کا بھی انکار کرتے تھے، تا آنکہ ہمارے سامنے وہ گھڑی آن پہنچی جس کا آنا یقینی تھا۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ، بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے

سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۔

(آلِ عمران ۱۸۰)

لیے اچھی ہے۔ نہیں یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۔ يَوْمَ يُحْمَى عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُونَ ۔

(التوبہ: ۳۴ - ۳۵)

جو سونے چاندی کی خزانے جمع کرتے ہیں اور انہیں راہ خدا میں خرچ کر کے نہیں دیتے ان کو دردناک عذاب کا نوٹس دے دیجیے جس کا مزا وہ اس دن چکھیں گے جب کہ یہ سونے چاندی کے توڑے جہنم کی بھٹی میں تپا کر ان کی پیٹھوں، پہلوؤں اور پیشانیوں کو داغا جائے گا۔ کہ "یہ لو کل تک جو اپنے لیے جمع کرتے رہے آج اس کا مزا چکھ لو"۔

ایسا نہیں کہ کنز کا اطلاق صرف اسی مال پر ہو جس کی زکوٰۃ نہ نکالی گئی ہو بلکہ ہر وہ مال جو ضرورت سے زائد ہوا اور خرچ نہ کیا گیا ہو اس کا جمع کرنا ایذا دہی کے ہم معنیٰ ہے۔

عن ابی امامۃ رضی اللہ عنہ: قالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ابنَ آدم انّکَ ان تبذل الفضل خیرٌ لك وان تمسکہ شرٌّ لك ۔ (مسلم، ترمذی)

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اے ابن آدم تیرے لیے ضرورت سے زائد مال کا خرچ کر دینا بہتر ہے اور اسے روکے رکھنا برے نتائج کا حامل ہے"۔

عن بلالٍ رضی اللہ عنہ۔ قال رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم "ما رزقت فلا تخبأ وما سئلت فلا تمنع" فقلتُ: یا رسول اللہ وکیف لی بذلك؟ قالَ هو ذاك او النار (رواہ الطبرانی فی الکبیر وابو الشیخ ابن حبان فی کتاب الثواب ــ والحاکم، وقال صحیح الاسناد)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ "جو رزق تجھے عطا کیا گیا ہے اسے چھپا کر نہ رکھ اور جو کچھ تجھ سے مانگا جائے اس میں بخل سے نہ کام لے"۔ میں نے کہا "اے اللہ کے رسول! یہ کیسے ہو سکے گا؟ آپ نے فرمایا۔ "یا تو یہ روش اختیار کرنی ہوگی یا جہنم کا ایندھن بننا پڑے گا"۔

یہی نہیں بلکہ ان کے بخل اور منع خیر کے بدلے ان کو دنیا میں بھی کبھی سزا مل جاتی ہے، قرآن کریم ایک چھوٹے سے قصہ کے ذریعہ ایک مثال سامنے لاتا ہے: یہ کچھ لوگوں کا قصہ ہے جن کے پاس ایک باغیچہ تھا، جس کے پھلوں میں سے یہ فقراء کو بھی کھلاتے تھے، پھر ان کے جی میں آئی کہ کنجوسی کریں اور کسی کو کچھ نہ دیں، ادھر باغیچہ پر ایک آفت آئی اور اللہ میاں نے اس کے پھلوں کا صفایا کر دیا۔ اب یہ لوگ بہت پچھتائے۔

إِنَّا بَلَوْنَاهُمْ كَمَا بَلَوْنَا أَصْحَابَ الْجَنَّةِ إِذْ
أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ، وَلَا يَسْتَثْنُونَ۔
فَطَافَ عَلَيْهَا طَائِفٌ مِنْ رَبِّكَ وَهُمْ نَائِمُونَ،
فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ أَنِ
اغْدُوا عَلَى حَرْثِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَارِمِينَ،
فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ، أَنْ لَا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ
عَلَيْكُمْ مِسْكِينٌ ۝ وَغَدَوْا عَلَى حَرْدٍ قَادِرِينَ،
فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوا: إِنَّا لَضَالُّونَ، بَلْ نَحْنُ
مَحْرُومُونَ، قَالَ أَوْسَطُهُمْ: أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ
لَوْلَا تُسَبِّحُونَ! قَالُوا سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنَّا كُنَّا
ظَالِمِينَ۔ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ يَتَلَاوَمُونَ
قَالُوا! يَا وَيْلَنَا! إِنَّا كُنَّا طَاغِينَ، عَسَى رَبُّنَا
أَنْ يُبْدِلَنَا خَيْرًا مِنْهَا، إِنَّا إِلَى رَبِّنَا رَاغِبُونَ۔

ہم نے ان کو اسی طرح آزمائش میں ڈال رکھا ہے
جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا۔ جب کہ انھوں نے قسم
کھائی کہ صبح سویرے ہی چل کر اس کا پھل توڑ لیں گے، ان کا
ارادہ تھا کہ ان پھلوں میں سے غریبوں اور محتاجوں کے لیے
کچھ بھی نہ الگ کریں گے[۱]۔ لیکن ابھی وہ محوِ خواب ہی تھے
کہ باغ پر تیرے رب کی جانب سے ایک آفت آئی اور باغ
ایک فصل کٹے ہوئے کھیت کی مانند رہ گیا۔ ادھر ان لوگوں نے
صبح تڑکے ہی ایک دوسرے کو آواز دی کہ پھل توڑنے ہوں
تو بس سویرے ہی کھیت پر چلے چلو، چنانچہ یہ لوگ سرگوشی
کرتے ہوئے چل کھڑے ہوئے کہ "آج کوئی مسکین آنے ہی
نہ پائے" یہ ایسا چلے گویا غریبوں کو کچھ نہ دینے پر پوری طرح قادر ہیں۔
جب یہ کھیت پر پہنچے اور اس کا یہ حال دیکھا تو (سر تھام کر)
بولے "ارے کیا ہم رستہ بھول گئے؟ نہیں نہیں بلکہ ہماری

لہ ہم نے آیت کا یہ ترجمہ اس لیے کیا ہے کہ فاضل مصنف نے اس سے یہی سمجھا ہے جیسا کہ ان کی دوسری تصنیف التصویر الفنی فی القرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ محققین اس ترجمہ کو صحیح نہیں سمجھتے اور صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ "اور انھوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا" اس ترجمہ کے پیشِ نظر آگے "لولا تسبحون" کا اشارہ بھی اسی کی طرف سمجھا جائے گا۔ آیت کے فہم میں یہ اختلاف اس موقع پر اس سے استدلال کو بھی قابلِ غور بنا دیتا ہے۔ واللہ عندہ علم الصواب (مترجم)

كَذٰلِكَ الْعَذَابُ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝ (القلم: ۱۷-۳۳)

قسمت ہی پھوٹ گئی۔ اب ان میں سے ایک شخص جس کی ذہنیت اچھی تھی آگے بڑھا اور بولا میں نے کہا تھا کہ (خراب ذہنیت کا انجام اچھا نہیں ہوتا) اب سے اللہ کے حضور (توبہ کرو اور) اس کی پاکی و بزرگی بیان کرو۔ " وہ بولے" خدایا! بس ایک تیری ہی ذات خطاؤں سے پاک اور بلند و برتر ہے، ہم تو اپنے اوپر سراسر ظلم ہی کرتے رہے۔" پھر وہ اس غلطی اور غلط طرز فکر کا ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھیرا کے ملامت کرنے لگے۔ بالآخر ان سب نے کہا کہ سبھی کا برا ہو کہ سب ہی حد سے بڑھ چلے تھے اب تو توبہ و استغفار ہی کی روش اختیار کرنی چاہیے شاید اس طرح اللہ ہمیں اس باغ کے بدلے اس سے اچھا باغ عطا فرمادے ہم سب اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں (جس طرح باغ والوں کے غلط طرز عمل کی پاداش میں ان پر آفت آئی اور ایسی اچانک آئی کہ ان کی ایک چال بھی نہ چلی اور بجز کفِ افسوس ملنے کے ان کے لیے اور کوئی چارہ کار نہ رہا) دنیا میں اللہ کا عذاب بھی اسی طرح آیا کرتا ہے اور آخرت کا عذاب تو اور زیادہ ہولناک ہوگا! کیا خوب ہوتا اگر ابھی سے اس بات کو سمجھ لیتے اور صحیح روش اختیار کر لیتے۔

اسی لیے قرآن لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وقت کے ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے انفاق کر لیں۔

قُلْ لِّعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خِلٰلٌ ۔ (ابراہیم: ۳۱)

اے نبیؐ! میرے جو بندے ایمان لائے ہیں ان سے کہہ دو کہ نماز قائم کریں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اسی میں سے کھلے اور چھپے راہ خیر میں خرچ کریں، قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہو گی نہ دوست نوازی ہو سکے گی۔

وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْ اِلٰى

جو کچھ ہم نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت اس کے سر پر آکھڑی ہو تو اس وقت وہ کف افسوس ملتا ہوا بولے" پروردگار! مجھے تھوڑی مدت کے لیے اور مہلت دی ہوتی

أَجَلٍ قَرِيبٍ، فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِّنَ الصَّالِحِينَ! وَلَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا۔

(المنافقون: ۱۰-۱۱)

کہیں کچھ صدقہ کرتا اور نیکوکار ہو جاتا۔ حالانکہ جب کسی کی مدت ختم ہونے کی گھڑی آجاتی ہے تو پھر اللہ ایک لمحہ کی مہلت بھی نہیں دیتا اور ہرگز نہیں دیتا۔ نیز انھیں آگاہ کرتا ہے کہ کنجوسی سے بچیں اور مال و اولاد کی حرص و محبت انھیں بخل میں مبتلا کر کے ہلاکت کے گھاٹ نہ اتار دے کیونکہ یہ چیزیں تو دراصل امتحان و آزمائش کا سامان ہیں اور بس!

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَاللَّهُ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ، فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ وَاسْمَعُوا وَأَطِيعُوا، وَأَنفِقُوا خَيْرًا لِّأَنفُسِكُمْ وَمَن يُوقَ شُحَّ نَفْسِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔ (التغابن ۱۵-۱۶)

تمہارا مال و دولت اور تمہاری اولاد درحقیقت سامان آزمائش ہے، اور (اگر اس فتنہ میں پھنس نہ جاؤ بلکہ صحیح روش پر قائم رہو تو تمہارے لیے) اللہ کے پاس اجر عظیم ہے۔ پس جہاں تک ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو اور بات سنو اور اطاعت کرو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو کہ اس میں تمہارا ہی بھلا ہے اور جو اپنے طبیعت کے حرص و بخل سے بچا رہا وہی حقیقی کامیابی کا منھ دیکھ سکے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر مسلمان کے لیے صدقہ کرنا ضروری قرار دیتے ہیں چاہے مفلس ہی کیوں نہ ہو۔ اس اجمال کی تفصیل آپ کا یہ فرمان ہے کہ "ہر مسلمان پر صدقہ کرنا لازمی ہے"، لوگوں نے کہا "اللہ کے نبیؐ! جسے کچھ میسّر ہی نہ ہو وہ کیا کرے"؟ آپ نے فرمایا، "اپنے ہاتھوں سے کام کرے اور پھر خود کو بھی فائدہ پہنچائے اور صدقہ بھی کرے"، لوگوں نے پھر کہا "اگر اس پر بھی اسے کچھ نہ ملے"! آپ نے جواب دیا "کسی مصیبت زدہ حاجت مند کی مدد کر دے"، لوگوں نے پوچھا "اگر اس سے یہ بھی نہ بن پڑے ......" آپ نے فرمایا کہ "ایسی شکل میں اسے چاہیے کہ خود اپنا طرز عمل ٹھیک رکھے اور برائی سے بچتا رہے کہ یہی اس کے حق میں صدقہ قرار پائے گا[۱]" اس طور پر انفاق کے معاملہ میں سب برابر قرار پاتے ہیں۔ جس کو جو کچھ بھی میسّر ہے اسی کے حساب سے اس پر ذمہ داری ہے اور جس سے جو کچھ ہو سکتا ہے اتنا ہی اسے کر کے دینا ہے۔

۱۔ بخاری و مسلم - یہ الفاظ بخاری کے ہیں۔

انفاق کی مدات کا تمام تر انحصار اس پر ہے کہ ضرورت کہاں ہے اور کتنی ہے۔ قریبی اعزہ حسن سلوک کے زیادہ مستحق ہیں لیکن دوسرے بھی اس معاملہ میں ان کے ساتھ ہی شمار کیے جاتے ہیں اور نیکی و احسان پر ابھارنے کے سلسلہ میں ان کا نام بھی اقربا، کے ساتھ ہی آتا ہے، کہ حسن سلوک اور نیکی پہلے ایک عام انسانی جذبہ ہے اور تب رشتہ داری کا تقاضا نیکی و احسان کا ذکر ایمان کے ساتھ اکثر آتا ہے کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں، یہ ایمان کی علامت ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى، وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا، الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ، وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا۔

(النساء: ۳۶-۳۷)

اور تم سب اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ، ماں باپ کے ساتھ نیک برتاؤ کرو، قرابت داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اور پڑوسی رشتہ داروں سے، اجنبی ہمسایہ سے، پہلو کے ساتھی اور مسافر سے اور ان لونڈی غلاموں سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں، احسان کا معاملہ رکھو، یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو محبوب نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے جو کنجوسی کرتے اور دوسروں کو بھی کنجوسی کی ہدایت کرتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اسے چھپاتے ہیں، ایسے کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ، قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ، وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (البقرہ: ۲۱۵)

لوگ پوچھتے ہیں: ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو، اپنے والدین پر، رشتے داروں پر، یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو۔ اور جو بھلائی بھی تم کرو گے، اللہ اس سے باخبر ہوگا۔

اس طرح اس معاملہ میں ساتھی اور پڑوسی، والدین اور اقربا کے ساتھ ہی شمار کیے جاتے ہیں اور پھر یتیم، مسکین اور

مسافر بھی انہی کے ساتھ آملتے ہیں۔ سب برابر ہیں یہاں تک کہ جن لوگوں سے کوئی تکلیف دہ حرکت صادر ہو جائے وہ بھی، جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کے عزیز مسطح سے ہو گیا تھا۔ مسطح نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں جھوٹی تہمت پھیلانے میں حصّہ لیا تھا۔ اسلام ایسے لوگوں سے درگذر کرنے کی تلقین کرتا ہے اور ان کو حسنِ سلوک سے محروم کرنے سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ جب اپنی عزّت و آبرو کو بالکل بر بنائے افترا و بہتان پامال ہوتے دیکھ کر حضرت ابو بکرؓ نے شدید غصّہ کے عالم میں قسم کھائی کہ مسطح کے ساتھ جو کچھ بھلائی بھی وہ کرتے رہے ہیں اُس سے اُن کو محروم کر دیں گے تو یہ آیت اُتری۔

وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُھٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَکُمْ ؕ (النور ۲۲)

تم میں جن لوگوں کو مال اور مالی فراخی نصیب ہے ان کے لیے مناسب نہیں کہ قرابت داروں، مسکینوں اور راہِ خدا میں ہجرت کرنے والوں کو اعانت نہ کرنے کی قسم کھا بیٹھیں، ان کو چاہیے کہ عفو و درگذر کی پالیسی اختیار کریں۔ کیا تم کو یہ نہیں پسند کہ اللہ تمہاری خطائیں بخش دے؟

اس طور پر اسلام انسانی شعور کو اس اعتبار سے ایک بلند سطح پر جا پہنچاتا ہے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے انسانیت کے عز و شرف کا باعث ہے۔ اور جس پر وہ ماضی، حال اور مستقبل میں فخر کرتی رہے گی —— جب تک اللہ کو منظور ہو۔ پھر وہ خود احسان کے تصوّر میں بھی بلندی پیدا کرتا ہے اور اسے خود اللہ کے ساتھ احسان قرار دیتا ہے، حالانکہ اس بزرگ و برتر کی ذات اس سے کہیں بلند ہے! نیکی کے اس تصوّر کی ایک اچھوتی تصویر کشی ایک حدیث قدسی میں یوں کی گئی ہے۔

انّ اللہ عزّ وجلّ یقول یوم القیامۃ یا ابن آدم مرضتُ فلم تعُدنی! فیقول ابن آدم: "یا ربّ کیف اعودک و انت ربّ العالمین؟" فیقول اللہ: اما علمت ان عبدی فلاناً مرض فلم تعدہ؟ اما انّک لو عدتہ لوجدتنی عندہ؟"

خداوند عزّ و جلّ قیامت کے دن فرمائے گا۔
"اے ابن آدم، میں بیمار پڑا تو تو میری عیادت کو نہ آیا!"
ابن آدم جواب دے گا: "پروردگار! میں تیری عیادت کیسے کرتا جب کہ تو سارے جہانوں کا آقا ہے۔؟"
اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار پڑا تو تو اس کی عیادت کو نہ گیا۔ اگر تو اس کی عیادت کو گیا ہوتا تو مجھے اس کے پاس پاتا؟"

"یا ابن آدم استطعمتک فلم تطعمنی! (اللہ تعالیٰ فرمائے گا) اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا کھلانے کو کہا تو تو نے مجھے کھانا بھی نہ کھلایا!"

فیقول: یا رب کیف اطعمک وانت رب العالمین؟ وہ کہے گا پروردگار! میں تجھے کھانا کیسے کھلاتا جب کہ تو خود ہی سارے جہانوں کا مالک ٹھہرا؟"

فیقول اللہ: اما علمت ان عبدی فلاناً استطعمک فلم تطعمہ؟ اما انک لو اطعمتہ لوجدت ذلک عندی" اللہ تعالیٰ فرمائے گا "کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کو مانگا تو تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا اگر تو نے اسے کھانا کھلا دیا ہوتا تو اس (کھانے) کو میرے پاس پا لیتا؟" (پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا) "اے ابن

"یا ابن آدم استسقیتک فلم تسقنی! آدم! میں نے تجھ سے پانی پلانے کو کہا تو تو نے مجھے پانی نہ پلایا!" وہ کہے گا

فیقول!" یا رب کیف اسقیک وانت رب العالمین؟" "پروردگا! میں تجھے کیسے پانی پلاتا جب کہ تو سارے جہانوں کا رب ہے؟"

فیقول: استسقاک عبدی فلان فلم تسقہ - اما انک لو سقیتہ لوجدت ذالک عندی (مسلم) (اس پر ارشاد ہوگا) "میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی پلانے کی درخواست کی تھی تو تو نے اسے پانی نہیں پلایا تھا، اگر تو نے اسے پلایا ہوتا تو اس (پانی) کو میرے پاس پا لیتا۔"

صدقہ کے لیے اس نے ایسے آداب مقرر کیے ہیں کہ وہ صاحبِ مال کی طرف سے غریب پر تفوّق و برتری کا اظہار نہیں بننے پاتا۔ پھر یہی آداب اُسے غیر پاکیزہ احساسات کے ساتھ کیے جانے والے ریاکارانہ صدقہ کی شکل اختیار کرنے سے بھی بچاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صدقہ کے محرکات پست اور ذلیل ہوں، اور جو صدقہ قبول کرے اس پر احسان جتلایا جائے، تو صدقہ دینا ایک نہایت ذلیل کام بن جاتا ہے خود اس فرد کی طبیعت اور اس کے اخلاق پر برے اثرات پڑتے ہیں اور اسی طرح سماج کے دوسرے افراد اور افراد کے باہمی تعلقات پر بھی اس طرح کے صدقہ سے بُرے اثرات پڑتے ہیں۔ انسانی طبیعت کے لیے احسان جتانے سے بڑھ کر گراں گذرنے والی، تلخ، رسوا کن اور قبول احسان سے روکنے والی دوسری کوئی چیز نہیں، اسی طرح اخلاقی اعتبار سے بھی ریاکارانہ صدقہ سے زیادہ گرا ہوا کوئی فعل نہیں، نہ ہی کوئی دوسری بات ضمیر کے لیے

اس سے زیادہ تباہ کن اور مضر ہے۔ اسلام دینے والوں اور لینے والوں دونوں کی طبیعت میں غلو پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی اسے بڑی فکر ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ، وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۤءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ، اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ، قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَاۤءَ النَّاسِ ، وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ ، فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ، لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاۤءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ

جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں صرف کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے، جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اُس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اسی طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے افزونی عطا فرماتا ہے وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔ جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتاتے، نہ دُکھ دیتے ہیں، ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔ ایک میٹھا بول اور کسی ناگوار بات پر ذرا سی چشم پوشی اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو۔ اللہ بے نیاز ہے اور بردباری اس کی صفت ہے، اے ایمان لانے والو! اپنے صدقات کو دکھ دے کر اور احسان جتا کر اس شخص کی طرح خاک میں نہ ملا دو، جو اپنا مال محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے نہ آخرت پر۔ اس کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چٹان تھی، جس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اس پر جب زور کا مینہ برسا تو ساری مٹی بہ گئی، اور صاف چٹان کی چٹان رہ گئی۔ ایسے لوگ اپنے نزدیک خیرات کر کے جو نیکی کماتے ہیں، اس سے کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں آتا اور کافروں کو سیدھی راہ دکھا دینا اللہ کا دستور نہیں ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات و قرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں، ان کے خرچ کی مثال

أُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ، فَإِن لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ، وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ. أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّن نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ، كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ.

(البقرہ : ۲۶۱-۲۶۶)

ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو، اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے، اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہو جائے۔ تم جو کچھ کرتے ہو سب اللہ کی نظر میں ہے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس ایک ہرا بھرا باغ ہو، نہروں سے سیراب، کھجوروں اور انگوروں اور ہر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا۔ اور وہ عین اس وقت ایک تیز گرم بگولے کی زد میں آکر جھلس جائے، جب کہ وہ خود بوڑھا ہو اور اس کے کم سن بچے ابھی کسی لائق نہ ہوں؟ اس طرح اللہ اپنی باتیں تمہارے سامنے بیان کرتا ہے شاید کہ تم غور و فکر کرو۔

اسی لیے صدقہ میں اخفاء سے کام لینا اور اسے پوشیدہ طور پر ناداروں تک پہنچا دینا زیادہ بہتر ہوتا ہے تاکہ ایک طرف ناتوان کی عزت آبرو سلامت رہے دوسری طرف یہ خود بے جا گھمنڈ اور فخر سے بچے رہیں۔

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (البقرہ : ۲۷۱)

اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے، لیکن اگر چھپا کر حاجتمندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

نبی کریمؐ نے اس شخص کا ذکر تعریف کے ساتھ کیا ہے جس نے "صدقہ دیا تو ایسا چھپا کر دیا کہ بائیں ہاتھ کو بھی نہ پتا چلا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا (تصدق بصدقۃ فاخفاها حتیٰ لا تعلم شماله ما تنفق یمینه)" نیکی کے معاملہ میں اخفاء سے کام لینے اور اسے نام و نمود اور فخر و غرور سے بچتے ہوئے خالصۃً للہ کرنے کی یہ کتنی حسین اور کامیاب تصویر ہے۔

اسلام حب ذات اور حب مال کی بنیادی خصلتوں کا ہمیشہ خیال رکھتا ہے، اس کا نظریہ یہ ہے کہ حرص و بخالت نفس انسانی میں بہرحال موجود رہنے والی چیزیں ہیں، ان سے مفر نہیں۔

وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ - (النساء : ۱۲۸)

نفس بخیل واقع ہوا ہے۔

چنانچہ وہ ترغیب دلا کر اور ابھار کر، خطرات سے خبردار کر کے اور ڈرا کے اور پھر اعلیٰ نمونوں اور بلند تصورات کی تصویریں سامنے لا کر، غرض ہر طرح سے کوشش کر کے ان چیزوں کا نفسیاتی طور پر علاج کرتا ہے اور بالآخر اپنا مطلب حاصل کر ہی لیتا ہے، چنانچہ وہ اسی کنجوس طبیعت سے یہ مطالبہ بھی کر دیتا ہے کہ وہ چیزیں راہِ خدا میں نکالے جو اس کو محبوب ہوں اور جن کی جدائی اس پر شاق ہو۔

لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون۔ — تم نیکی کا مقام ہرگز نہ پاؤ گے جب تک کہ اپنی محبوب چیزوں کا ایک حصہ خرچ نہ کر دو۔ (آل عمران: ۹۲)

چنانچہ نفس انسانی لبیک کہتا ہے اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر عمدہ مال خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔ اس طرح وہ فیاضی کے درجۂ کمال پر جا پہنچتا ہے اور گہرے شعور کے ساتھ کی جانے والی پاکیزہ داد و دہش میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے جتنا آگے بڑھنا عموماً بہت مشکل ہوتا ہے ...... یہاں پہنچ کر انسان اپنے نفس سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔ بلندی اور طلبِ علو کا جذبہ ضرورت کے احساس پر، اور ضمیر کے تقاضے طبیعت کے تقاضوں پر غالب آ جاتے ہیں یہ اپنی جگہ پر خود ایک بلند انسانی مقصد ہے جس کے لیے کوشش کی جانی چاہیے۔ یہ توازن پیدا کرنے، ناداری کا مقابلہ کرنے اور محروم و مستطیع کے درمیان تعاون اور کفالت باہمی کا اصول زیر عمل لانے کے لیے ہمارا اجتماعی ہدف ہے اور اسی طرح ایک صحت مند معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

یہ پالیسی جس کا ایک نمونہ ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ سامنے رکھا ہے، اسلام نے تمام معاملاتِ زندگی میں اختیار کی ہے۔ جس چیز کو قانوناً لازمی قرار دیتا ہے اس پر وجدان کو مطمئن کرنے کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ وہ قانونی طور پر اتنا ہی لازم کرتا ہے جتنا معاشرہ کی سلامتی کے لیے ناگزیر ہو اور لوگوں میں جو قوتِ تحمل عام طور پر پائی جاتی ہے وہ اس کا بار آسانی سے اٹھا سکے۔ پھر وہ وجدان کو مخاطب کرتا ہے تاکہ وہ اس قانونی حد پر مطمئن ہو جائے اور اس سے آگے جس قدر بھی جا سکے جانے کی کوشش کرے کیونکہ اس کا مقصد انسانی زندگی کو بلند سے بلند تر بنانا، اور مسلسل نئی بلندیوں کی طرف سرگرم سفر رکھنا ہے۔ اسلام کم سے کم پابندی کی لازمی حد اور بلند تر پسندیدہ حد کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑ دیتا ہے تاکہ اسی میں مختلف افراد اور مختلف نسلیں ہر زمانہ میں باہم مسابقت کرتی رہیں۔

اسلام نے اجتماعی عدل کے قیام میں یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ آئندہ دو ابواب میں ہم نے سیاسی پالیسی اور اقتصادی پالیسی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اس سے یہ بات سامنے آئے گی کہ اسلام ہمیشہ اپنے طریق کار کے انہی دو بنیادی اصولوں پر اعتماد کرتا ہے۔ قانون سازی، اور ترغیب و تلقین انہی دو طریقوں سے کام لے کر وہ زندگی کے ہر شعبہ میں اجتماعی عدل قائم کرتا ہے۔ اسلام کے اوّلین دور عروج میں اس طریقہ نے اپنا پورا پورا فائدہ پہنچایا اور گذشتہ چودہ صدیوں میں کتنے ہی ایسے ادوار گذرے ہیں جن میں اس نے اپنے برکات سے نوازا۔ اب بھی اس کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ حال و مستقبل میں پھر سے وہی فیض رسانی جاری کر دے، مگر یہ اُسی وقت ہو گا جب اسے ٹھیک ٹھیک سمجھا جائے، صحیح رُخ پر چلایا جائے، اور سب لوگ خود بھی اس کی سیدھی راہ پر چل پڑیں۔
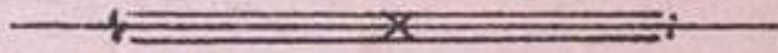
اسلام میں نظام حکومت

اسلام میں عدل اجتماعی پر گفتگو، طرزِ حکومت پر گفتگو کیے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ اس عدل کے مزاج کے بارے میں اوپر جو اصول بیان کیے گئے ہیں ان کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اسلام کا تعلق زندگی کے ہر پہلو اور ہر طرح کے اعمال سے ہے۔ یہ نظام روحانی اور مادّی دونوں طرح کی قدروں پر حاوی ہے، اور دونوں کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر کے نافذ کرتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر بھی یہ ضروری ہے کہ اسلامی سیاست کے مزاج پر روشنی ڈالی جائے، کیونکہ طرزِ حکومت ان اقدار سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ مزید برآں، قانون کو نافذ کرنے، معاشرہ کی مختلف پہلوؤں سے نگرانی کرنے، اس میں عدل و توازن برقرار رکھنے اور اسلامی اصولوں کے مطابق دولت کی تقسیم عمل میں لانے کا کام بھی بالآخر نظام حکومت ہی کے ذمہ کیا گیا ہے۔

اسلامی نظام حکومت پر کافی تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے، اور یہ کام علٰحدہ سے ہی کیا جا سکتا ہے[1]۔ اس کتاب میں اس موضوع سے صرف اسی حد تک تعرض کیا جائے گا جس حد تک کہ اجتماعی عدل کے سلسلہ میں ناگزیر ہے۔ حتی الامکان ہم بحث کو انہی امور تک محدود رکھیں گے جو اجتماعی عدل سے براہ راست متعلق ہیں۔ اسلام کے مطالعہ میں اکثر ایک دشواری کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے تمام پہلو ایک دوسرے سے مربوط اور بڑی حد تک ایک دوسرے پر منحصر نظر آتے ہیں۔ یہ مختلف پہلو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے، کیونکہ

---

[1] میں نے یہ سطور چند سال پہلے (۱۹۴۸ء) میں لکھی تھیں۔ اب یہ امر باعث مسرت ہے کہ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کا حق استاذ عبدالقادر عُودہ (مرحوم) نے اپنی تازہ کتاب "الاسلام واوضاعنا السیاسیۃ" میں ادا کر دیا ہے۔

یہ دین پورا کا پورا ایک اکائی ہے۔ عبادات و معاملات، حکومتی پالیسی اور مالی پالیسی، قوانین و ہدایات عقیدہ و عمل، دنیا و آخرت ..... سب کے سب ایک مکمل اور جامع نظام کے باہم مربوط و منظم اجزاء ہیں۔ ان میں سے کسی ایک جز، پر الگ سے گفتگو اس وقت تک بہت مشکل ہے جب تک کہ دوسرے اجزاء سے بھی تعرض نہ کیا جائے۔ بہر حال، ہم اپنی حد تک طرز حکومت پر گفتگو کی کوشش کرتے ہیں۔

اسلامی نظام پر لکھنے والے بعض مسلمان اہل قلم اسلام اور ان دوسرے مختلف النوع نظاموں کے درمیان کچھ مشابہت دکھلانے یا تعلق ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن سے انسانیت دور قدیم یا عہد جدید میں، اسلام سے قبل یا اس کے بعد، آشنا رہی ہے۔ ان میں سے بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور کسی دوسرے نئے یا پرانے نظام کے درمیان کوئی رشتہ ثابت کرکے وہ اسلام کے حق میں کوئی بڑی قوی سند فراہم کر دیتے ہیں۔

یہ کوشش در اصل داخل میں مغربی نظاموں کے سامنے احساسِ شکست کی غماز ہے۔ ان نظاموں سے مشابہت ثابت ہو جانے کی وجہ سے اسلام کی عزت میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ایسا نہ ہو سکنے کی شکل میں اسے کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ اسلام انسانیت کے لیے نظام کامل کا نمونہ پیش کرتا ہے، جس کی نظیر آپ کو کسی دوسرے نظام میں، جس سے یہ دنیا اسلام سے پہلے یا اس کے بعد متعارف ہوئی ہو، نہیں مل سکتی۔ اسلام نے کبھی بھی کسی دوسرے نظام کی تقلید کرنے یا اس سے اپنی مشابہت جتلانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اس نے ایک علحدہ اور اچھوتی راہ اختیار کی ہے۔ اور انسانیت کی تمام مشکلات کے حل کے لیے ایک مکمل علاج پیش کیا ہے۔

انسانی نظاموں کے ادل بدل میں یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے کہ کبھی وہ اسلام سے آملے اور کبھی جدا ہو گئے، لیکن خود اسلام اپنی جگہ پر ایک مکمل اور مستقل نظام ہے جسے ان دوسرے نظاموں سے کوئی واسطہ نہیں، نہ تو اس وقت جب کہ وہ اس کے ساتھ چلیں، اور نہ اس وقت جب وہ اس سے الگ راہ اختیار کرلیں۔ یہ ملنا یا جدا رہنا در اصل محض عارضی ہوتا ہے اور وہ بھی جزئی طور پر۔ ظاہر ہے کہ جزئیات اور عارضی امور میں اتفاق یا اختلاف کو کوئی خاص اہمیت نہیں حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اعتماد صرف بنیادی فکر اور مخصوص فلسفہ پر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اسلام اپنا مخصوص فلسفہ اور اپنا علحدہ فکر اساسی رکھتا ہے انہیں پر اس کی جزئیات متفرع ہوتی ہیں۔ بہر حال اختلاف ہو یا اتفاق اسلام اپنی مخصوص جداگانہ

راہ پر چلتا رہتا ہے۔

اسلامی محقق کا کام یہ نہیں کہ جب اسلام میں نظام حکومت پر گفتگو کرے تو کسی جدید یا قدیم نظام سے مماثلت یا اتفاق کے پہلو تلاش کرے۔ کیونکہ یہ موافقت اور مماثلت نہ صرف یہ کہ سطحی اور جزئی ہوتی ہے اور بنیادی فکر و فلسفہ میں نہیں بلکہ جزئیات میں اتفاقی توارد کا نتیجہ ہوتی ہے، بلکہ اسلام کی قوت میں بھی کوئی اضافہ نہیں کرتی، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔ ان کے لیے صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے دین کی بنیادوں کو پیش کریں اور اس بات پر پختہ یقین کے ساتھ پیش کریں کہ یہ بنیادیں اپنی جگہ پر خود ہی مکمل ہیں خواہ یہ دوسرے تمام نظاموں کے مخالف پڑیں یا موافق۔ رہا اسلامی نظام اور دوسرے نظاموں کے درمیان مشابہت اور موافقت کے نقطے تلاش کرکے اسلام کی تائید کرنے کی کوشش کرنا تو جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں، یہ احساس شکست ہے جس کو کوئی مسلمان محقق جو اس دین کو واقعی سمجھ چکا ہو، اور اس پر گفتگو کا پورا پورا حق ادا کرتے ہوئے اظہار خیال کرنا چاہتا ہو، اپنا شعار نہیں ٹھہرا سکتا۔

دنیا اپنے آغاز میں، اور بعد کے مختلف ادوار میں بہت سے نظاموں سے آشنا رہ چکی ہے۔ اسلامی نظام نہ تو ان میں کا ایک نظام ہے، نہ ان کا کوئی مرکب اور مخلوطہ ہے، اور نہ ہی ان سب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرتب کیا گیا ہے۔ وہ ایک مستقل بالذات نظام ہے جو اپنا الگ فکر اور اپنے علٰحدہ ذرائع و وسائل رکھتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اسے اس کی اپنی مستقل بالذات حیثیت میں پیش کریں کیونکہ اس نے دوسروں سے آزاد اور الگ رہ کر ہی نشو و نما پایا ہے اور اس نے اپنی راہ ہمیشہ دوسروں سے الگ ہی رکھی ہے۔

انہی وجوہ سے میں ڈاکٹر ہیکل[1] کے عالم اسلامی کو "اسلامی سامراج" سے تعبیر کرنے کو اور ان کے اس قول کو کہ "اسلام سامراجی ہے" درست نہیں سمجھتا اس لیے کہ اسلام کی حقیقی روح کے فہم سے اس سے زیادہ دور اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ اسے سامراجی قرار دیا جائے، چاہے ہم اسلامی سامراج اور 'سامراج' کے معروف مفہوم کے درمیان فرق واضح کرنے میں کتنا ہی زور کیوں نہ صرف کریں۔ اور اسی طرح دنیائے اسلام کے مختلف ممالک کے باہمی تعلقات کو "اسلامی سامراج" سے تعبیر کرنا ان تعلقات کے حقیقی فہم سے بہت دور ہے۔

اس سے زیادہ قابل تعجب بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ہیکل 'حیاتِ محمدؐ'، 'الصدیق ابوبکرؓ' اور 'الفاروق عمرؓ' میں اسلامی طرز حکومت پر گفتگو کرتے وقت اس حقیقی داخلی اختلاف اور تضاد کو تو محسوس کرتے ہیں جو اسلام اور ان دوسرے

---

[1] ڈاکٹر محمد حسین ہیکل، مصر کے ایک مشہور صاحب قلم اور سیاسی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ نبی کریمؐ اور خلفائے راشدین کی سیرت پر ان کی کتابیں علمی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ (مترجم)

نظاموں کے مزاج میں ہے جن سے دنیا کو سابقہ پڑتا رہا ہے، لیکن کچھ تو اِن غیر اسلامی مظاہر سے متاثر ہو کر جو آج اسلام سے وابستہ نظر آتے ہیں اور کچھ اسلام اور امپیریلزم میں بعض مظاہر کی حد تک مشابہت کی وجہ سے ان دونوں تعبیروں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں۔

شاید اس مشابہت کا سب سے نمایاں مظہر عالم اسلامی کا مختلف قوموں اور تمدنوں پر مشتمل ممالک سے مل کر بنا ہونا اور ان سب کے حکومتی نظم کا ایک ہی مرکز سے متعلق ہونا ہے۔ سامراج کی ظاہری شکل بھی یہی ہے! مگر یہ محض ظاہری شکل ہے، اس مسئلہ میں فیصلہ کن چیز یہ ہے کہ یہ مرکز ان مختلف ممالک کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ اور یہ کہ ان ممالک کے باہمی تعلق کی اصل نوعیت کیا ہے۔

اسلام کی روح اور حکومت کے باب میں اس کی پالیسی کی تحقیق کرنے والا ہر طالب علم قطعی طور پر یہی رائے قائم کرتا ہے کہ معروف سامراجی نظاموں سے یہ بہت دور، بہت دور واقع ہوا ہے۔ اسلام دنیا کے تمام حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کو برابر قرار دیتا ہے۔ وہ قومی اور وطنی عصبیتوں کو لغو بتاتا ہے بلکہ، جیسا کہ ہم اوپر دکھا چکے ہیں، بسا اوقات وہ دینی عصبیت کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتا اور اسے یکسر نظر انداز کر دیتا ہے۔ اسی اسپرٹ کے تحت وہ مختلف ممالک کو نہ تو مستعمرات (colonies) قرار دیتا ہے نہ انہیں استحصال بے جا کا ہدف بناتا ہے، وہ اُنھیں ان چشموں کی حیثیت نہیں دیتا جو بس ایک مرکز کے فائدے کی خاطر ہر چہار طرف سے سب کچھ لا کر اُسی میں اُنڈیل دیتے ہوں ہر ملک عالم اسلامی کے جسم کا ایک عضو ہے، اس کے بسنے والوں کو بھی وہ سارے حقوق حاصل ہیں جو مرکز میں بسنے والوں کو حاصل ہیں۔ اگر کسی ملک کا نظم مدینہ کے اسلامی مرکز کی طرف سے مقرر کردہ ایک والی کے ہاتھ میں تھا تو اُسے یہ عہدہ ایک ایسے صالح مسلمان کی حیثیت میں ملا تھا جو منصب ولایت کا اہل پایا گیا نہ کہ ایک امپیریلسٹ حاکم کی حیثیت سے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ان مفتوحہ ممالک میں سے اکثر کا نظم وہیں کے باشندوں میں سے کسی کے ہاتھ میں تھا اور یہ بھی اس فرد کے منصب حکمرانی کے لیے موزوں ہونے کی حیثیت سے تھا نہ کہ وہاں کا باشندہ ہونے کی وجہ سے ـــ ان ممالک سے جو محاصل جمع ہوتے تھے وہ پہلے وہیں کی ضروریات پر خرچ کیے جاتے تھے۔ اگر اس میں سے کچھ بچ رہتا تو وہ مرکزی بیت المال میں بھیج دیا جاتا تاکہ بوقت ضرورت تمام مسلمانوں پر خرچ کیا جا سکے، نہ اس لیے کہ اسے مرکزِ اسلامی کا خصوصی حصہ قرار دے دیا جائے، خواہ دوسرے ممالک اس کے بری طرح محتاج ہوں، جیسا کہ آج کی سامراجی سلطنتوں میں عملاً ہوتا ہے۔

یہ باتیں عالم اسلامی، یا زیادہ موزوں الفاظ میں، اُمت اسلامیہ اور امپیریلزم کے درمیان بہت بڑا بعد

پیدا کر دیتی ہیں۔ اور یہ بات کہ اسلام سامراجی (IMPEREALIST) ہے، اسلام کی روح اور اس کی تاریخ دونوں پر بڑی زیادتی ہے۔ یہ رائے ایک اجنبی اصطلاح کو زبردستی اسلام کے سر تھوپنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ اسلام اپنے علین مزاج کے اعتبار سے انسانی ہے کیوں کہ وحدت انسانیت کا نظریہ اپنی پوری قوت کے ساتھ اس کے یہاں موجود ہے اور اس اصول کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر وہ ساری انسانیت کو برابر برابر اور بھائی بھائی بنا کر اپنے پرچم تلے جمع کرنا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنی کتاب "الفتنۃ الکبریٰ — عثمانؓ" میں اسلامی نظام حکومت کا دوسرے نظام ہائے حکومت سے موازنہ کرتے وقت جو رائے ظاہر کی ہے وہ اس سے زیادہ دقتِ نظر پر مبنی ہے چنانچہ اُن کی رائے میں اسلام اپنے اصل مزاج کے اعتبار سے دوسرے تمام نظاموں سے مختلف ہے۔ درحقیقت نظامِ حکومت کے جزئیات اور خارجی مظاہر نہیں بلکہ اس کی روح اور اس کے مزاج کے گہرے مطالعہ سے جو حقیقت معلوم ہوتی ہے وہ یہی ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اسلام انسانیت کے مختلف مسائل کے ایسے حل پیش کرتا ہے جو اپنی جگہ مستقل اور اپنی شان میں منفرد ہیں۔ ان حلوں کو وہ اپنے بنیادی فکر، اپنی اصولی بنیادوں اور اپنے منفرد طریق کار سے اخذ کرتا ہے۔ ہمارا فرض یہ ہوتا ہے کہ جب ہم ان حلوں کی تحقیق کریں تو اُن کا رشتہ خواہ مخواہ دوسرے نظریات اور دوسری بنیادوں سے نہ جوڑ دیں کہ وہ ان کی تشریح یا ان پر حاشیہ آرائی کا کام کریں۔ یہ خود ایک مکمل فلسفہ اور ہم آہنگ اکائی ہے، کسی بھی خارجی اور اجنبی عنصر کو اس میں دخل دینے کا نتیجہ بجز فساد کسی اور شکل میں نہیں ظاہر ہوگا، جیسے ایک مکمل اور نازک میکانکی نظام ہو کہ اس میں جہاں کسی بیرونی پرزے کو فٹ کیا گیا پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا، اور وہ پرزہ بھی اُس میں ایک بھونڈے اور بے ضرورت پیوند کے سوا کچھ نہ معلوم ہوگا۔

یہ چند باتیں یہاں اس لیے قلم سے نکل گئیں کہ بہت سے لوگ جن کا طرز فکر اور طرز عمل اجنبی طور طریقوں سے بری طرح متاثر ہو چکا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام میں ان نظاموں کا جوڑ پیوند لگا کر اسلام کے لیے کچھ تازہ طاقت فراہم کر رہے ہیں۔ یہ خیال سراسر باطل اور اسلام کے حق میں انتہائی مفسدانہ خیال ہے۔ یہ اس کی روح کو ناکارہ بنا کر چھوڑے گا۔ ساتھ ہی یہ ایک طرح کے احساس ہزیمت کے ہم معنی بھی ہے چاہے صراحت کے ساتھ اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔

اسلامی نظام دو بنیادی افکار پر مبنی ہے جو خود اپنی جگہ پر حیات، کائنات اور انسان کے بنیادی

اور کلی فکر سے ماخوذ ہیں۔ پہلا نظریہ قومیت، مزاج اور نشو ونما کے اعتبار سے انسان کا ایک ہونا ہے اور دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اب رہتی دنیا تک کے لیے واحد عالم گیر اور دائمی نظام اسلام ہی ہے۔

اوپر "اسلام میں اجتماعی عدل کی بنیادیں" کے موضوع پر گفتگو کے ضمن میں ہم انسانیت کے قومیت، مزاج اور نشو ونما میں ایک ہونے کے نظریہ پر اظہار خیال کر چکے ہیں۔ ہم یہ حقیقت واضح کر چکے ہیں کہ اسلام جو حقوق ذمیوں اور معاہد مشرکین کو مسلمانوں کے مقابلہ میں عطا کرتا ہے، وہ خالص انسانی بنیادوں پر مبنی ہیں جو ان تمام معاملات میں جن کا انحصار عام انسانی امور پر ہو ایک دین اور دوسرے دین کے پیروؤں کے مابین کوئی فرق نہیں کرتیں۔

اگر اسلام مشرکین سے جنگ کا حکم دیتا ہے تو اس کا مقصد صرف ظلم و زیادتی سے دفاع اور فکر و عقیدہ اور اشاعت و دعوت کی آزادی کی بحالی ہے۔

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ۔

(الحج : ۳۹ - ۴۰)

جن لوگوں سے جنگ چھیڑی جا رہی ہے ان کو (بھی جنگی سرگرمیوں کی) اجازت دی جاتی ہے کیونکہ ان پر ظلم ڈھایا گیا ہے۔ اللہ ان کی مدد کرنے پر پوری طرح قادر ہے، وہ لوگ جن کو ناحق ان کے وطن سے نکال دیا گیا ہے (ان کا کوئی جرم نہ تھا) بجز اس کے کہ یہ کہتے تھے کہ: ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ دفع نہ کرتا رہتا تو صومعے۔ کلیسا اور دوسری عبادت گاہیں اور مساجد جن میں اللہ کا بکثرت ذکر کیا جاتا ہے ڈھا دیے جاتے۔ جو اللہ کی مدد کو اٹھے گا اللہ ضرور اس کی مدد کرے گا۔ بے شک اللہ قوت والا اور زبردست ہے۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ (البقرہ : ۱۹۰)

تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں، مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یہ مسلمانوں پر سے مادی دباؤ کو دفع کرنے کی خاطر لڑی جانے والی جنگ ہے، تاکہ ان کو تنگ

کر کے اور تاکہ دین سے نہ پھیر دیا جائے اور تاکہ دعوت کی راہ سے ہر طرح کی مادی رکاوٹیں ہٹ جائیں اور وہ تمام لوگوں تک بلا روک ٹوک پہنچ سکے۔

غیر مسلموں سے کیے گئے معاہدوں کے پاس و لحاظ میں اسلام اتنا آگے ہے کہ وہ معاہدین کے خلاف مسلمانوں کی مدد کرنے سے بھی روک دیتا ہے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ۔ (الانفال: ۷۲)

اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو یہ مدد تم پر فرض ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو۔

یہ ایفائے عہد کے باب میں ایک بلند اور مثالی ضابطہ ہے جو ایک وسیع اور عالم گیر فکر کا نتیجہ ہے۔ جو مقامی مصالح اور محدود اغراض و مفادات، یہاں تک کہ دینی علائق سے بھی بلند ہے۔

رہا اسلام کا یہ نظریہ کہ آئندہ رہتی دنیا تک واحد عالم گیر نظام زندگی اسلام ہی ہے تو اس کی بنیاد دراصل یہ ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں کی طرف مبعوث تھے، آپ آخری نبی تھے اور آپ کا لایا ہوا دین بہترین دین تھا۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ۔ (سبا: ۲۸)
ہم نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف مبعوث کیا ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ (انبیاء: ۱۰۷)
ہم نے آپ کو سارے جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

رَسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ (الاحزاب: ۴۰)
اللہ کے رسول اور انبیاء کے خاتم۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدہ: ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی ہے اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (الاسراء: ۹)
درحقیقت یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اسلام دوسروں کو اس کے اپنا لینے پر مجبور نہیں کرتا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ: ۲۵۶)

دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔

بلکہ ان کو اپنے شعائر دینی پر عمل کی پوری پوری آزادی دیتا ہے۔ اس آزادی کے پاس و لحاظ کی انتہا

یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر فرض کرتا ہے اور اس کے بالمقابل اہلِ ذمّہ سے جزیہ وصول کرتا ہے کیونکہ وہ بھی اسلامی حکومت کی حفاظت و سرپرستی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اس سلسلہ کے اخراجات کا بار بہر حال سب پر پڑنا چاہیے۔ البتہ وہ ان اخراجات کو اہلِ ذمّہ سے بطور زکوٰۃ نہیں وصول کرتا کیونکہ زکوٰۃ ایک اسلامی فریضہ، اور مسلمانوں کی ایک مخصوص عبادت ہے۔ اسلام نہیں چاہتا کہ اہلِ ذمّہ کو مسلمانوں کی کسی عبادت کے بجالانے پر مجبور کرے، چنانچہ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ ان لوگوں سے مال بطور مال ہی کے لیا جائے اور زکوٰۃ میں جو تعبّدی پہلو ملحوظ رکھا گیا تھا اس کو یہاں نہ آنے دیا جائے غیروں کے بارے میں حسِ عدل کی تیزی یہاں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہے!

غیروں کو ان حدود کے اندر آزادی بخشنا در اصل اسلام کے اپنی اسی اسپرٹ سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، ساتھ ہی اس کو اِس حقیقت پر بھی پورا پورا اعتماد ہے کہ جب بھی اِن لوگوں کو اس بات کا موقع ملے گا کہ غلط طرزِ فکر یا کسی مادّی طاقت کو درمیان میں لائے بغیر سنجیدگی سے اسلام کا مطالعہ کریں تو وہ اپنی فطرت کے عین تقاضے کے طور پر کشاں کشاں اسلام کی طرف کھنچ آئیں گے۔ اس اسلام کی طرف جس نے ان تمام مقاصد کو کمال توازن کے ساتھ جمع کر رکھا ہے جن کی خاطر پچھلے مذاہب کوشاں رہے ہیں، جس نے انسانی فطرت میں ودیعت کردہ تمام رجحانات و میلانات کی یکساں رعایت ملحوظ رکھی ہے، جو مطلق مساوات اور مکمل تعاون و تکافل کی ضمانت دیتا ہے اور جو وحدتِ انسانی کے اصول کو تمدّنی زندگی اور شعور و احساس کی داخلی دنیا دونوں میں نافذ دیکھنا چاہتا ہے۔

اسلامی نظام کے ان دو بنیادی افکار پر مبنی ہونے کا اثر اس کی ساخت اور سمتِ سفر دونوں پر پڑا ہے۔ وہ قانون سازی اور ہدایت و تلقین، طرزِ حکومت اور نظامِ مالی اور دوسرے تمام متعلّق نظاموں میں اس بات کا لحاظ رکھتا ہے کہ وہ کسی مخصوص قوم یا نسل کے لیے نہیں بلکہ ساری اقوام اور تمام نسلوں کے لیے قانون بنا رہا ہے چنانچہ اس نے اپنی تمام ضابطہ بندیوں میں ہمہ گیر اور وسیع انسانی بنیادوں کو سامنے رکھا ہے، اس نے عمومی قواعد اور وسیع المعنی مبادی ترتیب دے دیئے ہیں اور ان کی عملی تطبیق کا کام زمانہ کی تبدیلیوں اور نو بہ نو ضروریات کے نمودار ہونے پر چھوڑ دیا ہے۔

طرزِ حکومت میں بھی، جس کی ایک خاص انداز سے وضاحت ہمارے اس باب کا اصل موضوع ہے، کلّی قواعد کی طرف توجہ اور جزئیات سے بے اعتنائی کی یہ صفت پوری طرح موجود ہے۔

اسلام میں نظام حکومت حکّام کی جانب سے عدل، محکومین کی جانب سے اطاعت اور حاکم و محکوم کے مابین "شوریٰ" پر مبنی ہے۔ یہی وہ موٹے موٹے بنیادی اصول ہیں جن پر بقیہ سارے اصول و ضوابط متفرع ہوتے ہیں۔

(۱) حکّام کی جانب سے عدل:-

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (النحل: ۹۰)
اللہ تم کو عدل کا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔

وَاِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ۔ (النساء: ۵۸)
جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی (الانعام: ۱۵۲)
جب بات کہو انصاف ہی کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو۔

وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا، اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ (المائدہ: ۸)
کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔ عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ واقربھم مجلساً إمام عادل وانّ ابغض الناس الی اللہ یوم القیامۃ واشدھم عذاباً امام جائر۔ (الشیخان والترمذی)
قیامت کے دن اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب اور سب سے زیادہ قریب مقام پانے والا شخص امام عادل ہوگا، اور سب سے زیادہ مبغوض اور شدید ترین عذاب کا مستحق شخص امام جائر ہوگا۔

یہ عدل مطلق کی سچی ترازو ہے کہ بغض و محبت اس کی ڈنڈی ٹیڑھی نہیں کر سکتے اور نہ دوستی و دشمنی اِس کے قواعد و ضوابط کو بدل سکتے ہیں۔ یہ وہ عدل ہے جو افراد کی باہمی قرابت یا قوموں کے باہمی بغض و عناد، کسی سے بھی متاثر نہیں ہوتا۔ اس سے امّت اسلامیہ کے سارے ہی افراد یکساں مستفید ہوتے ہیں، نہ تو حسب و نسب کا فرق ان میں تفریق و امتیاز کا باعث بنتا ہے نہ مال و جاہ کا، اسی طرح دوسری قومیں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں چاہے اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان عداوت و دشمنی ہی کیوں نہ ہو۔

یہ عدل کے باب میں وہ بلند چوٹی ہے کہ آج تک نہ کوئی بین الاقوامی قانون اسے چھو سکا نہ ملکی قانون اسے پا سکا۔ جن لوگوں کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں تامّل ہو انھیں چاہیے کہ آج قوموں میں طاقت در اور کمزور گروہوں کے درمیان جو سیاست چلتی ہے اس کا مطالعہ کریں اور اسی طرح باہم جنگ و پیکار میں مصروف اقوام کے باہمی تعلقات

کا جائزہ لیں یہی نہیں بلکہ ان کو اس "عدل" کا بھی مطالعہ کرنا چاہیے جو امریکہ میں سفید اقوام، سرخ اور سیاہ قوموں کے ساتھ برتتی ہیں اور جسے جنوبی افریقہ میں سفید نسل کے لوگ رنگین نسلوں کے ساتھ اختیار کرتے ہیں، یہ سب اسی دور کے حالات ہیں جن کو بچہ بچہ جانتا ہے۔

اسلامی عدل کے سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ یہ مجرّد نظریات تک محدود نہ رہا بلکہ عملی زندگی میں بھی اس نے نفوذ کیا اور دفترِ تاریخ اس کی پے درپے مثالوں اور نمونوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس سلسلہ میں تفصیلات آگے مناسب موقع پر آئیں گی۔ یہاں ہماری کوشش یہ ہے کہ اسلامی نظریات کو نصوص کی روشنی میں واضح کردیں۔

(۲) محکومین کی طرف سے اطاعت:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ۔ (النساء: ۵۹)

اے ایمان لانے والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اُن لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔

آیت میں اللہ، رسول اور اولی الامر کو ایک ساتھ جمع کرنا اس اطاعت کی حدود اور اس کے مزاج کی تشریح و توضیح کا کام کرتا ہے، معلوم ہوا کہ صاحب امر کی اطاعت اس کی ذات کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ اس کے اللہ اور اس کے رسول کی دی ہوئی شریعت پر قائم رہنے کی بنا پر ہوتی ہے۔ یہ حق کہ اس کی اطاعت کی جائے اُسے اس بنا پر ملتا ہے کہ دوسروں کے بالمقابل وہ اس شریعت کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے، اب اگر وہ اس سے انحراف کرے تو اس کی اطاعت کا حق ساقط ہو جاتا ہے اور اس کے احکام کا نفاذ واجب نہیں رہ جاتا صاحبِ شریعت فرماتے ہیں۔

على المرء المسلم السمع والطاعة فيما احبّ وكره، الّا ان يؤمر بمعصية، فاذا أمر بمعصية، فلا سمع ولا طاعة (بخاری۔ مسلم)

ہر مسلمان پر لازم ہے کہ صاحب امر کا حکم مانے اور اسے بجالائے خواہ اسے یہ حکم پسند ہو یا نہ پسند ہو اِلّا یہ کہ اسے معصیت کا حکم دیا جائے۔ جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو اس پر نہ سننا فرض ہے نہ حکم بجالانا۔

اسمعوا واطيعوا۔ وإن استعمل عليكم عبد حبشي كان راسه زبيبة، ما اقام فيكم كتاب الله تعالى۔ (بخاری)

حکم سنو اور اس کی تعمیل کرو ــــ خواہ تم پر ایک حبشی غلام کو حکم بنا دیا جائے جس کا سر کشمش کے دانہ کے مانند (چھوٹا اور سیاہ) ہو جب تک کہ وہ تمہارے درمیان کتاب اللہ کے احکام نافذ کرتا ہے۔

اس حدیث میں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ سمع و طاعت اس وقت تک ہونی چاہیے جب تک کہ کتاب اللہ کو قائم کیا جائے۔ یہاں حکمراں کے ارادہ کی مطلق اور غیر مشروط اطاعت نہیں، اور نہ ہی ایسا ہے کہ چاہے حکمراں اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کو پسِ پشت ڈال دے لیکن اطاعت جاری رہے۔

یہاں دو چیزوں میں فرق کرنا ضروری ہے۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ حاکم شریعت دینیہ کی تنفیذ کا کام اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اس کا ذمہ دار ہوتا ہے اور یہ ایک بالکل دوسری چیز ہے کہ اسے اپنا اقتدار اور اپنی حاکمیت بھی براہِ راست دین ہی سے مل رہی ہو۔ اسلام میں حاکم کو کوئی ایسا اقتدار نہیں حاصل جسے وہ براہِ راست آسمان سے حاصل کرتا ہو جیسا کہ ماضی میں بعض حکمرانوں کا دعویٰ تھا۔ یہاں حاکم مسلمانوں کی مطلق آزادی اور کامل اختیار کے نتیجہ میں حاکم بنتا ہے اس سلسلہ میں نہ تو سابق حکمراں کا کیا ہوا یا کرایا ہوا کوئی عہد و پیمان مسلمانوں کو کسی خاص فیصلہ پر مجبور کرتا ہے نہ وہ اس منصب کو وراثت کے طور پر کسی خاندان کے لیے مخصوص رکھنے کے پابند ہیں۔ اُسے اگر یہ منصب ملتا ہے تو دراصل اس کے اقتدار کا منبع شریعت الٰہی کی تنفیذ کی ذمہ داری ہے۔ پھر اگر مسلمان اُس سے راضی نہ ہوں اور اُسے پسند نہ کریں تو وہ کسی طرح بھی یہ منصب نہیں پا سکتا۔ ان کی رضامندی کے بعد بھی اگر آگے چل کر امام اللہ کی شریعت کو چھوڑ دے تو پھر وہیں سے اس کی اطاعت بھی موقوف ہو جاتی ہے۔

یہیں سے ہم کو اس بات کا بھی پتہ مل جاتا ہے کہ اپنے بعد کے لیے اپنا خلیفہ نہ مقرر کرنے میں نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا حکمت تھی آپ کا ایسا کرنا یہ شبہ پیدا کر سکتا تھا کہ رسول اللہ کی طرف سے مقرر کیے جانے کی وجہ سے اسلام میں خلیفہ ایک طرح کی مذہبی ریاست کا حامل ہے۔

اسلام مسیحی کلیسا کے (Ecclesiastic) طبقہ کی طرح کی کسی دینی ہیئت کا قائل نہیں۔ اور نہ اسلامی حکومت کسی مخصوص ادارہ یا مجلس کے ہاتھوں چلائی جانے والی حکومت کا نام ہے۔ ہر وہ نظام حکومت جس میں اسلامی شریعت کو نافذ کیا جائے، اسلامی حکومت قرار پائے گا۔ اگر کسی مذہب کے نزدیک "مذہبی حکومت" سے وہ حکومت مراد ہوتی ہو جس کی باگ ڈور ایک متعیّن گروہ کے ہاتھوں میں ہو تو اسلام کے اندر یہ معنی کسی درجہ میں بھی متحقق نہیں ہوتے۔ اسی طرح یہ رائے بھی صحیح نہیں قرار دی جا سکتی کہ اسلامی قانون کے نفاذ کے ماسوا "اسلامی حکومت" کسی اور شرط کی تکمیل پر بھی منحصر ہے۔ درحقیقت ہر وہ حکومت جس میں اسلامی شریعت نافذ کی جاتی ہو اسلامی حکومت ہے چاہے حکومت کا نام یا اس کا ڈھانچہ جو بھی ہو۔

اسی طرح جس حکومت کے ہاتھوں یہ شریعت نہ نافذ کی جارہی ہو اسے اسلام اپنی طرف منسوب کرنے کو تیار نہیں خواہ اس کی نگرانی کسی دینی ہیئت کے سپرد ہو یا اسے کسی اسلامی نام سے موسوم کر دیا گیا ہو۔

محکومین کی طرف سے اطاعت اسلامی شریعت کی تنفیذ ہی پر منحصر ہے اور اسی دم تک ہے جب تک یہ صفت برقرار ہے۔ یہ بات حکمرانی میں عدل اور اللہ کی اطاعت کے سوا کسی دوسری شرط سے مشروط نہیں۔

(۳) حکام اور محکومین کے مابین مشاورت:

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ (آل عمران: ۱۵۹) معاملات میں ان سے مشورہ کر لیا کیجیے۔

أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (الشوریٰ: ۳۸) ان کے معاملات آپس کے مشوروں سے طے ہوتے ہیں۔

اس طور پر شوریٰ اسلام میں طرز حکومت کا ایک بنیادی اصول قرار پاتی ہے۔ رہا شوریٰ کا طریقہ تو اسلام نے اس کے لیے کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں مقرر کیا ہے اس نے اس اصول کی تطبیق کو احوال وظروف اور ضروریات پر چھوڑ رکھا ہے۔ چنانچہ جن امور میں وحی کے ذریعہ رہنمائی نہ کر دی جاتی ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے مشورہ کرتے تھے اور اُن کے دنیوی معاملات میں جن سے وہ بخوبی واقف ہوتے تھے، ان ہی کی رائے پر عمل کرتے تھے، مثلاً میدان جنگ اور متعلق امور۔ چنانچہ آپ نے غزوۂ بدر میں ان کی رائے مانی اور چشمۂ بدر پر آکر ڈیرے ڈالے حالانکہ اس سے قبل آپ اُس سے کچھ دور پہلے ہی پڑاؤ کر چکے تھے۔ اسی طرح آپ نے خندق کھودنے کے معاملہ میں مسلمانوں کی رائے مانی اور بدر کے قیدیوں کے معاملہ میں حضرت عمر کی رائے کے مقابلے میں اُن کی رائے پر عمل کیا تا آنکہ حضرت عمر کی رائے کی تائید میں وحی نازل ہوئی ......

البتہ جن معاملات میں وحی آکر کوئی راہ متعین کر دیتی تھی تو ظاہر ہے کہ اُن میں مشورہ کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ وہ فیصلہ فرائض دینیہ میں سے ایک فریضہ ہو جاتا تھا جیسا کہ نفس معاملہ سے ظاہر ہے، یہ بات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لیے خاص تھی۔

خلفاء راشدین بھی مسلمانوں سے مشورہ کی یہی پالیسی اختیار کیے رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے سلسلہ میں مشورہ کیا اور اُن سے جنگ کرنے کے معاملہ میں اپنی رائے پر عمل کیا۔ پہلے تو حضرت عمر آپ سے بحث کرتے رہے لیکن بعد میں جب آپ نے یہ دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنی رائے پر اصرار ہے نیز اللہ تعالےٰ نے اس کے حق میں خود آپ کو بھی شرح صدر بخشا تو آپ راضی ہو گئے اور ان ہی کی رائے کی تائید کرنے لگے۔ اسی طرح آپ نے باوجود حضرت عمر کے اختلاف کے اہلِ مکّہ سے شام والوں کے خلاف جنگ کرنے کی بابتہ رائے لی۔ خود

حضرت عمرؓ نے وبا زدہ علاقہ میں جانے کی بابت مشورہ طلبی کی اور ایک رائے قائم بھی کرلی، پھر جب آپ کو اس رائے کی تائید میں سنت نبوی سے ایک نص بھی مل گئی تو آپ نے اس کو بالکل حتمی طور پر اپنا لیا .... اس دور میں شوریٰ کا یہی حال رہا کہ اس کا کوئی لگا بندھا ضابطہ نہ تھا، کیونکہ اس دور کے احوال و ظروف اس کے علاوہ کسی اور طرز کی شوریٰ کے متقاضی ہی نہ تھے۔ البتہ معاملہ کی عمومی نوعیت کے پیش نظر اس بات کی پوری گنجائش ہے کہ شوریٰ کے سلسلہ میں مختلف نظام اختیار کیے جاسکیں کیونکہ اسلام نے بس عمومی اصول بیان کرنے پر اکتفاء کیا ہے اس کے طریقوں اور اس کی ہیئت کے سلسلہ میں کوئی تحدید نہیں کی ہے۔

اسلام میں حاکم کے لیے اس کے احکام کی اطاعت، اس کی خیر خواہی اور وفاداری اور شریعت کے قائم کرنے میں اس سے تعاون کے سوا کوئی ایسے حقوق نہیں ہیں جو عام مسلمانوں کو نہ میسر ہوں۔

واضح رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نرے حاکم ہی نہ تھے بلکہ آپ ہی قانون دینے والے بھی تھے، چنانچہ اسلام کے عطا کردہ حقوق کے دائرہ میں حاکم کو جن حدود کی پابندی کرنی ہے اُن کی آپ نے عملی طور پر نشاندھی کردی ہے۔ پھر آپ ہی کے اُسوہ پر خلفاء راشدین بھی چلتے رہے، جیساکہ آئندہ تاریخی مثالوں کے باب میں آرہا ہے۔ آپ کا حال یہ تھا کہ خود اپنی ذات سے بھی قصاص لیتے تھے الاّ آنکہ جس کا حق ہو خود وہی معاف کردے۔ ایک بار ایک قرض خواہ آیا اور آپ سے کچھ سختی کے ساتھ پیش آیا، اس پر کچھ مسلمان اس کی طرف لپکے، آپ نے انھیں اشارہ کیا کہ اُسے چھوڑ دیں کیونکہ حق دار کو کہنے سننے کا پورا پورا حق ہوتا ہے اسی طرح آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

لا یحل لی من غنائمکم الا ھذا الخمس، والخمس مردود علیکم۔

(ابوداؤد - نسائی)

تمہارے غنائم میں سے بجز اس پانچویں حصے کے میرے لیے اور کچھ حلال نہیں۔ اور یہ پانچواں حصہ بھی تمہارے ہی اوپر خرچ کیا جائے گا۔

آپ نے اپنے اہل خاندان اور قریبی رشتہ داروں کو مخاطب کرکے فرمایا:-

یا معشر قریش اشتروا لا نفسکم لا أغنی عنکم من اللہ شیئاً - یا بنی عبد مناف لا أغنی عنکم من اللہ شیئاً - یا عباس بن عبد المطلب لا أغنی عنک من اللہ شیئاً

اے اہل قریش اپنے لیے سامان کردیں اللہ کے حضور تمہارے کچھ بھی نہ کام آسکوں گا۔ اے نبی عبد مناف میں اللہ کے حضور تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اے عباس ابن عبد المطلب میں

ویا صفیۃ عمۃ رسول اللہ لا أغنی عنکِ من اللہ شیئًا۔ ویا فاطمۃ بنت محمد سلینی ما شئت من مالی، لا أغنی عنک من اللہ شیئًا۔ (متفق علیہ)

اللہ کے حضور تمہارے ذرّہ برابر بھی نہ کام آسکوں گا۔ اے رسول اللہ کی پھوپی صفیہ میں اللہ کے حضور تیرے کچھ بھی نہ کام آسکوں گا۔ اے فاطمہ بنتِ محمد میرے مال میں سے جو چاہے مانگ لے مگر اللہ کے حضور میں تیرے کچھ بھی نہ کام آسکوں گا۔

علی و فاطمہ سے جو ان کو سب سے زیادہ محبوب تھے، فرماتے ہیں:

لَا أُعْطِیْکُمْ وَاَدَعُ اَھْلَ الصُّفَّۃ تلوّی بطونہم من الجوع۔

یہ نہ ہو گا کہ میں تم کو کچھ دوں اور اہل صفہ کو اس حال میں چھوڑ دوں کہ بھوک کے مارے ان کے پیٹ پلٹے جا رہے ہوں۔

(حدیث ۵۹۶ مسند امام احمد۔ مرتبہ و نشر کردہ استاذ احمد محمد شاکر)

ایک دوسرے موقع پر انہی سے فرمایا کہ:

لا اخدمکما وادع اھل صفّۃ تطوی۔ (ایضاً)

یہ نہ ہو گا کہ تمہاری خدمت کروں اور اہل صفہ کو فاقہ کشی کرنے کے لیے چھوڑ دوں۔

آپ ہی کا ارشاد ہے کہ:

إن بنی اسرائیل کان اذا سرق فیہم الشریف ترکوہ، واذا سرق فیہم الضعیف قطعوہ، لو کانت فاطمۃ لقطعت یدھا۔ (رواہ الجماعۃ)

بنی اسرائیل کا حال یہ تھا کہ جب ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور اور معمولی آدمی چوری کر بیٹھتا تو اس کا ہاتھ کاٹتے۔ میں تو اگر فاطمہ بھی (اس جرم کی مرتکب) ہوتی تو اس کے ہاتھ کاٹ دیتا۔

پس حاکم کے لیے حدود شرعی یا اموال ریاست میں کوئی خصوصی حقوق نہیں اور اُس کے گھر والوں کو بھی اِن اموال میں اُن حقوق سے زائد کوئی حق نہیں حاصل جو عام مسلمانوں میں سے کسی شخص کو حاصل ہوتے ہیں۔ حاکم کو عام لوگوں کی روح، ان کے جسم، ان کی عزّت و آبرو اور ناموس، اور ان کے مال و دولت پر کسی طرح کی زیادتی کا حق نہیں حاصل ہے۔ جب وہ حدود شرعی قائم کر چکا اور فرائض کو نافذ کر چکا تو بس یہاں آ کر اس کے اختیارات ختم ہو گئے اور اس سے آگے اسے لوگوں پر کوئی اقتدار نہیں حاصل رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس دائرہ سے آگے اُن کو اس کے اقتدار کی دسترس سے باہر اور محفوظ رکھا ہے ——— روح و جسم و ناموس و مال ہر اعتبار سے۔

اسلام نے اتنے واضح اور مطلق احکام کے ذریعہ روح وجسم اور مال وناموس کے تحفظ کی ضمانت دی ہے کہ ان کے بعد اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اسلام امن وآشتی اور سب کے لیے باعزت زندگی کے مواقع فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰى اَهْلِهَا (النور : ۲۸)
اے اہل ایمان اپنے گھروں کے علاوہ دوسرے کسی گھر میں بغیر اجازت حاصل کیے اور گھر والوں کو سلام کیے نہ داخل ہوا کرو۔

لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا (البقرہ : ۱۸۹)
نیکی اس کا نام نہیں کہ گھروں میں عقب سے آؤ۔

وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۔ (البقرہ: ۱۸۹)
گھروں کے اندران کے دروازوں کی راہ سے آؤ۔

وَلَا تَجَسَّسُوْا (الحجرات : ۱۲)
دوسروں کے عیب نہ ڈھونڈھتے پھرو۔

حدیث ہے کہ:

كل المسلم على المسلم حرام دمه وعرضه وماله ۔ (مسلم وبخاری)
مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے حرام ہے۔ اس کا خون اس کی عزت وآبرو اور اس کا مال۔

اور ساتھ ہی اسلام میں جان کے بدلے جان، اور زخموں میں برابر کے بدلہ کا اصول رکھا گیا ہے۔

جہاں اسلام اپنی ذات سے متعلق امور میں حاکم کے حدودِ اختیار کو بہت محدود کردیتا ہے وہیں وہ جماعت کے مصالح مرسلہ کے سلسلہ میں اس کو انتہائی حد وتک وسعت دیتا ہے۔ یہ وہ مصالح ہیں جن کے باب میں کوئی نص نہ آئی ہو حالات کی تبدیلی اور زمانہ کے تغیرات کے ساتھ یہ نو بہ نو شکلیں اختیار کرتے رہتے ہیں۔ اس بارے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ سلطان کو یہ حق حاصل ہے کہ فرمانِ الٰہی:

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ (الحج: ۷۸)
اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی ہے۔

کے بموجب، اور اصلاح فرد وجماعت اور ساری انسانیت کی درستی احوال کی خاطر دین اپنے سامنے جو مقاصد رکھتا ہے ان کے حصول کے لیے پیش آمدہ مشکلات کی قدر و وسعت کے مطابق نئے فیصلے کرے اور نئی صورتیں نکالے۔ البتہ یہ سب کچھ اسے اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ یہ حق اسے ملتا ہی اس شرط پر ہے کہ امام کے اندر عدل وانصاف کی جو اسپرٹ ہونی چاہیے وہ اس میں پوری طرح موجود ہو۔

چنانچہ سلطان کا فرض ہے کہ ہر اس خرابی کا ازالہ کرے جو اُمّت کے حق میں کسی طرح کی مضرّت کی حامل ہو، اور ہر اُس کام کا اہتمام کرے جو کسی حیثیت سے بھی اُمّت کے لیے نفع بخش ہو ——— البتہ شرط یہ ہے کہ ایسا کرنے میں وہ شریعت کی نصوص میں سے کسی نص کی خلاف ورزی نہ کرے۔

یہ بڑے ہی وسیع اختیارات ہیں جو زندگی کے تمام ہی پہلوؤں پر حاوی ہیں۔ انہی اختیارات کے اندر اجتماعی عدل کے اپنی تمام شکلوں سمیت متحقق ہونے کی ضمانت بھی مضمر ہے۔ مثال کے طور پر، مالی شعبہ میں اسے یہ حق حاصل ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس بھی عائد کرے تاکہ (مختلف طبقات کے درمیان) توازن پیدا ہو اور مساوات رونما ہو سکے نیز محروم طبقات کے دلوں میں پرورش پانے والے حسد اور کینہ کے جذبات زائل ہوں۔ اُمّت سے وہ تمام بُرے اثرات دور رہیں جو عیش پرستانہ ٹھاٹ باٹ، یا حد سے زائد تنگی و افلاس، یا فراوانیٔ دولت کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی مصنوعی گرانی کے نتیجہ میں اس پر مترتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے دوسرے وجوہ بھی ہو سکتے ہیں جو حکومتی مداخلت کی وجہ جواز بن سکیں۔ امام ان کے تقاضے پورے کرنے کے لیے مناسب تصرّفات کرنے کا مجاز ہے۔

اُمّت اسلامیہ کی تاریخ اپنے اندر مصالح مرسلہ کے اعتبار و لحاظ کی متعدد مثالیں رکھتی ہے۔ اور اُن میں ایسی شکلیں بھی موجود ہیں جن کو ہر زمانہ کے حالات سے تطبیق دی جا سکتی ہے۔ ان کی تفصیل آگے مناسب موقع پر آئے گی۔ یہاں ہم صرف یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلام ایک جامد نظام نہیں ہے۔ اور اس کی عملی تطبیقات کی راہ میں نہ تو زمانہ آڑے آتا ہے نہ بدلے ہوئے احوال و ظروف مانع ہوتے ہیں۔

واضح رہے کہ یہ تصریحات اسلام کی حکومتی پالیسی کے صرف "رسمی" (یعنی قانونی اور ضابطہ کے تحت آنے والے) پہلو سے متعلق تھیں۔ اس کی پشت پر تطوّع (یعنی افراد کے اختیار و پسند پہ چھوڑی ہوئی ذمہ داریوں) کا پہلو بھی مستقل طور پر موجود ہے، جسے تلقین و ترغیب کی قوت قانونی طور پر عائد کی جانے والی ذمہ داریوں سے بہت آگے لے جاتی ہے۔ اسلام کا طریق کار اپنے سارے فرائض اور تمام نظاموں کے سلسلہ میں یہی ہے کہ وہ کم سے کم حد کو قانون کے حوالہ کرتا ہے اور اعلیٰ اور بلند حدود کو ترغیب و تلقین کے سپرد کرتا ہے ——— اس طرح وہ انسان کے لیے ان دونوں کے درمیان ایک وسیع فضا فراہم کر دیتا ہے جس میں ہر فرد بقدر ہمّت بلندی کی طرف جا سکتا ہے۔

پس اسلام میں نظامِ حکومت قانونی بنیاد کے ساتھ ہی ضمیر کی بنیاد پر بھی قائم ہے۔ اس بنیاد پر

کہ اللہ تعالیٰ ہر لمحہ حاکم و محکوم دونوں کے قریب ہے اور دونوں کو اچھی طرح دیکھ رہا ہے!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

ما من عبدٍ یسترعیہ اللہ رعیۃً فلم یحطھا بنصیحۃ الا لم یجد رائحۃ الجنۃ۔ (بخاری و مسلم)

جس بندے کو بھی اللہ کچھ لوگوں کا نگراں و سرپرست بنائے اور وہ انھیں اپنی خیر خواہیوں سے ڈھانپ نہ لے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ آشنا ہو سکے گا۔

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَآ إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (البقرہ: ۱۸۸)

ایک دوسرے کا مال غلط طریقہ پر نہ ہڑپ کر لیا کرو، نہ ہی ایسا کرنے کے لیے چھوٹے مقدمے لے کر حکام تک پہنچا کرو، تاکہ جانتے بوجھتے لوگوں کا مال ظلماً حاصل کر سکو۔

یہاں راعی اور رعایا دونوں سے ہمہ دم "اللہ" کو حاضر و ناظر جان کر اس کا پاس و لحاظ رکھنے کا مطالبہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ عدل کے قیام کی آخری ضمانت صرف اللہ کی خشیت ہے۔ ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ اسلام انسانی ضمیر کی تطہیر و تزکیہ کے بعد تعزیرات اور مالیات سے متعلق بڑے بڑے امور کی کل ذمہ داریاں اس کے سپرد کر دیتا ہے اب اگر خود اس ضمیر ہی میں خوف خدا نہ موجود ہو تو پھر (عدل اجتماعی کی) ضمانت دینے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ قانون کی زد سے بچنے اور عوام، حکام اور ججوں کو، دھوکہ دینے کی گنجائش نکل ہی آیا کرتی ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم یہ دیکھیں گے کہ اسی ضمیر نے جس کی تربیت و تطہیر کا اہتمام اسلام نے کیا ہے، بڑے شاندار کارنامے انجام دیئے ہیں، اور ایسے ایسے کام کیے جو اب اتنا زمانہ گذر جانے پر مسلمانوں کی زندگی میں معجزہ اور خرق عادت معلوم ہوتے ہیں۔

چھٹا باب

اسلام کی اقتصادی پالیسی

آج کل اجتماعی عدل پر اظہار خیال کرتے وقت سب سے زیادہ اہمیت اقتصادی پالیسی کو دی جاتی ہے اور اسی وجہ سے غالباً اکثر پڑھنے والوں نے ایسا محسوس کیا ہوگا کہ کتاب میں اس موضوع کو بہت موخر کر دیا گیا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جان بوجھ کر ایسا کیا، کیونکہ اسلام میں جس چیز کو ہم اجتماعی عدل کہتے ہیں وہ اقتصادی پالیسی سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند تر چیز ہے، جیسا کہ ہم گذشتہ ابواب میں واضح بھی کر چکے ہیں۔ اسی لیے ہم نے ضروری سمجھا کہ مخصوص طور پر اسلام کی اقتصادی پالیسی کے بیان سے پہلے اس بنیادی اہمیت کے حامل مکمل فکر کو سامنے لائیں جو اس نظام عدل کی رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ پھر ہم نے اس کے مزاج، اس کے ارکان اور اُن طریقوں کی تشریح کی جو اجتماعی عدل کے وسیع باب میں اسلام نے اختیار کر رکھے ہیں۔ اقتصاد کو مقدم رکھنا مادّی نظاموں کا خاصہ ہے جو معاشی قدروں کے ماسوا زندگی کی دوسری قدروں کو کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے۔

اسلام اقتصاد کے باب میں جو پالیسی اختیار کرتا ہے وہ اس کے جامع فکر اور بنیادی فلسفہ کے عین مطابق ہے۔ وہ فرد اور جماعت دونوں کے مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے اس سلسلہ میں ایک موزوں ومناسب درمیانی راہ اختیار کرتا ہے جس میں نہ تو فرد کی کوئی حق تلفی ہوتی ہے نہ جماعت کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ نہ تو فطرت کی راہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے نہ زندگی کے حقیقی اصول وضوابط یا اس کے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں روڑے اٹکاتا ہے۔

اس پالیسی کو کامیابی کے ساتھ انجام تک پہنچانے کے لیے اسلام اپنے وہی دو بنیادی طریقے اختیار کرتا ہے یعنی قانونی ضابطہ بندی اور ہدایت وتلقین۔ قانون کے ذریعہ وہ ایسے عملی مقاصد حاصل کرتا ہے جو اپنی جگہ

ایک صالح ترقی پذیر سماج کی تعمیر کے لیے کافی ہیں، اور ہدایات و تلقین کے ذریعہ وہ حاجات کی غلامی سے بلند ہونے، زندگی کے بلند تر تصور کی طرف متوجہ ہونے اور بحیثیت مجموعی زندگی کو "آئیڈیل" کی حد تک بلند کر دینے جیسے اعلیٰ مقاصد کی طرف اقدام کرتا ہے۔ یہ مقاصد کچھ ایسے واقع ہوتے ہیں کہ تمام لوگوں کا ہر طرح کے حالات میں ان تک پہنچ سکنا ممکن نہیں۔

مالی پالیسی پر تفصیل سے گفتگو کرنے سے قبل ہم ایک ایسی مثال سامنے لائیں گے جس سے خود مال کی اصل حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اسلام نے زکوٰۃ کو مال میں سے ایک واجب الوصول حق قرار دیا ہے، جسے وہ لوگوں پر قانوناً لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کی عدم ادائگی کی شکل میں اُس نے امام کو حدود قائم کرنے اور ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا ہے جو اس سے انکار کریں۔ مزید براں اُس نے امام کو یہ حق بھی دیا ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ اس قدر ٹیکس وصول کرے جس سے ہر طرح کے ضرر کا ازالہ ہو سکے، تنگی دور کی جا سکے، اور بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے مفادات و مصالح محفوظ کیے جا سکیں۔ یہ بھی ضرورت پڑنے پر زکوٰۃ ہی کی طرح ایک حق ہو جاتا ہے، جس کی بابت فیصلہ کا انحصار امت کے مصالح اور امام کی انصاف پسندی اور دیانت داری پر ہے۔

معاملہ کا قانونی پہلو تو اسی حد تک تھا لیکن ہدایت و تلقین کے ذریعہ لوگوں میں یہ اسپرٹ پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اپنے سارے ہی مال سے دستبردار ہو جائیں اور اُسے کُل کا کُل اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں۔ چنانچہ حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

خرج رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم یومًا نحو اُحدٍ وانا معہ، فقال "یا اباذر" فقلت لبّیک، یا رسول اللّٰہ فقال: الاکثرون ھم الاقلّون یوم القیامۃ، الّا من قال کذا وکذا — عن یمینہ وشمالہ وقدامہ وخلفہ — وقلیلٌ ماھم۔ ثم قال "یا اباذر" فقلت: نعم یا رسول اللّٰہ بابی انت واُمّی۔ قال: ما یسُرُّنی أن لی مثل اُحدٍ، انفقہ فی سبیل اللّٰہ، أموت واترک منہ قیراطین"

ایک دن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم اُحد کی طرف تشریف لے چلے میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ آپ نے فرمایا: "ابوذر!" میں نے عرض کیا: "یارسول اللہ، لبیک!" آپ نے فرمایا: "آج جو لوگ زیادہ رکھتے ہیں کل قیامت کے دن وہی مفلس ہوں گے بجز ان کے جو ایسا کریں — آپ نے اپنے ہاتھ دائیں بائیں، اور سامنے پیچھے چلاتے ہوئے کہا — اور ایسے لوگ کم ہی ہوں گے۔" پھر آپ نے فرمایا: "ابوذر" میں نے — عرض کیا "ہاں، اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان (ارشاد ہو)

قلت: أو قنطارين یا رسول اللّٰہ: قال: "بل قیراطین" ثم قال: "یا اباذر! انت تریں الاکثر وانا اریں الاقل" (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

آپ نے فرمایا "مجھے یہ بھی گوارا نہیں کہ میرے پاس اُحد جتنی دولت ہو اور میں اُسے راہِ خدا میں خرچ بھی کرتا رہوں لیکن مروں تو اُس میں سے دو قیراط (بلا خرچ کیے ہی) چھوڑ جاؤں" میں نے عرض کیا۔ رسول خدا، آپ کی مراد کیا دو قنطار سے ہے" آپ نے فرمایا "نہیں نہیں دو قیراط" پھر آپ بولے "ابو ذر، تم زیادہ کی طرف جاتے ہو اور میں کم تر کی طرف"

وہ تھی قانون سازی اور یہ ہے ہدایت و تلقین! اور یہ دونوں مل کر ہی اقتصادی پالیسی کی تشکیل کرتی ہیں۔ اسلام کی تمام پالیسیوں کا یہی حال ہے۔

آئیے اب ہم تفصیلات میں داخل ہوں۔

انفرادی ملکیت

انفرادی ملکیت کا حق

اسلام دولت کی انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے ـــ حصول ملکیت کی اُن مخصوص شکلوں کے ساتھ جن کو قانون جائز قرار دیتا ہو۔ ان شکلوں کا بیان آگے آتا ہے۔ پھر اسلام اس حق کو تسلیم کرنے پر مترتب ہونے والے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے مثلاً حق دار کے حق کی حفاظت اور اُسے چوری ڈاکہ، لوٹ مار اور اُچکّے پن وغیرہ کی تمام شکلوں سے محفوظ رکھنا، اس تحفظ کی عملی طور پر ضمانت وہ دست اندازی کی اِن تمام شکلوں پر سخت سزائیں مقرر کر کے دیتا ہے۔ ساتھ ہی وہ اصلاحی ہدایات و تلقینات اپنی جگہ پر ہیں جن کے ذریعہ وہ نفس کو ان چیزوں کی طرف لپکنے سے روکتا ہے جو اُس کے اپنے پاس نہیں بلکہ دوسروں کی مِلک میں ہیں۔

اسلام نے ذاتی ملکیت کے دوسرے لوازم بھی تسلیم کیے ہیں، یعنی اپنے مال میں تجارت، اجارہ، رہن، ہبہ، اور وصیت کے ذریعہ تصرّف کا حق اور تصرّف کی ان تمام شکلوں کا پورا پورا حق جو حلال ہوں اور ایسے تصرّفات کے لیے اسلام نے جو حدود مقرر کی ہیں ان کے اندر رہوں۔

اسلام میں اس صریح اور واضح حق کے تسلیم کیے جانے میں کوئی شبہ نہیں۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ مردوں کے لیے حصّہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں اور عورتوں

نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ (النساء: ۳۲)
کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ خود کمائیں۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ (النساء: ۲)
یتیموں کا مال اُن کے حوالہ کردو اور بُری چیز کو اچھی چیز سے بدل نہ لو۔

وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ، وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا، وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا، فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا، وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ۔
(الکہف: ۸۲)
رہی دیوار تو وہ اُسی شہر کے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا۔ ان کا باپ ایک صالح آدمی تھا۔ پس تیرے رب کی مشیت یہ ہوئی کہ وہ دونوں لڑکے پختہ عمر کو پہنچیں اور اپنا خزانہ برآمد کر لیں۔ یہ تیرے رب کی طرف سے کرم فرمائی تھی۔

حدیث میں آیا ہے کہ:

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهٖ فَهُوَ شَهِيْدٌ (بخاری و مسلم)
جو اپنے مال کی حفاظت میں مارا جائے وہ شہید ہے۔

چوری کی سخت سزا، اس حق کے احترام اور اس پر دست درازی کی ممانعت کی کھلی دلیل ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللَّهِ۔
(المائدہ: ۳۸)
چوری کرنے والے مرد یا عورت کا حکم یہ ہے کہ ان کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں اس جرم کے بدلے جس کے وہ مرتکب ہوئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا کے طور پر۔

غصب کرنا حرام اور اس جرم کا مرتکب ملعون ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ:

مَنْ ظَلَمَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا طُوِّقَهُ مِنْ سَبْعِ أَرَضِيْنَ۔
(بخاری و مسلم۔ یہ الفاظ بخاری کے ہیں)
جو کسی دوسرے کی زمین کا تھوڑا سا حصہ بھی غصب کرے گا۔ زمین کے ساتویں طبق سے اتنا حصہ نکال کر اس کے گلے کا طوق بنایا جاوے گا۔

من اقتطع مال امرئ مسلم بغیر حق لقی اللہ عزّ وجلّ وھو علیہ غضبان۔
(اسناد احمد محمد شاکر کی مرتب کردہ مسند امام احمد حدیث نمبر ۳۹۴۶)
جو شخص کسی مسلمان کا مال بلا استحقاق دبا بیٹھے وہ اللہ کے حضور اس حال میں جائے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر بہت غضبناک ہوں گے۔

فرد کو جس طرح ملکیت رکھنے کا حق حاصل ہے اسی طرح اسے ورثہ پانے اور وارث بنانے کا حق بھی حاصل ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ
مردوں کا حصّہ ہے اس ترکہ میں سے جو ماں باپ اور

وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ ۔ (النساء : ۷)

قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں اور اسی طرح عورتوں کا بھی ایک حصہ ہے اس ترکہ میں سے جو ماں باپ یا قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں۔

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (النساء : ۱۱)

اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے۔ اولاد نرینہ کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔

يَسْتَفْتُونَكَ ! قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلَالَةِ إِنِ امْرُؤٌ هَلَكَ لَيْسَ لَهُ وَلَدٌ وَلَهُ أُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۔ (النساء : ۱۷۶)

لوگ آپ سے فتویٰ پوچھتے ہیں کہہ دیجیے کہ اللہ تم کو کلالہ کا حکم بتاتا ہے اگر کوئی آدمی اس حال میں مرے کہ اس کے لڑکا نہ ہو اور اس کی بہن زندہ ہو تو اُس کو اس کے ترکہ کا نصف مل جائے گا۔

انفرادی ملکیت کا حق تسلیم کرنا اور اس کا تحفظ محنت اور بدلہ کے درمیان عدل قائم کرنے کا کام کرتا ہے۔ اس طور پر فطرت سے ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور نفس انسانی میں راسخ میلانات کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں —— وہ میلانات جن کی اسلام نظام اجتماعی کی تشکیل میں پوری پوری رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ ساتھ ہی ایسا کرنا جماعتی مصالح سے بھی پوری طرح ہم آہنگ ہے کیونکہ یہ فرد کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ زندگی کی ترویج و ترقی کے لیے جو کچھ بھی اُس کے بس میں ہو کر گذرے۔

چنانچہ فرد کی فطرت میں "خیر" کی طلب ودیعت کی گئی ہے۔

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ (العٰدیات)

وہ خیر کی طلب میں بہت حریص واقع ہوا ہے۔

اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جو کچھ اس کی ملک ہو اس پر قبضہ کرنے اور انھیں اپنی ملک میں باقی رکھنے پر حریص ہو۔

قُل لَّوْ أَنتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي ، إِذًا لَّأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنفَاقِ ۔ (الاسراء : ۱۰۰)

کہہ دیجیے کہ اگر تم میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے تو بھی ختم ہو جانے کی ڈر سے ہاتھ روک لیتے۔

وَأُحْضِرَتِ الْأَنفُسُ الشُّحَّ

دل تنگی کی طرف مائل ہو جایا کرتے ہیں۔

ان فطری میلانات کا ساتھ دینے اور ان کے تقاضے پورے کرنے میں کوئی حرج نہیں تا کہ انسان محنت اور پیدائش دولت —— کی مہم میں اپنی ہی ضروریات کی خاطر اور اپنے ہی ذوق و شوق کے تحت پورے جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھے اور اس میں اپنی پوری طاقت صرف کر دے حالانکہ وہ کسی طرح بھی خود کو محنت کرنے پر مجبور نہ پاتا ہو، نہ ہی بے دلی، ناپسندیدگی اور مایوسی کے جذبات اس کے پاس پھٹکیں۔ اس کی اس کدو کاوش کا حاصل بالآخر جماعت کے حصہ میں آئے گا۔ مزید برآں اسلام ایسے قواعد و ضوابط بھی ترتیب

دیتا ہے جو اس کا فائدہ جماعت کو بہم پہنچانے کے علاوہ ان متوقع نقصانات کا بھی سدّباب کرتے ہیں جو فرد کی آزادئ مطلق اور اس کو عطا کردہ حق ملکیت کے نتیجہ میں سامنے آسکتے ہیں۔

یہ بات عدل کے اولین تقاضوں میں سے ہے کہ جہاں تک مفاد جماعت کے لیے مضر نہ ہو، اجتماعی نظام کو فرد کے میلانات و رجحانات سے ہم آہنگ اور اس کی مرضی کے مطابق ہونا چاہیے۔ فرد جماعت کی راہ میں جو قوتیں صرف کرتا ہے، جس طرح اپنا پسینہ بہاتا ہے اور اس کے لیے جو جسمانی اور ذہنی کدّوکاوش کرتا رہتا ہے اس کے پیش نظر ایسا کرنا بالکل ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ عدل ہی اسلام کا اصل الاصول ہے۔ عدل اجتماعی کا قیام و بقا اس طور پر نہیں ممکن کہ اس سلسلے کی قربانیوں کا سارا بار فرد ہی پر آن پڑے۔ اگر ہم درمیانی راہ چل کر اجتماعی عدل کو اس کی تمام صورتوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں تو لازماً ایسا ہونا چاہیے کہ اس کا بار فرد اور جماعت دونوں پر یکساں طور پر پڑے۔

کوئی بھی قطعیّت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا کہ معقول طبیعی محرکات وعوامل کو کچلنا فرد یا جماعت کے حق میں کچھ اچھا ثابت ہو سکتا ہے۔ درحقیقت یہ فطرت انسانی سے ایک بلاوجہ کی بدگمانی ہے جو قیام عدل کی واحد ممکن شکل بس اسی کو قرار دیتی ہے کہ ان فطری میلانات کو دبا دیا جائے اور ان کی راہ روک کر کھڑے ہو جایا جائے۔ وہ خیالی نظریات جو حقیقت واقعہ سے کوئی بحث نہیں کرتے صرف وہی یہ فرض کر سکتے ہیں کہ خارج، قانون اور سماجی نظم کا دباؤ ڈال کر ایک آدھ پشت یا چند پشتوں میں ان محرّکات کو یکسر ختم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام فطرت سے اس درجہ بدگمانی نہیں کرتا، اور نہ ہی وہ حقائق سے آنکھیں بند کر کے خیالی بنیادوں پر اپنی عمارت اٹھانے کا خیال ذہن میں لاتا ہے۔

اب ہم یہ آواز بلند کر سکتے ہیں کہ خود انسانیت کے احترام کا تقاضا ہے کہ ہم اسے ذرا اور گہری نظر سے دیکھیں، جو اس کے مزاج کی گہرائیوں کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکے، اس کی فطرت کی اصل کو پا سکے اور یہ معلوم کر سکے کہ اس کی جڑیں کتنی گہری جا چکی ہیں۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ ہم انسانیت کی رہنمائی اور اس کی تعمیر نو کے اہم کام میں زیادہ دانشمندی، سوجھ بوجھ اور سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کا مظاہرہ کر سکیں، لکھوکھا برس پر پھیلی ہوئی انسانی زندگی جو دلائل پیش کرتی ہے وہ اتنے ہلکے اور بے وزن تو نہیں قرار دیئے جا سکتے کہ ہم حیات انسانی کی فطرت اس کی اصل ازدش اور اس کے میلانات و رجحانات کی بابتہ خود سے کچھ نظریات گھڑ لیں اور پھر زبردستی انھیں کو مسلط بھی کر دیں!

حق وراثت و توریث کی بابتہ ہم تفصیلی گفتگو اجتماعی تکافل کے باب میں کر چکے ہیں۔ اب یہاں ہم نے جس اسپرٹ

پر روشنی ڈالی ہے یہ حق اس کے عین مطابق اور ساتھ ہی عدل اجتماعی سے اس کی بلند ترین سطح پر اور مفاد جماعت سے اس کے وسیع ترین معنی میں، ہم آہنگ ہے۔ یہ تصور نوع انسانی کی ایک پشت اور دوسری پشتوں کے درمیان کوئی مصنوعی دیوار نہیں کھڑی کرتا اور پھر، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہی حق تقسیم دولت کے وسائل میں سے بھی ایک اہم وسیلہ ہے۔

انفرادی ملکیت کا مزاج

لیکن ایسا نہیں کہ اسلام نے ذاتی ملکیت کے حق کو حدود و قیود عائد کیے بغیر یونہی چھوڑ دیا ہو۔ وہ اس حق کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن اسی کے پہلو بہ پہلو کچھ دوسرے اصول و ضوابط بھی دیتا ہے جو اس حق کو ایک عملی حق کے بجائے قریب قریب نظری بنا دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صاحب مال کو اس کی ضروریات پوری ہو جانے کے بعد بقیہ سارے مال سے محروم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ اس حق کو قانوناً تسلیم کرنے کے ساتھ ہی ایسی قانونی حد بندیاں بھی کرتا ہے کہ حق پانے والا مال کی افزائش، خرچ اور لین دین سے متعلق تصرفات کے باب میں بجائے آزاد و خود مختار ہونے کے پوری طرح پابند نظر آنے لگتا ہے۔..... ان تمام باتوں کی پشت پر جو چیز کام کر رہی ہے وہ جماعتی مصالح کا لحاظ اور خود فرد کے مفاد کی رعایت ہے —— ان فطری اغراض و مقاصد کی حدود میں رہتے ہوئے جن پر اسلام زندگی کی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

حق ملکیت کے سلسلہ میں اسلام کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنے مال و املاک کے سلسلہ میں فرد کی حیثیت جماعت کے نمائندہ اور نائب کی سی ہے، اس پر اس کا قبضہ ملکیت سے کہیں زیادہ ایک ذمہ داری ہے۔ اپنی عمومی حیثیت میں مال و دولت جماعت کا حق ہے، جب کہ خود جماعت بھی اس معاملہ میں اُس خدا کی نیابت پر مامور ہے جس کے سوا کوئی ذات کسی چیز کی حقیقی مالک نہیں۔

قرآن کریم فرماتا ہے:

آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ (الحدید: ۷)

اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس (مال) میں تم کو نائب مقرر کیا گیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔

آیت کسی تاویل کی محتاج نہیں اور واضح طور پر ہمارے بیان کی تائید کر رہی ہے، یعنی انسان کے ہاتھ میں جو مال ہے وہ اصلاً اللہ کا ہے اور انسان کی حیثیت نائب کی ہے نہ کہ اصل مالک کی۔ ایک دوسری آیت میں جو مکاتب غلاموں کی بابت ہے حکم دیا گیا ہے کہ:-

وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللّٰهِ الَّذِي آتَاكُمْ (النور: ۳۳)

اللہ نے جو مال تم کو دیا ہے اس میں سے اُن کو دو۔

گویا یہ مال جو انھیں دیتے ہیں وہ اپنی ملک سے نہیں بلکہ اللہ کے مال میں سے دیتے ہیں اور ان کی حیثیت صرف ایک درمیانی واسطہ کی ہے۔ ایک تیسری آیت میں بات بالکل صاف کردی گئی ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَادِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاءٌ۔ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ؟ (النحل: ۷۱)

اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں کو دوسروں پر رزق کے معاملہ میں برتری عطا کی ہے۔ تو اب ایسا نہیں ہوتا کہ جن کو برتری دی گئی ہے وہ اپنے غلاموں کو اپنا مال دے دیں، کیونکہ دونوں ہی اس میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ کیا یہ لوگ اللہ کی نعمت کا کفران کرتے ہیں۔

آیت بتاتی ہے کہ جن لوگوں کو اللہ نے[1] زیادہ دے رکھا ہے وہ اپنے غلاموں کو جو کچھ دیتے ہیں اُس کا مطلب یہ نہیں کہ ان اغنیاء کے اپنے مال کا کچھ حصہ فقراء کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ ہرگز نہیں، یہ تو ان فقراء کا اپنا حق ہے۔ اس مال میں فقیر و غنی یکساں طور پر حصہ دار ہیں اور اس کا منبع بھی ایک ہی ہے[2]۔ جو کچھ وہ لیتے ہیں اس پر اُن کا اتنا ہی حق ہے جیسا کہ اُن کا جو اسے دیتے ہیں، اس حقیقت کی وضاحت کے بعد ایک استفہام انکاری سامنے لا رکھا گیا کہ "کیا یہ اللہ کی نعمتوں کو جھٹلاتے ہیں؟" کہ یہ درحقیقت ان کی اپنی پیدا کردہ چیز نہیں اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے۔

دولت کی ذاتی ملکیت کی حقیقت کے بیان میں اس سے زیادہ واضح اور صریح چیزیں بھی ہیں۔ جو بتاتی ہیں کہ اس کا مطلب تصرّف اور انتفاع کے حق سے زیادہ اور کچھ نہیں، واقعی صورت حال بھی یہی ہے۔ کیونکہ بلا تصرّف اور انتفاع کے حق کے تو ملکیت ذاتی متحقق ہو ہی نہیں سکتی۔ چنانچہ اس حق کے بقا کی شرط تصرف کی صلاحیت کو قرار دیا گیا ہے اور جب کوئی تصرّف میں نادانی اور نالائقی کا مظاہرہ کرے تو سرپرست یا سماج کو حق تصرف

---

[1] فاضل مصنف نے آیت کو جس موقع پر جس منشاء کے لیے استعمال کیا ہے اس سے ہم مجبور ہیں کہ آیت کی ترجمانی اس طور پر کریں جہاں بعض علمائے قرآن نے یہ مفہوم لیا ہے: ہاں بیشتر مفسرین اور محققین کی رائے میں آیت ابطالِ شرک کے سیاق میں آئی ہے اور مشرکین مکہ کو یہ جتلانا مقصود ہے کہ جب خود تم اپنے مال کو اپنے غلاموں کے حوالے نہیں کر دیا کرتے، کہ سب برابر ہو جائیں تو اللہ کے بارے میں یہ گمان کیوں کرتے ہو کہ وہ اپنی خدائی میں اپنے غلاموں کو حصہ دار بنالے گا! آیت کے اس فہم کی روشنی میں ترجمہ بالکل بدل جائے گا۔ لیکن واضح رہے کہ نحوی اعتبار سے دونوں ہی ترجمے صحیح ہیں مصنف کے فہم کی تائید کے لیے ملاحظہ ہو۔ روح المعانی، البحر المحیط، تفسیر فتح القدیر، اور کشاف میں اس آیت کے ذیل کی تفسیر۔ (مترجم)

[2] جماعت اور اس کی پیداآور قوتیں اللہ کی دین ہیں۔ (مترجم)

واپس چھین لینے کا حق ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا، وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ۔ (النساء: ۵)

اپنے وہ اموال جن کو اللہ نے تمہارے گذارے کا ذریعہ بنایا ہے کم عقلوں کے حوالے نہ کردو (البتہ) اس میں سے ان کو کھلاؤ اور پہناؤ۔

تصرّف کا حق رُشد اور اس ذمہ داری کی بحُسن و خوبی انجام دہی پر منحصر قرار دیا گیا ہے۔ جب مالک اس ذمہ داری کو پورا کر کے نہ دے تو ملکیت کے طبعی نتائج یعنی تصرّف کے جملہ حقوق بھی موقوف ہو جاتے ہیں۔ اس اصول کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث امام ہوتا ہے، کیونکہ مال دراصل جماعت کا تھا جسے ایک فرد کی نگرانی میں دیا گیا تھا، اب جب اس کے پیچھے اس کا کوئی نہ رہا تو مال جہاں کا تھا وہاں لوٹ آیا۔

اس اصل پر زور دینے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ہم دولت کی "اجتماعی ملکیت" کا اصول ثابت کریں۔ ذاتی ملکیت کا حق اسلام میں واضح طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس پر زور دینے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اسلام میں ذاتی ملکیت کی جو اصل حقیقت ہے اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اور یہ بات بھی واضح طور پر سامنے آجائے کہ اسلامی تصوّر ملکیت نے ان دونوں نظریات (انفرادی ملکیت اور اجتماعی ملکیت) کے درمیان توازن کس طرح قائم کیا ہے۔ بالفاظ دیگر، فرد کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ وہ اس مال میں، جو دراصل جماعت کا ہے صرف ایک ذمہ دار کارپرداز کی حیثیت رکھتا ہے، تاکہ یہ احساس اسے اپنے تصرفات پر جماعت کی عائد کردہ پابندیوں کو بخوشی تسلیم کر لینے اور اس کی سونپی ہوئی ذمہ داریوں کو جی سے قبول کر کے آگے بڑھنے پر آمادہ کرے۔ اسی طرح، جماعت کو اس بات کا شعور ہونا چاہیے کہ وہی اس مال کی حقیقی مالک ہے، تاکہ وہ فرد پر ذمہ داریاں ڈالنے یا حد بندی عائد کرنے میں زیادہ جری اور بے باک ہو جائے۔ یہی طرز فکر ہم کو ملکیت کے مفید استعمال کے سلسلہ میں کامل اجتماعی عدل کی ضمانت دینے والے اصول عطا کر سکتا ہے، کیونکہ ملکیت بذات خود مقصود نہیں بن سکتی اور نہ مال کی "ملکیتِ عینی" کوئی حقیقت رکھتی ہے۔ دولت کی بعض شکلوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عینِ شئے کی ملکیت کوئی حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ اس بات کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا کہ انسان "عینِ زمین" کا مالک ہے، درحقیقت وہ صرف اس کی پیداآوری اور غلّہ کا مالک ہوتا ہے۔ پس اصل اعتبار ملکیت سے انتفاع کا ہوا نہ کہ حقیقی معنی میں ملکیت کا۔

مال سے انتفاع کے سلسلہ میں اسلام کا دوسرا اصول یہ ہے کہ مال کا لوگوں کے ایک خاص گروہ میں محدود ہو کر

رہ جانا، اور انہی کے درمیان اس طرح گردش کرتے رہنا کہ دوسرے لوگ اسے نہ پاسکیں سخت ناپسندیدہ اور سراسر نامطلوب ہے۔

كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (الحشر: ۷) تاکہ مال تمہارے مالدار لوگوں ہی کے درمیان چکر لگاتا نہ رہ جائے۔

اس نص سے جو تاریخ وابستہ ہے اس کا جاننا اسلام کے اس بنیادی اصول کو صحیح طور پر سمجھنے میں کافی مدد دیتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ مہاجرین مکہ سے ہجرت کر کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ چلے آئے تھے، غریب مہاجرین کے پاس تو مال تھا ہی نہیں کہ اُسے ساتھ لانے کا سوال پیدا ہوتا۔ خود اغنیاء بھی اپنا مال پیچھے چھوڑ آئے تھے اور اب بالکل محتاج ہو کر رہ گئے تھے۔ اس موقع پر انصار نے بڑی سخاوت کا مظاہرہ کیا اور ثابت کر دیا کہ نفس میں جو فطری بخل پوشیدہ ہے وہ اس سے بلند ہو چکے ہیں۔ اُن کے پاس جو کچھ بھی تھا اس میں انھوں نے اِن کو بھائی کی طرح شریک کر لیا، یہاں تک کہ اپنی خاص الخاص چیزوں کو بھی مستثنیٰ نہ رکھا۔ اور یہ سب کچھ بالکل خوشی خوشی اور پوری آمادگی کے ساتھ۔

يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ۔ (الحشر: ۹)

جو لوگ ان کی طرف ہجرت کر کے آئے ہیں ان کو یہ عزیز رکھتے ہیں، ان کو جو کچھ دیا جائے اس کی یہ خود اپنے لیے خواہش نہیں کرتے، یہ اپنے اوپر انھیں ترجیح دیتے ہیں خواہ خود تنگ دستی کے شکار رہوں۔

عقیدہ نفس کو کس طرح سنوارتا ہے، اس کے وہ جیتے جاگتے نمونے بن گئے تھے۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ضروریات کے دباؤ سے بے نیازی اور اعلیٰ جذبات اور بلند تصورات کی طرف میلان کی ایک مثال بن کر سامنے آئے تھے۔

لیکن اس کے باوجود بھی مدینہ کے امراء اور غریب مہاجرین کے درمیان کا خلا کافی وسیع رہا۔ انصار کی فراخ دلی اور سخاوت کا حال پوری طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تھا۔ اس لیے آپ نے ان سے مزید مطالبہ کی کوئی ضرورت نہیں محسوس کی اور نہ انھیں یہ حکم دیا کہ اپنے مال کا کچھ حصہ مہاجرین کے حوالہ کر دیں کیونکہ وہ خود ہی اپنی ساری املاک میں ان کو بالکل بھائی بنا کر شریک کر رہے تھے۔ یہی حالات تھے کہ بنی نضیر کا واقعہ پیش آیا۔ جنگ نہیں ہوئی بلکہ ایک صلح کے ذریعہ آپ کا قبضہ مان لیا گیا۔ برخلاف عام جنگوں کے جن میں $\frac{4}{5}$ لڑنے والوں کا حصہ قرار پاتا اور صرف $\frac{1}{5}$ اللہ اور اس کے رسول کی طرف منتقل کیا جاتا، اس بار ساری غنیمت اللہ اور اس کے رسول کی قرار پائی۔ نبی کریم نے اسے مسلمانوں کے درمیان تقسیم دولت کے باب میں یک گونہ توازن پیدا کرنے کا ایک مناسب موقع جانا چنانچہ آپ نے بنی نضیر کی فے کو مہاجرین کے لیے خاص کر دیا، بجز دو غریب

انصاریوں کے جن کو حصہ دینے کے لیے بعینہٖ وہی وجوہ موجود تھے جو اس فئے کو مہاجرین کے لیے خاص کرنے کے باعث بنے تھے۔ اسی واقعہ کے سلسلہ میں قرآن کریم فرماتا ہے۔

مَا أَفَاءَ اللَّهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ مِنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ فَلِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ ۚ وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۔ لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۔

(الحشر: ۷ - ۸)

ان آبادیوں کے جن اموال کو اللہ نے اپنے رسول کو (بغیر جنگ) عطا کیا ہے۔ وہ اللہ اس کے رسول اور رسول کے قرابت داروں نیز یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے لیے مخصوص ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ مال و دولت تمہارے صاحبِ ثروت لوگوں ہی کے درمیان چکر کھاتی رہ جائے جو (حکم یا حق) تمہیں رسول دے اسے تسلیم کرلو، اور جن باتوں سے بھی روکے ان سے باز آجاؤ اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ اللہ بہت سخت سزا دینے والا واقع ہوا ہے۔ (اور مذکورہ بالا اموال واملاک) ان مہاجرین کے لیے (وقف) ہیں جو اپنے گھر بار اور مال واملاک سے (بے دخل کرکے) نکال دیئے گئے ہیں، جو اللہ کے فضل اور اس کی رضامندی کے طالب ہیں (اور اسی کی خاطر انھیں ان حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے) جو اللہ اور اس کے رسول کے (مشن میں اس کے) مددگار رہیں، درحقیقت یہی لوگ سچے اور راستباز ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس تصرف اور اس کی اس توجیہ سے جو قرآن نے بیان کی ہے، جو اصول سامنے آتا ہے وہ بالکل واضح ہے اور کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں یہ بات واضح طور پر اسلام کا ایک بنیادی اصول متعین کرتی ہے اور وہ ہے اس بات کا ناپسندیدہ ہونا کہ دولت جماعت کے چند ہاتھوں میں گھر کر رہ جائے، اور اس بات کا ضروری ہونا کہ جہاں ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے وہاں حالات کی اصلاح کی جائے تاکہ یک گونہ توازن پیدا ہو سکے۔

اصل بات یہ ہے کہ ایک طرف دولت کی افراط اور دوسری طرف اس کا فقدان، یہ کیفیت کچھ دلوں میں حسد وکینہ کے جذبات پیدا کرنے کے علاوہ دوسرے گوناگوں مفسدات کو بھی جنم دیتی ہے۔ جہاں بھی زائد از ضرورت دولت پائی جائے اس کی حیثیت وہی ہے جو بدن میں فالتو قوتِ حیات کی ہے کہ اسے کسی نہ کسی سمت

میں لگانا ضروری ہے۔ اب یہ کوئی ضروری تو نہیں کہ لوگ اُسے ہمیشہ محفوظ سمت میں اور ستھرائی کے ساتھ ہی لگائیں۔ یہ بات توقع کے عین مطابق بلکہ لابدی ہے کہ نفس کو بگاڑ دینے والی اور مہلک عیش کوشی یا اتباعِ شہوات کی شکل اختیار کرلے جیسے جماعت کے محتاج طبقوں میں خوب کھل کھیلنے کے لیے ایک وسیع میدان مل جائے یہ طبقہ اصحاب دولت کی خواہشات کی تسکین اور ان کے کبر و غرور کی پیاس بجھانے کی خاطر آبرو فروشی، عصمت و عفّت کی تجارت، خوشامد اور جھوٹ کے ذریعہ اپنی شخصیت اور خودی کو فنا کرکے اس طبقہ سے تعلّق جوڑتا ہے، کہ مجبوری میں کوئی کیا کچھ نہیں کرتا۔ دولت کی بہتات رکھنے والے کو اس بات کے سوا اور کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنی فالتو دولت اور فالتو قوّت حیات کے لیے کوئی مصرف نکالے۔ بدکاری یا اس قبیل کی ساری چیزیں مثلاً جوا، شراب، بردہ فروشی اور غلاموں کی تجارت، اور شرف عزّت اور مردانگی کا کھو بیٹھنا یہ سب نتیجہ ہے محض ایک طرف دولت کی بہتات اور دوسری طرف اس کے کال کا، سماج میں ہر طرح کا عدم توازن بس صرف اسی تفاوت کا نتیجہ ہے۔

دلوں میں جو کینہ پیدا ہوتا ہے اور ان مفلسوں کے دل جنھیں خرچ کرنے کے لیے چند پیسے بھی نہیں میسر ہوتے، بے انتہا دولت رکھنے والوں سے جس طرح بھر جاتے ہیں وہ ان چیزوں کے علاوہ ہے۔ یہ لوگ اس کے سوا اور کر ہی کیا سکتے ہیں کہ یا تو حسد میں جلتے رہیں، یا ان کے طبیعتیں اِدھر اُدھر لپکیں اور اس طرح ذلیل و خوار ہوں۔ ان کی قیمت خود ان ہی کی نظر میں گھٹ جاتی ہے اور طاقتِ ثروت کے مظاہر کے سامنے وہ اپنی واقعی عزّت کو بھی حقیر جاننے لگتے ہیں۔ غرضکہ وہ بالآخر انسانوں کے بجائے صرف گوشت و پوست کے پتلے رہ جاتے ہیں جن کو صرف اس بات کی فکر ہوتی ہے کہ مال و دولت اور جاہ و منزلت کے مالکوں کو خوش رکھیں۔

اگرچہ اسلام نے معنوی اور تصوّراتی اقدار پر زیادہ توجہ کی ہے لیکن وہ معاشی قدروں کے اثر کو نظرانداز نہیں کرتا۔ وہ لوگوں کو ان کی ادنیٰ ضروریات سے جتنا بھی بلند دیکھنا چاہتا ہو لیکن اُن پر انسان کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ کبھی نہیں ڈالتا۔ اسی لیے اسے یہ گوارا نہ ہوا کہ دولت صرف اغنیاء کے اندر چکّر کرتی رہے اور اس نے اپنی مالی پالیسی کے سلسلے میں اس کو ایک مستقل اصول کی حیثیت دے دی۔

بعض مشترک قسم کے مال ایسے ہوتے ہیں جن کا اپنے قبضہ میں لانا افراد کے لیے ناجائز قرار دیا گیا ہے رسول کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ان میں سے تین کا نام لیا ہے، پانی، گھاس اور آگ۔

النّاس شرکاء فی ثلاثٍ، فی الماء والکلاء والنّار۔ تین چیزوں میں سب کے سب شریک ہیں، پانی، گھاس اور آگ، (مصابیح السنۃ کے مرتب نے اس حدیث کو "حسن" قرار دیا ہے)۔

ایسا ان چیزوں کی اس خصوصیت کی بنا پر ہے کہ اس وقت کے عرب میں یہ چیزیں جماعت کی زندگی کے لیے ضروریات میں شمار کی جاتی تھیں، اسی لیے ان سے انتفاع کا حق پوری جماعت کو یکساں طور پر دیا گیا۔ جماعت کی زندگی کے لیے لازمی اشیاء میں ماحول اور زمانہ کے لحاظ سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے اور قیاس میں، جو اسلامی اصول تشریع میں سے ایک اہم اصول ہے، اتنی وسعت موجود ہے کہ ان دوسری چیزوں پر بھی اس کا انطباق کیا جا سکے، جو اس حکم کے تحت داخل ہوں ...... لیکن یہ ایک مستقل مبحث ہے جو اس کتاب میں اپنے مناسب مقام پر آئے گا۔ مال کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو محتاجوں کا حق ہے اور یہ حصہ زکوٰۃ کی صورت میں قانوناً فرض ہے۔

وفی اموالھم حق للسائل والمحروم   ان کے اموال میں محروم اور (احتیاج کی بنا پر) سوال کرنے والے کا بھی حق ہے۔

اور اس طرح وہ ذاتی ملکیت کی حدود سے نکل کر جماعت کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے تاکہ وہ اسے اس کے معروف مصارف میں خرچ کرے۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین ..... الخ

پس اسلام میں انفرادی ملکیت کا مزاج مختصراً یہ ہے کہ

- دولت کی اصل مالک جماعت ہے، اپنی عمومی حیثیت میں۔
- ذاتی ملکیت فی الحقیقت ایک مشروط اور پابند ذمہ داری ہے۔
- دولت کی بعض شکلیں عام اور مشترک ملکیت شمار ہوتی ہیں کسی فرد واحد کو ان پر قبضہ کا حق نہیں۔
- دولت کا ایک حصہ جماعت کا حق ہے جو اس کی طرف لوٹ جائے گا تاکہ وہ اس کو متعین گروہوں تک پہنچا دے جو اس کے محتاج ہیں تاکہ اس کا اور اس کے ساتھ ہی جماعت کا حال درست اور بہتر ہو سکے۔

ذاتی ملکیت کے ذرائع

قبضہ اور ملکیت کی حقیقت کے باب میں اس نظریہ پر اسلام اس کے منطقی نتائج بھی مرتب کرتا ہے وہ قبضہ کے شرائط متعین کرتا ہے، تصرف پر پابندیاں عائد کرتا ہے اور انتفاع کے لیے حدیں مقرر کرتا ہے۔ اس طور پر ملکیت ہمیشہ اسی دائرہ میں رہتی ہے جو جماعتی مصلحت اور اس سے کبھی نہ الگ ہونے والی، اسی میں شامل، فردی مصلحت کے لیے متعین کرتی ہے۔

سب سے پہلے وہ بتاتا ہے کہ ملکیت، یعنی شئے مملوک سے انتفاع کا حق، شارع کے اذن کے بغیر نہیں

متحقق ہوتا کیونکہ شارع ہی جماعت کے جملہ معاملات کا نگراں ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔ کیونکہ درحقیقت یہ شارع ہی ہے جس نے اسے سبب شرعی پر منحصر قرار دے کر انسان کو ملکیت کا حق عطا کیا چنانچہ ملکیت کی مختلف تعریفوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ "ملکیت کسی شے کی ذات یا اس کے فائدہ سے متعلق ایک شرعی حکم ہے جو اس بات کا متقاضی ہے کہ جس فرد کی طرف اس حکم کی اضافت کی جائے اُسے اُس شئے سے انتفاع کا اور اُسے دے کر اُس کی قیمت وصول کرنے کا حق دار سمجھا جائے۔"

"فقہاء اسلام کی متفقہ رائے ہے کہ ملکیت اُسی وقت متحقق ہوتی ہے جب خود شارع اُسے عطا کرے یا تسلیم کرے، اس لیے کہ سارے حقوق جن میں حق ملکیت شامل ہے بلا شارع کے عطا کیے یا اس کے اسباب کو تسلیم کیے نہیں ثابت ہوتے، یہ حق اشیاء کی طبیعت سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ شارع کے اِذن سے اور اس بات سے وجود میں آتا ہے کہ اس نے شرعی طور پر سبب کو مسبّب کے وجود میں لانے کا ذریعہ تسلیم کیا ہے (الملکیۃ ونظریۃ العقد فی الشریعۃ الاسلامیہ مصنّفہ استاذ محمد ابو زہرہ - پروفیسر اسلامی قانون ، لاکالج - قاہرہ یونیورسٹی)

حق ملکیت کے بارے میں اسلامی نظریہ کی وضاحت میں یہ بات کافی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کی رو سے ملکیت جماعت کے نائب کی حیثیت میں شارع کی طرف سے دیا ہوا کسی خاص چیز پر قبضہ کا وہ حق ہے جو کہ کسی فرد کو دیتا ہے اگر یہ تملیک نہ ہوتی تو اس فرد کا قبضہ کبھی درست نہ ہوتا - اصلاً ہر چیز جماعت کی ہے اور شارع ہی اس بات کا مجاز ہے کہ کسی کو کسی چیز کے اپنی ذات کے لیے مخصوص کرنے کی اجازت دے، خواہ یہ اجازت کسی اصول عام کے تحت ہو یا کسی خاص اجازت نامہ کے ذریعہ۔

اسلام میں ملکیت کا حق پانے کا واحد ذریعہ عمل ہے وہ عمل، اپنی تمام قسموں اور تمام شکلوں میں اس طرح محنت اور اس کی جزا کے درمیان مساوات قائم رکھی گئی ہے - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دولت کے حاصل کرنے اور اس کا مالک قرار پانے کی جن شکلوں کو اسلام درست تسلیم کرتا ہے وہ یہ ہیں -

(۱) **شکار** :- یہ انسانی زندگی کا قدیم ترین ذریعہ معاش رہا ہے - اب بھی متمدن اور ترقی یافتہ ممالک میں یہ مختلف اقسام کے مال حاصل کرنے کا ذریعہ بنا ہوا ہے - مچھلی ، موتی ، مرجان ، اسفنج اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کا شکار آج بھی قوموں اور افراد کی آمدنی کا ایک معتد بہ حصّہ فراہم کرتا ہے - یہی حال تجارت کے لیے یا تفریحی طور پر چڑیوں اور جانوروں کے شکار کا بھی ہے -

(۲) جن افتادہ زمینوں کا کوئی مالک نہ ہو ان کو کسی طریقہ سے کارآمد بنا لینا: اس سلسلہ میں یہ لازم قرار دیا گیا

کہ زمین پر قبضہ کرنے کے بعد تین سال کے اندر اندر وہ شخص اس کو کارآمد بنالے ورنہ اس کا حق ملکیت زائل ہو جائے گا،
کیونکہ اصل غرض یہ ہے کہ افتادہ زمینیں کارآمد بنائی جائیں تاکہ اس سے فائدہ اٹھانے سے جو مصالح وابستہ ہیں وہ
متحقق ہوسکیں۔ تین سال کی مدت اس بات کو جانچنے کے لیے کافی ہے کہ قبضہ کرنے والا کارآمد بنانے پر قادر ہے یا نہیں
اتنے عرصہ میں اگر اس قدرت کا ثبوت دینے والے کوئی بھی مظاہر سامنے نہیں آئے تو افتادہ زمین دوبارہ جماعت
کی طرف لوٹ آئے گی اور کوئی فرد اس کا مالک نہ سمجھا جائے گا۔

عادیّ الارض للہ ولرسولہ، ثم لکم من بعد، فمن احیا ارضاً میتاً فھی لہ، ولیس لمحتجز حق بعد ثلاث سنین۔

(قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں اس حدیث کو لیث عن طاؤس کے واسطے سے روایت کیا ہے)

افتادہ زمینیں اللہ اور اس کے رسول کی ملک ہیں اس کے بعد وہ تمہاری ہیں۔ چنانچہ جو شخص بھی کسی افتادہ زمین کو کارآمد بنالے وہ اس کی ہو جائے گی۔ البتہ کسی ہاتھ ڈالنے والے کا تین سال بعد کوئی حق نہ تسلیم کیا جائے گا۔

اس معاملہ میں اسلامی قانون آج کے اس خود ساختہ قانون سے بہتر ہے جو فرانسیسی قانون کو سامنے رکھ کر
وضع کیا گیا ہے۔ اس قانون میں صرف پندرہ سال تک قبضہ کو اس بات کے لیے کافی تسلیم کیا گیا ہے
کہ زمین قابض کی ملکیت قرار پاجائے، خواہ وہ اسے کارآمد بنائے یا اس عرصہ میں، اور اس کے بعد بھی
اسے یونہی ناکارہ چھوڑے رہے۔ یہاں حق ملکیت دینے میں جو حکمت کام کر رہی ہے وہ محض ایک منفی
حکمت ہے اور صرف "صورتِ واقعہ" کو قانوناً تسلیم کرنے کا نظریہ فیصلہ کن بن رہا ہے۔ یہاں اسلامی
نظریہ اور خود ساختہ قانون کے نظریہ کے مابین زمین آسمان کا فرق ہے۔

(۳) زمین کے اندر جو کانیں (رکاز) ہیں ان کو نکالنا:۔ کان سے جو کچھ نکلتا ہے اس کا ۴/۵ حصہ
نکالنے والے کی ملک قرار پاجاتا ہے اور ۱/۵ زکاۃ، کیونکہ یہ دفینہ اصلاً مباح تھا جسے فرد محنت مشقت کر کے
حاصل کرتا ہے۔

یہاں ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ درحقیقت جس وقت یہ حکم صادر کیا گیا تھا اس وقت تک "رکاز"
سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا وہ صرف قلیل الاستعمال معدنیات تھے مثلاً سونا اور چاندی۔ اور یہ چیزیں پٹرول
اور کوئلہ کی طرح کی نہیں جن کی ضرورت مند ساری جماعت ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پٹرول، کوئلہ،
لوہا اور اس قبیل کی دوسری چیزوں کو پانی، گھاس اور آگ جیسی مشترک قرار دی گئی ضروری چیزوں پر قیاس

کیا جائے گا یا ان رکاز پر جو اسلام کے ابتدائی دور میں معروف تھے۔ اس موضوع پر مزید گفتگو ہم اسی کتاب میں مناسب موقع پر کریں گے۔

(۴) جنگ :- اس سے ایک تو "سلب" کی ملکیت پیدا ہوتی ہے جس کے تحت وہ ساری چیزیں آجاتی ہیں جو کسی مشرک مقتول کے پاس اس وقت ہوں جب کوئی مسلمان اسے قتل کرے۔

من قتل قتیلاً له علیه بینة فسلبه له — جو کسی مشرک کو قتل کرے تو اس کی سلب اس کی ملکیت قرار پائے گی بشرطیکہ وہ اس امر کی باقاعدہ گواہی پیش کرے۔ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

دوسری چیز جس کی ملکیت جنگ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے وہ مال غنیمت ہے جس کا ۴/۵ جنگ کرنے والوں کا حق ہے اور ۱/۵ اللہ اور اس کے رسول کا۔

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ۔ (الانفال: ۴۱)

جان لو کہ جو چیزیں تم کو غنیمت کے طور پر حاصل ہوں اس کا ۱/۵ اللہ کا، اس کے رسول کا، رسول کے اہل قرابت یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کا حصہ ہے۔

(۵) اجرت کے عوض کسی دوسرے کی خاطر محنت کرنا :- اسلام اس طرح کی محنت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اس کی اجرت کو بلا کسی تاخیر اور بلا کسی تخفیف کے پوری پوری ادا کرنے کا حکم دیتا ہے۔ خود قرآن عمل پر اکساتا ہے اور اسے نگاہوں کا مرکز اور غور و فکر کا مقام قرار دیتا ہے۔

وَقُلِ اعْمَلُوا فَسَيَرَى اللَّهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُولُهُ وَالْمُؤْمِنُونَ۔ (التوبۃ: ۱۰۵)

کہہ دیجیے کہ عمل کر کے دکھاؤ، اللہ اس کا رسول اور مومنین تمہارے عمل کا جائزہ لیں گے۔

اس آیت میں کام کو حسن و سلیقہ اور خوش اسلوبی سے انجام دینے پر ابھارا گیا ہے، پھر اس میں محنت کی تعظیم بھی پائی جاتی ہے اور اسے مطالعہ کرنے، غور و فکر، اور اس کے نتائج کے انتظار میں رہنے کے قابل قرار دیا گیا ہے۔ ایک دوسرے موقع پر عمل اور اس کی خاطر زمین میں چلنے پھرنے پر ابھارا گیا ہے۔

فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ (الملک)

اس کے اوپر چلو اور اس کی روزی میں سے کھاؤ۔

رسول اللہ علیہ وسلم سے محنت کا رتبہ بلند ہونے کے بارے میں متعدد احادیث منقول ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ العبدَ المؤمنَ المحترف
(اس حدیث کو قرطبی نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے)

اللہ اس بندۂ مومن کو عزیز رکھتا ہے جو کسی پیشے کے ذریعہ اپنی روزی کماتا ہو۔

ما اکل احدکم طعاماً قطّ خیراً من عمل یدہٖ (بخاری)

اپنے ہاتھوں کی کمائی کے کھانے سے بہتر تم نے کبھی کوئی کھانا نہ کھایا ہوگا۔

محنت کی قدر و منزلت اور اس کی بزرگی و احترام کے اس نظریہ کی بنیاد پر اسلام مزدور کے حق اجرت کو ایک مقدس حق قرار دیتا ہے۔ چنانچہ وہ سب سے پہلے اس کو ٹھیک ٹھیک ادا کرنے کی تلقین کرتا ہے اور جو کوئی محنت کشوں کا یہ حق دبا بیٹھنے کی کوشش کرے اسے وہ یہ جتلا کر ڈراتا ہے کہ ایسا کرنے والا در اصل اللہ سے لڑائی مول لیتا ہے اور اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔

قال رسول اللّٰہ صلّی اللّٰہ علیہ وسلم
"قال اللّٰہ عزّ وجلّ: ثلاثۃ انا خصمھم یوم القیامۃ: رجل اعطیٰ بی ثم غدر، ورجلٌ باع حرّاً فاکلَ ثمنہ ورجلٌ استاجر اجیراً فاستوفیٰ منہ ولم یعطہ اجرہٗ۔"
(بخاری)

اللہ کے رسول نے بتایا ہے کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔
"تین طرح کے لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن اُن سے نبٹنے والا خود میں ہوں گا۔ ایک تو وہ شخص جس نے میری قسم کھا کر کسی کو زبان دی اور پھر اپنے وعدہ سے مکر گیا، دوسرا وہ جس نے کسی آزاد شخص کو بیچ کر اس کی قیمت وصول کی۔ اور تیسرا وہ جس نے کسی مزدور کو اُجرت پر بلایا اور اُس سے پورا کام لینے کے بعد بھی اُسے اُس کی مزدوری نہ دی"

ان تینوں گناہوں کو ایک ساتھ رکھنے اور ان کی سزا یکساں رکھنے میں ایک خاص معنی پنہاں ہیں۔ پہلا گناہ صریح خیانت اور اللہ کی دی ہوئی ضمانت کی بے حرمتی ہے دوسرا انسانیت کی توہین کے ہم معنیٰ ہے ایک آزاد شخص اور اسے فروخت کرکے اس کی قیمت کھانا! تیسرا گناہ مزدور کے پسینہ کے پھل کا خود ہڑپ کر جانا ہے۔ یہ آزاد شخص کی قیمت کھانے کی طرح انسانیت کے ساتھ ایک غداری ہے اور اللہ کی قسم کھانے کے بعد بدعہدی کی طرح اللہ کی دی ہوئی ضمانت کی بے حرمتی بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی خباثت اور اپنے اندر نمایاں طور پر موجود غداری کی بنا پر اللہ کی طرف سے جواب طلبی اور اعلان جنگ کا مستحق ہے۔ پر زور ہدایت ہے کہ یہ اجر وقت کے وقت ادا کیا جائے۔ صرف پوری پوری ادائیگی کافی نہیں بلکہ بلاتاخیر ادائیگی ضروری ہے۔ اللہ کا رسول فرماتا ہے۔

اعطوا الاجیر حقہ قبل ان یجف عرقہ۔ (مصابیح السنۃ ! فی الصحاح)

مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے پہلے ادا کر دو۔

اس ہدایت میں اسلام نے مزدور کی صرف مادّی ضروریات کو ہی ملحوظ نہیں رکھا ہے بلکہ اس کی نفسیاتی ضرورت کا بھی پورا پورا خیال رکھا ہے۔ نفسیاتی طور پر اس کی تسکین کا سامان یوں کیا گیا ہے کہ اسے یہ احساس دلایا جائے کہ اس کے مسئلہ کو اہمیت دی جا رہی ہے اور اسے پوری توجہ اور اعتناء کے قابل سمجھا جا رہا ہے اجرت کی ادائیگی میں جلدی اسی خوبی کی حامل ہے۔ اس طرح اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ اس کی محنت قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی اور یہ کہ سماج میں اس کا ایک مقام تسلیم کیا گیا۔ جہاں تک مادّی ضروریات کا سوال ہے مزدور عموماً اپنی مزدوری کا فوری طور پر محتاج ہوتا ہے تاکہ اس سے وہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات کی تکمیل کر سکے۔ اسی وجہ سے اجرت میں تاخیر اس کے لیے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے اسے اپنے محنت کے پھل کی جس وقت سب سے زیادہ ضرورت رہتی ہے، یہ تاخیر اسی وقت اس سے محروم کر دیتی ہے۔ اس طرح نہ کام میں لگن باقی رہتی ہے نہ اس سلسلہ میں نشاط باقی رہتا ہے۔ اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ جو کوئی بھی کچھ کام کر سکتا ہو کرے، جتنا زیادہ سے زیادہ کر سکتا ہو کرے اور نفسیاتی طور پر اطمینان ورضامندی اور مادّی طور پر معقول معاوضہ سے لطف اندوز ہوتا رہے۔

مزدور کے حق کا اتنا خیال رکھنے کے بدلے اسلام اُس سے یہ چاہتا ہے کہ وہ کام کو خوب اچھی طرح اور حسن وخوبی سے انجام دے، کیونکہ اسلام میں ہر حق کسی نہ کسی فرض کے بدلہ میں ملتا ہے یہ محنت اور اس کے ثمرہ میں برابری کے اصول کا بھی ایک فطری تقاضا ہے اور اخلاقی پہلو سے بھی ضروری ہے۔ واضح رہے کہ اسلام اخلاق کو زندگی کی بنیاد بنانا چاہتا ہے۔ دھوکہ دہی اور کام میں سہل انگاری، احساس ذمہ داری کے فقدان اور ضمیر کے مردہ ہو جانے کا ثبوت ہے۔ ان دونوں خصلتوں میں برابر مبتلا رہنا اور ان پر اصرار، احساس ذمہ داری کو بالکل ختم کر دینے اور ضمیر کو کھوکھلا کر دینے کے لیے کافی ہے۔ جماعت کے جملہ مصالح اس طرح جس عظیم فساد اور انفرادی کا شکار ہوتے ہیں وہ الگ ہیں۔

(۶) سلطان کا ان زمینوں میں سے کسی کو کچھ عطیہ کے طور پر دے دینا جن کا کوئی مالک نہ ہو، اور جو لاوارث مشرکین کی طرف سے جن کا سرپرست امام قرار پاتا ہے، بیت المال میں آئی ہوں۔ یا اسی طرح ان ناکارہ زمینوں میں سے جن کا کوئی مالک نہ ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت

ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو زمینیں عطا فرمائی تھیں، آپؐ کے بعد خلفاء بھی عطیہ کے طور پر زمینیں دیتے رہے ہیں۔ یہ عطایا اسلام کی کسی خدمت یا کسی نمایاں کارنامہ کے صلہ میں دیئے جاتے تھے۔ لیکن بہت محدود پیمانہ پر اور صرف انہی زمینوں میں سے جو یا تو ناکارہ ہوں یا ان کا کوئی مالک نہ ہو۔ جب بنی اُمیہؓ کا زمانہ آیا تو انھوں نے لوگوں کو لوٹنا اور زمین کے عطایا اپنے اعزّہ واقرباء میں تقسیم کرنا شروع کر دیا، اس لیے کہ جیسا کہ آگے تفصیل سے آئے گا یہ لوگ خلفاء راشدین میں سے نہ تھے بلکہ ان کا شمار ظالم حکمرانوں میں ہوتا ہے۔

(۷) بقائے حیات کی خاطر مال کا محتاج ہونا۔ چنانچہ اسلام نے زکاۃ کے مال کا متعیّن مدّات میں صرف کیا جانا ضروری قرار دیا ہے۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیھا، والمؤلّفۃ قلوبھم و فی الرقاب، والغارمین، وفی سبیل اللہ وابن السبیل۔

صدقات کے مستحق صرف فقراء، مساکین اور صدقات کی تحصیل پر مقرر کردہ کارندے ہیں، اور وہ لوگ جن کی تالیف قلب مقصود ہو۔ اور گردنیں چھڑانے میں، مقروض کی مدد میں، اللہ کی راہ میں اور مسافروں پر (بھی صدقات میں سے صرف کیا جائے گا۔)

ان میں سے کسی ایک میں شامل ہونا کسی شخص کو مال زکاۃ میں سے ایک حصہ کی ملکیت کا حق دار بنا دیتا ہے۔ ان لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جن کے سلسلہ میں بجز ضرورت مندی کے اور کوئی وجہ نہیں کام کر رہی ہے۔ گویا ضرورت کو اضطرار کی شکل میں محنت کا بدل قرار دے دیا جاتا ہے جسے اسلام نے ایک بلند درجہ عطا کیا ہے اور ملکیت حاصل کرنے کا پہلا اور آخری ذریعہ قرار دیا ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کو اسلام ابتداء ملکیت کے سلسلہ میں جائز تسلیم کرتا ہے۔ ان کے علاوہ جو بھی طریقے ہیں اسلام ان کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، چوری ڈاکہ اور لوٹ مار یا مجرّد قبضہ ملکیت کا باعث نہیں بن سکتے۔ یہی حال جوئے کا بھی ہے کہ اسے حرام قرار دے دیا گیا ہے۔

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام و رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ (المائدہ: ۹۰-۹۱)

شراب، جوا، پانسے اور (غیر خدا کے) استھان شیطانی حرکتیں اور ناپاک امور ہیں۔ ان سے بچو تا کہ تم فلاح پا سکو۔

جو مال حرام طریقے سے کمایا جائے وہ حرام ہی سمجھا جاتا ہے، درحقیقت جوئے بازی کوئی "کام"

نہیں بلکہ محض زبردستی اور فریب ہے۔ اس پر مستزاد وہ بغض و عناد ہے جو یہ جوا کھیلنے والوں کے درمیان پیدا کرتا ہے اور جو اسلام کے اہم ترین اصول یعنی بھائی چارہ اور تعاون کی اس اسپرٹ کے بالکل خلاف ہے جسے اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے۔

ان تمام اسباب کی حکمت واضح طور پر ان کا "محنت" پر مبنی ہونا ہے، محنت بہرحال جزا کی مستحق ہے کہ اسی پر زندگی کی فلاح و بقا منحصر ہے، زمین کو آباد اور کارآمد بنانا، سوسائٹی کو فائدہ پہنچانا، نفس کی صفائی ضمیر کی تطہیر، سب اسی پر منحصر ہیں۔ تزکیہ روحانی، جسم کو تقویت پہنچانے اور سستی، کاہلی اور گمنامی کے عوامل سے انسان کو بچائے رکھنے وغیرہ امور جس حسن و خوبی کے ساتھ 'محنت' کے ذریعہ انجام پاتے ہیں کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں۔

جب تک حصول ملکیت کا واحد ذریعہ "عمل" ہو، انفرادی ملکیت کا ان حدود کے اندر تسلیم کیا جانا جن کی وضاحت ہم نے اوپر کی ہے، کسی کے لیے ضرر رساں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ فرد کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ اپنی انتہائی کوششیں بھی کر گذرے۔ اسی طرح اسے اس بات کا موقع ملتا ہے کہ مقررہ حدود میں رہتے ہوئے اور دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہوئے اپنے قبضہ میں لانے، اور 'ملکیت میں رکھنے' کے رجحانات کو پورا کر سکے۔ اگر وہ ان حدود سے تجاوز کرتا ہے تو منصفانہ طریقہ یہ ہے کہ اسے حدود کے اندر لوٹ آنے پر مجبور کیا جائے نہ یہ کہ اس کو ہر طرح کی سرگرمیوں سے روک کر پست ہمت، گمنام اور کم تر استعداد رکھنے والوں کے برابر کر دیا جائے۔

ملکیت کے اسی نظریہ کا نتیجہ ہے کہ اسلام انتقال ملکیت کے طریقوں میں بھی مداخلت کرتا ہے اور فرد کو اس سلسلہ میں بالکل آزاد نہیں چھوڑتا۔ وراثت اور وصیت کے ضابطوں سے بھی یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ صرف ہبہ اور ہدیہ کو ہر قید سے آزاد رکھا گیا ہے اور صاحب مال کو اس بات کا پورا اختیار دیا گیا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنا مال جس کو چاہے ہبہ کر دے یا ہدیۃً دے دے۔ اس گنجائش کی وجہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں طبیعت خود ہی ایک روک ثابت ہوتی ہے اور صاحب مال اپنے مال کا ایک حصہ ہی ہدیہ یا ہبہ کے طور پر دیتا ہے۔ اس سے وارث کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ یہی حال وصیت کا بھی ہے۔ اب اگر وہ اسراف پر اتر آتا ہے تو اسے بے جا تصرف کرنے والا قرار دیا جائےگا اور اس پر قانونی پابندی عائد کی جا سکے گی، یعنی اسے اپنے حقوق ملکیت سے فائدہ اٹھانے سے محروم کیا جا سکے گا۔

مالک کے قبضہ کا اٹھنا اور مال کا۔ اس کے بعد ورثا یا جن لوگوں کے حق میں وصیت کی گئی ہو ان کی طرف منتقل ہونا ایک منفرد ضابطہ کے تحت عمل میں آتا ہے جس کی حکمتیں علٰحدہ ہیں۔ چنانچہ "کسی وارث کے لیے وصیت نہیں کی جا سکتی" اور نہ ہی ایک تہائی سے زیادہ میں وصیت کا کوئی دخل ہو گا گو یہی آخری حد ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں وصیت کی اجازت بعض خاص طرح کے حالات کے پیش نظر دی گئی ہے۔ بسا اوقات بعض ایسے قریبی رشتہ دار وراثت سے محروم رہ جاتے ہیں جن کے رشتہ اور تعلق کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کو بھی کچھ ملے لیکن رشتہ داری میں ان کا مقام کچھ ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے ورثا ان تک وراثت پہنچنے میں مانع ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے اس پہلو کے اعتبار سے وصیت حسن سلوک اور صدقہ کی ایک قسم ہے۔

وراثت کے ذریعہ مال اس ضابطے کے مطابق منتقل ہوتا ہے جس کا بیان میراث کی آیتوں میں آیا ہے (یہ آیات اجتماعی تکافل کی بحث میں گذر چکی ہیں) حصوں کے بارے میں جس عام قاعدہ کی پابندی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مرد کے لیے دو عورتوں جتنا حصہ ہے۔ اس اصول کی حکمت ہم پہلے ہی واضح کر چکے ہیں۔ پدری رشتے کی رو سے وارث ہونے والا ماں کے رشتہ سے وراثت کا مستحق قرار پانے والے پر ترجیح پاتا ہے، گو بعض حالات میں موخر الذکر کو زیادہ حصہ بھی مل جاتا ہے (دونوں میں اس تفریق کی) وجہ حقوق کو ذمہ داریوں کی مناسبت سے تقسیم کرنے کا اصول ہے۔ کیونکہ پدری رشتہ سے وارث ہونے والے پر مورث کے سلسلہ میں زیادہ ذمہ داریاں عائد تھیں۔ اس طرح خاندان میں بیٹے کو دادا اور دادی کا حصہ علٰحدہ کرنے کے بعد سب کا سب مل جائے گا کیونکہ اگر ضرورت تقاضا کرتی تو باپ کی زندگی میں اس کی کفالت ان کے ہی ذمہ ہوتی۔ حقیقی بھائی سوتیلے بھائی کو وراثت سے محروم کر دیگا، کیونکہ اگر اس کا حقیقی بھائی کسب معاش سے عاجز رہ جاتا تو اس کی کفالت کا شرعاً یہی ذمہ دار ہوتا۔ اس طرح اس ضابطہ میں ایک منصفانہ تقسیم کے ذریعہ فوائد اور ذمہ داریوں، حقوق اور فرائض کے درمیان ایک مناسب توازن برقرار رکھا گیا ہے۔

قانون وراثت کی حکمتوں اور اس کے دوررس اثرات پر ہم اجتماعی تکافل کی بحث میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ وہیں ہم نے اس تکافل یا رشتہ داروں اور پھر مختلف پشتوں کے درمیان ربط و تعلق کو مضبوط کرنے والے دوسرے اصولوں سے اس قانون کی ہم آہنگی بھی واضح کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح یہ ضابطے

فرد اور جماعت دونوں کے مفادات وضروریات نیز فطرت اور طبعی میلانات کی یکساں رعایت ملحوظ رکھتے ہیں۔

اب یہاں ہم نظام وراثت کی ان حکمتوں پر غور کریں گے جو خصوصیت کے ساتھ اجتماعی پہلو سے متعلق ہیں۔

اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ اسلام دولت کے ارتکاز اور ......

اس کے ایک طبقہ کے اندر محدود ہو کر رہ جانے کو پسند نہیں کرتا اور اسلام کا نظام وراثت پشت در پشت جمع ہونے والی دولت کی تقسیم کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ چنانچہ اس کے ذریعہ ایک ملکیت محض مالک کی وفات سے اس کی متعدد اولاد اور اعزہ کو منتقل ہو جاتی اور اس طرح چھوٹے چھوٹے یا متوسط حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ اس ضابطے کے باوجود ملکیت جیوں کی تیوں رہ جائے۔ ان شاذ و نادر پیش آنے والے حالات کے لیے کوئی اصول بنانا ممکن نہیں (مثلاً یہ کہ مالک صرف ایک بیٹا چھوڑ کر وفات پائے جو اس کے سارے ترکہ کا وارث قرار پا جائے گا کیونکہ متوفیّٰ کے باپ ماں یا بیوی اور لڑکی میں سے کوئی زندہ نہیں رہا) زیادہ تر یہی ہوتا ہے کہ دولت متعدد چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔

جب ہم اس ضابطہ کا دوسرے ضابطوں مثلاً انگریزوں کے ضابطہ سے مقابلہ کرتے ہیں، جو ترکہ کا تمام تر مستحق بڑے لڑکے کو گردانتا ہے، تو ہم پر اسلام کی یہ حکمت کہ وہ جمع شدہ دولت کو چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دینا چاہتا ہے، اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے، اسلامی ضابطہ میں ورثاء کے مابین جو عدل ملحوظ رکھا گیا ہے وہ اس پر مستزاد ہے، اس کا عدل صرف بڑے لڑکے کے لیے مخصوص نہیں!

ملکیت کو نمو بخشنے کے طریقے۔

ملکیتِ دولت کی بابت اسلام جس نظریہ کا قائل ہے اس کے تحت اس نے مال کے ذریعہ مزید مال حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے طریقوں میں بھی مداخلت کی ہے۔ وہ مالک کو اس بات کی کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں من مانی کرتے رہیں، کیونکہ فرد کی ذاتی مصلحت کے پہلو بہ پہلو اس جماعت کی مصلحت بھی قابل لحاظ ہے جس سے فرد معاملات کرتا ہے۔

چنانچہ ہر فرد کو مال کے ذریعہ نفع کمانے کی پوری آزادی ہے لیکن قانون الٰہی کے مقرر کردہ حدود کے اندر — اسے پوری آزادی ہے کہ زمین میں کاشت کرے۔ خام مال کے ذریعہ مصنوعات تیار کرے، تجارت کرے ...... وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اس کی اجازت نہ کہ وہ دھوکہ دہی پر اتر آئے، یا عام ضرورت کی اشیاء کو قیمت چڑھنے کے انتظار میں

ذخیرہ کیے رہے، یا اپنی دولت کو سود پر دے، یا مزدوروں کی اجرت کے سلسلہ میں ظلم و زیادتی سے کام لے کر خود اپنے نفع میں اضافہ کرے۔ یہ سب کچھ اس پر حرام کر دیا گیا ہے۔ اسلام افزائش دولت کے لیے صرف پاکیزہ اور ستھرے ذرائع ہی کو روا رکھتا ہے اور پاکیزہ ذرائع کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سرمایہ کو اس حد تک بڑھنے کا موقع نہیں دیتے کہ طبقاتی فرق میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔ آج ہم سرمایہ میں جو بے تحاشا اضافہ دیکھتے ہیں اس کی وجہ در اصل دھوکہ فریب، سود، مزدور کی حق تلفی، احتکار، عوام کی ضروریات سے بے جا فائدہ اٹھانا، جیب تراشی، چوری، غصب ..... وغیرہ وہ جرائم ہیں جو آج کے معروف طریق ہائے استحصال (Exploitation) میں مضمر ہیں ...... اسلام ان کی اجازت کبھی نہیں دیتا۔ آیئے اب ہم افزائش دولت کے سلسلہ میں احکام اور ان کی حکمتوں کا مطالعہ کریں۔

۱۔ اسلام کاروبار میں بد دیانتی کو حرام قرار دیتا ہے۔

من غشّ فلیس منّی۔ (اصحاب السنن)

جس نے (کاروبار) میں دھوکہ دیا وہ میرا پیرو نہیں۔

البیّعان بالخیار ما لم یتفرّقا، فان صدقا وبیّنا بورک لھما فی بیعھما، وان کتما وکذبا محقت برکۃ بیعھما۔

(بخاری ومسلم)

خریدار اور فروخت کنندہ جب تک ایک دوسرے سے جدا نہ ہو جائیں وہ معاملہ کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں پورا اختیار رکھتے ہیں، اگر انھوں نے راستبازی اور درست بیانی سے کام لیا تو ان کے معاملہ میں برکت ہوگی اور اگر غلط بیانی اور (عیوب کے) اخفاء کا طریقہ اختیار کیا تو ان کے معاملۂ بیع کی برکت ختم کر دی جائیگی۔

گویا آپ کو خرید و فروخت کی پوری آزادی ہے البتہ شرط یہ ہے کہ نہ تو مال میں کسی طرح کا دھوکہ ہو، نہ دام میں۔ اگر کسی چیز میں کوئی عیب ہو تو اس کا بتا دینا لازم ہے ورنہ آپ دھوکہ باز قرار پائیں گے اور جو نفع کمایا ہوگا وہ بھی آپ کے لیے حرام ہوگا۔ اس حرام نفع کو صدقہ کر دینا بھی آپ کو مواخذہ سے نہیں بچا سکے گا کیونکہ وہی صدقہ آپ کے حساب میں لکھا جائے گا جو حلال کمائی میں سے کیا جائے۔

عن عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ عن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم انّہ قال: "لا یکسب عبدٌ مالا حرامًا فیتصدّق منہ فیقبل منہ، ولا ینفق منہ فیبارک لہ"

عبد اللہ ابن مسعودؓ، رسول اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص حرام مال کمائے اور اس میں سے صدقہ خیرات کرے تو وہ (عند اللہ) قبول کر لیا جائے، یا وہ

فیہ، ولا یترکہ خلف ظہرہ، الا کان زادہ الی النار۔ ان اللہ لا یمحو السیئ بالسیئ، ولکن یمحو السیئ بالحسن، ان الخبیث لا یمحو الخبیث"

(ذکرہ صاحب مصابیح السنۃ فی الصحاح)

اس میں سے خرچ کرے تو اس میں برکت ہو سکے، وہ ایسے مال کو اگر اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے تو یہ اس کے لیے راہ جہنم کا توشہ ثابت ہوتا ہے۔ اللہ برائی کی تلافی برائی کے ذریعہ نہیں کرتا بلکہ برائی کو اچھائی ہی کے ذریعہ مٹایا جا سکتا ہے ناپاک چیز ناپاک چیز کا دفعیہ نہیں کر سکتی۔

آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ :۔

"انہ لا یربو لحم نبت من سحت الا کانت النار اولیٰ بہ" (ترمذی، نسائی)

مال حرام پر پلا ہوا گوشت (جسم) پروان نہیں چڑھتا بلکہ اس کا اصل ٹھکانا جہنم کی آگ ہے!

اس باب میں اسلام کی پالیسی اپنے بنیادی اصولوں کے عین مطابق ہے، وہ ہر طرح کی ضرر رسانی کا سدباب کرنے اور لوگوں کے درمیان باہمی تعاون کی اسپرٹ پیدا کرنے کے بنیادی مقاصد کو یہاں بھی اپنے سامنے رکھتا ہے۔ چنانچہ دیکھا جائے تو دھوکہ دہی ایک طرف تو نفس کی کثافت ہے ساتھ ہی یہ دوسروں کو ضرر رسانی کے بھی ہم معنی ہے۔ بالآخر اس طرح ایک ایسی فضا بن جاتی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کرنا ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اعتماد باہم کے بغیر کسی گروہ میں تعاون کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ پھر دھوکہ دہی کا مآل یہی تو ہے کہ بلا کسی معقول اور جائز کوشش کے کچھ مال ہاتھ لگ جائے، جب کہ اسلام کا عام اصول یہ ہے کہ کوئی ثمرہ بلا محنت نہیں، اور اسی طرح کوئی محنت نہیں جو رائگاں جائے اور اپنے ثمرہ سے محروم رہے۔

۲۔ اشیاء ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کو اسلام دولت کمانے اور اس میں اضافہ چاہنے کا جائز طریقہ نہیں تسلیم کرتا۔

من احتکر فھو خاطئ (مسلم، ابوداؤد، وترمذی) جس نے احتکار کیا وہ غلط کار ہے۔

وجہ یہ ہے کہ احتکار صنعت و تجارت کی آزادی کا خون ہے۔ کیونکہ اجارہ دار (MONOPOLIST) کو یہ نہیں گوارا ہوتا کہ دوسرا بھی بازار میں اسی جیسا مال لائے، یا اسی جیسی مصنوعات تیار کرے۔ وہ تو بازار پر اپنا پورا کنٹرول چاہتا ہے تاکہ لوگوں سے من مانی قیمتیں وصول کر سکے اور نتیجۃً لوگوں کو ہر طرح کی شدت اور تنگی کا شکار کر کے ان کا جینا دوبھر کر دے۔ وہ دوسروں کے لیے اس بات کے مواقع ختم کر دیتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح روزی کما سکیں یا اس تگ و دو میں اس سے زیادہ سرگرمی دکھا سکیں، چنانچہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ احتکار کرنے والا دولت کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھ جاتا ہے اور زائد سامان کو تلف کر دیتا ہے

تاکہ کسی نہ کسی طرح ایک خاص نرخ کو لوگوں پر مسلط کر سکے۔ یہ طرز عمل صریح طور پر سامان معیشت کے ان سماجی خزانوں کی بربادی ہے جن کو اللہ تعالٰے نے تمام انسانوں کے فائدے کے لیے زمین میں پیدا کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ کس طرح برازیلی قہوہ کے ہزار ہا ٹن صرف اس لیے نذر آتش کر دیئے جاتے ہیں کہ بازار میں قہوہ کی قیمت گرنے نہ پائے جب کہ لاکھوں انسانوں کو حسب ضرورت قہوہ نہیں میسر ہوتا! دواؤں کے بازار کا بھی یہی حال ہے۔ یہودی اور یہود صفت افراد ان کا احتکار کرتے رہتے ہیں اور لاکھوں انسان دواؤں بغیر تڑپتے رہتے اور گویا زبردستی دھکیل کر موت کے منھ میں لے جائے جاتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ ذخیرہ اندوز تاجر بڑھ چڑھ کر نفع کما سکیں اور اس طرح اپنی حرام کمائی میں اضافہ کر سکیں!

کسب مال کے اس ذریعہ کا سدّ باب کرنے کو اسلام نے اتنی اہمیت دی کہ احتکار کو دائرہ دین سے خارج کرنے والا جرم قرار دے دیا۔

من احتکر طعاماً اربعین یوماً	جس نے چالیس دن تک سامان غذا کو ذخیرہ کیے
فقد بریٔ من اللہ، وبریٔ اللہ منہ	رکھا اس کو اللہ سے کوئی واسطہ نہیں نہ اللہ کو اس
(مسند امام احمد)	کی کوئی پرواہ!

ایسے شخص کو مسلمان تسلیم ہی نہیں کیا جا سکتا جو جماعت کی دشمنی میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ اپنی ذاتی نفع اندوزی اور اس طرح اپنے خزانہ میں اضافہ کی خاطر اجتماعی مصالح کو دانستہ مجروح کرتے ہوئے سماج میں مصنوعی طور پر خوف اور احتیاج پیدا کر دیتا ہے۔

۳۔ سودی کاروبار بھی افزائش دولت کا ایک حرام ذریعہ ہے جسے اسلام واضح طور پر قابل نفریں قرار دیتا ہے۔ وہ اس کی خباثت واضح کرتے ہوئے اسے اپنانے والوں کو بدترین انجام کی خبر سناتا ہے۔

یَا أَیُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا لَا تَأْکُلُوا الرِّبَا	اے اہل ایمان دوگنا چوگنا کر کے
أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ، وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّکُمْ	سود نہ کھاؤ، اور اللہ سے ڈرو تاکہ
تُفْلِحُونَ۔ (آل عمران: ۱۳۰)	فلاح یاب ہو سکو۔

یہاں مقصود صرف دوگنے، چوگنے سے روک کر سود کی معمولی شرحوں کو سند جواز عطا کرنا نہیں۔ یہ صرف احوال واقعی کا بیان ہے اور جو کچھ (اس وقت عرب میں) عملاً ہو رہا تھا اس کی تفصیل ہے۔ جیسا کہ دوسری آیات سے واضح ہوتا ہے نفس سود کی ممانعت مقصود ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوۡمُوۡنَ اِلَّا کَمَا یَقُوۡمُ الَّذِیۡ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیۡطٰنُ مِنَ الۡمَسِّ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّہُمۡ قَالُوۡۤا اِنَّمَا الۡبَیۡعُ مِثۡلُ الرِّبٰوا ۘ وَ اَحَلَّ اللّٰہُ الۡبَیۡعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنۡ جَآءَہٗ مَوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ فَانۡتَہٰی فَلَہٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمۡرُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ وَ مَنۡ عَادَ فَاُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ ○

(البقرہ : ۲۷۵)

سود خوار کا حال اس شخص کا سا ہے جس کو شیطان (جنوں) نے اپنے اثر سے خبط الحواس بنا دیا ہو۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بیع کا معاملہ بھی سودی معاملہ کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور سودی معاملات کو حرام قرار دے دیا ہے۔ اب جس کو اس کے رب کی نصیحت (اس باب میں) پہنچے اور وہ آئندہ سودی معاملات سے باز آجائے تو جو کچھ (سودی معاملہ) پہلے ہو چکا وہ اُس کا ہے، اور اس باب میں اس کا معاملہ اللہ کے سپرد، اور جو اب بھی یہ حرکت کرے گا تو ایسے لوگ جہنمی ہیں اور اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔!

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ ذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ۔ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ ۚ وَ اِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَ لَا تُظۡلَمُوۡنَ ۔

(البقرہ: ۲۷۸ - ۲۷۹)

اے اہلِ ایمان اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سودی مطالبات باقی رہ گئے ہیں ان کو، اگر تم درحقیقت مومن ہو، چھوڑ دو۔ اگر تم ایسا نہیں کرتے تو تمہیں اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کی وارننگ دی جاتی ہے اگر تم توبہ کرو (اور سودی معاملات سے باز آجاؤ) تو تمہارے راس المال (Principal) تمہارے ہیں (وہ تم کو ملیں گے) نہ تم زیادتی کرو نہ تمہارے ساتھ زیادتی کی جائے گی۔

سود کی مذمت اور اس کے اجتناب کی تلقین میں اسلام یہاں تک آگے جاتا ہے کہ اس معاملہ میں جو کوئی کسی طرح بھی شریک ہو، چاہے اس کا دستاویز لکھنے والا ہو یا اس پر گواہی دینے والا، ان سب پر وہ لعنت بھیجتا ہے۔

عَنۡ جَابِرٍ: لعن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: آکل الربا وموکلہ وکاتبہ و

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اور اس کا دستاویز

شاهدیہ، وقال: هم سواء۔ لکھنے والے، اس پر گواہی دینے والوں سب پر لعنت بھیجی ہے اور فرمایا: یہ سب برابر ہیں۔ (مسلم)

ان تمام امور میں اسلام اُن بنیادی اصولوں کے مطابق پالیسی اختیار کرتا ہے جو مال و دولت، اخلاق اور مصالح عامّہ کے سلسلہ میں اس کے سامنے ہیں۔ اس کے نزدیک دولت صاحب دولت کے ہاتھ میں ایک امانت ہے اور وہ اس پر پوری جماعت کے مفاد کا نگراں مقرر کیا گیا ہے۔ اسے لوگوں کو نقصان پہنچانے اور ذاتی نفع کی خاطر اس ذمہ داری کو پس پشت ڈال دینے کا کوئی حق نہیں کہ وہ اُن کی ضرورت مندی کی گھڑی کا منتظر رہے۔ ان کی کمزور پوزیشن سے بے جا فائدہ اٹھائے اور جو کچھ انھیں دیتا ہے اس سے بڑھ چڑھ کر معاوضہ وصول کرے۔ ضرورت ہر قسم کی ہوتی ہے۔ کبھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے جس پر زندگی کی گاڑی کے آگے کھسکنے کا انحصار ہے تو کبھی علاج کے لیے دوا کی یا حصول علم یا کسی اور ضروری کام کے لیے اخراجات کی اس طرح یا تو یہ سارے کام یونہی پڑے رہ جائیں گے یا دولت مند لوگ ضرورت مندوں پر اپنا حکم چلائیں گے، اس کو تھوڑا دے کر اس سے بہت سا واپس لیں گے اور اس طرح اس کی محنت کا حق دبا بیٹھیں گے۔ وہ بے چارہ محنت مشقت برداشت کیے جائے اور نتیجہ صرف یہ نکلے کہ یا تو ساری کی ساری کمائی سود ادا کرنے میں سود خوار کی نذر ہو جائے یا سال بسال قرض میں اضافہ ہوتا جائے۔

یہ زائد از ضرورت دولت جس سے صاحب مال فائدہ اٹھاتا ہے —— درین حالیکہ وہ کرتا کچھ نہیں بس راس المال (PRINCIPAL) اس کا ہوتا ہے —— یہ در اصل خون اور پسینہ ہوتا ہے جس کو یہ کمال حیوانیت سے چاٹتا رہتا ہے اور بیٹھے ہی بیٹھے حریصانہ طور پر چوستا رہتا ہے۔

اسلام جو محنت کی عظمت و تقدس جتلاتا ہے اور اسے ملکیت اور نفع کی اساس قرار دیتا ہے اس بات کو روا نہیں رکھتا کہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہنے والا فرد مال کا حق دار ٹھہرے۔ یا دولت، دولت کو جنم دے۔ دولت کو صرف محنت جنم دے سکتی ہے، بصورت دیگر وہ مال حرام قرار پاتا ہے۔

اسلام فرد کی اخلاقی پاکیزگی اور جماعت میں باہم میل و محبت دونوں کو پوری اہمیت کے ساتھ سامنے رکھتا ہے۔ درحقیقت نہ تو کوئی صاحب خیر اور شریف انسان سود خواری میں ملوث ہو سکتا ہے نہ ہی یہ ممکن ہے کہ کسی جماعت میں سود خواری کی لعنت عام ہو جائے اور پھر بھی اس کے افراد میں باہم انس و محبت باقی رہ جائے۔ جو شخص مجھے ایک دینار صرف اس لیے دیتا ہے کہ اُسے دو دینار کر کے مجھ سے واپس وصول کر سکے وہ درحقیقت

میرا دشمن ہے، میں کبھی اپنا دل اس کی طرف سے صاف نہیں رکھ سکتا اور نہ ہی اس کی محبت میرے دل میں جگہ پا سکتی ہے۔ تعاون اسلامی سماج کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے اور سود اس اصول کا دشمن واقع ہوا ہے، وہ اس بنیاد کو ڈھا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام اسے سخت ناپسند کرتا ہے۔

حرمت سود میں ایک اور حکمت مضمر ہے جو ہم پر آج دورِ جدید میں منکشف ہو رہی ہے اور غالباً کل تک سامنے نہ آئی تھی۔ وہ یہ کہ سود ایک ایسا عامل ہے جو سرمایہ میں بے حد و حساب اضافہ کرتا جاتا ہے! یہ اضافہ نہ تو کسی سعی و جہد کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کسی طرح کی محنت کا ثمرہ۔ سود کی یہ صفت ایسی ہے جو ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہنے والے ایک طبقہ کو اس کا موقع فراہم کرتی ہے وہ افزائش دولت کے سلسلہ میں تمام تر اسی ایک ذریعہ پر انحصار کر بیٹھیں۔ نتیجۃً اس طبقہ میں سستی و کاہلی، مسرفانہ عیاشی اور بدکرداری پھیل جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ ان محنت کشوں کے بل پر جو دولت کے محتاج ہوتے ہیں اور تنگی کے عالم میں مجبور ہو کر سودی قرض لیتے ہیں۔ اس طرح دو خطرناک اجتماعی امراض سر اٹھاتے ہیں۔ سرمایہ میں بے حد و حساب اضافہ اور انسانیت کی بلند و پست دو طبقات میں روز افزوں تفریق جو کسی حد پر ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی۔ مزید برآں ایک نئے خطرہ کے طور پر ایک کاہل اور بے عمل طبقہ کا وجود جو بجز عیش و عشرت کچھ اور کرنے کا نام نہیں لیتا، اور دنیا کی ساری نعمتیں بس بیٹھے ہی بیٹھے حاصل کرتا رہتا ہے۔ گویا اس کی دولت مزید دولت کے شکار کے لیے ایک جال ہے، ایسا جال جس میں شکار کو مغالطہ دینے کے لیے دانے کی بھی ضرورت نہیں! ضرورت مندوں کے غول اس میں خود بخود پھنستے رہتے ہیں، ان کی ضروریات ان کو دھکیل کر آگے بڑھاتی ہیں اور اپنے پیروں پر چل کر وہ اُس میں آپڑتے ہیں!

ضرورت مندوں کو کسی نفع کی توقع بغیر قرض دیا جانا چاہیے، یہی شرافت کا بھی تقاضا ہے اور اسی طرح باہم اُنس و محبت بھی پروان چڑھ سکتی ہے۔ یہی روش اس بات کی بھی ضمانت دے سکتی کہ سماج میں اصحابِ دولت محروم افراد کی، اور ذی استطاعت لوگ معذور افراد کی کفالت کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت بذاتِ خود کوئی اعلیٰ قدر نہیں، اصل چیز اس سے مستفید ہونا اور اس کے لیے کوشش کرنا ہے۔ لہٰذا اُس کا کسی مخصوص فرد کے ہاتھ میں ہونا اس بات کا جواز نہیں فراہم کر سکتا کہ اصل محنت تو وہ کر رہا ہے جس نے اُسے قرض لیا ہے مگر فائدہ اِس کو حاصل ہو۔ ضروری ہے کہ محنت کا ثمرہ محنت کرنے والے کو ملے اور صرف راس المال ـــ بلا کسی اضافہ اور نفع کے ـــ صاحب مال کو واپس مل جائے۔

اسلام کے نزدیک قرض سب یکساں ہیں، خواہ اُسے ضروریات میں خرچ کرنے کے لیے لیا جائے، یا

پیدا آور کاموں پر لگانے کے لیے۔ کیونکہ اگر قرض مصارف کے لیے لیا گیا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ قرض لینے والا اپنی ضروریات میں خرچ کرے تو اُس کو اصل کے علاوہ کچھ اور دینے پر مجبور کرنا کسی طرح قرین انصاف نہیں، یہی بہت ہے کہ وہ گنجائش ہونے پر اصل کو واپس کر دے۔ اگر قرض پیدا آور کاموں میں لگانے کے لیے لیا گیا ہے تو اس پر جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ ثمرہ دراصل اس محنت کا ہے جو وہ خود کرتا ہے نہ کہ اس مال کا جو اس نے قرض لیا، کیونکہ مال بلا محنت نفع آور نہیں ہوتا اور اسلام میں اصل اہمیت محنت ہی کو حاصل ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر سود کو کسی حال میں جائز نہیں قرار دیا گیا ہے۔ اپنی ضروریات کے لیے قرض چاہنے والے کو قرض دینا بہرحال لازمی قرار دیا گیا ہے۔

اب اگر قرض لینے والے نے قرض لیا اور پھر تنگی ہی میں مبتلا رہا تو اُسے "فراخی تک مہلت" دی جائے گی۔ (فَنَظِرَۃٌ اِلیٰ میسرۃ) میری رائے میں یہ صیغہ حکم کے لیے ہے کیونکہ یہ شرط اور جواب شرط کی شکل میں وارد ہوا ہے۔

وَاِن کَانَ ذُوْعُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلیٰ مَیْسَرَۃ (البقرہ: ۲۸۰)	اگر (مقروض) تنگ حالی میں مبتلا ہو تو اسے فراخی تک مہلت ملنی چاہیے۔

اس صیغہ کے استعمال سے حکم دینا مقصود ہے نہ کہ صرف ترغیب اور اظہار پسندیدگی۔ اس حکم کے پہلو بہ پہلو اسلام نرمی برتنے اور سہولت سے پیش آنے کی تلقین بھی کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"رحم اللہ رجلاً سمحاً اذا باع واذا اشتریٰ واذا اقتضیٰ" (بخاری: ترمذی)	اس شخص پر خدا اپنے رحم و کرم کی بارش کرے جو خرید و فروخت میں خوش دلی اور سلیقہ مندی برتتا ہے اور قرض کا تقاضا کرنے میں نرمی سے پیش آتا ہے۔

قرض کے تقاضے میں نرمی اور شرافت مقروض کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھنے کا باعث بنتی ہے اور اس کے دل میں قرض دینے والے کی محبت کے لیے جگہ بناتی ہے، یہی نہیں بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ ابھارتی ہے کہ حتی الامکان ادا کرنے کی پوری کوشش کرے۔ آپؐ نے فرمایا:

من سرّہ ان ینجیہ اللہ من کرب یوم القیامۃ فلینفس عن معسرٍ او لیضع عنہ۔ (مسلم)	جو قیامت کے روز کرب و اضطراب سے بچنا چاہتا ہو اسے چاہیے کہ تنگ حال مقروض کی مشکلات رفع کرے یا اس سے جو مطالبہ ہو اس میں کچھ کمی کر دے۔

اور یہ کہ :

من انظر معسرًا او وضع لہٗ اظلّہ اللہ یوم القیامۃ تحت ظلّ العرش یوم لا ظلّ الا ظلّہ ۔ (ترمذی)

جس نے تنگ حال مقروض کو مہلت دی یا اس کے لیے کچھ کمی (اصل قرض میں سے) کر دی اسے اللہ قیامت کے دن عرش پاک کے سایہ تلے لے گا، جب کہ اس دن بجز اس کے سایہ کے کوئی سایہ میسر نہ ہوگا۔

اس کے بالمقابل اسلام قرض دار کا فرض قرار دیتا ہے کہ وہ قرض کو ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے تاکہ اس طرح اپنی ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ ہو جائے اور قرض دینے والے کے احسان کا بدلہ واپسی کے معاملہ میں وعدہ کا سچا ثابت ہو کر ادا کر دے۔ نیز اس کے اس طرز عمل کا ایک مزید فائدہ یہ بھی ہوگا کہ معاملات میں لوگوں کا باہمی اعتماد بڑھ جائے گا۔

من اخذ اموال النّاس یرید اداءھا ادّی اللہ عنہ ومن اخذھا یرید اتلافھا اتلفہ اللہ ۔ (بخاری)

جو ادا کرنے کی نیت سے لوگوں کا مال (قرض) لیتا ہو اللہ اس کی طرف سے ادائگی کا بندوبست فرمائے گا۔ اور جو اڑانے بڑپنے کی نیت سے لیتا ہے اللہ اس کو بربادی کے حوالہ کر دے گا۔

چنانچہ جو ادا کرنے کی نیت سے قرض لے گا وہ ضرور کوشش کرے گا کہ کچھ کمائے اور روزی حاصل کرے اور عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ دھن کا پکا عزّ و شرف کمانے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ اور جو اڑانے بڑپنے کے خیال سے لے گا وہ دوسروں کے مال پر عیش کرنے ہی میں ٹھاٹ جمائے گا اور سعی وجہد چھوڑ، ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے گا۔ نتیجہ میں سستی اور کاہلی اُسے آ دبوچے گی، اس کی ہمّت جواب دے دے گی اور بالآخر وہ ناکامی اور تباہی سے دوچار ہوگا۔ اللہ کا رسول فرماتا ہے۔

مطل الغنی ظلمٌ (رواہ الخمسۃ) مال رکھنے والے کا واپسی قرض میں خواہ مخواہ تاخیر کرنا صریح ظلم ہے۔

ایک شخص نے دریافت کیا کہ: "اللہ کے رسول، آپ کا کیا خیال ہے اگر میں راہِ خدا میں قتل کیا جاؤں تو اللہ میری خطاؤں سے درگذر فرمائے گا؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا "ہاں بشرطیکہ تو خالصۃً للہ لڑ رہا ہو، صبر و ثبات کا مظاہرہ کرے اور الٹے قدم بھاگتے ہوئے نہیں بلکہ آگے کو اقدام کرتے ہوئے مارا جائے" پھر آپؐ نے اس شخص سے فرمایا کہ ذرا اپنا سوال دہرانا! اس نے سوال کو دہرایا۔ آپؐ نے فرمایا، "ٹھیک ہے، لیکن قرض نہیں بخشا جائے گا۔ جبریل مجھے یہ بات بتا گئے ہیں۔"[1] گویا صاحب قدرت مقروض کے

---

[1] مالک، مسلم، ترمذی، نسائی۔

سر سے قرض کا بار اس طرح بھی نہیں ہٹ سکتا کہ وہ جہاد کرے، راہ خدا میں مخلصانہ طور پر صبر و ثبات کے ساتھ لڑے اور پیٹھ پھیر کر بھاگتا ہوا نہیں جرأت مندانہ اقدام کی حالت میں مارا جائے، کیونکہ قرض کا تعلق دوسروں کے حقوق سے ہے جو اس کے ذمہ ہیں۔ صرف اللہ کا حق نہیں۔ یہ اس شکل میں جبکہ وہ ادائے قرض پر قادر ہو، رہا معذور اور عاجز آدمی تو وہ زکوٰۃ میں سے ایک حصہ کا مستحق قرار دیا گیا ہے۔ "اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ ...... وَالْغَارِمِیْنَ" اس کو ادائے قرض کی خاطر صدقہ کے طور پر کچھ دینا بھی مناسب ہے۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: رسول اللہ کے زمانہ میں ایک شخص نے (کاروباری نقطہ نظر سے) پھلوں کا ایک باغ خریدا۔ آفات سماوی کے نتیجہ میں باغ تباہ ہو گیا۔ بے چارہ بہت مقروض ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اس شخص پر صدقہ کرنے کی تلقین کی چنانچہ لوگوں نے صدقہ کیا لیکن اتنا مال نہ جمع ہو سکا کہ پورا قرض ادا کیا جا سکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو مل جائے اسے لے لو، اب اور زیادہ تمہیں نہیں مل سکتا۔ (ترمذی)

جب پے در پے فتوحات کے نتیجہ میں کافی مال جمع ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اگلا قدم اٹھایا۔ اب آپ نے یہ دستور بنا لیا کہ مقروض افراد کے بعد ان کے ذمہ کے قرضے بیت المال سے ادا کر دیا کرتے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: "کان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یؤتی بالرجل المتوفیٰ علیہ الدین فیسأل: ھل ترک لدینہ قضاء؟ فان حدّث انّہ ترک وفاءً صلّی علیہ، والاّ قال للمسلمین صلّوا علیٰ صاحبکم، فلمّا فتح اللہ علیہ الفتوح قام فقال: انا اولیٰ بالمومنین من انفسھم فمن مات علیہ دین ولم یترک وفاء، فعلینا قضاءہ، ومن ترک مالاً فلورثتہ (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی)

حضرت ابو ہریرۃ رضؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا: "مقروض افراد کی میت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی جاتی تو آپ دریافت کرتے "کیا اس نے اپنے قرض کی ادائگی کے بقدر مال چھوڑا ہے۔ اگر جواب ملتا کہ اس نے اس قدر مال چھوڑا ہے کہ قرض ادا کیا جا سکے تب تو اس کی نماز جنازہ پڑھاتے ورنہ مسلمانوں سے کہہ دیتے کہ اپنے ساتھی کی نماز جنازہ ادا کریں۔ جب اللہ نے آپ کو متعدد فتوحات عطا کیں تو آپ نے اعلان فرما دیا کہ: میں مسلمانوں کا ان کی نسبت بھی زیادہ قریبی اور سرپرست ہوں، پس جو اس حال میں انتقال کر گیا کہ اس پر قرض ہے اور ادائگی کے لیے

اس نے کافی مال نہیں چھوڑا تو اس قرض کی ادائیگی ہمارے ذمہ ہے
اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے ورثاء کا حق ہے۔

ان نظائر سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جس طرح اسلام کو اس کی بڑی فکر ہے کہ بیکس و مجبور کی مدد کی جائے اور اسے ادائے قرض میں سہولت بہم پہنچائی جائے۔ اسی طرح وہ اس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ ہر حق دار کو اس کا حق ملے۔ اسلام معاملہ کے ہر پہلو کا لحاظ رکھتا ہے، جملہ مصالح کا تحفظ عمل میں لاتا ہے، اور حقوق و فرائض کے درمیان توازن قائم کرتا ہے۔

صرف کی راہیں

اوپر ہم نے ان حدود پر گفتگو کی ہے جو اسلام نے باہمی لین دین کے ذریعہ افزائش دولت کے سلسلہ میں عاید کی ہیں۔ جہاں اسلام نے کسب مال کے لیے یہ حدود متعین کی ہیں وہیں وہ مال کے صرف کو بھی یونہی بلا کسی ضابطہ کے نہیں چھوڑ دیتا۔ چنانچہ صاحب دولت کو کھلی چھٹی نہیں دی گئی کہ جس طرح چاہے مال کو نہ صرف کرے اور روکے رکھے یا جہاں جس طرح چاہے اُسے خرچ کرتا رہے گو اس طرح کا تصرّف ایک شخصی مسئلہ ہے لیکن اسلام میں فرد کی یہ حیثیت نہیں تسلیم کی گئی ہے کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں من مانی کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ بلاشبہ اُسے یک گونہ آزادی حاصل ہے لیکن چند متعیّن حدود کے اندر رہتے ہوئے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شاید ہی کوئی انفرادی فعل ہو جس کا تعلق دوسروں سے کچھ بھی نہ ہو، یہ دوسری بات ہے کہ یہ تعلّق بالکل واضح اور قریبی نہ ہو۔

اسلام کو نہ تو اسراف کی حد تک بڑھا ہوا خرچ کرنا پسند ہے نہ ہی کنجوسی کی حد تک ہاتھ روکنے کو وہ صحیح سمجھتا ہے، کیونکہ یہ دونوں ہی طریقے بالآخر اس فرد اور پوری جماعت کے حق میں نقصان کا باعث بنتے ہیں۔

ولا تجعل يدك مغلولة الى عنقك
ولا تبسطها كل البسط فتقعد ملوما محسورا
(الاسراء: ۲۹)

اپنے ہاتھ کو گلے میں باندھ کر سکیڑ نہ لے، نہ ہی اسے پوری طرح پھیلا کر (بعد میں تو) ہدف ملامت بن کر تنگ دستی کے عالم میں بیٹھ رہنے پر مجبور رہو جائے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ - (الاعراف: ۳۱)

اے بنی آدم ہر مسجد میں تم اپنے کو زیب و زینت دینے والے اسباب کو ساتھ رکھو اور کھاؤ پیو لیکن اسراف میں نہ مبتلا ہو۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ مسرفین کو پسند نہیں کرتا۔

صرف سے دست کشی کا نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ نفس جائز حد تک بھی آرام و راحت نہ اٹھا سکے در حالیکہ اسلام ضروری قرار دیتا ہے کہ فرد شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنی ذات کو بھی آرام پہنچائے

اور مختلف لذائذ سے لطف اندوزی کا موقع دے۔ اسے یہ بات چنداں گوارا نہیں کہ لوگ ان چیزوں سے بھی محروم رکھے جائیں جو حرام نہیں قرار دی گئی ہیں۔ کیونکہ زندگی کو معقول اور خوش گوار ہونا چاہیے۔ ایسا ہونا چاہیے کہ اس میں حسن و جمال پیدا ہو سکے اور اسے بلا اسراف اور لہو لعب میں مبتلا ہوئے شاداں و فرحاں اور شاداب و شگفتہ رکھا جا سکے۔ اسلام نے ترکِ لذائذ، زہد و تقشّف اور پاکیزہ و طیّب نعمتوں سے خود کو محروم کر لینے کا حکم کبھی نہیں دیا۔

چنانچہ مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہے کہ اسلام انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ مناسب حد تک زیب و زینت اختیار کرے۔ اس آیت کے بعد ہی قرآن استفہام انکاری کے انداز میں کہتا ہے۔

قُلْ: مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ؟ قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ۔ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ، وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ، وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا، وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ۔

(الاعراف: ۳۲، ۳۳)

ان سے کہو کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں بھی ایمان والوں کے لیے ہیں۔ اور قیامت کے دن تو خالصۃً انہی کے لیے ہوں گی۔ اس طرح ہم اپنی باتیں صاف صاف بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھنے والے ہیں۔ ان سے کہو کہ میرے رب نے جو چیزیں حرام کی ہیں وہ تو یہ ہیں: بے شرمی کے کام — خواہ کھلے ہوں یا چھپے — اور گناہ اور حق کے خلاف زیادتی اور یہ کہ اللہ کے ساتھ تم کسی کو شریک کرو جس کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی اور یہ کہ اللہ کے نام پر کوئی ایسی بات کہو جس کے متعلق تمہیں علم نہ ہو کہ وہ حقیقت میں اسی نے فرمائی ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ تمام لوگ، بڑے چھوٹے اور امیر و غریب — سب زندگی کو خوش گوار بنانے والی نعمتوں سے فائدہ اٹھائیں، اور یہی وجہ ہے کہ اس آیت میں خطاب کا رخ "بنی آدم" کی طرف ہے۔ اب اگر وہ کبھی صبر اور تسلیم و رضا کی تلقین کرتا ہے تو اس کے معنی زہد اور ترک دنیا کے نہیں بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ جب شدائد و مصائب آن پڑیں تو ان کے دور ہونے یا دور کیے جانے تک آدمی بجائے گھبرانے کے اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ رہے۔ ایسے مواقع کے علاوہ فرد ہمیشہ اس بات کا مکلّف ہے کہ حلال چیزوں سے

متمتع ہوتا رہے۔ اور جماعت پر اس بات کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ اپنے سارے افراد کے لیے یہ چیزیں مہیا کرنے کی کوشش کرے اور انھیں اُن چیزوں سے محروم نہ رکھے جن سے مستفید ہوتے رہنے کی دعوت ان کو اللہ تعالےٰ نے دی ہے۔

اسی لیے اسلام نے فقراء کو ——— یعنی ان لوگوں کو جو نصاب زکاۃ سے کم مال رکھتے ہیں، زکاۃ میں سے ایک حصہ کا مستحق قرار دیا ہے جس کا منشا صرف یہی نہیں کہ ان کو کفاف (ناگزیر ضرورت) کے بقدر میسّر آجائے کیونکہ اتنا تو ان کے پاس ہوتا ہی ہے، بلکہ یہ بھی ہے کہ انکو رزق میں مزید فراخی نصیب ہو۔ یہ اس لیے کہ اسلام صرف بقدر کفاف کا طالب نہیں بلکہ وہ زندگی سے متمتع ہونے پر ابھارتا ہے ظاہر ہے کہ تمتع ہونے کا سوال کفاف کے بعد ہی پیدا ہوتا ہے اور اس سے زائد ملنے پر ہی ممکن ہے۔

جب اسلام فقیر کو زکاۃ میں سے حصہ دیتا ہے تاکہ اس مزید مال سے وہ اپنے نفس کی آسائش کا کچھ سامان کرے اور ناگزیر ضروریات کے ماسوا بھی سامانِ حیات سے لطف اندوز ہو سکے، تو صاحبِ مال کو بدرجۂ اولیٰ خرچ کرنا چاہیے۔ اسے ایک معقول حد تک سامانِ حیات فراہم کرنا چاہیے، اور اپنے نفس کو پاکیزہ اشیاء سے محروم نہ کرنا چاہیے ——— اور ظاہر ہے کہ پاکیزہ اشیاء بکثرت اور بے شمار ہیں! ——— تاکہ زندگی میں نکھار پیدا ہو، وہ حسن وجمال سے آراستہ ہو اور (اس خوش گوار فضا میں) انسان کی طبیعت ضروریات سے ماوراء بلندئ تفکیر اور لطافت احساس کی فضا میں سانس لے سکے اور اس کارخانۂ تخلیق اور عالم موجودات پر غور وفکر نیز (اس صنّاعی کے) کمال اور جمال کی بلندیوں کا شعور پیدا کرنے والے تدبر میں محو ہو سکے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اذا آتاك الله نعمة فليُرَ اثر نعمة الله عليك وكرامته۔ (ابو داؤد ونسائی)

جب اللہ تجھے نعمت سے نوازے تو ضروری ہے کہ اس انعام الٰہی کا اثر تیرے (ظاہر کے) اوپر دیکھا جا سکے!

گویا آپ کے نزدیک باوجود قدرت کے خستہ حال اور مسکین صورت بنا رہنا اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناقدری، بلکہ ان کے انکار کے ہم معنیٰ ہے جسے اللہ تعالےٰ ناپسند کرتا ہے۔

یہ ساری گفتگو ایک زاویۂ نظر سے تھی، مال کے گردش میں آنے اور صرف کیے جانے سے روکنے کو اسلام ایک اور زاویہ سے بھی دیکھتا ہے، یعنی یہ کہ اس کا اس طرح روکے رہنا اس کے حقیقی عمل کو معطل کر دیتا ہے جماعت کا مفاد متقاضی ہے کہ اس کی دولت ہمیشہ گردش کرتی رہے تاکہ زندگی ہر طرح پھلے پھولے، پیداوار

میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو، محنت کاروں کے لیے وسائل کار فراہم ہوں اور انسانیت عامہ کو تعمیری سرگرمیوں کے پورے پورے مواقع میسّر آئیں۔ مال کا روکے رکھنا اس پورے نظام کو معطل کر دیتا ہے۔ لہٰذا وہ اسلام کے نزدیک حرام ہے۔ اس سے مال دار فرد کے مخصوص مفادات اور سماج کے عام مصالح دونوں کا خون ہوتا ہے۔

اسراف دوسری انتہا کا نام ہے اور وہ بھی فرد اور جماعت دونوں کے لیے مہلک ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اللہ کی راہ میں مال صرف کرنا، خواہ سارے کا سارا مال اس مصرف میں کام آجائے، اسراف نہیں کہلاتا۔ اوپر وہ حدیث گذر چکی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تمنا ظاہر کی ہے کہ اگر آپ کے پاس پہاڑ برابر سونا ہوتا تو بھی اُسے کُل کا کُل اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے اور دو قیراط بھی بچا کر نہ رکھتے۔ اسراف کا اطلاق اس فضول خرچی پر ہوتا ہے جو اپنے نفس کی خاطر کی جائے اور اسلام کو اِسی سے بحث ہے۔

ان معنٰی میں اسراف اسی عیش پرستی کا نام ہے جسے اسلام سخت ناپسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک یہ بات بہت بُری ہے کہ مال امیروں ہی کے درمیان گردش کرتا رہے، تاکہ ایسا نہ ہو کہ کثرت مال لوگوں کو عیش وعشرت میں مبتلا کر دے۔ اسلام عیش پرستی کو فرد وجماعت دونوں کے لیے شر وفساد کا منبع قرار دیتا ہے۔ چنانچہ اس کے نزدیک یہ ایک ایسا منکر ہے جسے مٹا دینا جماعت کا فرض ہے، اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اِسی کے سبب خود کو ہلاکت کے منہ میں جا ڈالے گی۔

ایسی بہت سی آیات اور متواتر حدیثیں ہیں جو دو ٹوک الفاظ میں عیش کوشی کو ناپسندیدہ اور حرام قرار دیتی ہیں۔ یہ واضح طور پر بتاتی ہیں اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک یہ انتہائی گھناونے قسم کا فعل حرام ہے۔ وہی اسلام جو لوگوں کو زندگی کی پاکیزہ نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی دعوت دیتا اور اس بات کو ناپسندیدہ قرار دیتا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے تو انھیں حلال قرار دیا مگر لوگ انھیں اپنے اوپر حرام کر لیں؛ وہ اسلام جو زندگی کو صرف باقی رکھنے اور خستہ حال بنا کر رکھنے کی بجائے اسے حسین، خوش گوار اور دل پسند بنا کر گذارنے پر ابھارتا ہے . . . وہی اسلام اسرافِ بے جا اور عیش پرستی کو اتنی شدّت کے ساتھ ناپسندیدہ اور نامرغوب قرار دیتا ہے۔

چنانچہ قرآن بتاتا ہے کہ عیش پرست کم ہمّت، کمزور، اور بزدل ہوتے ہیں۔

وَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ اَنْ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ — اور جب کوئی سورۃ اس مضمون کی نازل ہوئی کہ اللہ

وَجَاهِدُوْا مَعَ رَسُوْلِهٖ، اسْتَاذَنَكَ اُولُوا الطَّوْلِ مِنْهُمْ، وَقَالُوْا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِيْنَ -

(التوبۃ ۸۶)

کو مانو اور اس کے رسول کے ساتھ مل کر جہاد کرو تو تم نے دیکھا کہ جو لوگ ان میں سے صاحب مقدرت تھے وہی تم سے درخواست کرنے لگے کہ انھیں جہاد کی شرکت سے معاف رکھا جائے اور انھوں نے کہا کہ ہمیں چھوڑ دیجیے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔

اسلام ان صاحب قدرت لوگوں کو مجاہدین کی صفوں سے پیچھے ہٹ جانے اور بیٹھ رہنے پر کتنی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، اس کا پورا اندازہ اس وقت ہوگا جب ہم اچھی طرح یہ سمجھ لیں کہ اسلام جہاد کو کتنی اہمیت دیتا ہے، اس کی کتنی ترغیب دلاتا ہے، اور جو لوگ خود سے اس کی طرف بڑھیں ان کو کتنا بلند مرتبہ قرار دیتا ہے۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

من مات ولم یغز، ولم یحدث نفسہٗ بغزوٍ مات علیٰ شعبۃٍ من النفاق -

(مسلم - ابو داؤد - نسائی)

وہ شخص یک گونہ نفاق کی حالت میں مرا جس نے موت تک اللہ کی راہ میں جنگ نہ کی، اور نہ اس کے دل میں اس کا کوئی ارادہ پیدا ہوا۔

یہ چنداں تعجب کی بات نہیں کیونکہ عیش پرست کاہل اور سہولت پسند ہوتا ہے نہ اس میں مردانگی باقی رہتی نہ قوت ارادی۔ اس نے محنت و مشقت کی عادت نہیں ڈالی، لہٰذا اس کا جذبہ دروں سرد پڑ جاتا ہے اور اس کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں۔ جو چیز اس کو عزیز ہے وہ شہوانی لذائذ ہیں، جہاد کے سلسلہ کی مشقتیں اسے کچھ عرصہ کے لیے ان حیوانی لذتوں سے محروم کر دیتی ہیں، اور ایسا آدمی بجز ان بے حیا اور محش و ناکارہ اقدار کے زندگی میں کسی اور چیز کی قدر و قیمت سے آشنا ہی نہیں ہوتا۔

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ تاریخ انسانی میں مترفین کا عمل کیا رہا ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ اس ہدایت کی راہ میں روڑا اثابت ہوئے ہیں جو ان کے اور ان کے کمزور زیردستوں کے لیے آئی ہے۔ جس سماج میں کچھ لوگ عیش پرست ہوں وہاں زیردستوں کا ایک گروہ بھی ضروری ہے تاکہ وہ ان کی خوشامدیں کرکے ان کے کبر نفس کو تسکین دے۔ محنت کرکے ان کی خواہشات پوری کرے، اور ان کی چاکری کرتا ہوا کیڑے مکوڑوں کی طرح فنا ہو جائے۔

وَمَا اَرْسَلْنَا فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا

ہم نے جب کبھی کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا بھیجا تو اس کے

قَالَ مُتْرَفُوْهَا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ

(سباء: ۳۴)

خوش حال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم تو اس چیز کا انکار کرتے ہیں جسے لے کر تم بھیجے گئے ہو۔

وَقَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِلِقَآءِ الْاٰخِرَةِ وَاَتْرَفْنٰهُمْ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ وَلَئِنْ اَطَعْتُمْ بَشَرًا مِّثْلَكُمْ اِنَّكُمْ اِذًا لَّخٰسِرُوْنَ۔

(المومنون: ۳۳-۳۴)

اور اس کی قوم کے ان سرداروں نے جنھوں نے کفر کیا تھا اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا تھا، اور جنھیں ہم نے دنیا کی زندگی میں خوش حال بنایا تھا، یہ کہا، یہ تو تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے اور کچھ نہیں، جو تم کھاتے ہو وہی یہ بھی کھاتا ہے اور جو تم پیتے ہو وہی یہ بھی پیتا ہے، اگر تم نے اپنے ہی جیسے ایک آدمی کی اطاعت کی تب تو تم واقعی بڑے ہی گھاٹے میں رہو گے۔

وَقَالُوْا: رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا۔ رَبَّنَآ اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا (الاحزاب: ۶۷-۶۸)

اور انھوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار، ہم نے اپنے سرداروں اور اپنی قوم کے بڑے لوگوں کی پیروی کی اور انھوں نے ہمیں راہِ راست سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار ان (سرداروں اور بڑے) لوگوں کو دوگنا عذاب دے اور ان پر بہت بڑی لعنت کر۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ عیش پرستوں کو جس چیز کی سب سے زیادہ فکر ہوتی ہے وہ ان کی نرالی، سہل پسند اور مریضانہ زندگی ہے۔ یہ اپنی خواہشات و مرغوبات سے چمٹے رہتے ہیں۔ ان کو اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے خدمت گذاروں اور نمک خواروں کا ایک گروہ چاہیے۔ دین و ایمان ان کو ان مرغوبات کے ایک بڑے حصّہ سے محروم کر دیتا اور دنیا کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کے لیے چند راہیں متعیّن کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جائز حدود ان کے لیے بہت کم اور غیر تشفی بخش ثابت ہوتی ہیں جس پر ان کی مریضانہ ذہنیت اور بے لگام خواہشات قانع نہیں ہوتیں۔ پھر اسی پر بس نہیں، اسلام تمام انسانوں کی قدر و قیمت بالا کرتا ہے، اور ان عیش پرستوں کے لیے مفلس و کمزور طبقات پر اس طرح کی حکومت جتانے کا موقع نہیں باقی رہتا جس کے سبب وہ ان کے آلۂ کار اور غلام بنے رہتے ہیں۔ اسلام ان اوہام و خرافات اور بے بنیاد قصّوں کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ جن کے ذریعہ یہ لوگ اپنے گرد ایک ہالہ بنا لیتے اور جاہل و گمراہ اور

غلامانہ ذہنیت رکھنے والے سماج میں انھیں استحصال کے لیے ایک موثر حربے کے طور پر استعمال کیا کرتے ہیں۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ یہی وجہ ہے یہ لوگ ہر ہدایت اور ہر روشنی کے دشمن ہوتے ہیں۔ عیش پرستی ضمیر انسانی پر جو برا اثر ڈالتی ہے، اور لذت پرستی کی زندگی انسان کے جذبات عالیہ کو جس جمود و خمود کا شکار بنا دیتی ہے وہ ان خرابیوں کے علاوہ ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ، فَيَقُولُ: أَأَنْتُمْ أَضْلَلْتُمْ عِبَادِي هَٰؤُلَاءِ أَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيلَ؟ قَالُوا سُبْحَانَكَ! مَا كَانَ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَّخِذَ مِنْ دُونِكَ مِنْ أَوْلِيَاءَ، وَلَٰكِنْ مَتَّعْتَهُمْ وَآبَاءَهُمْ حَتَّىٰ نَسُوا الذِّكْرَ وَكَانُوا قَوْمًا بُورًا۔ (الفرقان ۱۷-۱۸)

اور وہی دن ہو گا جب کہ (تمہارا رب) ان لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے ان معبودوں کو بھی بلائے گا جنھیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پوج رہے ہیں پھر وہ ان سے پوچھے گا کیا تم نے میرے ان بندوں کو گمراہ کیا تھا؟ یا یہ خود راہ راست سے بھٹک گئے تھے؟ وہ عرض کریں گے: پاک ہے آپ کی ذات، ہماری تو یہ مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں، مگر آپ نے ان کے باپ دادا کو خوب سامان زندگی دیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۔

یعنی عیش و عشرت کے سامان جو عرصہ دراز تک میسر رہیں، اور آبا و اجداد سے ورثہ میں ملے ہوں انسان کو خدا سے غافل کر دیتے اور ناکارہ بنا کر چھوڑتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ وہ لوگ بُور ہو گئے۔ قرآن نے گویا ان کی تصویر کھینچ دی ہے۔ اس میں بڑے گہرے معانی پوشیدہ ہیں "بُور" ان قحط زدہ زمینوں کو کہتے ہیں جو کچھ پیدا کر کے نہیں دیتی ہیں۔ ان لوگوں کے دل، ان کی طبیعتیں، اور ان کی پوری زندگی اسی طرح سخت اور بنجر ہو جاتی ہے، اب اس میں زندگی کی کوئی بھی حرکت نہیں محسوس کی جا سکتی۔

اللہ کا رسول مُترفین کے گھروں کو شیطان کے ٹھکانے قرار دیتا ہے کہ انہی سے فساد پھوٹتا ہے اور وہیں پر فتنہ سر اٹھاتا ہے۔

تکون ابل للشیاطین، وبیوت للشیاطین۔ فامّا ابل الشیطان فقد رایتھا، یخرج احدکم بنجیبات معہ قد اسمنھا فلا یعلو ابعیراً منھا، ویمر باخیہ قد انقطع فلا یحملہ، وامّا بیوت الشیاطین فلا اراھا الا ھٰذہ الاقفاص التی تستر الناس

شیطان کے اونٹ بھی ہوتے ہیں اور گھر بھی شیطان کے اونٹوں کو میں نے خود دیکھا ہے۔ تم میں سے کوئی اپنے ساتھ بہترین قسم کے اونٹ لیے نکلتا ہے جسے اُس نے کھلا پلا کر خوب فربہ کیا ہوتا ہے وہ نہ تو کسی اونٹ پر خود سوار ہوتا ہے نہ اپنے اس بے سہارا بھائی کو اس پر سوار کراتا ہے جو اسے رستہ میں ملتا ہے۔ رہے شیطان کے

بالدیباج ۔ (ابوداؤد) گھر تو میرے نزدیک وہ یہ پنجرے ہیں جو لوگوں کو دیباج سے ڈھنک دیتے ہیں لہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اونٹوں کو جن پر ان کے مالکوں کو سواری کی چنداں ضرورت نہ تھی، جب کہ کتنے ہی اکیلے مسافر سواری سے محروم تھے، شیطان کے اونٹ قرار دیا اور آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شاندار موٹریں چھوٹے چھوٹے کاموں کے سلسلہ میں ادھر اُدھر دوڑا کرتی ہیں جب کہ ہزاروں افراد کو ٹرام کے ٹکٹ کے لیے چند پیسے بھی میسّر نہیں ہوتے، اور سیکڑوں افراد تو ایسے ہیں جن کو چلنے کے لیے دو پاؤں بھی نہیں میسّر کیونکہ ان کی ٹانگیں حادثوں کی نذر ہو چکیں! رہے وہ گھر جنھیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ان "پنجروں" سے تعبیر کیا تھا جو (اپنے اندر رہنے والے) لوگوں کو دیباج (کے پردوں) سے ڈھنک دیتے ہیں تو وہ آج بھی نظر آتے ہیں۔ آج ان گھروں میں عیش و عشرت کے ایسے ایسے سامان پائے جاتے ہیں جو اُس زمانے کے انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔

عیش و عشرت کا باعث ہلاکت ہونا ایک تاریخی حقیقت ہے کیونکہ متاع دنیا کی فراوانی اور ان میں انہماک سے انسان میں اِتراہٹ پیدا ہوتی ہے۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيشَتَهَا فَتِلْكَ مَسَاكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِنْ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيلًا (قصص : ۵۸)

اور ہم نے کتنی ہی ایسی بستیاں غارت کر دیں جو اپنی معاشی حالت پر اترانے لگی تھیں، تو یہ ہیں ان کے گھر بار جو ان کے بعد بہت ہی کم آباد ہو سکے۔

عیش پرستی آخرت میں عذاب شدید سے دوچار کرانی ہے کیونکہ اس کے سبب آدمی طرح طرح کے گناہوں سے آلودہ ہوتا ہے۔

وَاَصْحَابُ الشِّمَالِ مَا اَصْحَابُ الشِّمَالِ

اور بائیں جانب والے، کیسے بائیں جانب والے؟

فِي سَمُومٍ وَحَمِيمٍ، وَظِلٍّ مِنْ يَحْمُومٍ لَا بَارِدٍ وَلَا كَرِيمٍ۔ اِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِينَ

بادِ سموم اور کھولتے پانی میں، دھوئیں کے سایہ میں، جو نہ ٹھنڈا ہوگا نہ اچھا، یہ لوگ اس سے پہلے (دنیا میں)

لہ یہ حدیث ابو داؤد۔ کتاب الجہاد۔ باب الجنائب۔ میں آئی ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ اُس سے کچھ مختلف ہیں جو مصنف نے لکھے ہیں۔ ابو داؤد کی شرح عون المعبود میں قفص سے ہودج مراد لیا گیا ہے۔ اقفاص وہ ہودج ہیں جن پر ریشمی پردے ڈالے جاتے تھے۔ جیسا کہ مصنف کی عبارت سے واضح ہے وہ اس کی شرح کچھ اور ہی کرتے ہیں۔ (مترجم)

وَكَانُوا يُصِرُّونَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيمِ، وَكَانُوا يَقُولُونَ: أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَعِظَامًا أَئِنَّا لَمَبْعُوثُونَ، أَوَآبَاؤُنَا الْأَوَّلُونَ۔

(الواقعہ: ۴۱ - ۴۸)

خوش حال لوگ تھے، یہ لوگ گناہ عظیم (یعنی شرک و کفر) پر مُصِر تھے۔ اور کہا کرتے تھے: کیا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈی بن چکے ہوں گے تو ہمیں پھر اٹھایا جائے گا، اور ہمارے اگلے باپ دادوں کو بھی!

لیکن یہ دنیوی تباہی اور اخروی عذاب صرف عیش پرست فرد پر نہیں آتا بلکہ اس پوری جماعت کو گھیر لیتا ہے جو مترفین کے وجود کو برضا و رغبت گوارا کرتی رہتی ہے۔

وَإِذَا أَرَدْنَا أَنْ نُهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيرًا۔

(بنی اسرائیل: ۱۶)

جب ہم کسی بستی کو ہلاک کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے خوش حال لوگوں کو حکم دیتے ہیں اور وہ اس میں نافرمانیاں کرنے لگتے ہیں۔ تب عذاب کا فیصلہ اس بستی پر چسپاں ہو جاتا ہے اور ہم اسے برباد کر کے رکھ دیتے ہیں۔

یہاں اللہ تعالےٰ کے ارادہ سے اُن معنٰی میں جبریت مراد لینا صحیح نہیں جو کہ عوام میں رائج ہیں۔ یہاں سَبَب اور مُسَبَّب یا مقدمات اور نتائج کے درمیان تلازُم کی حد تک جبریت مفہوم ہے۔ جماعت میں عیش پرستوں کا وجود، جماعت کا اسے بخوشی گوارا کر لینا اور اپنی خاموشی کے ذریعہ گویا اس کی اجازت دینا، عیش و عشرت کے اسباب کا ازالہ کرنے کی طرف توجہ نہ کرنا، اور عیش پرستوں کو فساد پھیلانے کے لیے آزاد چھوڑ دینا۔ ۔ ۔ ۔ یہ اپنی عین فطرت کے اعتبار سے ایسے اسباب و عوامل ہیں جو بالآخر لازماً تباہی اور بربادی کے گڑھے میں گرا دیتے ہیں۔ اس آیت میں ارادہ کے یہی معنٰی ہیں ۔ یعنی مقدمات کے متحقق ہو جانے پر اُن کے نتائج مرتب کرنا، اور اسباب فراہم ہو جانے پر ان کے مسبّبات کو بروئے کار لا دینا، جیسا کہ حیات و کائنات میں ازل سے اللہ تعالےٰ کا طریقہ رہا ہے۔

اپنے اندر نمودار ہونے والے اس منکر کے بارے میں جماعت ہی کو جواب دہ قرار دیا گیا ہے۔

لہ یہاں امرنا کے معنٰی اکثرنا (تعداد بڑھا دینا) کے ہیں (مصنّف) جیسا کہ ہمارے ترجمہ سے ظاہر ہے، ہمارے لیے مصنّف کی رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے (مترجم)

کسی جماعت میں عیش پرستی کا وجود دراصل اس کے اندر منکر کے فروغ کا ذریعہ بنتا ہے۔ اوپر ہم نے یہ بتایا ہے کہ فاضل دولت اپنا کوئی نہ کوئی مصرف تلاش کر لیتی ہے۔ ان مترفین کے پاس فاضل مال، فالتو جسمانی طاقت، اور خالی وقت ہوتا ہے جس میں نہ انھیں کوئی کام ہوتا ہے نہ کسی کام کی فکر۔ یہ سب مختلف طرح کی قوتیں ہیں۔ یہ سب صاحب ثروت نوجوان مرد اور عورتیں جن کو جوانی، دولت کی فراوانی اور وقت کی ارزانی سبھی کچھ میسّر ہے، فسق و فجور نہ کریں گے تو کیا کریں گے؟ ان کو وقت، مال، اور جسم کی ان فاضل قوتوں کے کچھ مصرف تلاش کرنے پڑتے ہیں اور اکثر یہ مصارف بہت پست قسم کے ہوتے ہیں جو زمانہ اور ماحول کے اعتبار سے مختلف روپ دھارتے رہتے ہیں لیکن پستی و ذلّت اور ظاہری و معنوی خباثت ایک قدر مشترک کے طور پر ان میں ہمیشہ موجود رہتی ہے۔

دوسری طرف نفع اندوزوں، استحصال کرنے والوں اور حاجت مندوں کا گروہ ہوتا ہے جس میں بردہ فروش، مسخرے، اور ان عیش پرستوں کے حاشیہ نشیں اور خدمت گذار شامل ہوتے ہیں جو اپنے قول و عمل سے بے حیائی، فحاشی، عیش پرستی اور سہل پسندی کی اشاعت میں ہمہ دم مشغول رہتے ہیں۔ یہ لوگ زندگی کی ان تمام اعلیٰ قدروں کی توہین کرتے رہتے ہیں جو مترفین کے اس گروہ کے مفاد و مذاق سے ٹکراتی ہیں۔

رفتہ رفتہ یہ مرض زندگی کے تمام شعبوں میں پھیل جاتا ہے اور یہ خرابیاں بالآخر ایک ایسی فضا بنا دیتی ہیں کہ فحاشی اور بے حیائی پوری قوم میں عام ہو جاتی ہے، ایک بے قیدا باحیّت ہر کس و ناکس کا شعار قرار پاتی ہے، لوگوں کے نہ صرف جسم بلکہ دماغ بھی کسل و اضمحلال کا شکار ہو کر ناکارہ ہو جاتے ہیں، اور روحانی اور معنوی اقدار کا چراغ ٹمٹمانے لگتا ہے.... جب سماج ان پستیوں میں جا گرتا ہے تو اللہ کی سنت کے مطابق وہ تخریب و ہلاکت کا مستحق قرار پا جاتا ہے اور اللہ اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیتا ہے۔

یہ ہے اسلام کی نظر میں جرم عیش پرستی کی تاریخ اور اس کا انجام۔ یہ خرابی پہلے چند انفرادی کرداروں میں نمودار ہوتی ہے، پھر جب جماعت اسے خاموشی سے گوارا کر لیتی ہے تو یہ فساد اپنے نتائج سامنے لاتا ہے۔ اور یہ جماعت کے جسم کو اپنے نامبارک اثرات سے رستے ہوئے ناسوروں میں بدل دیتا ہے۔ مقدّمات پر نتائج کے مرتّب ہونے، اور فراہمی اسباب پر مسبّبات کے ظہور میں آنے کے قاعدہ کے تحت یہ فساد جماعت کو بالآخر ہلاکت کے غار میں دھکیل دیتا ہے۔

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (الاحزاب ۶۲) تم اللہ کے طریقہ کو بدلتا نہ پاؤ گے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عیش پرستی اور مفلسی کے حدود کیا ہیں، اور ان کے مابین اعتدال وتوسط کی راہ کیا ہے۔؟

ہمارے خیال میں اس باب میں فیصلہ کن چیزیں عرف عام اور عام سماجی حالات ہیں۔ اس اصول کے تحت جب ہم اسلام کے اوّلین دورِ عروج کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم کو یہ نظر آتا ہے کہ خستہ حالی اور مفلسی کا دور دورہ ہے اور فقر وفاقہ عام ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ریشمی لباس پہننے سے منع فرمایا۔

من لبس الحریر فی الدنیا لم یلبسہ فی الآخرۃ (بخاری) — جس نے دنیا میں ریشم (کا کپڑا) پہنا اسے آخرت میں ریشمی لباس نہ نصیب ہوگا۔

اور علی کرم اللہ وجہہ روایت فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو قسّی[1] اور زرد رنگ کا کپڑا پہننے اور سونے کی انگوٹھی سے روک دیا تھا...... یہ ممانعت صرف مردوں کے لیے تھی عورتوں کے لیے ریشمی لباس اور سونے کے زیور مباح قرار دیئے گئے، اگرچہ رسول اللہ نے یہ نہیں پسند کیا کہ آپ کی صاحب زادی فاطمہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہا) سونے کے زیور پہنیں۔ لیکن یہ ایک خصوصی حکم تھا جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے گھر والوں کے لیے دیا تھا، عام لوگوں کے لیے ایسا کرنا ضروری نہیں قرار دیا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ کہنا حرام کو حلال کر دینے کے مترادف نہ ہوگا کہ یہ احکام دراصل ان احوال وظروف کے پیش نظر دیے گئے تھے جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات فرمائی تھی۔ اگر قوم کے احوال وظروف کا تقاضا نہ ہو تو اسلام بذاتِ خود خستہ حالی اختیار کرنے کی دعوت نہیں دیتا۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رنگین اور شوخ کپڑے اور ریشمی یا نقش ونگار سے آراستہ لباس پہننے سے مرد کی امتیازی شان گھٹتی اور اس کا وقار مجروح ہوتا ہے۔ ایسے لباس سے ان میں عیش کوشی اور سہل پسندی راہ پاتی ہے۔ خاص طور پر زمانۂ جہاد میں، اور بالخصوص ایسی شکل میں جب کہ جماعت کے اقتصادی حالات ایسے بناؤ سنوار کی اجازت نہ دیتے ہوں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بھی نہیں گوارا کہ یہ خستہ حالی بھونڈے پن اور بدسلیقگی تک جا پہنچے، کہ آدمی اپنے لباس سے لاپروائی برتنے لگے اور اسے دیکھ کر وحشت ہو۔

---

[1] ایک سوتی کپڑا جس پر ابریشم کے بنے ہوئے نقش ونگار ہوتے تھے۔ یہ کپڑا عرب میں مصر سے درآمد کیا جاتا تھا۔ (مترجم)

حضرت جابر سے روایت ہے کہ: ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس ملاقات کے لیے
[تش]ریف لائے آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ پریشاں حال ہے اور اس کے بال پراگندہ ہیں، آپ نے فرمایا۔
"کیا اسے اپنے سر کے (بال) درست کرنے کے لیے کوئی چیز نہ مل سکی؟"
ایک بار آپ نے ایک شخص کو میلے کچیلے کپڑے پہنے دیکھا تو فرمایا:۔
"کیا اسے اپنے کپڑے دھونے کے لیے کچھ بھی نہ مل سکا؟"
ابو الاحوص الجشمی نے اپنے والد سے روایت کیا ہے کہ انھوں نے کہا: مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ و
[سل]م نے اس حال میں دیکھا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ آپ نے دریافت کیا کہ:۔
"کیا تمھارے پاس کچھ مال ہے۔؟"
میں نے جواب دیا: ہاں، آپ نے فرمایا:۔
"کس قسم کے مال"
میں نے عرض کیا کہ "اللہ تعالےٰ نے مجھے ہر قسم کے مال دے رکھے ہیں، اونٹ ہیں اور بکریاں ہیں"
[آپ] نے فرمایا:

اذا اتاک اللہ مالاً فلیرا اثر نعمۃ [و]کرامتہ علیک (ابو داؤد۔ نسائی)	جب تجھے اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو ضروری ہے کہ تیرے (ظاہر سے) اوپر اس کی نعمت اور کرم فرمائی کا اثر بھی محسوس کیا جائے"

نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ان اللہ طیبٌ یحب الطیب، نظیفٌ [یح]ب النظافۃ، کریمٌ یحبّ الکرم، جوادٌ [یح]ب الجود، فنظفوا افنیتکم ولا [تش]بّھو بالیھود۔ (ترمذی، لسندِ حسن)	اللہ پاک ہے اور پاکیزگی کو پسند فرماتا ہے۔ صاف ستھرا ہے اور صفائی ستھرائی اسے پسند بھی ہے، خود کریم ہے اور رحم و کرم کو محبوب رکھتا ہے۔ سخی ہے اور اسے سخاوت پسند ہے۔ لوگو! تم بھی اپنے صحنوں کو صاف ستھرا رکھا کرو اور یہود کی طرح (گندے) نہ ہو جاؤ۔

اللہ تعالےٰ نے بنی آدم کو زیب و زینت اختیار کرنے اور حلال و پاکیزہ چیزوں کو حرام نہ ٹھہرا لینے
[کا] حکم دیا ہے اس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ احوال

ذظروف کو ایک اہم مقام حاصل ہے اور سماج کی عام معاشی سطح ہی علیش کوشی اور بدحالی کی حدیں متعین کر سکتی ہے۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو بڑے بڑے ملکوں کا فاتح بنایا، دولت عامہ میں اضافہ ہوا اور معاشی سطح بلند ہوئی تو ان کے لباس بھی بدل گئے، اور وہ ان نعمتوں سے بھی لطف اندوز ہونے لگے جن سے وہ پہلے نہیں لطف اندوز ہوتے تھے۔ کسی نے بھی ان کو ایسا کرنے پر ملامت نہیں کی الّا یہ کہ یہ کبھی حد معقول سے تجاوز کر گئے ہوں (اور تب ان پر تنقید کی گئی ہو) نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

کل ماشئت والبس ماشئت ماخطئتک انثتان : سرف او مخیلۃ۔ (بخاری)

جو چاہو کھاؤ، اور جو چاہو پہنو۔ بشرطیکہ اسراف اور اترا ہٹ ان دو چیزوں سے بچے رہو۔

اس کی بعض مثالیں ہم دور جدید کے حالات سے بھی دے سکتے ہیں۔ آج امریکہ میں ایک معمولی مزدور کے مکان میں بجلی کی روشنی، گرم پانی، اور بجلی اور گیس کے چولھے ہوتے ہیں۔ اس کے پاس ریڈیو اور موٹر کار بھی ہوتی ہے اور اس کی آمدنی میں اتنی گنجائش ہوتی ہے کہ ہر ہفتہ اپنے خاندان سمیت سیر و تفریح کے لیے ایک دن باہر جا سکے، یا سینما دیکھ سکے۔ اب اگر صدر جمہوریہ وہائٹ ہاؤس میں رہتا ہے تو اسے ہم علیش پرستی نہیں قرار دے سکتے، جب کہ وہائٹ ہاؤس بھی امریکہ میں کوئی غیر معمولی عمارت نہیں، اور بہت سے امریکی اس سے زیادہ شاندار مکانات میں رہتے ہیں۔ لیکن ہماری قوم میں جب لاکھوں افراد کو صاف پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں آتا تو یہ بات سراسر علیش بے جا قرار پائے گی کہ کچھ لوگ سمندر پار سے فیشی اور افیان کے پانی[1] منگوا کر پئیں۔ جب لاکھوں افراد کو معمولی گھر بھی نہیں میسر اور وہ اس بیسویں صدی میں بھی کھر اور پھوس کی جھونپڑیاں ڈال کر رہنے پر مجبور ہیں، اور جب انھیں تن ڈھانکنے کے لیے کھدر بھی نہیں مل سکتا تو کسی مسجد پر دس لاکھ پاؤنڈ صرف کرنا علیش بے جا ہے جسے حرام قرار دیا گیا ہے، اور اسی طرح کعبہ پر طلائی کام کیا ہوا مخملی غلاف چڑھانا بھی سراسر حرام اور کھلی ہوئی علیش پرستی ہے۔ بلاشبہ کعبہ کعبہ ہی ہے اور مسجد کا مقام بھی بہت بلند ہے لیکن ان پر اس قسم کے اخراجات کرنے سے یہ بہتر ہے کہ (یہ رقمیں) انسانوں پر صرف کی جائیں۔

---

[1] EVIAN اور VICHY فرانس کے دو مقامات کا نام ہے جہاں معدنی پانی MINERAL WATER کے چشمے پائے جاتے ہیں (مترجم)

عیش کوشی اور خستہ حالی کی تعریف اسی طور پر کی جا سکتی ہے کیونکہ اس معاملہ میں احوال و ظروف کے تقاضے ہی فیصلہ کن حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے فیصلوں میں غلطی کا امکان کم ہے۔ جماعت کی دولت عام اور اس کی معاشی سطح ہی یہ فیصلہ کرے گی کہ کسی زمانہ میں عیش کوشی اور میانہ روی کے مظاہر کیا ہیں۔ ایسے معاملات میں جماعت کی رائے عامہ بہت کم غلطی کرتی ہے۔ مختلف زمانوں اور مختلف حالات میں (رائے عامہ کا) یہی فیصلہ اسلام کا فیصلہ قرار پائے گا۔

فریضۂ زکاۃ

اب ہمارا موضوع بحث زکاۃ ہے جو ارکان اسلام میں سے ایک ایسا رکن ہے جو واضح طور پر اجتماعی واقع ہوا ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام پر گفتگو میں زکاۃ کی بحث مرکزی مقام کی حامل ہے۔

زکاۃ مال میں عائد ہونے والا ایک حق ہے۔ ایک اعتبار سے تو یہ عبادت ہے اور اپنے دوسرے پہلو کے اعتبار سے ایک اجتماعی فریضہ۔ عبادات اور اجتماعی مسائل کے باب میں اسلام کے مخصوص طرز فکر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم زکاۃ کو ایک تعبدی اجتماعی فریضہ قرار دیں گے۔ اسی لیے اسے زکاۃ کا نام دیا گیا ہے۔ زکاۃ کے معنی ہیں طہارت اور نمو کے۔ یہ عبارت ہے ضمیر کی اس پاکیزگی سے جو حق واجب کی ادائیگی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ یہ قلب کی اس صفائی کا نام ہے جو حب ذات اور حرص و بخل کے طبیعی خصائص سے بلند و بے نیاز ہو جانے پر میسر آتی ہے۔ مال ہر ایک کو عزیز ہوتا ہے...... اور اپنی ملکیت ہر ایک کو محبوب ہوتی ہے۔ نفس اسے دوسروں کی خاطر صرف کرے تو اسے پاکیزگی اور برتری حاصل ہوتی ہے، اسی میں اس کی جلا مضمر ہے۔ زکاۃ مال کی وہ پاکیزگی ہے جو اسے حق مال ادا کرنے اور اس طرح حلال قرار پا جانے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ زکاۃ کا یہی تعبدی پہلو ہے جس کے سبب اسلام کے لطیف احساس نے یہ گوارا نہ کیا کہ اہل ذمہ اور اہل کتاب سے اس کی ادائیگی کا مطالبہ کرے۔ چنانچہ اس نے اس کے عوض ان پر جزیہ عائد کیا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعہ ریاست کے عام اخراجات میں شریک ہو سکیں مگر جبراً کسی اسلامی عبادت کے پابند نہ قرار دیئے جائیں، الا یہ کہ وہ خود اسے اختیار کر لیں۔

زکاۃ سماج کا ایک حق ہے جو فرد پر واجب ہوتا ہے تاکہ ضرورت مند طبقوں کی ضروریات پوری ہو سکیں

اور بسا اوقات ناگزیر ضروریات کے ماسوا بھی انھیں کچھ سامان زندگی فراہم کیا جا سکے۔ اس طرح اسلام کسی حد تک اپنے اس اصول کو عملی جامہ پہناتا ہے جو آیۂ کریمہ کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" میں بیان ہوا ہے۔ اسلام کو انسانوں کا فقر و احتیاج میں مبتلا رہنا ناگوار ہے۔ اس نے یہ اصول طے کر دیا ہے کہ فرد اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی قوتِ بازو کے بل پر اپنی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے اور اگر وہ کسی وجہ سے ایسا نہ کر سکتا ہو تو اُسے سماج کے مال میں سے کفالت دیا جائے۔

اسلام کو انسان کا فقر و احتیاج میں مبتلا رہنا کیوں نہیں گوارا؟ اس لیے کہ وہ چاہتا ہے کہ انسان کو اس کی مادّی ضروریات سے فارغ کر کے اُن بلند تر مقامات و منازل کی طرف توجہ کرنے کا موقع فراہم کرے جو مقام انسانیت اور اس خصوصی شرف و امتیاز کے شایان شان ہیں جو اللہ نے بنی آدم کو عطا فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا ۔ (بنی اسرائیل ۷۰)	ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور ان کو خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی۔

اللہ نے انسانوں کو یہ بزرگی عقل و جذبات اور جسمانی ضروریات سے بلند تر مقاصد کی طرف روحانی میلانات دے کر عملاً عطا فرما دی ہے۔ اب اگر انسانوں کو ضروری سامان زندگی اس قدر بھی نہ میسّر ہو کہ انھیں ان روحانی میلانات اور فکری بلند پروازیوں کے لیے کچھ وقت مل سکے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ان کی یہ بزرگی ان سے چھین لی گئی اور وہ جانوروں کے مقام پر واپس چلے گئے، بلکہ اس سے بھی نیچے، کیونکہ جانوروں کو تو عموماً کھانے پینے کو مل جاتا ہے۔ بہت سے جانور مست ہو کر کلیلیں کرتے پھرتے ہیں، اور کتنی ہی چڑیاں پیٹ بھر لینے کے بعد زندگی کی رعنائیوں پر خوشیاں مناتی اور چہچہاتی پھرتی ہیں۔

ایسا شخص جسے اپنے کھانے پینے کی فکر اتنا مشغول رکھے کہ بلند مقام انسان کے شایان شان افکار و تصورات کی طرف توجہ کرنا تو کجا، اتنی فرصت اور اس قدر فراغ ذہن بھی نہ میسّر ہو جتنا چرند و پرند کو حاصل ہے، نہ تو انسان کہلانے کا مستحق ہے نہ اللہ کے نزدیک شرف و امتیاز کا حامل۔ یہ صورت حال کہ آدمی اپنا سارا وقت صرف کر دینے اور ہر ممکن کوشش کر لینے کے باوجود بقدر کفایت روزی نہ حاصل کر سکے، اُس کے حق میں سمّ قاتل ہے۔ یہ اُسے اس مقام سے بہت نیچے گرا دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے

پسند فرمایا ہے۔ یہ صورت حال اس سماج کے حق میں بھی مہلک ہے جس کے افراد اس میں مبتلا ہوں۔ یہ ایک گرا ہوا سماج ہے جو اللہ کی طرف سے عطا ہونے والی عزت و بزرگی کا مستحق نہیں کیونکہ اس نے ارادۂ الٰہی کی خلاف ورزی کی ہے۔

انسان اللہ کی زمین میں اس کا نائب ہے۔ اللہ نے اسے منصب نیابت اس لیے عطا فرمایا ہے کہ وہ اس زمین پر حیات کو نشو و نما بخشے، اسے ترقی دے، اسے شاداب و شگفتہ بنا کر رکھے اور پھر اس شادابی اور حسن سے لطف اندوز ہو کر ان ساری نعمتوں پر اللہ کا شکر بجا لائے، کہ سب اُسی کی عطا کردہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر انسان کی پوری زندگی روٹی کی نذر ہو جائے تو، چاہے یہ روٹی اس کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہو، وہ ان بلند مقاصد کو کبھی نہ حاصل کر سکے گا۔ پھر، وہ زندگی کتنی گری ہوئی زندگی ہے جس میں انسان عمر بھر کوشش کے باوجود اپنی ضروریات بھی نہ پوری کر سکے!

اسلام کو یہ بات بہت ناپسند ہے کہ قوم کے مختلف طبقات کے درمیان اتنا تفاوت پایا جائے کہ کچھ لوگ تو عیش و عشرت کی زندگی گذاریں اور دوسرے لوگ خستہ حال اور پریشان رہیں، اور یہ خستہ حالی مفلسی، فاقہ کشی اور کپڑوں بغیر ننگے رہنے کی حد تک جا پہنچے۔ ایسی قوم مسلمان نہیں کہی جا سکتی۔ اللہ کا رسول فرماتا ہے۔

ایما اهل عرصة اصبح فیهم امرؤ جائع فقد برئت منهم ذمة الله۔

(مسند امام احمد۔ حدیث نمبر ۴۸۸۰ بحوالہ جدید ایڈیشن مرتبہ احمد محمد شاکر)

جس بستی میں کسی شخص نے اس حال میں صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا اس بستی سے اللہ کی حفاظت و نگرانی کا وعدہ ختم۔

نیز آپ نے یہ فرمایا کہ:

لا یومن احدکم حتی یحب لاخیه ما یحب لنفسه۔

(متفق علیه)

تم میں سے کسی کا ایمان اس وقت تک معتبر نہیں جب تک وہ جو کچھ اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی نہ پسند کرے۔

اسلام مختلف طبقوں کے درمیان اتنے زیادہ تفاوت کو کیوں نہیں پسند کرتا؟ اس کا جواب حسد و کینہ کے ان خطرناک جذبات میں مضمر ہے جو سماج کی بنیادیں ہلا دیتے ہیں؛ اس کا جواب اس بے جا امتیاز، حق تلفی اور سنگ دلی میں مضمر ہے جو قلب و ضمیر کو آلودہ کر دیتے ہیں۔ اتنا تفاوت ہونے کا مطلب ضرورت مندوں کو چوری اور غصب کرنے یا عزت نفس اور خودداری سے ہاتھ دھو کر انتہائی ذلت و

خواری میں مبتلا ہو جانے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ انسانوں کو پستی کی طرف لے جانے والے عوامل ہیں جن سے اسلام سماج کو بچائے رکھنا چاہتا ہے۔

زکاۃ کا مقصد یہی ہے۔ شارع نے اسے ایک مالی فریضہ قرار دیا ہے جو اپنے مستحقین کا ایک قانونی حق ہے، نہ کہ زکاۃ نکالنے والوں کا ایک احسان۔ اس کا نصاب اس طرح مقرر کیا گیا ہے کہ سارے مالدار لوگ اس کی ادائیگی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ حد جس سے کم مال پر زکاۃ نہیں عائد ہوتی بیس مثقال سونا ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ مالک مقروض نہ ہو، یہ رقم ضروریات کے علاوہ اس کے پاس فاضل بچ رہی ہو، اور اس پر پورا ایک سال گذر چکا ہو۔ ظاہر ہے کہ جو آدمی خود ہی زکوٰۃ کا مستحق ہو اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا! زرعی پیداوار اور پھلوں کی زکوٰۃ موسم موسم وصول کی جاتی ہے اور فصل تیار ہونے پر واجب ہوتی ہے۔ سامان تجارت کی زکوٰۃ سونے یا چاندی میں اُس کی جو قیمت آتی ہے اس کے حساب سے لی جاتی ہے۔ مویشیوں کی زکوٰۃ کی شرحیں بھی مقرر ہیں اور ان میں وہی تناسب ملحوظ رکھا گیا ہے جو نقد سرمایہ کی زکوٰۃ میں پایا جاتا ہے (یعنی چالیسواں حصہ)

قرآن کریم کی صراحت کے بموجب مال زکوٰۃ کے مستحق یہ ہیں:-

فقراء :- یہ وہ لوگ ہیں جو نصاب سے کم مال رکھتے ہیں، یا اگر صاحب نصاب ہیں تو اتنے مقروض ہیں کہ قرضہ وضع کرنے کے بعد صاحب نصاب نہیں رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے پاس کچھ نہ کچھ مال تو ضرور رہتا ہے لیکن یہ مال ناکافی ہوتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر فرد کو بقدر کفایت مال ملے اور جہاں تک ممکن ہو انھیں سامان دنیا سے مستفید ہونے کی خاطر قدر کفایت سے زیادہ بھی حاصل ہو۔

مساکین۔ وہ لوگ جن کے پاس کچھ نہ ہو۔ قدرتی طور پر یہ لوگ فقراء سے زیادہ مستحق ہیں لیکن میرا خیال یہ ہے کہ آیت میں فقراء کے ذکر کو ان پر مقدم رکھنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فقراء کے پاس جو تھوڑا مال ہوتا ہے وہ کافی نہیں اور ان کا حال بھی گویا مساکین جیسا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے، اسلام بقدر ضرورت کفاف کی فراہمی پر قانع نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ فراہم کرنا چاہتا ہے۔

عاملین زکوٰۃ۔ یعنی وہ لوگ جو اس کی تحصیل عمل میں لاتے ہیں۔ ان کو ان کے کام کے معاوضہ کے طور پر کچھ

دیا جاتا ہے خواہ یہ خود صاحب مال ہوں۔ گویا (ان کا حصّہ) ایک طرح کی تنخواہ ہے اور اس کا تعلق نظام محنت و اجرت سے ہے نہ کہ ضروریات کی تکمیل سے۔

مؤلفۃ القلوب:۔ یعنی وہ لوگ جو ابھی نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے ہوں ان کو مال دے کر ان کی ہمّت افزائی کرنا اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف لانا مقصود ہوتا ہے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں مرتدین کے خلاف فوج کشی کے بعد سے اس مصرف پر خرچ کرنا بند کر دیا گیا ہے کیونکہ پھر اسلام کو اتنا غلبہ و استحکام حاصل ہو گیا کہ اسے مال کے ذریعہ تالیف قلوب کی کوئی حاجت نہیں باقی رہ گئی۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ قرآن کی ایک آیت واضح طور پر ایسے لوگوں کو زکوٰۃ کا مستحق قرار دیتی ہے حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں تصرّف کرنے میں کوئی حرج نہ محسوس کیا (اس نظیر سے آگے ہم مناسب موقع پر خاطرخواہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔)

گردنیں چھڑانے میں:۔ یعنی ان مکاتب غلاموں کی مالی امداد جو اپنے آقاؤں سے ایک متعین رقم کے عوض آزادی حاصل کر لینے کا معاہدہ کر لیں تاکہ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکیں (ظاہر ہے کہ حالات بدل جانے کے سبب اب یہ مصرف خود بخود ساقط ہو گیا ہے)

قرض دار:۔ جن کے اوپر ان کی پونجی سے کہیں زیادہ قرض ہو۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ قرض کسی گناہ کے کام میں نہ لیا گیا ہو، مثلاً عیش پرستی وغیرہ۔ ان کو زکوٰۃ سے حصّہ دینا ایک طرف تو قرض سے نجات کا ذریعہ بنے گا دوسری طرف ان کو صاف ستھری باعزّت زندگی بسر کرنے کا موقع ملے گا۔

فی سبیل اللہ:۔ یہ ایک عام مد ہے جس کی عملی شکلیں حالات ہی متعیّن کر سکتے ہیں مجاہدین کی تیاری، بیماروں کا علاج، جو لوگ خود سے تعلیم نہ حاصل کر سکتے ہوں ان کی تعلیم کا بندوبست، غرض یہ کہ وہ سارے کام جو مصالح مسلمین کی خاطر مفید اور ضروری ہوں اس مد کے تحت آ جاتے ہیں۔ اس کے اندر اتنی وسعت ہے کہ مختلف حالات میں سارے ہی اجتماعی کام اس کے تحت آ جاتے ہیں۔

مسافر:۔ جو غریب الوطنی کے باعث اپنے مال سے فائدہ نہ اٹھا سکتا ہو اور اس وقت اس کا ہاتھ خالی ہو۔ اس تعریف کے تحت آج کل کے وہ مہاجرین بھی آ جاتے ہیں جو جنگ، غارت گری اور ظلم و جور کے باعث بے گھر ہو جاتے ہیں، جو کچھ مال و دولت اُن کے پاس تھا وہ وہیں چھوٹ جاتا ہے اور اب ان کے لیے اس سے استفادہ ممکن نہیں رہ جاتا۔"

یہ مدات جن میں خاص و عام ہر طرح کے مصارف شامل ہیں اجتماعی زندگی میں سماجی تحفظ (SOCIAL SECURITY) کی تمام شکلوں پر حاوی ہیں ساتھ ہی یہ بھی واضح رہے کہ اسلام ان مستحقین کو زکوٰۃ میں سے حصہ پانے کا حق اسی وقت دیتا ہے جبکہ یہ کسب مال کی کوشش میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں اور اس کے باوجود ان کا کام نہ چلے اس پالیسی کی وجہ یہ ہے کہ اسلام عزت نفس اور خودداری کو سب سے اہم چیز سمجھتا ہے باوجود اس کے کہ اس نے زکوٰۃ کو ایک قانونی حق قرار دیا ہے نہ کہ احسان و کرم، وہ اس حقیقت سے غافل نہیں کہ

الید العلیا خیرٌ من الید السفلی (بخاری)

اوپر کا (دینے والا) ہاتھ نیچے کے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔

دینے والا جو بھی ہو بہرحال محسن ہے اور لینے والا احسان مند۔ اسی لیے وہ لوگوں کو ترغیب دلاتا ہے کہ محنت کریں اور اس طرح مدد لینے سے مستغنی رہیں۔ اسی لیے اس نے جماعت کی اوّلین ذمہ داری قرار دی ہے کہ ہر فرد کے لیے روزگار فراہم کرے۔ ایک آدمی نبی صلّی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مانگنے آیا آپ نے اسے ایک درہم عنایت فرمایا کہ اس سے ایک رسی خرید لے۔ جنگل سے لکڑیاں چنے اور انھیں باندھ کر لے آئے، اور اس طرح اپنی قوت بازو کی کمائی پر گذر بسر کرے۔ آپ نے فرمایا۔

لان یاخذ احدکم حبلہ فیحتطب علیٰ ظھرہٖ فیبیعہ، خیرٌ لہٗ من ان یسأل النّاس اعطوہ او منعوہ۔

یہ بات کہ تم میں سے کوئی رسّی لے، لکڑیاں چن کر اپنی پیٹھ پر لاد لائے اور اسے فروخت کر کے (گذر بسر کرے) اس سے کہیں بہتر ہے کہ لوگوں سے مانگتا پھرے کہ ان کا جی چاہے اسے دیں۔ جی چاہے نہ دیں۔

زکوٰۃ کی رقم سے دی جانے والی امداد آخری اجتماعی بچاؤ ہے۔ یہ درحقیقت ایسے افراد کے لیے سماجی تحفظ ہے جو باوجود کوشش کے کچھ نہ کما سکیں یا ضرورت سے کم، یا بقدر ضرورت ہی حاصل کر سکیں۔ یہاں اسلام بیک وقت معاملہ کے دونوں پہلوؤں کی رعایت ملحوظ رکھتا ہے۔ ایک طرف تو یہ خواہش کہ ہر فرد اپنی طاقت بھر کام کرے اور سماجی امداد کا سہارا لے کر بےکار وقت گذاری نہ کرے، اور دوسری طرف اس بات کا لحاظ کہ ضرورت مند کو بقدر ضرورت مدد دے کر ضروریات حیات کا بار اس کے سر سے ہلکا کر دیا جائے اور اسے ایک صاف ستھری اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کر دیے جائیں۔

زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے ٹیکس

زکوٰۃ وہ واحد حق نہیں جو مال میں عائد ہوتا ہو۔

مجھے ایسا نظر آتا ہے کہ جو لوگ آج کل زکوٰۃ کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہیں وہ اس بات پر قریب قریب متفق ہو گئے ہیں کہ اسلام سرمایہ پر جو ٹیکس عائد کرتا ہے اس کی آخری حد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زکوٰۃ ہے پیشہ ور علماء، کے اس سازشی اجماع کا پردہ چاک کرنا بہت ضروری ہے۔

درحقیقت زکوٰۃ مال و دولت پر عائد کیے جانے والے ٹیکس کی ادنیٰ ترین شرح ہے، اور یہ ان حالات کے لیے ہے جب کہ جماعت کو محاصل زکوٰۃ کے بعد مزید فنڈ کی ضرورت نہ پڑے۔ ایسے حالات میں جب کہ زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو اسلام کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ اس نے صاحب امر کو سرمایہ پر ٹیکس لگانے کے وسیع اختیارات دیئے ہیں۔ وہ سرمایہ میں سے اس قدر طلب کر لینے کا مجاز ہے جس قدر کہ اصلاح حال کے لیے ضروری ہو۔ چنانچہ ایک حدیث میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ:

ان فی المال حقاً سوی الزکاۃ۔ (ترمذی) مال میں زکوٰۃ کے علاوہ حق بھی ہے

اسلامی قانون سازی میں مصالح مرسلہ اور سدِّ ذرائع کے اصول اپنے اندر اتنی وسعت رکھتے ہیں کہ ان کے تحت ہر طرح کے سماجی مصالح کا حصول اور ہر طرح کی مضرتوں کا ازالہ ممکن ہے۔

ان اصولوں کی وسعت سامنے لانے کے لیے ہم استاذ محمد ابو زہرہ، پروفیسر قانونِ اسلامی، لا کالج، قاہرہ یونیورسٹی، کی کتاب "الامام مالک" کے بعض اقتباسات پیش کریں گے۔

مصالح مرسلہ

"وہ مصالح جن کے (شرعاً) معتبر ہونے پر (کتاب و سنّت کی) کوئی خاص نص نہ دلالت کرتی ہو مصالح مرسلہ کہلاتے ہیں۔ یہ بات فقہاء کے نزدیک مختلف فیہ ہے کہ ان مصالح کا اعتبار و لحاظ فقہ اسلامی کے بنیادی اصولوں میں سے ہے کہ نہیں۔ قرانی کا دعویٰ ہے کہ بلا استثنا، تمام فقہا نے جزئیات فقہ میں ان مصالح کو ملحوظ رکھا ہے اور ان کو دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر نے انھیں ایک بنیادی اصول تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ قرانی لکھتے ہیں:

"دوسرے مکاتب فکر کے لوگ مصلحت مرسلہ کا انکار کرتے ہیں لیکن اگر آپ غور کریں تو

مسائل کی تفریع میں ان کو اکثر مطلق مصلحت کا اعتبار کرتے ہوئے پائیں گے۔ وہ ہر اس موقع پر جب کہ دو (ہم جنس) امور میں مختلف احکام تجویز کرتے یا دو (مختلف) امور کو ایک ہی حکم کے تحت قرار دیتے ہیں خود کو اصولی دلائل دینے کا مکلف نہیں سمجھتے بلکہ محض ادنیٰ مناسبت پر بھروسہ کر لیتے ہیں۔ ہم اسی کو مصلحت مرسلہ (پر اعتبار کرنا) کہتے ہیں۔

"قرافی کا یہ دعویٰ صحیح ہو یا غلط، یہ بات طے شدہ ہے کہ جن مصالح کے اعتبار کو کسی نص شرعی کی سند نہ حاصل ہو ان کو معتبر قرار دینے کے سلسلہ میں علماء مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ اگر ان کے اعتبار میں (عملاً) اختلاف نہ موجود ہو تو بھی، جیساکہ قرافی کا بھی خیال ہے۔ اس بارے میں ضرور اختلاف ہے کہ ان کا اعتبار کس حد تک کیا جائے۔

علماء کے درمیان اس سلسلہ میں چار مختلف رائیں ملتی ہیں۔

"پہلی قسم شوافع اور ان کے ہم مسلک لوگوں کی ہے، جن مصالح کے اعتبار کے لیے کوئی شرعی دلیل نہ موجود ہو انھیں یہ معتبر نہیں قرار دیتے کیونکہ یہ حضرات صرف منصوص اور قیاس علی المنصوص کے قائل ہیں۔ قیاس کے لیے ان کے یہاں یہ شرط ہے کہ اصل اور فرع کے درمیان، یعنی جو حکم مستنبط کیا جا رہا ہے اس کے اور منصوص حکم کے درمیان کوئی باقاعدہ اصولی رشتہ پایا جاتا ہو۔ قرافی ہمارا ساتھ دے سکے تو بہتر ہو، کیونکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ شوافع کے یہاں بغیر باقاعدہ قیاس کے کسی مصلحت مرسلہ کے اعتبار کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔

"دوسری رائے احناف اور ان دوسرے حضرات کی ہے جو قیاس کے ساتھ استحسان کے بھی قائل ہیں، استحسان کی یہ لوگ جو تعریف بھی کرتے ہوں، اس میں مطلق مصلحت پر اعتماد کرنا آپ سے آپ شامل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے استنباط میں مصالح کا اعتبار شوافع سے کہیں زیادہ پایا جاتا ہے۔ لیکن خالص استحسان کی مثالیں ان کے یہاں بھی بہت زیادہ نہیں، کیونکہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ میں ان کا سہارا تمام تر صرف مصالح پر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان مصالح کو اُن کے یہاں بنیادی اصول کے طور پر نہیں شمار کیا جاتا۔

"تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو مصالح کے اعتبار میں غلو سے کام لیتے ہیں یہاں تک کہ انسانی معاملات میں مصالح کو نص پر مقدم قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مصلحت نص کی تخصیص کر سکتی ہے یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک مصلحت اجماع کی بھی تخصیص کر سکتی ہے۔ اگر کسی نص کی روشنی میں کسی مسئلہ پر علماء کا اجماع ہو گیا ہو اور پھر یہ حکم بعض پہلوؤں کے اعتبار سے مصلحت کے منافی نظر آئے تو مصلحت کے لحاظ کو مقدم

رکھا جائے گا، اور ایسا کرنے کو تخصیص سمجھا جائے گا۔ طوفی نے یہی رائے ظاہر کی ہے۔

"چوتھی قسم معتدل رائے رکھنے والوں کی ہے اور انہی کا مسلک اقرب الی الصواب نظر آتا ہے۔ ان کی رائے میں مصالح مرسلہ کا اعتبار ان امور میں کیا جائے گا جن میں نص قطعی نہ وارد ہوئی ہو۔ مالکیہ میں سے اکثر یہی رائے رکھتے ہیں۔ یہ مسلک کہ مصالح مرسلہ کا اعتبار ایک مستقل اصول قانون ہے امام مالک کا خود اختراع کردہ نہیں بلکہ اس باب میں وہ (سلف صالح کے) متبع تھے (جیسا کہ ذیل کے نظائر سے واضح ہوتا ہے)

۱۔ "یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، نے آپ کی وفات کے بعد کچھ ایسے اقدامات بھی کیے جو آپ کے عہد میں نہ کیے گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے قرآن کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا نہ ہوا تھا۔ مگر جب انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ حفاظ قرآن کی موت کے بعد قرآن کو بھول نہ جایا جائے تو مصلحت متقاضی ہوئی کہ وہ جمع قرآن کا اہتمام کریں۔ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ مرتدین کے خلاف جنگوں میں حفاظ قرآن یکے بعد دیگرے شہید ہوتے جا رہے ہیں تو آپ کو قرآن کے ضائع جانے کا اندیشہ لاحق ہوا اور آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ قرآن کو کتابی شکل میں جمع کر دیا جائے۔ سارے صحابہ نے آپ کی تجویز سے پورا پورا اتفاق کیا۔

۲۔ "صحابۂ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شراب خوار کو اسّی کوڑوں کی سزا دینے پر اتفاق کر لیا۔ یہ فیصلہ بھی مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے کیا گیا تھا کیونکہ انھوں نے دیکھا کہ شراب خواری فضول بکواس پر ابھارتی اور بالآخر افترا پردازی اور پاکیزہ شریف عورتوں پر تہمت طرازی پر منتج ہوتی ہے۔

۳۔ "خلفاء راشدین نے متفقہ طور پر صناعوں پر ضمان عائد کرنے کا فیصلہ کیا اگرچہ جو اشیاء ان کاریگروں کو کام کے لیے دی جاتی تھیں وہ اصولاً امانت کی حیثیت رکھتی تھیں (اور امانت میں نقصان واقع ہو جانے، یا اس کے ضائع جانے کی شکل میں امانت دار سے تاوان نہیں وصول کیا جا سکتا) لیکن عملاً صورت حال یہ تھی کہ لوگوں میں صناعوں کی بڑی طلب تھی۔ اگر ان صناعوں کو لوگوں کے سامان ضائع جانے یا ان میں نقص واقع ہو جانے پر قابل تاوان نہ قرار دیا جاتا تو یہ لاپروائی برتتے اور عوام کا نقصان ہوتا۔ ایسی شکل میں مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ ان پر ضمان عائد کی جائے۔ اسی بنا پر حضرت علیؓ نے ان لوگوں کو ان سامانوں کا ذمہ دار اور دین دار قرار دینے کی بابت یہ فرمایا ہے کہ۔

"اس کے بغیر لوگوں کے مفادات کا تحفظ نہیں ہو سکتا۔"

"۴۔ حضرت عمرؓ ابن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دستور یہ تھا کہ جن والیوں پر خیانت کا شبہ ہوتا ان کے مال میں سے نصف حصہ بحق سرکار ضبط کر لیتے۔ وجہ یہ تھی کہ جو اموال یہ لوگ اپنے منصب ولایت کے اثر سے فائدہ اٹھا کر کماتے تھے وہ ان کے اصل ذاتی مال کے ساتھ مل چکا ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ آپ کا یہ فیصلہ بھی مصلحت مرسلہ کے تحت آتا ہے۔ آپ نے یہ محسوس کیا کہ والیوں کی اصلاح اور ان کو منصب ولایت کے رعب داب سے بے جا فائدہ اٹھا کر، نیز دوسرے ناجائز طریقوں سے مال و دولت کمانے سے روکنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

"۵۔ حضرت عمرؓ کے بارے میں روایت کی جاتی ہے کہ آپ نے ملاوٹ کرنے کی سزا کے طور پر ایک بار پانی ملا ہوا دودھ زمین پر بہا دیا تھا۔ یہ اقدام بھی مصلحت عامہ کے تحفظ کے لیے تھا تاکہ تاجر عوام کو دھوکہ دینے سے باز آجائیں۔

"۶۔ آپ کے بارے میں منقول ہے کہ اگر کسی آدمی کے قتل میں ایک پورا گروہ شریک ہو تو آپ پورے گروہ کے قتل کا فیصلہ کرتے تھے کیونکہ مصلحت کا تقاضا یہی تھا اور اس باب میں کوئی نص نہیں موجود تھی۔ مصلحت کا ثبوت یہ ہے کہ مقتول بے گناہ ہے اور اسے عمداً قتل کیا گیا ہے۔ ایسی شکل میں اُس کے خون کا بدلہ نہ لینا اصولِ قصاص کی جڑ کاٹ دینے کے ہم معنٰی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگ قتل کرنے میں ایک دوسرے سے مدد لینے لگیں گے کیونکہ انھیں بخوبی معلوم ہوگا کہ مل جل کر یہ کام کیا جائے تو اُن سے قصاص نہیں لیا جا سکے گا۔ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس شکل میں جو قاتل نہیں اسے قتل کی سزا دے کر دین میں ایک بدعت کا ارتکاب کیا جاتا ہے، کیونکہ مذکورہ بالا گروہ میں سے کسی ایک فرد کو بھی، اس کی انفرادی حیثیت میں، قاتل نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ قتل کا اصل مجرم وہ پورا گروہ بحیثیت گروہ ہے۔ اسے بھی اُسی طرح قتل کیا جائے گا، جیسے کہ کسی منفرد قاتل کو۔ اس گروہ کی طرف قتل کا جرم اسی طرح منسوب ہوا ہے جس طرح کہ وہ کسی فرد واحد کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گویا کہ اس شکل میں یہ پورا گروہ سزائے قتل کے سلسلہ میں فرد واحد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایسا کرنے کا محرک مصلحت ہے، کیونکہ خونریزی کا سدّباب اور انسانی سماج کا تحفظ اسی طرح ممکن ہے۔

"مسائل عامّہ میں مصلحت کے لحاظ کی ایک مثال یہ ہے کہ جب بیت المال خالی ہو، یا فوج کے اخراجات بڑھ جائیں اور بیت المال میں بقدر ضرورت فنڈ نہ موجود ہو، تو امام کو چاہیے کہ مال داروں پر بقدر ضرورت

ٹیکس عائد کر دے۔ جب تک بیت المال میں دوسری مدّات سے کچھ آمدنی نہ ہو جائے، یا اس میں ضروریات کے بقدر مال نہ آجائے یہ طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ امام کو چاہیے کہ یہ ٹیکس فصل کٹنے اور پھلوں کے توڑے جانے کے وقت وصول کرے تاکہ صرف اصحاب ثروت سے مالیہ طلب کرنا ان میں بددلی پیدا کرنے کا باعث نہ بن جائے۔ اس میں مصلحت کا پہلو یہ ہے کہ امام عادل اگر ایسا نہیں کرتا تو اس کی دھاک اکھڑ جائے گی، ہر طرف فتنے سر اٹھانے لگیں گے، اور ان لوگوں کے غلبہ کا خطرہ قوی تر ہو جائے گا جو ایسے مواقع سے فائدہ اٹھا کر اوپر آنا چاہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ امام کو ٹیکس لگانے کے بجائے بیت المال کی طرف سے قرض لے لینا چاہیے۔ شاطبی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ناگہانی امور پیش آجانے پر قرض لینا اسی شکل میں مناسب ہوگا جب کہ بیت المال کو مستقبل قریب میں کچھ آمدنی ہونے کی توقع ہو۔ ایسی شکل میں جب کہ کوئی آمدنی متوقع نہ ہو اور آمدنی کے جو ذرائع میسّر ہوں ان کی آمدنی بھی گر گئی ہو اور ضروریات کے لیے ناکافی ہو ٹیکس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

ذرائع

"ذریعہ کے معنی ہیں وسیلہ کے۔ سدّ ذرائع کا مطلب یہ ہے کہ (ناپسندیدہ چیزوں کے) اسباب کا ازالہ کر دیا جائے۔ جو چیز کسی حرام کا سبب یا ذریعہ ہو وہ خود بھی حرام قرار پاتی ہے، اور جو چیز کسی واجب کا وسیلہ ہو وہ خود بھی واجب ہے۔ زنا حرام ہے۔ لہٰذا کسی اجنبی عورت کی طرف قصداً دیکھنا بھی حرام ہے کیونکہ یہ چیز زنا کی طرف لے جاتی ہے۔ جمعہ کی نماز فرض ہے لہٰذا اس کے لیے جانا، اور اس روانگی کی خاطر کاروبار روک دینا بھی فرض ہے۔ حج فرض ہے۔ لہٰذا بیت الحرام کی طرف سفر اور حج کے جملہ مراسم کو بجا لانا بھی فرض ہے۔

سدّ ذرائع میں اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ کوئی کام بالآخر کس انجام تک پہنچتا ہے۔ اگر اس کا رُخ ان مصالح کی جانب ہو جو باہمی معاملات سے متعلق، اور ہر طرح مطلوب و مقصود ہوں تو خود یہ کام بھی ان مقاصد کی اہمیت اور ضرورت کی مناسبت سے کم یا زیادہ مطلوب قرار پائیں گے۔ البتہ یہ کام (جو ذریعہ بن رہے ہیں) اپنی مطلوبیت میں ان مقاصد کے ہم پلّہ نہیں۔ اگر یہ کام ایسے ہیں کہ ان کے انجام نامطلوب مفاسد ہوں تو یہ خود بھی انہیں مفاسد کی حرمت کی مناسبت سے حرام قرار پائیں گے اگرچہ اس شدّت کے ساتھ نہیں جس شدّت کے ساتھ کہ خود یہ مفاسد حرام ہیں۔

"اس سلسلہ میں اصل اہمیت کام کرنے والے کی نیت اور ارادے کو نہیں بلکہ اس کے کام کے اثرات

ونتائج کو حاصل ہے۔ آخرت میں جزا و سزا کا مدار بلاشبہ کام کرنے والے کی نیت اور ارادے پر ہے لیکن کسی کام کو بھلا یا برا قرار دینے، یا اسے مطلوب یا ممنوع قرار دینے کا مدار تمام تر اس کے عملی نتیجہ پر ہے۔ دنیا کا نظام بندگان خدا کے مصالح کے تحفظ، عدل و انصاف اور توازن پر مبنی ہے، اور ان امور کا تقاضا ہے کہ حسن نیت اور ارادۂ ثواب پر نہیں بلکہ کاموں کے عملی اثرات و نتائج پر نظر ڈالی جائے۔ جو شخص خالصۃً لوجہ اللہ بتوں کو گالیاں دے وہ اپنے تئیں مخلص ہو سکتا ہے لیکن اگر اس کے اثر سے مشرکین غضبناک ہو کر اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے لگیں تو اس شخص کو خود اللہ تعالیٰ نے ایسا کرنے سے منع کر دیا کر دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ، فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ - (الانعام: ۱۰۸)	یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انہیں گالیاں نہ دو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

"جو چیز اس ممانعت کا باعث بنی وہ اس فعل کا عملی نتیجہ ہے۔ اس نیت کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جو اپنی جگہ خالصۃً مذہبی تھی اور جس کا مقصد حصول ثواب تھا۔ اس سے ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جو چیز گناہ و فساد پر منتج ہوتی ہو اس کی ممانعت میں صرف خلوص نیت کا لحاظ نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے عملی نتیجہ کو بھی اہمیت دی جاتی ہے اور اسی برے نتیجے کے سبب اسے ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ کو اس کے مخلصانہ محرک کا خوب علم ہوتا ہے۔"

"ایک آدمی کسی مباح کام کو کسی برے مقصد کا ذریعہ بناتا ہے۔ ایسا آدمی خدا کے حضور گناہ گار قرار پائے گا لیکن کسی دوسرے کو اس پر اعتراض کا حق نہیں، اور اس کے اس طرح کے تصرف کو شرعاً باطل نہیں قرار دیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص اپنے مال کا نرخ بہت ارزاں کر دیتا ہے تاکہ اپنے کسی حریف تاجر کو نقصان پہنچا سکے۔ یہ بلاشبہ ایک مباح کام ہے لیکن ساتھ ہی یہ ایک گناہ یعنی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا ذریعہ بھی بن رہا ہے اور وہ بھی قصداً۔ لیکن اس کے باوجود اس کے اس فعل کو علی الاطلاق باطل نہیں قرار دیا جا سکتا اور نہ یہ ایسا کھلا ہوا فعل ممنوع ہے جسے عدالت کے ذریعہ روکا جا سکتا ہو۔ نیت کے اعتبار سے یہ کام شر کا ذریعہ ہے اور ظاہراً طور پر یہ خاص اور عام دونوں طرح کے فائدوں کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ جہاں تک اس تاجر کا سوال ہے اسے اپنی تجارت کے چمک اٹھنے

اور گاہکوں کی تعداد میں اضافہ سے یقیناً فائدہ ہوگا۔ عام لوگوں کو بھی ارزانی سے فائدہ ہوگا، ہوسکتا ہے کہ اس کے سبب عام نرخ بھی گر جائے۔

"جیساکہ اوپر کے بیان سے واضح ہو گیا ہوگا سدّ ذرائع کا اصول صرف انفرادی نیتوں اور مقاصد کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظر عام لوگوں کے مفاد اور ان سے ضرر و فساد کے ازالہ پر بھی ہوتی ہے یہ اصول ارادہ کے ساتھ عملی نتیجہ کا، اور بسا اوقات صرف عملی نتیجہ کا لحاظ کرتا ہے۔

"سدّ ذرائع کا اصولِ قانون سازی ہونا قرآن و سنّت سے ثابت ہے۔ قرآن میں اللہ تعالےٰ کا یہ قول موجود ہے کہ:۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ۔ (الانعام: ۱۰۸)

یہ لوگ اللہ کے سوا جن کو پکارتے ہیں انھیں گالیاں نہ دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ جہالت کی بنا پر اللہ کو گالیاں دینے لگیں۔

روایت ہے کہ مشرکین نے مطالبہ کیا تھا کہ مسلمان ان کے خداؤں کو برا کہنے سے باز آجائیں ورنہ وہ ان کے خدا کو برا کہنے لگیں گے۔

نیز اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَلٰكِنْ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا (البقرہ: ۱۰۴)

اے ایمان لانے والو رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہو، اور توجہ سے بات کو سنو۔

"مسلمانوں کا ارادہ نیک تھا لیکن یہود نے اس لفظ (رَاعِنَا) کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو گالی دینے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔

"سنت میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بہت سے ارشادات اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے متعدّد فتاویٰ اس کی نظیریں ہیں۔ مثلاً، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کے قتل سے اسی لیے احتراز کیا کہ کفّار کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کر دیتے ہیں۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرض خواہ کو مقروض سے ہدیہ قبول کرنے سے منع فرمایا ہے اِلّا یہ کہ وہ اسے قرض میں سے وضع کر دے۔ وجہ یہ ہے کہ ہدیہ دینے سے مقروض کی غرض یہی ہوسکتی ہے کہ وہ اسے ادائے قرض میں تاخیر کا بہانہ بنائے۔ یہ کھلا ہوا سود ہوگا، کیونکہ قرض خواہ کا اصل تو اُسے پورا پورا واپس ملے گا اور

جو کچھ تحفہ کے طور پر اسے دیا جائے وہ مزید ہو گا۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمانہ جنگ میں (چوری کی سزا کے طور پر) ہاتھ کاٹنے سے منع کر دیا ہے تاکہ ایسا نہ ہو کہ یہ سزا یافتہ کے دشمن سے جا ملنے کا باعث بن جائے۔ اسی مصلحت کی بنا پر جنگ میں حدود نہیں نافذ کی جاتیں کہ مبادا سزا کی دہشت مجرم کو گمرہی میں نہ مبتلا کر دے جس کا دروازہ حالتِ جنگ میں بالکل سامنے ہوتا ہے۔

"مہاجرین و انصار میں سے سابقین اوّلین کا طریقہ یہ تھا کہ جس عورت کو اس کے شوہر نے مرضِ موت میں طلاق بائن دی ہو اُسے اس مرد کے ورثہ کا (بربنائے زوجیت) مستحق قرار دیتے تھے کیونکہ مرد پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اس نے عورت کو اس لیے طلاق دی کہ وہ ورثہ سے محروم ہو جائے محروم کرنے کا ارادہ ثابت تو نہیں کیا جا سکتا مگر طلاق عملاً اس کا ذریعہ بنتی ہے۔

"نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے احتکار سے منع فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا ہے۔

من احتکر فھو خاطی (مسلم، ابو داؤد۔ ترمذی) جس نے احتکار کیا اس نے غلط کام کیا۔

"احتکار ضروریات زندگی کا ذخیرہ کر کے لوگوں پر تنگی کرنے کا ذریعہ ہے اسی لیے جس چیز کی ذخیرہ اندوزی عوام کے لیے تنگی کا باعث نہ ہو اس کا احتکار ممنوع نہیں۔ مثلاً سامان زینت و آرائش جنھیں ضروریات میں نہیں شمار کیا جاتا۔

"آپ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے صدقہ کرنے والے کو اپنی صدقہ کی ہوئی چیز کے خریدنے سے منع کر دیا ہے خواہ وہ چیز عام بازار میں فروخت ہوتی ہوئی ملے۔ مقصود یہ ہے کہ کسی ذریعہ سے بھی اس چیز کو واپس لینا ممکن نہ رہے جو اللہ کی راہ میں دی جا چکی، خواہ یہ ذریعہ خریداری ہی کیوں نہ ہو۔ جب آپ نے بالعوض ایسی چیز کو واپس لینے سے روک دیا ہے تو بلا عوض واپس لینا بدرجۂ اولیٰ ممنوع قرار پائے گا۔ صدقہ کی ہوئی چیز کو قیمت دے کر حاصل کر لینے کی اجازت دینے سے اس بات کی گنجائش نکل آتی کہ کوئی کسی فقیر کے ساتھ حیلہ بازی کرے۔ وہ اسے ایک چیز صدقہ کے طور پر دے پھر اسے اصل قیمت سے کم پر خرید لے، اور فقیر بے چارا یہ سمجھ کر کہ اسے کچھ نہ کچھ تو مل ہی رہا ہے خوشی خوشی اسے کم داموں پر فروخت کر دے۔

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرام سے اس طرح کے بکثرت نظائر منقول ہیں۔ علامہ ابن قیّم نے اعلام الموقّعین میں تقریباً نوّے نظائر پیش کیے ہیں جن میں سدّ ذرائع کی خاطر کسی چیز سے منع کیا گیا ہے۔

"کہا گیا ہے کہ آدھے اسلامی قوانین سدّ ذرائع پر مبنی ہیں۔"

حاصل کلام یہ کہ مصالح مرسلہ اور سدّ ذرائع کے یہ دو اصول ایسے ہیں کہ ان کو ان کے وسیع معانی کے ساتھ زیر عمل لایا جائے تو یہ حاکم کو ہر طرح کے اجتماعی مفاسد کے ازالہ کا اختیار مطلق عطا کرتے ہیں، خصوصاً جب کہ اس میں دولت پر ٹیکس لگانے کا اختیار شامل ہے۔ یہ اختیار اگر کسی قید کا پابند اور کسی شرط سے مشروط ہے تو صرف یہ کہ اُمّت کے عام مفاد و مصالح کی رعایت ملحوظ رکھی جائے اور مکمل اجتماعی عدل کے قیام کو ہدف قرار دیا جائے۔

ان تصریحات کی روشنی میں واضح ہے کہ اسلام میں انفرادی ملکیت کا اصول اس بات میں مانع نہیں ثابت ہو گا کہ ریاست نفع یا خود سرمایہ میں سے ایک حصہ وصول کر لے۔ زکوٰۃ کی طرح اس حصّہ کی کوئی خاص شرح نہیں متعیّن ہے بلکہ اجتماعی مصالح کے تقاضے یہ طے کریں گے کہ ان کی شرح کیا ہو۔

یہ عجیب رسم چل پڑی ہے کہ سارا زور صرف زکوٰۃ پر صرف کیا جائے گا، گویا اسلام میں مال کا حق صرف زکوٰۃ تک محدود ہے۔ ہمارا صاف صاف بیان اس غلط رسم کا پردہ چاک کرنے اور ان پیشہ ور علماء کی حقیقت آشکارا کرنے کے لیے ضروری ہوا جن کا کاروبار آیات کی سستے داموں تجارت کرنا ہے یہ لوگ اپنے پیٹ جہنّم کی آگ سے بھر رہے ہیں۔

ساتواں باب

اسلام کی تاریخ سے چند مثالیں

ایک ایسی اسپرٹ بھی اپنا وجود رکھتی ہے جسے ہم بجا طور پر "اسلام کی روح" کہہ سکتے ہیں۔
اس دین کے مزاج اور اس کی تاریخ کا جو شخص بھی صحیح طریقہ سے مطالعہ کرے گا اس روح کو پالے گا۔
اسے یہ روح اسلام کی ہدایات اور قوانین کے پیچھے کام کرتی، اور ان کے اندر جاری وساری ملے گی۔ یہ روح اتنی واضح اور موثر ہے کہ کوئی انسان اس کا اثر لیے، اور اس کی فضا میں محو ہوئے، بغیر نہیں رہ سکتا لیکن ہر بنیادی اور گہرے احساس، اور ہر کلی اور بلند فکر کی طرح اسے بھی محدود الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ روح رجحانات اور مقاصد میں اپنی جھلک دکھاتی ہے، واقعات وحوادث اور رسوم ورواج میں جلوہ فرما ہوتی ہے، مگر اسے محدود الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہے۔

یہی روح اُس اُفق اعلیٰ کے نقش ونگار واضح کرتی ہے جس کی طرف اقدام کی اسلام اپنے پیرووں کو تلقین کرتا ہے۔ یہی مقام بلند ہے جس تک پہنچنے کے لیے اسلام انسان کو ترغیب دیتا ہے کہ صرف فرائض کی تعمیل اور شعائر اسلامی کی پابندی پر اکتفا نہ کرے بلکہ اپنی طبیعت کے تقاضے سے، راضی خوشی، مزید کوشش بھی کرے ...... اس بلندی کی راہ کٹھن اور دشوار گذار ہے، اور اس تک پہنچ کر اس پر قائم رہ جانا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ حیات انسانی کے طبعی میلانات اور ضروریات زندگی کا دباؤ ان مقامات بلند کی طرف پیش قدمی میں اکثر انسانوں کے پاؤں کی زنجیر بن جاتا ہے۔ اگر وہ وفور شوق اور خروش جذبات کے سہارے کبھی اس تک پہنچ بھی جائیں تو یہ چیزیں زیادہ عرصہ اس مقام کی دشواریوں کا مقابلہ کرتے ہوئے

اس پر جمے رہنے کا موقع نہیں دیتیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس مقام بلند کے ساتھ جان و مال اور فکر و عمل سے متعلق کچھ گراں بار ذمہ داریاں وابستہ ہیں۔ ان ذمہ داریوں میں سب سے زیادہ کٹھن ہمہ دم بیدار و ہوشیار رہنے کی وہ ذمہ داری ہے جو اسلام نے فرد کے ضمیر پر عائد کی ہے، اور وہ شدّت احساس جو وہ فرد کے شعور کو عطا کرتا ہے۔ اس شدّت احساس کا تعلق ان حقوق و فرائض سے ہے جو فرد پر اپنی ذات اپنے سماج، نوع انسانی اور پھر اس خالق کے سلسلہ میں عائد ہوتے ہیں جو اس کے چھوٹے بڑے ہر عمل کو دیکھ رہا ہے اور اس کی راز کی باتوں اور خاموش سرگرمیوں سے بھی پوری طرح واقف ہے۔

اس پیش قدمی کی دشواری اور اس مقام بلند پر ثابت قدم رہنے میں کامیابی کا مشکل ہونا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ اسلام ایک شاعرانہ تخیّل یا ایک ایسا وجدانی تصوّر ہے کہ ہمارا شوق تو اس کے دامن چھو سکتا ہو مگر عمل کی رسائی اُس تک ناممکن ہو۔ ایسا نہیں، جس مقام بلند کا ذکر ہے اس تک پہنچنے کا ہر زمانہ میں ہر انسان کو مکلّف نہیں بنایا گیا بلکہ یہ ایک ایسا ہدف ہے جس کے نقوش واضح کر دیے گئے ہیں تاکہ انسانیت ہر آن اُس کے حصول کے لیے سرگرم عمل رہے۔ آج بھی اس کے لیے تگ و دو کرے اور کل بھی، جس طرح کہ ماضی میں کرتی رہی ہے۔ کبھی اس نے اسے پالیا اور کبھی اس سے دور رہ گئی۔ یہ ایک ایسا آئیڈیل ہے جس میں انسان، اس کے ضمیر، اور اس کی صلاحیتوں اور قوّتوں پر گہرا اعتماد مضمر ہے۔ اس میں اس بات کی دلیل پنہاں ہے کہ مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں انسان سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس ہدف سے پہلے ہی ایک وسیع میدان ہے جو سعی و جہد اور کامیابی کے اس معیار کے لیے کافی ہے جو اکثر انسانوں کے لیے ممکن ہے۔ اللہ تعالےٰ کا ایک مستقل اصول ہے کہ وہ کسی فرد کو اس کی طاقت سے زیادہ کوشش کا مکلّف نہیں بناتا۔ (لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا)۔ اسلام کا معتدل مزاج عام انسانوں سے اتنے عمل کو بھی بخوشی قبول کر لیتا ہے کہ وہ قانونی حدود کی پابندی کریں اور زندگی کو اس سطح سے نیچے نہ گرنے دیں، کیونکہ لِکُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔

رہی افق اعلیٰ کی راہ تو وہ ہمیشہ کھلی ہوئی ہے، مجسّم دعوتِ اقدام!

جس روح کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اس نے اسلام کی عملی تاریخ کی تشکیل میں اپنا پورا اثر دکھایا ہے۔ یہ اسی کا فیض ہے کہ اسلام، جو ایک فکر اور ایک تصوّر کا نام تھا، شخصیتوں اور تاریخی واقعات کی شکل میں مجسّم ہو کر سامنے آیا۔ اب یہ مجرّد نظریات کا نام نہیں رہ گیا، نہ محض ارشادات و مواعظ کا پشتارہ

اور نہ صرف تصوّرات وخیالات کا مجموعہ - اب یہ جیتے جاگتے انسانی کردار عملی دنیا کے حقائق، اور ایسے ادارں اور کارناموں کا جامہ پہن چکا تھا جو آنکھوں سے دیکھے جا سکتے تھے، جنھیں کان سُن سکتے تھے، اور جنھوں نے عملی زندگی اور تاریخ انسانی پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے - جیسے کوئی جادو تھا جو ان شخصیتوں میں اُتر کر ان کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیتا، پھر انھیں ایک نئے رنگ میں رنگ کر ایک نئی زندگی دے کر اٹھاتا۔

یہی صحیح توجیہ ہے ان عجیب شخصیتوں کی جن کا ریکارڈ تاریخ اسلامی کے شروع اور اس کے بعد کے ادوار پیش کرتے ہیں - یہی بات ان سارے واقعات کی کہنہ تک پہنچاتی ہے جو آپ کو بلندیٔ تخلیل کے گھڑے ہوئے افسانے معلوم ہوتے ہیں جو کبھی پیش نہ آئے ہوں، نہ واقعات نے ان پر گواہی دی ہو، اور نہ تاریخ نے انھیں اپنے صفحات میں محفوظ کر لیا ہو۔

یہی چیز پاکیزگیِ روح، شجاعت نفس، ایثار و قربانی، مقصد میں فنا ہو جانے کی کیفیت، فکر و روح کی غیر معمولی بلند پروازیوں اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ان عظیم کارناموں کی بھی توجیہ کرتی ہے جن کا پوری طرح احاطہ کرنا تاریخ کے بس سے باہر ہے -

جو کارنامے اور غیر معمولی واقعات تاریخ کے صفحات پر پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں ان کے اور اسلام کی قوی اور فعّال روح کے درمیان ہمیں ایک گہرا ربط تسلیم کرنا پڑے گا - یہی روح اس طاقت کا منبع ہے جس کے مظاہر تاریخ اسلام میں چار سُو پھیلے نظر آتے ہیں -

اگر ہم ان کارناموں کا اِس سرچشمہ سے صحیح ربط و تعلّق سمجھے بغیر انھیں الگ الگ دیکھیں گے تو قوی اندیشہ ہے کہ ہمارا مطالعہ ناقص رہے گا اور یہ غلط مطالعہ ہم کو ان قوتوں کے بارے میں سخت غلط فہمی میں مبتلا کر دے گا جو کائنات وحیات میں حقیقتاً کارفرما ہیں - اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص کی عظمت کا راز اس کی عبقریت میں مضمر قرار دیا جائے گا - اور اس روح کو نظر انداز کر دیا جائے گا جو اوّلین محرّک اور موثر ترین عامل ہے - جو ان عظیم افراد کے قلب وضمیر پر اثر انداز ہوئی جس نے زمانہ کی گاڑی کا رخ بدل دیا۔ واقعات وحوادث کی باگیں خود سنبھال لیں اور ان سب کو خروش زندگی سے لبریز ایک تیز رو اور ہنگامہ خیز دھارے کے سپرد کر دیا جس کی موجوں کے سہارے یہ عبقری اور یہ کارنامے ابھر کر سامنے آتے ہیں -

اگر ہم عبقریین کے ظہور اور ان کارناموں کے صدور کو تمام تر اس طاقت ور اور فعّال روح کا فیضان قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا - دراصل یہ روح ایک کائناتی حرکت ہے جو کارناموں اور شخصیتوں کی ان قوتوں سے

آئی ہے جو بظاہر انفرادی مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے آفاقی ہیں۔ ان میں سے ہر فرد کی عبقریت کا معیار اس کائناتی فیض کو جذب کرنے کی وہ صلاحیت ہے جس کا اس نے مظاہرہ کیا۔ اب اگر بلند ترین رتبہ محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا قرار دیا جاتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہی وہ ذات گرامی تھی جس نے اس فیض کو بتمام وکمال جذب کر لیا۔ اس کو پوری طرح اپنا لیا، اور اس مقام بلند پر عرصہ دراز تک فائز رہی جو ساری عمر میں ایک یا دو عارضی اتفاقات کے علاوہ اس مقام بلند سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہ ہٹی۔ یہی وہ اتفاقی لمحات ہیں جن پر اللہ تعالےٰ نے اپنے نبی کو سختی کے ساتھ تنبیہ فرمائی ہے۔ ان دو مواقع کے سوا اپنی زندگی کے سارے لمحات میں اِس بشر کی روح نے اس کائناتی فیضان کو پوری طرح جذب کیے رکھنے کا عظیم کارنامہ کر دکھایا ــــــ کیوں نہ ہو، روح انسانی بھی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک کائناتی قوت ہے نہ کہ انفرادی۔

مقام نبوت کے بعد بلندئ مراتب کے مختلف درجے ہیں، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف صحابیوں کو اور اور بعد کی تاریخ کے ادوار میں ان کے پیروؤں کو نصیب ہوتے رہے ہیں۔ جو فرد اس عظیم دین کی روح کو جس درجہ جذب کر سکا اُسے اُس کے مناسب رُتبہ ملا۔

یہ جامع مطالعہ ہی ہمیں بتا سکتا ہے کہ اس اسپرٹ نے انسانی روحوں کو کس طرح متاثر کیا، کس طرح اس نے خوابیدہ عبقریتوں کو بیدار کیا اور متحرک اور فعّال بنایا۔ عظیم اور محیرّ العقول کارناموں کو جنم دیا اور بالآخر تاریخ انسانی کا رخ بدل دیا۔

اس روح کی تاثیر کا پتہ ہمیں تاریخ کے بڑے بڑے واقعات اور روزمرّہ زندگی میں پیش آنے والی باتوں، دونوں کے اندر ملتا ہے۔ ظاہر ہے کہ روحانی عظمت کو مقدار اور طول وعرض میں نہیں ناپا جا سکتا بلکہ اس کا تعلق کیفیت سے ہے، اس کا اندازہ صرف آثار و قرائن کے ذریعہ لگایا جا سکتا ہے۔ جزیرہ عرب کے مٹھی بھر انسانوں نے بہت مختصر سی مدّت میں قیصر اور کسریٰ کی دو عظیم سلطنتوں پر غلبہ حاصل کر لیا۔ تاریخ انسانی اتنی مختصر مدّت میں اتنی بڑی فتح کی کوئی اور نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔ لیکن اس عظیم واقعہ کی عظمت میں کوئی کمی نہ آجائے گی اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ یہی عظمت بلال حبشی نامی غلام کے اُس صبر میں بھی پائی جاتی ہے جس کا مظاہرہ آپ نے قریش کی ایذ دہی کے مقابلہ میں فرمایا (رضی اللہ عنہ)۔ قریش نے بلال حبشی کو ان کے دین سے پھیر دینے کے لیے وہ تکلیفیں دیں جن کو برداشت کر لینا انسان کے بس سے

باہر ہے۔ نیچے سے ان کو تپتے ہوئے سنگ ریزوں کی گرمی جُھلسا رہی تھی، پیٹ اور سینہ پر پتھروں کا بوجھ تھا، بھوک اور پیاس کی شدّت بھی تھی، اور دوسری تکلیفیں بھی دی جا رہی تھیں لیکن ناقابلِ برداشت عذاب کی اس دہکتی ہوئی بھٹّی میں بھی آپ کے منہ سے جو بات نکلی وہ تھی " اَحَدٌ ، اَحَدٌ "!

یہی اسپرٹ ہے جو راہ چلتے عامی میں سرایت کر جاتی ہے تو اسے مختارِ کل سلطانِ وقت کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے، جہاں وہ کھری کھری بات سناتا ہے اور راہِ خدا میں کسی کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتا یہی روح اس خلیفۂ راشد میں نظر آتی ہے جس کی حکمرانی بہت سے ممالک پر پھیلی ہوئی ہے لیکن وہ قناعت، خاکساری اور بے نیازی کے اعلیٰ معیار پر قائم رہتا ہے۔ دونوں افراد ایک ہی چشمہ سے سیراب ہوئے ہیں، اور وہ ہے یہ طاقت ور، فعّال، اور موثّر روحِ اسلام۔

قیصر و کسریٰ کی عظیم سلطنتوں پر عربوں کے غلبہ کا ذکر آ گیا ہے تو مناسب ہوگا کہ ہم اس روح کی قوتوں کا صحیح طور پر اندازہ کریں۔ یہ اُن بے پناہ قوتّوں پر کیسے غالب آ گئی جو اس جنگ کی خاطر ان سلطنتوں میں اکٹھا کی گئی تھیں، جن پر اہلِ عرب کو بغیر اس روح کے ہرگز غلبہ نہیں نصیب ہو سکتا تھا۔ یہاں اسلام کی فتح دراصل ایک روحانی نظریہ کی فتح تھی جس نے انسانوں کے دلوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ واقعہ تاریخ کی روحانی تعبیر کی تائید کرتا ہے کیونکہ یہاں مادّی تعبیر سے کام نہیں چل سکتا۔ وہ اس غیر معمولی فتح کی توجیہہ نہیں کر سکتی۔

واضح رہے کہ وہ عظیم نفسیاتی انقلاب جو اسلام نے عربوں کے فکر و عمل، مقصد اور نصب العین اور سماجی اور معاشی تنظیم میں برپا کیا، اس کا درجہ ان فتوحات سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ وہ روح اسلام کی قوّت و عظمت پر ان فتوحات سے زیادہ واضح طور پر گواہی دیتا ہے۔ آخر محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت اور آپ کی وفات کے درمیان جزیرہ عرب کے معاشی حالات میں کون سی بنیادی تبدیلیاں واقع ہو گئی تھیں جنھوں نے عربوں کے فکر و نظر، حرکت و عمل، اور اجتماعی تنظیم کے اندر ایک انقلاب برپا کر دیا؟ ان سارے کارناموں کا خالق یہی روحانی نظریہ تھا۔

یہاں ہمارے لیے اس انقلاب کا تفصیلی مطالعہ ممکن نہیں، ہم صرف اس کی ایک جھلک دکھانے پر اکتفا کریں گے۔ یہ جھلک اس بیان میں نظر آتی ہے جو اُس زمانہ کے عرب نے اس دین کے منکرین کی موجودگی میں دیا تھا جس کی وہ لوگ کوئی تردید نہ کر سکے تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب دعوتِ اسلامی اپنے

ابتدائی مراحل سے گذر رہی تھی اور قریش کی ایذا رسانی سے بچ کر اپنے دین کو سلامت رکھنے کی خاطر مسلمان ہجرت کرکے حبشہ چلے گئے تھے۔ قریش کو اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کو دار الہجرت میں اطمینان کا سانس لینے کا موقع نہ مل جائے۔ چنانچہ اس نے حبشہ کے نجاشی کے پاس دو سفیر بھیجے تاکہ وہ ان مہاجرین کو وہاں سے نکلوا دیں۔ یہ دو سفیر عمرو بن العاص اور عبداللہ ابن ابی ربیعہ تھے۔ انھوں نے جا کر یہ کہا:

"اے بادشاہ! ہمارے یہاں کے کچھ ناسمجھ لڑکے بھاگ کر تیرے ملک میں آبسے ہیں انھوں نے اپنے قوم کے دین کو چھوڑ دیا ہے، اور تیرے دین کو بھی نہیں اپنایا ہے، بلکہ یہ اپنی جانب سے گھڑ کر ایک ایسا دین لائے ہیں جو ہمارے لیے بھی اجنبی ہے اور تیرے لیے بھی۔ ہمیں ان کی قوم کے معززین نے جن میں ان لڑکوں کے باپ، چچا اور دوسرے اعزا بھی شامل ہیں تیرے پاس بھیجا ہے تاکہ تو انھیں ان کے پاس واپس بھیج دے۔ وہ ان لڑکوں سے زیادہ بالغ نظر واقع ہوئے ہیں اور یہ جن چیزوں کی بابت اعتراض کرتے اور انھیں برا بھلا کہتے ہیں ان کو وہ ان سے بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔"

جب نجاشی نے مسلمانوں سے دریافت کیا کہ:

"یہ دین کیا ہے جس کی خاطر تم نے اپنی قوم کو چھوڑ دیا اور نہ تو میرے دین میں داخل ہوئے نہ کسی اور دین میں۔"

تو جعفر بن ابی طالب نے جواب دیا:۔

"اے بادشاہ! ہم جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کی پوجا کرتے، مردار کھاتے، اور بدکاریاں کرتے تھے۔ خونی رشتوں کا پاس و لحاظ نہ کرنا اور پڑوسی کے حق سے غافل رہنا ہمارا شعار تھا ہم میں سے جو طاقتور ہوتا وہ کمزوروں کا خون چوستا تھا ....

ہم اس حال میں تھے کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ایک کو ہماری جانب پیغامبر بنا کر بھیجا۔ ہم اس کے حسب نسب، اس کی صداقت شعاری، امانت داری اور پاکبازی سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اس نے ہمیں اللہ کی طرف بلایا، اسے ایک جاننے اور اسی کی عبادت کرنے کی تلقین کی۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم ان پتھروں اور بتوں کی پوجا ترک کر دیں جن کو ہم اور ہمارے آباء اللہ کے سوا، پوجتے رہے ہیں۔ اس نے ہمیں سچ بولنے، امانت داری، صلہ رحمی اور پڑوس کے ساتھ

حسن سلوک کی اور خونریزی اور بے حرمتی سے باز رہنے کی تلقین کی اس نے فحش، دروغ گوئی، یتیم کا مال کھانے اور شریف عورتوں پر تہمت طرازی کرنے سے منع کیا۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ ہم صرف اللہ کی عبادت کریں، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں اور روزے رکھیں ..... " الخ

قریش کے دونوں سفیر دربار میں موجود تھے۔ ان میں سے ایک عمرو بن العاص تھے جن میں نہ تو ڈپلومیسی کی کمی تھی نہ طلاقت لسان کی مگر جعفر نے اسلام کے قبل عرب کی حالت کا جو نقشہ کھینچا، یا اس نئے دین کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ کہا اس کی دونوں میں سے کسی نے تردید نہ کی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ عرب کے ماضی اور حال کا یہ بیان بالکل ٹھیک تھا۔

یہ تاریخ کے صفحات میں سے صرف جزیرۂ عرب کی بابت ایک گواہی تھی۔ دورِ جدید کا ایک غیر مسلم اس وقت کی پوری دنیا سے متعلق ایک ایسی ہی گواہی دیتا ہے۔ جے۔ ایچ ڈینیسن (J. H. DE NISON) اپنی کتاب "جذبات بحیثیت اساسِ تہذیب" (EMOTIONS AS THE BASIS OF CIVILIZATION) میں لکھتا ہے:-

" پانچویں اور چھٹی صدی میں مہذب دنیا مزاج کے ایک ناپائدار اور پرخطر کراڑے پر کھڑی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ عظیم الشان تمدن جس کی تعمیر پر چار ہزار سال کی ان تھک کوششیں صرف ہوئی تھیں پارہ پارہ ہوا چاہتا ہے اور انسانیت، وحشت و بربریت کے اس دور کی طرف دوبارہ لوٹنا چاہتی ہے جو اس سے پہلے گذر چکا تھا۔ مختلف قبائل خونیں جنگوں میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے، نہ کوئی قانون باقی رہ گیا تھا نہ کوئی نظم۔ مسیحیت نے جس نظم کی طرح ڈالی تھی، وہ اتحاد و تنظیم کی بجائے انتشار و تفریق کا باعث بن رہا تھا۔ اس وقت تہذیب کی حالت ایک تناور درخت کی سی تھی جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوں اور ساری دنیا اس کے سایہ تلے آ جائے لیکن اندر ہی اندر اسے گھن لگ کر اس کے گودے تک سرایت کر چکا ہو .... اس ہمہ گیر فساد کے مظاہر کے درمیان وہ شخص پیدا ہوا جس نے سارے عالم کو ایک کر دکھایا۔" [1]

---

[1] ماخوذ از Islam and the new world order مصنفہ مولانا محمد علی عربی ترجمہ استاذ احمد جودۃ السحار۔

یہ کہانی لمبی ہے، اور ہماری کتاب کا موضوع اسلام نہیں بلکہ اسلام میں اجتماعی عدل ہے۔ لہذا اب ہم خاص اس عنوان سے متعلق کچھ تاریخی نظائر سامنے لانے پر اکتفا کریں گے۔

بیداری ضمیر کے نمونے

لیکن ان تاریخی نظائر سے پہلے ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس سے اہم تر موضوع یعنی اسلام کے ضمیر پر روشنی ڈالنے والی بعض مثالیں سامنے لائیں، کہ اسی ضمیر پر اسلام کی ساری عمارت قائم ہے۔

اسلام فرد کے ضمیر کو ہر آن بیدار رہنے کی جو تعلیم دیتا ہے اور اس کے شعور کو جتنا زیادہ حسّاس دیکھنا چاہتا ہے اس کا ذکر ہم اوپر کر چکے ہیں۔ اسلامی تاریخ نے اس بیداری ضمیر اور شدّت احساس کے اتنے نمونے محفوظ کر رکھے ہیں کہ وہ ان صفحات میں نہیں سما سکتے۔ یہاں بہت سی مثالوں کی بجائے چند مختلف النوع نمونے پیش کیے جا سکیں گے۔

بریدہ سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا "ماعز بن مالک نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں آئے۔ اور کہا 'اے اللہ کے رسول مجھے پاک کر دیجیے'، آپ نے فرمایا۔ تیرا بُرا ہو، لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ واستغفار کر لے، راوی کہتا ہے وہ تھوڑی دور تک واپس گئے پھر لوٹ آئے اور آپ سے پھر یہی کہا کہ "اے اللہ کے رسول مجھے پاک کر دیجیے۔ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے پھر وہی جواب دیا۔ تین بار ایسا ہی ہوا، چوتھی بار رسول اللہ نے فرمایا 'میں تجھے کس چیز سے پاک کر دوں؟ وہ بولے 'زنا سے' رسول اللہ نے لوگوں سے پوچھا یہ شخص پاگل تو نہیں، آپ کو بتایا گیا کہ وہ پاگل نہیں ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا' کیا اس نے شراب پی رکھی ہے؟ ایک شخص نے اُٹھ کر ماعز کے منہ کی بُو سونگھی تو اُسے شراب کی بُو نہیں ملی۔ آپ نے پھر ان سے پوچھا' کیا تم نے زنا کیا ہے'، اُنھوں نے کہا' ہاں' اس پر آپ نے حکم صادر فرما دیا اور ان کو سنگسار کر دیا گیا۔

"اس واقعہ کو دو تین دن گذرے ہوں گے کہ ایک دن رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے اور آپ نے فرمایا: ماعز بن مالک کے لیے مغفرت کی دعا کرو، اس نے ایسی توبہ کی ہے جو اگر ایک پوری قوم کے درمیان تقسیم کر دی جائے تو ان سب کے لیے کافی ہو۔

"پھر آپ کے پاس قبیلہ ازد کے بطن غامد کی ایک عورت آئی اور اس نے کہا' اللہ کے رسول مجھے پاک کر دیجیے، آپ نے فرمایا' تیرا برا ہو، لوٹ جا اور اللہ کے حضور توبہ واستغفار کر لے' وہ بولی کیا آپ مجھے ماعز بن مالک کی طرح لوٹانا چاہتے ہیں؟ یہ زنا سے قرار پایا ہوا حمل ہے! آپ نے فرمایا کیا تو (زنا سے

حاملہ) ہے۔ اس نے کہا ہاں۔ آپ نے اس سے کہا وضع حمل تک انتظار کر۔ راوی کہتا ہے کہ پھر آپ نے اس عورت کو بچہ جلنے تک کے عرصہ کے لیے ایک انصاری کی نگرانی میں دے دیا۔ کچھ عرصہ بعد اس انصاری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر آپ کو مطلع کیا کہ غامدی عورت بچہ جن چکی۔ آپ نے فرمایا مگر ہم ایسا نہیں کریں گے کہ اسے سنگ سار کردیں اور اس کے شیر خوار بچہ کو اکیلا چھوڑ دیں کہ کوئی اسے دودھ پلانے والا نہ ہو۔ اس پر ایک انصاری نے اٹھ کر یہ کہا کہ اللہ کے نبی، اس کے دودھ پلانے کا انتظام میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ راوی کہتا ہے کہ پھر رسول اللہ نے اسے سنگ سار کروا دیا۔

ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس سے یہ کہا کہ لوٹ جا، جب بچہ جن لینا تب آنا۔ جب وہ بچہ جن لینے کے بعد آئی تو آپ نے فرمایا کہ جا اسے دودھ پلا، جب دودھ چھڑا لینا تب آنا۔ جب وہ دودھ چھڑا چکی تو بچہ کو لے کر آپ کے پاس آئی، بچہ کے ہاتھ میں روٹی کا ایک ٹکڑا تھا۔ اس نے آپ سے کہا رسول خدا، میں نے اس کا دودھ چھڑا دیا ہے اور اب یہ کھانا کھانے لگا ہے، آپ نے بچہ کو کسی مسلمان کے حوالہ کردیا اور اس عورت کے رجم کا حکم صادر فرمادیا چنانچہ اس کے لیے سینہ تک گہرا ایک گڈھا کھودا گیا۔ پھر آپ کے حکم سے لوگوں نے اسے سنگ سار کردیا۔ خالد بن ولید نے ذرا آگے بڑھ کر ایک پتھر اس کے سر پر مارا جس سے خون کے چھینٹے اڑ کر ان کے چہرے پر پڑے۔ اس پر انھوں نے اس عورت کو برے الفاظ سے یاد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "خالد! ذرا سنبھل کر، اس ذات کی قسم جس کے ہاتھوں میں میری جان ہے، اس عورت نے ایسی توبہ کی ہے جو اگر (ناجائز) چنگی وصول کرنے والا بھی کرتا تو اسے بخش دیا جاتا۔" پھر آپ کے حکم سے اس کے جنازہ کی نماز پڑھی گئی اور اسے دفن کردیا گیا۔" (مسلم، نسائی)

ماعز بن مالک اور اس عورت کا کردار ہمارے سامنے ہے۔ ان میں سے کسی کے بارے میں یہ شبہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس سخت سزا سے ناواقف رہا ہوگا جو اس پر عائد ہونے والی تھی، یا اسے اس بات کا اندازہ نہ رہا ہوگا کہ اسے کتنے برے انجام سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان کو کسی نے جرم کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا کہ ان کا جرم ثابت کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت اصرار کیا۔ آپ کی شفقت اور اسلام کی رحمت کا تقاضا ہوا کہ شبہ کی بنا پر ان کو سزا سے معاف رکھیں، لیکن ان دونوں نے بہت اصرار کیا۔ انھوں نے اپنے اوپر وہ سارے دروازے بند کرلیے جن سے وہ نکل کر بچ سکتے تھے۔ اس عورت نے تو رسول اللہ سے یہ گستاخانہ بات بھی کہہ دی کہ آپ نے اسے اس طرح

واپس کرنا چاہا جس طرح ماعز کو واپس کیا تھا ــــــ گویا آپ پر دین کے معاملہ میں نرمی اور تساہل سے کام لینے کا الزام رکھ رہی ہو!

آخر یہ سب کیوں ؟ . . . . ان کا یہ کہنا کہ اللہ کے رسول مجھے پاک کر دیجیے، اُن کے اندر ایک ایسی محرک قوّت کے وجود کی نشاندہی کرتا ہے جو خود زندہ رہنے کی خواہش پر بھی غالب ہے۔ یہ قوّت ضمیر کی بیداری، اور شعور کا احساس ہوتا ہے۔ یہ اس گناہ سے پاک ہونے کی طلب ہے جس سے اللہ کے سوا کوئی اور واقف نہیں ہے۔ یہ اس بات سے آنے والی شرم ہے کہ کل کو اللہ کے حضور اس حال میں حاضر ہونا پڑے گا کہ ایک گناہ کیا تھا جس سے اب تک پاک نہیں ہو سکے۔

یہ ہے حقیقی اسلام۔ وہ شدّت احساس اسی کا ظہور ہے جو مجرم کے ضمیر میں جنم لیتا ہے۔ وہ رحم و کرم اسی کا پرتو ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مجرم کو واپس کر دینے میں نمایاں ہے۔ وہ دانشمندی اسی کا فیضان ہے جس کا اظہار تہمت ثابت ہو جانے پر مجرم کو سزا دے دینے میں ہوتا ہے، کہ اعتراف کی پاکیزگی یا توبہ کی عظمت آپؐ کو نفاذ قانون سے نہ روک سکی۔ وجہ یہ ہے کہ مجرم اور شارع دونوں ہی کو اس دین کا اپنی محکم بنیادوں پر قائم رہنا عزیز تھا۔

حدود کے بارے میں اس ضمیر کا یہ حال ہے، اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ان اجتماعی امور میں اس کا کیا حال ہوگا جن کی خاطر جان تک قربان کر دی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں شام کے لشکر کی امارت سے خالد کو معزول کر کے ابو عبیدہ کو امیر مقرر کرنے کا واقعہ سامنے آتا ہے۔ یہ خالد وہی سپہ سالار ہیں جو اس وقت تک کبھی شکست سے نہیں دوچار ہوئے تھے۔ وہ ایک عرب تھے، اور ہر عربی کی طرح اپنے حسب و نسب اور کارناموں پر فخر کرنے والے، اور خود پسند واقع ہوئے تھے۔ اِن خالد کو امارت سے معزول کیا جاتا ہے مگر یہ کینہ و فساد پر نہیں اتر آتے۔ ان کو غیرت نہیں ستاتی کہ میدان جنگ سے روپوش ہو جائیں۔ کسی طرح کی بغاوت کا خیال دل میں لانے کا تو کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ اسی میدان جنگ میں، اُسی جوش و جذبہ کے ساتھ، اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے اس تڑپ کے ساتھ، اور خدا کی راہ میں شہید ہونے کی اُسی تمنّا کے ساتھ مصروف پیکار رہتے ہیں۔ وہ اس موقع پر کسی سوء کو اپنے دل میں راہ نہیں دیتے کیونکہ اسلام فرد کے ضمیر میں جو ہمہ وقتی بیداری اور اس کے احساس میں جو شدّت پیدا کرتا ہے وہ اس سے بہت بلند ہے کہ ان جیسی باتوں کو کچھ اہمیّت دے۔

اس واقعہ کا دوسرا پہلو بھی معنی خیز ہے۔ یہ پہلو عمر بن الخطابؓ سے متعلق ہے درحقیقت ان کا خالد کو معزول کرنا خود اسی شدّت احساس کا نتیجہ تھا۔ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کے دورِ خلافت میں خالد بن ولید کی بعض ایسی غلطیاں پکڑی تھیں جن پر آپ کا ضمیر کانپ کانپ گیا۔ ایک بات یہ تھی کہ انھوں نے مالک ابن نویرہ کو قتل کرنے میں جلدی کی اور پھر اس کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اس کے بعد آپ نے پھر اسی قسم کی ایک بات پکڑی اور وہ یہ کہ مسیلمہ کذّاب کے خلاف جنگ میں عین اسی صبح کو جس کے قبل والے دن بارہ سو منتخب صحابہ اس جنگ میں شہید ہو چکے تھے، خالد نے مجّاعہ کی بیٹی سے نکاح کیا تھا۔۔۔۔

ان غلطیوں کے سامنے آپ نے اس بات کو کوئی وزن نہ دیا کہ خالد سب سے بڑے سپہ سالار تھے۔ اور انھوں نے سب سے زیادہ معرکے سر کیے تھے۔ اُمّت اسلامیہ شام و اعراق میں فیصلہ کن جنگوں سے دوچار تھی جن میں خالد کی شکست سے نا آشنا سپہ سالارانہ مہارت کی شدید ضرورت تھی۔ لیکن خالد کی فاحش غلطیوں نے عمر کے ضمیر میں جو ہیجان برپا کر دیا تھا اس کو ان میں سے کوئی بات بھی نہ دبا سکی، کوئی بات ان کی اس رائے کو نہ بدل سکی کہ خالد کو لشکر کی امارت سے اور پھر خود لشکر سے علٰحدہ کر دینا ضروری ہے۔ ایک مزید سبب یہ تھا کہ خالد کے ذمہ جو کام کیے جاتے۔ وہ انھیں آزادانہ طور پر انجام دیتے اور یہ بات حضرت عمر کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھی۔ آپ کا احساس ذمہ داری یہ ضروری سمجھتا تھا کہ جزئیات میں بھی دخل دیں اور ہر معاملہ پر پوری طرح نظر رکھیں۔ [۱]

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اگر خالد نے اتنی بڑی غلطی کی تھی تو حضرت ابوبکرؓ نے انھیں کیوں چھوڑے رکھا؟

حقیقت یہ ہے کہ خالد کے بارے میں حضرت ابوبکر کی رائے اتنی بری نہیں تھی جتنی حضرت عمر کی تھی۔ آپ کا خیال تھا کہ خالد سے تاویل میں غلطی ہوئی ہے اور انھوں نے قصداً کسی غلطی یا گناہ کا ارتکاب نہیں کیا ہے۔ اسی وجہ سے باوجود ان کے اس فعل پر غضبناک ہونے کے آپ نے انھیں معاف کر دیا دوسرے واقعہ کو خاص طور پر آپ نے بہت بری نظروں سے دیکھا اور انھیں ایک خونیں، خط لکھ بھیجا لیکن چونکہ آپ کے نزدیک خالد کی غلطی قابل معافی غلطیوں میں شمار کی جا سکتی تھی لہٰذا آپ نے انھیں معاف کر دیا۔ اس دور میں اسلامی ضمیر جتنے بلند مقام پر تھا اُس سے اس واقعہ کی یہی توجیہ میل کھاتی ہے چنانچہ

---

[۱] استاذ صادق عرجون کی کتاب خالد بن ولید سے۔

مجھے سخت تعجب ہے کہ ڈاکٹر ہیکل جیسے شخص کو کس چیز نے مجبور کیا کہ انھوں نے خالد کے معاملہ میں ابو بکر اور عمر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کے موقف کی ایسی توجیہہ کی جو اسلام کی روح سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی اگرچہ وہ آج کل کی گندی سیاست سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ اپنی کتاب "الصدیق ابو بکر" کے صفحات ۱۵۰ تا ۱۵۲ پر لکھتے ہیں۔

"تم نے دیکھا کہ مالک ابن نویرہ کے معاملہ میں ابو بکر اور عمر کے درمیان اختلاف رائے کس حد تک جا پہنچا۔ یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہر دو نوں حضرات مسلمانوں اور اسلام کا بھلا چاہتے تھے، پھر کیا اس اختلاف کی بنا یہ تھی کہ خالد کی غلطی ایک کے نزدیک بہت بڑی اور دوسرے کے نزدیک چھوٹی تھی یا یہ کہ اصل اختلاف اس میں تھا کہ مسلمانوں کی زندگی کے ایسے نازک موقع پر کیا پالیسی ہونی چاہیے جب کہ ارتداد کی لہر چل پڑی تھی اور جزیرہ عرب کے مختلف گوشوں میں بغاوت سر اٹھا رہی تھی۔

میری رائے یہ ہے کہ اختلاف اس میں تھا کہ اس موقع پر کیا پالیسی اختیار کی جانی چاہیے۔ ان دونوں افراد کے مزاج میں جو فرق تھا اس کے پیش نظر یہ اختلاف بالکل قدرتی تھا۔ عمر بے لچک عدل کا نمونہ تھے۔ ان کے نزدیک خالد نے ایک مسلمان پر ظلم کیا تھا، پھر عدّت گذرنے سے پہلے اس کی بیوی کو اپنے نکاح میں لے لیا تھا، لہذا اب ان کا لشکر میں رہنا کسی طرح مناسب نہ تھا تاکہ انھیں پھر ایسا کام کرنے کا موقع نہ ملے جس سے مسلمانوں میں فساد پھیلے اور اہل عرب کی نگاہ میں ان کی وقعت گھٹ جائے۔ انھوں نے لیلیٰ کے ساتھ جو کچھ کیا اس پر ان کو سزا نہ دینا کسی طرح ٹھیک نہ تھا۔ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جاتا کہ مالک کے معاملہ میں ان سے ایک اجتہادی غلطی ہو گئی تھی —— اگرچہ عمر اسے کبھی نہیں تسلیم کر سکتے تھے —— تو بھی انھوں نے اس کی بیوی (لیلیٰ) کے ساتھ جو کچھ کیا وہ آپ کے نزدیک اس بات کے لیے کافی تھا کہ ان پر حدّ جاری کی جائے[1]۔ یہ بات کہ وہ سیف اللہ ہیں اور ایک ایسے کمانڈر ہیں کہ فتح ان کے رکاب میں چلتی ہے، ان کے لیے عذر نہیں بن سکتی تھی۔ اگر اس طرح کے عذر تسلیم کیے جانے لگتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ خالد اور ان جیسے لوگوں کے لیے حرام چیزیں مباح قرار دے دی گئی ہیں۔ ایسا کرنا مسلمانوں کے سامنے احترام کتاب اللہ کی بہت بری مثال پیش کرنے کے ہم معنی ہوتا اپنی اس رائے کی وجہ سے عمرؓ ابو بکر کو بار بار توجہ دلاتے رہے یہاں تک کہ ابو بکر نے خالد کو بلا کر ان کو ان حرکتوں پر سخت تنبیہ کی۔

---

[1] اگر واقعی آپ کی رائے یہی ہوتی تو آپ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں خالد پر حد جاری کی ہوتی۔

ابو بکرؓ کے نزدیک موقع اتنا زیادہ نازک تھا کہ اس طرح کی باتوں کو اہمیت نہیں دی جاسکتی تھی۔ ساری مملکت خطرہ کی زد میں تھی اور بلاد عرب میں چاروں طرف بغاوت و سرکشی کے فتنے سر اٹھا رہے تھے۔ ایسی حالت میں اجتہادی غلطی سے، یا بغیر غلطی کے، ایک فرد یا چند افراد کے قتل کی کیا اہمیت؟ یہ کمانڈر جس پر غلطی کا الزام تھا ان خطرات سے دفاع کا سب سے طاقتور ذریعہ تھا۔ کسی عورت سے نکاح کر لینا، بلکہ اس کے پوری طرح پاک ہونے سے پہلے اس سے خلوت کرنا اہل عرب کے عادات و اطوار کے خلاف نہ تھا۔ بالخصوص کسی فاتح کے لیے، کیونکہ اسے تو جنگ کے طفیل یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ جنگ میں پکڑی ہوئی لونڈیاں اس کی مِلک میں آئیں[1] ضروری نہیں کہ خالد جیسے عظیم اور غیر معمولی انسانوں پر بھی قانون کے نفاذ میں سختی اور اصول پرستی سے کام لیا جائے۔ بالخصوص ایسی حالت میں جب کہ ایسا کرنا مفاد مملکت کے منافی ہو اور اسے خطرات میں مبتلا کر سکتا ہو۔ اس وقت مسلمانوں کو خالد کی تلوار کی شدید ضرورت تھی۔ جس دن ابو بکرؓ نے انھیں بلا کر تنبیہ کی تھی اسی دن مسلمانوں کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت تھی (خالد کے مستقر) البطاح کے بالکل قریب یمامہ میں مسیلمہ بنی حنیفہ کے چالیس ہزار جوان لیے کھڑا تھا۔ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کی بغاوت سب سے خطرناک بغاوت تھی۔ مسلمانوں کے کمانڈروں میں سے وہ عکرمہ بن ابی جہل کو زیر حراست لے چکے تھے۔ اور اب فتح کی ساری امیدیں خالد کی تلوار سے وابستہ تھیں۔ کیا صرف مالک ابن نویرہ کے قتل کی بنا پر، یا خالد کو فتنہ میں مبتلا کر دینے والی حسین لیلیٰ کی وجہ سے، خالد کو معزول کر دیا جاتا اور مسلمان فوجوں کو مسیلمہ سے مغلوب ہو جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا؟ اور اللہ کے دین کو اس عظیم دین خطرہ میں ڈال دیا جاتا جو اس زمین پر ممکن ہے؟ خالد خدا کی نشانی تھا۔ وہ خدا کی تلوار تھا، لہٰذا عین مناسب ہوا کہ جب ابو بکرؓ انھیں طلب کریں تو صرف تنبیہ و سرزنش پر اکتفا کریں اور اُسی وقت انھیں یہ حکم بھی دیں کہ یمامہ جائیں اور مسیلمہ کا مقابلہ کریں۔

یہ ہے میرے نزدیک صحیح تصویر اس اختلاف کی جو اس معاملہ میں ابو بکرؓ اور عمرؓ کے درمیان پیدا ہو گیا تھا۔ بنی حنیفہ کے جھوٹے مدعی نبوت نے جب عکرمہ کو پکڑ لیا تو ابو بکرؓ نے خالد کو اُس سے مقابلے کے لیے

---

[1] ایسی باتیں وہی شخص لکھ سکتا ہے جو شریعت اسلامی کی الف ب سے بھی ناواقف ہو۔ اگر واقعۃً خالد نے ایک مسلمان پر ظلم کیا تھا تو لازم تھا کہ ان پر حد جاری کی جائے۔ پھر جب یہ شخص مسلمان تھا تو اس کی بیوی کو جنگ میں لونڈی نہیں بنایا جاسکتا تھا۔

جانے کا حکم غالباً اسی لیے دیا کہ اہل مدینہ اور خاص کر وہ لوگ جو عمر کی رائے سے متفق تھے یہ دیکھ لیں کہ خالد کٹھن وقت پر کام آنے والا مرد میدان ہے۔ اور یہ کہ آپ نے یہ حکم دے کر گویا انھیں دہکتی آگ میں ڈال دیا کہ یا تو وہ انھیں نگل جائے اور یہ میدان جنگ میں کام آجائیں تو یہ ام تمیم اور اس کے شوہر کے ساتھ کیے کی بہترین سزا ہوگی، یا اس معرکہ میں فتح ان کے قدم چومے اور انھیں (اس گناہ سے) پاک کر دے۔ چنانچہ یہ فتح یاب ہوئے اور مال غنیمت لے کر لوٹے اور مسلمانوں کو اتنے بڑے خوف سے نجات دلائی جس کے سامنے اس حرکت کا کوئی وزن نہیں جو ان سے البطاح میں سرزد ہوگئی تھی۔"

یہ ہے ڈاکٹر ہیکل کی نظر میں صحیح صورت حال۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایک شخص اپنے تخیّل کے سہارے تاریخ اسلامی کے اس دور میں داخل ہوتا اور ان حسّاس اور بیدار ضمیروں کے زیر سایہ لکھتا ہے لیکن اس کا اپنا قلب وضمیر واقعات کی توجیہ میں اس سطح سے بلند نہیں ہوتا جو سراسر موجودہ مادّی دور سے متاثر بلکہ ماخوذ ہے، نہ کہ اسلام کی حقیقی اسپرٹ اور اس مخصوص دور میں اس کی عملی تاریخ سے۔ یہ تو موجودہ دور کی سیاست ہے جس کی نگاہ میں اچھے مقصد کے لیے برے ذرائع بھی جائز ہیں جو ضمیر انسانی کو ہنگامی ضروریات کا تابع بنا دیتی ہے اور پھر اسے ڈپلومیسی کا کمال اور تدبیر معاملات میں اعلیٰ درجہ کی لیاقت کا مظاہرہ قرار دیتی ہے۔ اس تصویر میں، جسے ڈاکٹر ہیکل واقعہ کی واحد صحیح تصویر دیتے ہیں، حضرت ابوبکرؓ کی شخصیت کتنی گھٹیا نظر آتی ہے! خیریت یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی شخصیت اس سے بلند ہے کہ آج کے ذلیل اور پست دور کا انسان جس دوربین سے دیکھنے کا عادی ہے اس سے اُسے دیکھا جا سکے۔ اس دوربین کے لیے اس مقام بلند کو پا سکنا ناممکن ہے، پھر اگر دیکھنے والا شریعت اسلامی کی ابتدائی باتوں سے بھی ناواقف ہو تو معاملہ اور بگڑ جاتا ہے۔

اپنی کتاب "الفاروق عمر" میں ڈاکٹر ہیکل نے ایک بار پھر اسی موضوع پر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے کوشش کی ہے کہ خالد کی معزولی کا ارادہ کرتے وقت حضرت عمر کی ذہنی کیفیت کا تجزیہ کریں۔ ایک بار پھر اپنے زمانہ کی پستی نے ان کو متاثر کر دیا ہے اور ان کے ذہن پر اس پارٹی لیڈر کا کردار مسلّط ہوگیا ہے جس کے سامنے وقتی مصالح اور مقامی ضروریات کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا، جس کے لیے اسلام کی بلند مرتبہ روح کو سمجھنا ممکن ہی نہیں۔ صفحہ ۹۹-۱۰۰ پر لکھتے ہیں۔

"آخر عمر نے خالد کی معزولی جیسا نازک فیصلہ کیسے کیا جب کہ شام میں مسلمانوں کی ساری

فوجی طاقت خالد کے تحت تھی ؟ یہ طاقتیں اس وقت بڑے نازک مرحلہ سے گذر رہی تھیں - وہ رومیوں کے بالمقابل کھڑی تھیں مگر نہ تو کھل کر مقابلہ ہوتا تھا نہ رومیوں پران کا کچھ بس چلتا تھا - اسی طرح رومی بھی مسلمانوں کا کچھ نہیں کرسکتے تھے - خالد کے عراق سے وہاں آنے سے پہلے بھی یہی صورت حال تھی اور ان کے آنے کے بعد بھی یہی صورت حال باقی رہی - دونوں فریق موقع کے منتظر تھے تاکہ یہ جمود ختم ہو اور وہ دشمن پر حملہ کرسکیں - کیا خلیفہ کو یہ اندیشہ نہ ہوا کہ خالد کی معزولی سے مسلمانوں کے اندر ان کی دھاک کمزور پڑ جائے گی اور موقع کی نزاکت بڑھ جائے گی؟ کیا زیادہ بہتر نہ تھا کہ وہ اس وقت تک صبر کرتے جب تک کہ خالد مسلمانوں کو اس پیچیدہ مرحلے سے گذار نہ لیتے، اور اس کے بعد جو حکم چاہتے صادر فرماتے ؟

" جنگی اتار چڑھاؤ میں یہ باتیں بلاشبہ قابل لحاظ ہیں - جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے ابو عبیدہ نے خلیفہ کی ناپسندیدگی اور خفگی کی پروا نہ کرتے ہوئے ان باتوں کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی - لیکن عمر نے معاملہ کو ایک دوسرے زاویہ نگاہ سے دیکھا - اگر وہ خالد کی معزولی کا معاملہ جنگ ختم ہونے تک ملتوی رکھتے تو ان کی پالیسی کو نقصان پہنچتا اور معاملہ بد سے بدتر ہو جاتا - ظاہر ہے کہ جنگ میں یا تو مسلمانوں کو فتح ہوتی یا شکست - اگر شکست ہوتی تو خالد کی معزولی سے اس میں کوئی فرق نہ آتا - لیکن اگر خالد کی قیادت میں مسلمانوں کو فتح ہوتی تو عمر کے لیے یہ ممکن نہ رہ جاتا کہ کسی کمانڈر کو فتح و کامرانی کی بلندیوں سے نیچے اتار کر برطرف کر دیں، ایسا کرنا سخت غلطی ہوتی - عمر بہر حال یہ فیصلہ کر چکے تھے کہ شام میں یا کسی دوسری جگہ بھی خالد کو سپہ سالار نہ رہنے دیں گے، اسی لیے آپ نے ان کی معزولی کے احکام صادر کرنے میں جلدی کی - اس کے لیے ان کے پاس یہ وجہ موجود تھی کہ خالد نے ابو بکر کی ہدایات پر پوری طرح عمل نہیں کیا - چونکہ اس کے بعد بھی مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی لہٰذا کوئی عمر پر اعتراض نہ کرسکتا تھا - انھوں نے وہی کیا جسے انھوں نے ٹھیک سمجھا تھا اور خالد ایسی پوزیشن میں تھے کہ ان کو برطرف کرنے والے پر کسی طرح بھی زیادتی کرنے کا الزام نہیں رکھا جا سکتا تھا -"

یہ بیسویں صدی کے ہیکل "پاشا" کا طرز فکر ہے جسے وہ قرن اول کے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سر تھوپ رہے ہیں - اس سے پہلے وہ حضرت ابو بکرؓ کے سلسلہ میں بھی ایسا کر چکے ہیں - یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی روح ابو بکر و عمر کی روح کو چھو بھی نہیں سکی ہے - جو اسلام کی فضا میں کچھ عرصہ سانس لینے کے باوجود ایک لمحہ کے لیے بھی بیسویں صدی کی خباثتوں سے پاک نہیں ہو سکا ہے - اِس دور کے جھوٹے وعدے، پُرفریب چالیں،

اور ضمیر، صداقت، دین، سب کو پس پشت ڈال دینے والی موقع پرستی نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔

آخر ہیکل نے عمر کو سمجھا کیا ہے؟ اگر حالات مختلف ہوتے، اور یہ موقع نہ میسر ہوتا، تو کیا عمر خالد کو چھوڑ دیتے درآں حالیکہ خود ہیکل پاشا کی کھینچی ہوئی تصویر کے مطابق انھیں پورا یقین تھا، اور ان کا ضمیر اس پر مطمئن تھا، کہ خالد مالک بن نویرہ کے حق میں، اور پھر اللہ اور اس کے دین کے حق میں سراسر غلط کار اور گنہگار رہا!

ان باتوں کا لحاظ کرنا، اور ان حالات کے آگے سپر ڈال دینا کیا اس عمر کا کام ہوسکتا تھا جو پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دے لیکن اپنی راہ نہ کھوٹی کرے، جس کا ایمان آندھیوں کا رُخ موڑ دے لیکن خود نہ مڑے؟

اس قسم کے کام بنو امیہ اور بنو عباس کے بادشاہ ہونے کیے ہیں اور لوگ انہیں ان کی ڈپلومیسی اور ہوشیاری پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن عمر اور ابو بکر اس سے بہت بلند ہیں۔ اگر بعض لوگ ان دونوں حضرات کے بارے میں بھی اسی طرح سوچنے لگتے ہیں تو اس کا اصل سبب دورِ حاضر کی اسپرٹ کی کمزوری اور اس کے معیاروں کا پست ہونا ہے۔

میں نے اس طرز فکر کو پیش کرنے اور اس کی لغویت واضح کرنے میں قدرے تفصیل سے کام لیا ہے تاکہ اس کھلی ہوئی مہلک غلطی کی نشاندہی کر سکوں جس میں بعض لوگ آج کل مبتلا ہیں، روح اسلام کے زمانۂ عروج میں جو طرز فکر پایا جاتا تھا اس کی تصویر کشی یہ لوگ آج کے مادّی دور کے طرز فکر کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں جو اس روحانی بیداری سے کوسوں دور ہے۔ میں اس غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں جو اس غلطی کے نتیجہ میں خود انسانی ضمیر، اس کی بیداری، اور ترقی کی ان مخفی صلاحیتوں کے بارے میں لاحق ہوسکتی ہے جو ضمیر انسانی میں مضمر ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ (قرن اوّل کے) ان انسانوں کو کسی مصنوعی لباس میں سامنے لاؤں یا انھیں ہر طرح کی بشری کمزوریوں سے مبرّا ثابت کر دوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر لوگوں کو ضمیر انسانی پر بھروسہ کرنا سکھاؤں۔ اسی لیے میں مسلمانوں کی زندگی کے اس دور کی بالکل ٹھیک تصویر کھینچنا چاہتا ہوں تاکہ ہر وہ ضمیر جو اس مقام بلند کی طرف اقدام کی صلاحیت رکھتا ہو اسے محسوس کرنے لگے۔

اب ہم مختلف شعبہ ہائے حیات میں بیداریِ ضمیر کے نمونے پیش کرنے کا سلسلہ پھر شروع کرتے ہیں، اِدھر دیکھیے، خلیفۃ المسلمین عمر بن الخطاب پانی کا مشکیزہ اٹھائے چلے آرہے ہیں! ان کے صاحبزادے ناپسندیدگی کے لہجہ میں ان سے پوچھتے ہیں۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ جواب دیتے ہیں: "میرا نفس غرور و خودپسندی میں مبتلا ہوگیا تھا، میں نے چاہا کہ اسے ذلیل کروں۔" بیداریِ احساس ملاحظہ ہو! اس شخص کے دل کے کسی گوشہ میں خلافت، فتوحات، اور آئندہ آنے والی عزت و عظمت پر تھوڑی خودپسندی پیدا

ہوئی، انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ یہ خود پسندی باقی رہے اور پروان چڑھے، وہ جھٹ نفس کو ذلیل کرنے اٹھ کھڑے ہوئے، اور وہ بھی سب کے سامنے۔ انسے اس بات کی ذرا پروا نہ ہوئی کہ وہ اتنی بڑی سرزمین کا مالک و مختار خلیفہ ہے جس میں عرب کے علاوہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کے بیشتر ممالک شامل ہیں۔

اور یہ ہیں علی ابن ابی طالب —— جاڑوں کا زمانہ ہے، ٹھنڈک کے مارے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔ بدن پر گرمی کے کپڑے ہیں، اس کے علاوہ سردی سے بچاؤ کے لیے اور کچھ نہیں۔ بیت المال ان کے ہاتھ میں ہے لیکن ان کے ضمیر کی بیداری اور شعور کی بلندی اس سے استفادہ نہیں کرنے دیتی۔

ابو عبیدہ عمواس میں اپنی فوج کے ساتھ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ عمواس کو ایک مہلک طاعون نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ حضرت عمر کو ڈر ہے کہ "امین الامت" کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، چنانچہ انھیں ہلاکت کے منھ سے نکالنے کے لیے وہ انھیں خط لکھ کر بلاتے ہیں۔ خط میں لکھتے ہیں:

"امّا بعد، مجھے ایک ضروری کام کے سلسلہ میں تم سے بالمشافہ گفتگو کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے تاکید کرتا ہوں کہ اس خط کو پڑھنے کے بعد، اسے رکھنے سے پہلے ہی میری طرف چل پڑو۔"

ابو عبیدہ خط پڑھتے ہی عمر کا اصل مقصد بھانپ لیتے ہیں۔ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ آپ نے ان کو مہلک وبا کے منھ سے نکالنے کے لیے ایک بہانہ تلاش کر لیا ہے۔ فرماتے ہیں "اللہ امیر المومنین کو معاف کرے" اور حضرت عمر کو یہ لکھ بھیجتے ہیں کہ:

"میں سمجھ گیا کہ آپ کو میری کیا ضرورت ہے۔ اس وقت میرے ساتھ مسلمانوں کا پورا لشکر ہے، میں نہیں چاہتا کہ ان سے جدا ہوں، میں انھیں اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اللہ میری اور ان کی تقدیر کا لکھا پورا نہ کر دے۔ امیر المومنین، ان وجوہ کی بنا پر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ مجھے اپنی تاکید سے بری فرمائیں اور اپنے لشکر میں رہنے دیں۔"

عمر یہ خط پڑھ کر رونے لگتے ہیں۔ حاضرین دریافت کرتے ہیں کیا ابو عبیدہ چل بسے؟ وہ آنسوؤں کے درمیان رُندھی ہوئی آواز میں جواب دیتے ہیں "نہیں، مگر گویا کہ (وہ چل بسے)" اور ایسا ہی ہوا۔

یہ تقدیر الٰہی پر گہرا ایمان ہی تو تھا جو ابو عبیدہ کو موت کے منھ میں روکے رہا۔ بلاشبہ، اور یہ احساس بھی کہ خود بھاگ جانا اور پورے لشکر کو موت کے منھ میں چھوڑ دینا کسی طرح مناسب نہیں جب کہ سب اللہ کی راہ کے سپاہی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موذن، بلال بن رباح کے اسلامی بھائی ابورویحہ کی خواہش ہے کہ یمن کے کچھ لوگوں سے اُن کی شادی کی بات چیت کرنے کے لیے واسطہ بنیں۔ حضرت بلال ان لوگوں سے فرماتے ہیں "میں بلال بن رباح ہوں، اور یہ میرے بھائی ابورویحہ ہیں جو دین اور اخلاق دونو میں بُرے واقع ہوئے ہیں۔ تمہارا جی چاہے تو ان سے رشتہ کرلو، نہ جی چاہے نہ کرو۔"

بالکل صاف بات کہہ دی۔ نہ تو اپنے بھائی کی کوئی کمزوری چھپائی نہ ان لوگوں کو کسی مغالطہ میں مبتلا کیا۔ انھوں نے اپنی اس حیثیت کا ذرا بھی لحاظ نہ کیا کہ وہ شادی کی گفتگو میں واسطہ بن رہے ہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ اس جواب دہی سے غافل ہوجائیں جو اپنے ہر قول کے سلسلہ میں اللہ کے حضور کرنی ہوگی۔ یمن والوں نے ان کی حق گوئی پر بھروسہ کرکے رشتہ قبول کرلیا، ان کے لیے یہ کافی تھا کہ ایسا حق گو ان کی بیٹی کے لیے شادی کا پیغام لایا تھا۔

ابوحنیفہ کا کردار ملاحظہ ہو: "انھوں نے کچھ سامان اپنے شریکِ تجارت حفص بن عبدالرحمٰن کے پاس بھیجا اور ان کو مطلع کردیا کہ اس میں ایک کپڑا عیب دار ہے، اس کا عیب لوگوں کو بتادیں، حفص نے یہ مال فروخت کردیا مگر عیب بتانا بھول گئے ناقص کپڑے کے عوض پورا دام وصول کرلیا۔ روایت ہے کہ اس کا دام تیس[۳۰] ہزار یا پینتیس[۳۵] ہزار (درہم) تھا۔ ابوحنیفہ نے اپنے شریک کو کہلا بھیجا کہ خریدار کو تلاش کریں لیکن انھیں خریدار کا پتہ نہ ملا۔ اس پر ابوحنیفہ نے اپنے شریک سے علیحدگی اختیار کرلی بلکہ اس قیمت کو اپنے پاکیزہ مال میں ملانا بھی گوارا نہ کیا اور اسے کل کا کل خیرات کردیا۔"[۱]

روایت ہے کہ یونس بن عبید کے پاس مختلف داموں کے کپڑے تھے۔ ایک قسم تھی جس کے ہر جوڑے کا دام چار سو تھا اور دوسری قسم کا دام دو سو فی جوڑا تھا۔ یہ نماز کے لیے گئے اور اپنے بھتیجے کو دوکان پر چھوڑ گئے۔ اسی اثناء میں ایک اعرابی آیا اور اس نے چار سو کی قیمت کا ایک جوڑا مانگا، لڑکے نے اسے دو سو والے جوڑے دکھائے۔ وہ اسے پسند آگئے اور وہ راضی خوشی ان کو خرید کرلے گیا، وہ وہ یہ کپڑا ہاتھ میں لیے جا رہا تھا کہ راستہ میں یونس کا سامنا ہوگیا وہ اپنا کپڑا پہچان گئے۔ انھوں نے اعرابی سے دریافت کیا کہ اسے کتنے میں خریدا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ چار سو میں۔ اُنھوں نے کہا کہ یہ تو دو سو سے زیادہ کا نہیں، لوٹ جاؤ اور اسے واپس کردو۔ اس نے جواب دیا کہ یہ جوڑا ہمارے ملک میں پانچ سو کا

---

[۱] ابوحنیفہ بطل الحریۃ والتسامح فی الاسلام، مصنفہ استاذ عبدالحلیم الجندی۔

ملتا ہے، اور میں نے اسے راضی خوشی خریدا ہے۔ یونس نے کہا کہ واپس چلو، کیونکہ دین کی راہ میں خیر خواہی دنیا جہان کی دولت سے بہتر ہے۔ یہ اُسے اپنی دوکان پر لے گئے اور دو سو درہم واپس کر دیئے۔ پھر انھوں نے اپنے بھتیجہ کو ڈانٹ سنائی اور کہا "تجھے شرم نہ آئی، تجھے خدا کا خوف نہ لاحق ہوا، صد فی صد نفع لیتا ہے، اور مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی نہیں برتتا!" لڑکا قسم کھانے لگا کہ خریدار نے راضی خوشی مال خریدا تھا۔ اس پر انھوں نے کہا "تو خود اپنے لیے جو پسند کرتا ہے وہی تو نے اس کے لیے کیوں نہ پسند کیا۔"

محمد ابن منکدر سے مروی ہے کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کے ملازم نے ایک اعرابی کے ہاتھوں پانچ پانچ (درہم) والے ٹکڑے دس (درہم) میں فروخت کر دیے۔ (محمد ابن منکدر کو معلوم ہوا تو) وہ تمام دن اس اعرابی کی تلاش میں سرگرداں رہے، یہاں تک کہ اسے ڈھونڈ نکالا، اور اس سے کہا: ملازم نے غلطی کی، اور پانچ کا مال تجھے دس میں دیا۔ وہ تعجب کے ساتھ بولا، مگر ہم نے تو یہ دام راضی خوشی دئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا تم راضی ہو تو بھی ہم تمہارے لیے وہی پسند کریں گے جو خود اپنے لیے پسند کرتے۔" یہ کہہ کر انھوں نے اسے پانچ (درہم) واپس دیے۔[1]

ان تینوں واقعات کا راز کھولنے والی شاہ کلید یونس بن عبید کا یہ جملہ ہے کہ تجھے شرم نہ آئی، تجھے خدا کا خوف نہ لاحق ہوا۔ بے شک، ان تمام واقعات کے پیچھے کام کرنے والی اصل قوت اپنے ضمیر کے آگے شرمانا اور خدا سے ڈرنا ہے، جب نفس انسانی اسلامی اسپرٹ کو اپنا لیتا ہے اور یہ روح رگ وپے میں سرایت کر جاتی ہے تو اسلام اس کے اندر پوری قوت کے ساتھ یہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔

ان چند نمونوں کے علاوہ سیکڑوں نمونے اور ہیں۔ لیکن یہ چند مثالیں اس مقام بلند کی طرف ہماری رہنمائی کے لیے بہت کافی ہیں جو اسلام ضمیر انسانی کی تطہیر و ترقی کے لیے اپنے سامنے رکھتا ہے جس کے ذریعہ وہ اس کو ہر طرح کی ضروریات و تعلّقات سے، اور جان و مال اور عزّ و جاہ کی محبت سے بلند ہونا سکھاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ انسانی ضمیر ان ذمہ داریوں کو بنا ہے جو ہمہ وقت بیدار و ہوشیار رہنے اور شدّت احساس کا حامل ہونے کا تقاضا ہیں۔

اب ہم اطمینان کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں اور اجتماعی عدل کے باب میں اسلام کی عملی تاریخ کے بعض پہلو سامنے لاتے ہیں۔ اس کام میں ہمارے رہنما اسلامی تاریخ کے مذکورہ بالا بلند اور روشن نمونے ہوں گے۔

---

[1] الرسالۃ الخالدہ مصنفہ استاذ عبدالرحمٰن عزّام۔

مساوات کے نمونے

اسلام بنی نوع انسان کے درمیان کامل مساوات کا پیغام لے کر آیا تھا - وہ انسان کے ضمیر کو ان تمام قدروں کی غلامی سے آزاد کرنے آیا تھا جو اس مساوات میں خلل پیدا کر سکتے ہیں - اوپر ہم اس مساوات اور آزادی کے بارے میں اسلام کا نظریہ وضاحت کے ساتھ پیش کر چکے ہیں اور ان نصوص کو سامنے لا چکے ہیں جو اس نظریہ کی گہرائی اور اسلام کے بنیادی سماجی فکر سے اس کی گہری وابستگی پر دلالت کرتی ہیں - اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ نظریہ عملی زندگی پر کس طرح منطبق کیا گیا -

اس زمانہ میں ساری دنیا میں غلام آزاد انسانوں سے الگ ایک جداگانہ طبقہ تھے - یہی حال جزیرہ عرب میں بھی تھا - اس سلسلہ میں ہم جب محمد ابن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ نے اپنی پھوپی زاد بہن زینب بنت جحش کی، جو قریش کے ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، شادی اپنے آزاد کردہ غلام زید کے ساتھ کر دی - شادی ایک ایسا نازک مسئلہ ہے جس میں برابری کا سوال دوسرے سوالات سے زیادہ اہم ہوتا ہے - اس نبی کے سوا کسی دوسرے شخص، یا اس کے دین کی قوت کے سوا کسی دوسری قوت کے بس میں نہ تھا کہ ایسا معجزہ کر دکھائے' جو آج بھی ممالکِ اسلامیہ کے سوا کہیں اور ممکن نہیں - ممالک متحدہ امریکہ میں غلامی قانوناً ممنوع ہے - لیکن کسی نیگرو کے لیے کسی گوری نسل کی عورت کے ساتھ، خواہ وہ کتنی ہی گئی گذری ہو، شادی کرنا ممنوع ہے - یہی نہیں بلکہ نیگرو کا پبلک بسوں اور دوسری سواریوں میں گوروں کے پہلو میں بیٹھنا ان کے ساتھ ریستوران یا تھیٹر میں جانا، یا کسی سرائے یا ہوٹل میں ٹھہرنا بھی آج تک ممنوع ہے -

ہجرت کے اوّلین دور میں جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ کرائی تو ان کے آزاد کردہ غلام زید اور ان کے چچا حمزہ بھائی بھائی قرار پائے - اس طرح حضرت ابوبکر اور خارجہ ابن زید بھائی بھائی قرار دیئے گئے، اور خالد ابن رویجہ خثعمی اور بلال بن رباح کے درمیان مواخاۃ ہوئی - یہ بھائی چارہ الفاظ تک نہیں محدود رہا بلکہ زندگی کا ایک ایسا پختہ رشتہ بن گیا جو خونی رشتہ کے برابر تھا - جان و مال اور زندگی کے سارے ہی معاملات میں ان کے درمیان قربت داری قائم ہو گئی -

اس کے بعد رسول اللہ نے زید کو غزوۂ موتہ میں فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا - پھر ان کے بیٹے اسامہ کو

روم کی لڑائی کے لیے جانے والے ایک ایسے لشکر کا سپہ سالار بنایا جس میں مہاجرین و انصار کی اکثریت شامل تھی اسی لشکر میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ شامل تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ان کے قریب ترین ساتھی اور وزیر رہے اور آپ کے بعد مسلمانوں کے کامل اتفاق سے خلیفہ چنے گئے۔ اسی لشکر میں سعد بن ابی قاصؓ بھی تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رشتہ دار تھے۔ ان کا تعلق بنی زہرہ سے تھا جن سے آپؐ کا ننھیالی رشتہ تھا۔ مزید برآں، یہ قریش کے ان افراد میں سے تھے جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت کی تھی۔ اللہ تعالےٰ نے انھیں سترہ سال کی عمر میں اسلام لانے کی توفیق دی تھی۔ بڑی دولت و ثروت کے مالک تھے، جنگی مہارت بھی تھی، اور جہاد کی خصوصی صلاحیتیں رکھتے تھے۔

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واصل بحق ہوئے اور حضرت ابوبکر نے جیش اسامہ کی روانگی پر اصرار کیا تو آپ نے رسول اللہؐ کے مقرر کئے ہوئے کمانڈر کو بھی باقی رکھا۔ آپ ان کو رخصت کرنے اس حال میں مدینہ کے باہر تک آئے کہ اسامہ سواری پر تھے اور خلیفۃ المسلمین ابوبکر پیدل چل رہے تھے اسامہ کو یہ بات کھٹکی کہ وہ جوان ہو کر سواری پر چلیں اور رسول خدا کا نائب بوڑھا ہو کر پیدل چلے۔ چنانچہ انھوں نے کہا۔ خلیفۂ رسول اللہؐ آپ بھی سواری پر آ جائیں ورنہ میں اُتر آؤں گا۔ خلیفہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ " خدا کی قسم ہرگز نہ اترنا، خدا کی قسم میں ہرگز نہ سوار ہوں گا۔ میں کچھ دیر تک راہ خدا میں اپنے پاؤں غبار آلود کر لوں تو میرا کوئی نقصان نہ ہو جائے گا۔" پھر حضرت ابوبکر کو یہ خیال آیا کہ ان کو حضرت عمر کی ضرورت پڑے گی، خصوصاً اب، جب کہ خلافت کا بار ان کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ عمر جیش اسامہ کے ایک سپاہی تھے۔ چونکہ اس کے امیر اسامہ تھے لہذا ضروری تھا کہ ان سے اجازت حاصل کی جائے۔ چنانچہ خلیفہ کہتا ہے: " اگر آپ مناسب سمجھیں تو عمر کو میری مدد کے لیے چھوڑ جائیں ۔"

اللہ اللہ! مناسب سمجھیں تو عمر کو میری مدد کے لیے چھوڑ جائیے، یہ مقامات کتنے بلند ہیں، اتنے بلند کہ الفاظ ان تک پہنچنے سے قاصر ہیں۔

زمانہ کی گاڑی آگے بڑھتی ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ خلیفۃ المسلمین عمر بن الخطاب عمار بن یاسر کو کوفہ کا والی مقرر فرماتے ہیں۔ حالانکہ وہ موالی میں سے تھے۔ پھر ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ عمر کے دروازہ پر عمرو بن حارث بن ہشام کے بیٹے سہیل، ابو سفیان ابن حرب، اور چند دوسرے اکابر قریش باریابی کے منتظر کھڑے ہیں۔ لیکن آپ دو غریب موالی صہیب اور بلال کو ان سے پہلے بلا لیتے ہیں، کیونکہ وہ رسول اللہؐ

کے صحابی، اور جنگ بدر کے شرکا میں سے تھے۔ اس تقدیم پر ابوسفیان کے نتھنے مارے غصہ کے پھول جاتے ہیں، اور ان کی زبان سے جاہلیت کی بات نکل آتی ہے" ایسی بات میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی .... ان غلاموں کو اندر بلا لیا اور ہمیں دروازے پر چھوڑ دیا۔"

عمر بن الخطاب ایک دن مکّہ میں کہیں جا رہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ ملازمین اپنے آقاؤں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں بلکہ کنارے کھڑے ہیں۔ ان کو غصّہ آجاتا ہے اور ناپسندیدگی کے لہجہ میں ان کے آقاؤں سے فرماتے ہیں "لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اپنے خادموں کے ساتھ بیچ کا برتاؤ کرتے ہیں؟" پھر آپ ان ملازمین کو بلا کر آقاؤں کے ساتھ بٹھا دیتے ہیں تاکہ وہ ان کے ہم پیالہ و ہم نوالہ بن سکیں۔"

حضرت عمر نے نافع بن الحارث کو مکّہ کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اُن سے عسفان میں آپ کی ملاقات ہوئی تو دریافت فرمایا کہ "وادی والوں پر کس کو اپنا نائب مقرر کیا ہے"، انھوں نے جواب دیا کہ "ابن ابزیٰ کو اپنا نائب بنا کر آیا ہوں"۔ آپ نے پوچھا ابن ابزیٰ کیا ہیں؟ انھوں نے بتایا کہ وہ ہمارے موالی میں سے ہیں عمرؓ بولے تم نے ایک آزاد کردہ غلام کو مکّہ والوں پر اپنا نائب بنا دیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ کتاب اللہ کے قاری فرائض کے عالم، اور ساتھ ہی قاضی بھی ہیں۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ "کیوں نہ ہو، تمھارے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم فرما گئے ہیں کہ: اللہ اس کتاب کے ذریعہ بعض لوگوں کو اوپر اٹھائے گا اور بعض کو نیچے گرائے گا۔ (اِنَّ اللہَ یَرْفَعُ بِهٰذَا الکتاب اقواماً ویضع به آخرین۔)

حضرت عمر کے سوال کا مقصد اعتراض کرنا نہیں تھا بلکہ وہ ابن ابزیٰ کو نہیں جانتے تھے، لہٰذا انھوں نے بس یہ معلوم کرنا چاہا کہ ان کی خصوصیت کیا تھی جو وہ اس منصب پر مقرر کیے گئے۔ ورنہ یہی عمر ہیں جو اپنے بعد (منتخب خلیفہ کے لیے مقرر کی جانے والی) شوریٰ کے چھ آدمیوں کو وصیت کرتے وقت یہ فرماتے ہیں: اگر ابوحذیفہ کے مولیٰ سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو (منصب خلافت پر) مقرر کر جاتا۔ گویا وہ آپ کے نزدیک شوریٰ کے چھ آدمیوں سے بہتر تھے، ان چھ میں عثمانؓ، علیؓ، اور سعدؓ بن ابی وقاص بھی شامل تھے۔

موالی ہی میں سے کسی نے قریش کے ایک فرد کو اس کی بہن سے رشتہ کا پیغام دیا اور اس کی بہن کے لیے کافی مال کی پیشکش کی۔ مگر قرشی نے اس کے ساتھ اپنی بہن کا نکاح کرنے سے انکار کر دیا، جب یہ بات حضرت عمر کو معلوم ہوئی تو آپ نے اس قرشی سے کہا۔ اس کے ساتھ شادی کر دینے میں کیا چیز مانع ہے۔

وہ اچھا آدمی ہے اور اس نے تیری بہن کو عطیہ دینے میں بھی کافی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔ قریش نے کہا امیر المومنین ہم اعلیٰ حسب ونسب والے لوگ ہیں، یہ میری بہن کا کفو نہیں۔" عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ آدمی دنیا و آخرت دونوں کا حسب لایا ہے۔ دنیا کا حسب مال ہے اور آخرت کا تقویٰ۔ اگر عورت راضی ہو تو اُسے اس آدمی کے نکاح میں دے دے۔ اس نے اپنی بہن کا عندیہ لیا تو وہ راضی تھی، چنانچہ اُس نے اس آدمی کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا۔

اس سے قبل ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح ایک آزاد کردہ غلام بلال عربی النسل ابو رویحہ کی شادی کے معاملہ میں سفارشی بن کر یمن والوں کے پاس گئے تھے اور انھوں نے بلال کی وجہ سے ابو رویحہ کی عزت کی اور رشتہ قبول کر لیا۔

موالی کو اس بات کا پورا پورا موقع حاصل تھا کہ وہ جس سمت میں چاہیں بلند سے بلند مرتبہ تک ترقی کر جائیں۔ عبداللہ ابن عباس کا ذکر آتا تو ان کے ساتھ ان کے مولیٰ عکرمہ کا ذکر بھی ضرور آتا۔ اسی طرح عبداللہ بن عمر کے ساتھ ان کے مولیٰ نافع کا، انس ابن مالک کے ساتھ ان کے مولیٰ ابن سیرین کا اور ابو ہریرہ کے ساتھ ان کے مولیٰ عبدالرحمٰن ابن ہرمز کا ذکر آنا لازمی تھا۔

" بصرہ میں حسن بصری اور مکہ میں مجاہد ابن جبیر، عطاء بن ابی رباح، اور طاؤس بن کیسان نامی فقہاء تھے (جن کا تعلق موالی سے تھا)۔

" اسی طرح عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں مصر میں منصب افتاء پر یزید ابن ابو جیب فائز ہو۔ دنقلہ کے تھے اور اسود کے مولیٰ تھے .... [1]

محنت کشوں کے ساتھ بھی مسلمانوں کا رویہ ایسا ہی تھا۔ اپنے ہاتھوں سے کام لے کر روزی ان کے نزدیک صرف نظریات و خیالات کی دنیا میں نہیں عملی زندگی میں بھی عزت و احترام کا مستحق تھا کہ کا پیشہ جو بھی ہو، اس سے اس کی عزت میں کوئی فرق نہ آسکتا تھا، کہ محنت بذات خود احترام کی مستحق ہے۔ کسی محنت کش کا پیشہ کبھی بھی اس میں مانع نہیں ثابت ہوا کہ وہ علم حاصل کرے، اس میں بلند درجات تک پہنچے، اسے استاذ تسلیم کیا جائے اور اس کی عظمت تسلیم کی جائے۔

" ابو حنیفہ پارچہ فروش تھے۔ آپ کے بعد بھی بہت سے فقہاء گزرے ہیں جو تاجر

[1] ابو حنیفہ بطل الحریۃ والتسامح فی الاسلام، مصنفہ استاذ عبدالحلیم الجندی۔

امام احمد بن عمر بن مہیر موچی تھے - ان کے والد امام ابوحنیفہ کے رفقاء محمد اور حسن کے شاگرد تھے - ایک طرف تو یہ جوتا بنانے کا کام کر کے روزی کماتے تھے اور دوسری طرف (خلیفہ) مہتدی باللہ کے لیے کتاب الخراج مرتب کر رہے تھے، اور اسی زمانہ میں انھوں نے فقہ پر اپنی گراں قدر تصانیف بھی مرتب کی ہیں - اسی طرح کرابیسی کرابیس یعنی معمولی قسم کے کپڑوں کی تجارت کرتے تھے - قفال جب اپنا ہاتھ باہر نکالتے تو اس کی پشت پر نشانات نظر آتے اور یہ بتاتے کہ یہ اس کام کے نشانات ہیں جو یہ پہلے کیا کرتے تھے (یعنی تالا بنانے کا کام) ابن قطلو بغا درزی کا کام کرتے تھے - اپنے زمانہ کے مسلّم استاد، امام جصّاص اپنے پیشے، گچ کاری، کی طرف منسوب کیے جاتے تھے - اسی طرح تاریخ کے صفحات سے اٹھ کر گواہی دینے کے لیے پیتل کے برتن بیچنے والے (صفّار) عطر فروش (صیدلانی) حلوہ فروش کے بیٹے (حلوانی) آٹا بیچنے والے (دقّاق) صابون فروش (صابونی) جوتا بنانے والے (نعالی) سبزی فروش (بقالی) ہانڈی بیچنے والے (قدوری) وغیرہ وغیرہ ہمارے سامنے آتے ہیں - ابھی تہذیب اسلامی کی فجر طلوع ہوئی تھی کہ اس اُمت نے قرن اوّل میں وہ کام کر دکھایا جس کے لیے مغربی دنیا صدیوں سر مارتی رہی مگر نہ کر سکی - یعنی یہ کہ پیشے بذات خود معزز یا ذلیل نہیں ہوتے بلکہ بعض افراد بلند ہوتے ہیں اور بعض بلند اوصاف سے عاری ہوتے ہیں"۔ [1]

آزادیٔ ضمیر

انسانی مساوات کے اس اعلیٰ معیار کا بیان اس وقت تک نامکمل رہے گا جب تک ہم اس بات کا جائزہ نہ لے لیں کہ اسلامی سماج کا اپنے بڑے آدمیوں کے ساتھ کیا سلوک تھا - جب تک بڑے چھوٹوں کے ساتھ ایک صف میں نہ کھڑے ہوں اور بزرگی و برتری کی واحد بنیاد حسب و نسب اور جاہ و مال نہیں صرف عمل نہ رہ جائے، صرف چھوٹوں کا احترام اور تعظیم حقیقی مساوات کے لیے کافی نہیں -

امام ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں " مجھ سے عبد الملک ابن ابی سلیمان نے عطاء کے واسطہ سے بیان کیا ہے کہ انھوں نے کہا حضرت عمر نے اپنے عمّال کو لکھ بھیجا کہ حج کے موقع پر ان سے ملیں - چنانچہ یہ سب لوگ آئے - آپ نے کھڑے ہو کر یہ تقریر کی :-

" لوگو میں ان عمّال کو اس لیے مقرر کرتا ہوں کہ راست روی کے ساتھ تمہاری سرپرستی و نگرانی کا فرض انجام دیں - میں نے انھیں اس لیے ہرگز نہیں مقرر کیا ہے کہ تمہاری جان و مال اور

---

[1] ابو حنیفہ لبطل الحریۃ والتسامح فی الاسلام، مصنفہ استاذ عبد الحلیم الجندی -

عزت و آبرو پر دست درازی کریں - لہذا اگر تم میں سے کسی کو کسی عامل کے خلاف ظلم و زیادتی کی شکایت ہو تو کھڑا ہو جائے "۔

راوی کہتا ہے کہ اس دن تمام لوگوں میں سے صرف ایک آدمی کھڑا ہوا۔ اس نے کہا "امیر المومنین آپ کے عامل نے مجھے سَو کوڑے (علی ناحق) مارے ہیں"۔

حضرت عمر نے فرمایا :- کیا تم اُسے سَو کوڑے مارنا چاہتے ہو، آؤ اور اس سے انتقام لو"۔ اس پر عمرو بن العاص نے اُٹھ کر یہ کہا کہ "امیر المومنین! اگر آپ اپنے عمال کے ساتھ یہ سلوک کرنا شروع کر دیں گے تو انھیں سخت گراں گزرے گا - یہ ایک مستقل طریقہ بن جائے گا جس پر آپ کے بعد کے لوگ بھی عمل کریں گے"۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا: "پھر، کیا میں اس آدمی کو بدلہ نہ دلواؤں جب کہ میں نے اللہ کے رسول کو خود اپنی ذات سے بدلہ دلواتے دیکھا ہے (پھر آپ نے اس آدمی سے مخاطب ہو کر فرمایا) آؤ اور اس (عامل) سے بدلہ لو"۔

عمرو بن العاص نے کہا کہ ہمیں اجازت دیجیے کہ اس آدمی کو راضی کر لیں - راوی کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تمھیں اجازت ہے، چنانچہ ان لوگوں نے اس شخص کو ۲۰۰ سَو دینار کے بدلہ راضی کر لیا - ہر کوڑا دو دینار کے عوض پڑا -

عمرو بن العاص نے دوسرے پر سے تو یہ بلا ٹال دی لیکن جب ان کے بیٹے کے ایک مصری لڑکے کو مارنے کا معاملہ پیش ہوا تو عمرؓ نے اُسے بدلہ دلوایا اور ان سے کچھ نہ بن پڑی - بدلہ دلواتے وقت حضرت عمرؓ کہہ رہے تھے "اس خاندانی شریف زادے کو مار"۔ عمرو بن العاص خود بھی سزا کا مزا چکھنے والے تھے مگر اس مصری نے معاف کر دیا اور مارنے سے باز رہا -

ایک دن حضرت عمر بیٹھے مسلمانوں کے درمیان کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے - لوگوں کا اجتماع ہجوم کی شکل اختیار کر گیا تھا - سعد بن ابی وقاص، جن کے حسب و نسب اور اسلام کی راہ میں قربانیوں کا حال ہم اوپر دیکھ چکے ہیں، آگے بڑھے اور دوسرے لوگوں کو ہٹاتے ہوئے حضرت عمر تک پہنچ گئے - عمر نے یہ کہتے ہوئے ان پر دُرّہ سنسنایا "تو زمین پر اللہ کی حکومت کا کچھ رعب نہیں مانتا، میں نے ضروری سمجھا کہ تجھے جتلا دوں کہ اللہ کی حکومت تجھ سے مطلق مرعوب نہیں"۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ عمر تو خلیفہ ہیں، ان کا کیا کہنا -

چنانچہ اب ہم اس بات کا جائزہ لیں گے کہ خلفاء اور بادشاہوں کے ساتھ ان کی رعایا اظہارِ خیال اور تنقید میں کس آزادی کے ساتھ پیش آتی تھی۔ اظہارِ رائے میں اس آزادی اور جرأت کا اصل منبع وجدان کی آزادی ہے جو اسلام ضمیرِ انسانی کو عطا کرتا ہے۔ اور وہ مساواتِ مطلق جس کو اس نے قولاً اور فعلاً متحقق کر دکھایا ہے۔

عمر خلیفہ کی حیثیت میں لوگوں کو خطاب کر رہے ہیں۔ فرماتے ہیں: "اگر میرے اندر کوئی کجی دیکھو تو مجھے سیدھا کر دینا۔" عامۃ المسلمین میں سے ایک فرد جواب دیتا ہے کہ: "اگر ہم تیرے اندر کوئی کجی دیکھی تو اپنی تلوار کی دھار سے تجھے سیدھا کر دیں گے۔" عمر نے اس پر صرف اتنا کہا: اللہ کا شکر ہے جس نے عمر کی رعایا میں ایسے افراد بھی پیدا کیے ہیں جو اسے اپنی تلواروں کی دھار سے سیدھا کر سکتے ہیں۔

مسلمانوں کو غنیمت میں کچھ یمنی چادریں ملیں۔ حضرت عمر نے تمام مسلمانوں کی طرح خود بھی ایک چادر پائی اور اپنے بیٹے عبداللہ کو بھی ایک چادر دی، چونکہ خلیفہ کو کپڑے کی ضرورت تھی لہٰذا عبداللہ نے اپنے حصہ کی چادر بھی ان کو دے دی تاکہ دونوں کو ملا کر ایک کپڑا تیار ہو سکے۔ ایک دن آپ اسی کپڑے کو پہن کر لوگوں کو خطاب کرنے کھڑے ہوئے اور فرمایا: لوگو! سنو اور اطاعت کرو۔ سلمان نے اٹھ کر کہا: ہمارے اوپر آپ کی بات سننا اور اطاعت کرنا واجب نہ رہا، عمر نے پوچھا: کیوں؟ سلمان نے کہا: یہ بتائیے کہ یہ کپڑا آپ نے کیسے بنوالیا کیوں کہ آپ کے حصہ میں بھی ایک ہی چادر آئی تھی اور آپ لمبے قد کے آدمی ہیں۔ آپ نے فرمایا: جلد بازی سے نہ کام لو، پھر آپ نے پکارا: اے عبداللہ، مگر کسی نے جواب نہ دیا۔ پھر آپ نے پکارا ' اے عبداللہ ابن عمر '، وہ بولے، اے امیرالمومنین میں حاضر ہوں، حضرت عمر نے فرمایا: "تمہیں خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں، بتاؤ کہ جس چادر کو میں نے تہہ بند بنایا ہے وہ تمہاری ہی چادر ہے کہ نہیں، انھوں نے کہا: ہاں۔ پھر سلمان نے کہا۔ اب آپ حکم دیجیے، ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو عمر ہیں، ان کا کیا کہنا۔

ابو جعفر منصور کی مثال لے لیجیے جو ایک ایسی سلطنت کے بانی ہیں جس میں ہماری اصطلاح کے مطابق، قانون کا مدار رسم و رواج پر تھا (نہ کہ شریعت پر) سفیان ثوری ان کے پاس جا کر فرماتے ہیں: ..... "امیرالمومنین! آپ نے اللہ اور امتِ محمدیہ کا مال ان کی مرضی اور اجازت کے بغیر

خرچ کیا ہے اس کی آپ کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔ عمرؓ نے ایک بار حج کیا تھا جس میں اُن کے اور اُن کے ساتھیوں پر کل سولہ دینار صرف ہوئے تھے، پھر بھی انھوں نے فرمایا: میرا خیال ہے کہ ہم نے بیت المال پر بہت زیادہ بار ڈال دیا،" آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ منصور ابن عمار نے ہم کو کیا حدیث سنائی تھی، کیونکہ آپ اس مجلس میں موجود تھے اور سب سے پہلے آپ ہی نے اسے نوٹ کیا تھا۔ ابن مسعود سے علقمہ نے، علقمہ سے اسود نے اور اسود سے ابراہیم نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے: اللہ اور اس کے رسول کے مال میں اپنی خواہش کے مطابق تصرفات کرنے والے کچھ لوگ ہیں..... جن کے لیے کل کو نارِ جہنم مقدر ہے۔" اس پر ابو عبید نامی کاتب جو بادشاہوں کے دربار کا ایک کہنہ مشق حاشیہ نشین تھا، بول اٹھا: امیر المومنین سے اس طرح کا کلام! سفیان نے ڈانٹ کر کہا: "خاموش؟ کیونکہ فرعون نے ہامان کو ہلاک کیا اور ہامان نے فرعون کو" اس پر زور کلمۂ حق کا اعلان کر کے سفیان باہر چلے آئے۔[۱]

جابر سلاطین کی جباریت کتنی ہی بڑھ جائے، کسی ایسے شخص پر ہاتھ ڈالنا ان کے بس سے باہر تھا جس کے دل کی دنیا آباد ہو اور وہ ضروریات سے بلند ہو کر اللہ کے لیے یکسو ہو چکا ہو۔

واثق کا شمار بھی جابر سلاطین میں ہوتا ہے۔ اس کے پاس ایک بار اساتذۂ متکلمین میں سے ایک صاحب آئے۔ انھوں نے اسے سلام کیا لیکن اس نے جواب میں سلام کرنے کی جگہ یہ کہا لاسلّم اللہ علیک (اللہ تجھ پر سلامتی نہ بھیجے) یہ سنتے ہی ان صاحب نے واثق کو یہ ڈانٹ پلائی: تمھارے اساتذہ نے تمھیں بڑی بُری تمیز سکھائی ہے۔ اللہ تعالٰے فرماتا ہے کہ جب تم کو سلام کیا جائے تو تم اس سے بہتر سلام کرو یا اُسی جیسا جواب دو (واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا او ردّوھا۔) لیکن تم نے مجھ پر نہ تو میرے سلام سے بہتر سلام بھیجا نہ اس کا جواب دیا۔[۲]

" ابو یوسف عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ایک شخص ان کے سامنے مقدمہ لاتا ہے۔ عباسی بادشاہ ہادی سے ایک باغ کے بارے میں جھگڑا ہے۔ ابو یوسف یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ حق اسی شخص کے ساتھ ہے مگر مشکل یہ ہے کہ بادشاہ کے پاس گواہ موجود ہیں۔ انھوں نے کہا۔ مدّعی کا

---

[۱] - ابو حنیفہ، مصنفہ استاذ عبد الحلیم الجندی۔

[۲] المسند جلد اوّل - مرتبہ استاذ احمد محمد شاکر۔

مطالبہ ہے کہ ہادی قسم کھائیں کہ ان کے گواہ سچے ہیں - ہادی نے قسم کھانے کو اپنی توہین سمجھتے ہوئے اس سے انکار کر دیا - اور باغ باغ والے کو واپس کر دیا - اسی طرح ایک اور مقدمہ میں جس میں آپ کے نزدیک حلف اٹھوانا ضروری تھا، آپ نے ہارون الرشید سے حلف اٹھوائی فضل ابن ربیع ہارون الرشید کے گواہ بن کر آئے تو آپ نے ان کی گواہی رد کر دی - خلیفہ نے بگڑ کر اعتراض کیا کہ اس کی گواہی کیوں رد کی، تو آپ نے کہا: میں نے اُسے آپ سے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں آپ کا غلام ہوں - اگر وہ سچا ہے تو غلام کی گواہی نہیں قبول کی جاتی اور اگر جھوٹا ہے تو بھی گواہی نہیں قبول کی جا سکتی" [1]

یہ شمع جو اسلام نے ضمیر انسانی میں جلائی تھی تاریخ کے تاریک ترین ادوار میں بھی نہ بجھ سکی - تاریخ کے تمام ادوار میں اس آزادیٔ ضمیر کی، اور دوسری قدروں، طاقتوں، اور تعلقات سے روحانی طور پر بلند و مستغنی ہونے کی اس شان کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں -

"مصر میں احمد بن طولون بکار ابن قتیبہ نامی حنفی قاضی کی بڑی عزت کرتا تھا - وہ آپ کی مجلس میں اس طرح آتا تھا کہ جب تک قریب نہ پہنچ جاتا آپ کو خبر بھی نہ ہوتی - جب اس نے آپ سے (عباسی خلیفہ کے ولی عہد) موفق پر لعنت بھیجنے کا مطالبہ کیا تو آپ نے قدرے توقف کے بعد صرف اتنا فرمایا الا لعنۃ اللہ علی الظالمین کسی نے ابن طولون کو توجہ دلائی کہ قاضی نے اس قول کا ہدف خود اُس کو بنایا تھا تو اُس نے آپ سے ان عطایا کی واپسی کا مطالبہ کیا جو اُس نے انھیں دیے تھے - یہ چیزیں اُسے اسی حال میں سربمہر واپس مل گئیں، جس حال میں دی گئی تھیں - اُس نے آپکو ایک کرایہ کے مکان میں قید کر دیا - یہ ایک دریچہ میں بیٹھ کر ان لوگوں سے گفتگو کرتے رہتے جو ابن طولون سے اس کی اجازت حاصل کر لاتے تھے - جب ابن طولون مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس نے آپ کی رہائی کا حکم صادر کر دیا - جو قاصد یہ خبر لے کر آیا تھا اس سے آپ نے فرمایا: "اس سے کہنا کہ میں کافی بوڑھا ہو گیا ہوں، اور تو بیمار ہے، اب جلد ملاقات ہو گی، ہمارے درمیان صرف اللہ ہی کی آڑ ہے" - ابن طولوں نے وفات پائی تو بکار کہا کرتے تھے "بے چارا مر گیا"، [2]

"بے چارا مر گیا" گویا انہیں اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ اگرچہ ابن طولون صاحب اقتدار تھا لیکن وہ ان سے فروتر تھا اس میں بے چارگی تھی -

---

[1] ابو حنیفہ - عبد الحلیم الجندی - [2] ایضاً

ایوبی سلطنت کے زمانہ میں "جب (مصر کے حکمران) اسماعیل نے صلیبی جنگوں میں انگریزوں کا ساتھ دیا اور اس وعدہ پر صیدا، اور دوسرے قلعے ان کے حوالہ کردیے کہ وہ لوگ سلطان نجم الدین ایوب کے خلاف اس کی مدد کریں گے تو عزالدین ابن عبدالسلام نے اس پر اعتراض کیا - بادشاہ اس اعتراض پر بھڑک اٹھا اور اس نے آپ کو معزول کرکے قید کردیا، پھر اس نے قاصد کے ذریعہ انھیں ڈرایا دھمکایا اور لالچ بھی دلائی۔ قاصد نے ان سے کہا: "آپ کا سابق عہدہ بحال کردیا جائے گا اور مزید ترقی دی جائے گی، بشرطیکہ آپ سلطان سے ذرا دب کر رہیں" شیخ نے جواب دیا: خدا کی قسم مجھے یہ بھی نہیں پسند کہ سلطان آکر میرے ہاتھ چومے۔ دراصل تم کسی اور دنیا کے آدمی ہو اور میں کسی اور دنیا کا آدمی ہوں۔[۱]

ماضی قریب کی تاریخ میں بھی اس بلندی طبع کی متعدد مثالیں ملتی ہیں - ہم ان میں سے صرف دو واقعات بیان کرتے ہیں جن کو میں نے سنانے والوں سے سنا ہے، مجھے معلوم نہیں کہ وہ صفحۂ قرطاس پر منتقل ہو سکے ہیں یا نہیں - پہلا واقعہ مجھ سے اسماعیلی دور کے مشہور مورخ احمد شفیق پاشا مرحوم نے بیان کیا تھا - دوسرا واقعہ حال میں خدیو توفیق کے زمانہ کا ہے اور اس کے راوی بکثرت ملتے ہیں -

پہلا واقعہ ان دنوں کا ہے جب اسماعیل کے عہد حکومت میں سلطان عبدالعزیز مصر آیا تھا۔ اسماعیل کو اس آمد کی بڑی فکر تھی کیونکہ خدیو کا لقب حاصل کرنے کی اسکیم میں اس آمد کو بہت اہمیت حاصل تھی - نیز اس آمد سے مصر کے سیاسی نظام کو بہت سی خصوصی مراعات ملنے کی توقع تھی - اسی آمد سے متعلق ایک پروگرام یہ بھی تھا کہ سلطان محل میں علماء کو شرف باریابی بخشے گا - اس باریابی کے ساتھ بہت سے آداب و رسوم بھی وابستہ تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ آنے والا زمین بوس ہو کر تین بار ترکی طریقے کے مطابق کورنش بجالائے اس کے علاوہ بھی نہ جانے کون کون سے دقیانوسی اور پست قسم کے غیر اسلامی رسوم و آداب تھے۔ چنانچہ محل کے منتظمین پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ کئی دن تک علماء کو باریابی کے ان آداب کی مشق کرائیں تاکہ وہ سلطان کے سامنے کوئی غلطی نہ کریں -

جب یہ موقع آیا تو حضرات علماء کرام اندر داخل ہوئے اور بکمال دین فراموشی و دنیا پرستی اپنے ہی جیسے ایک بندۂ مخلوق کے آگے جھک جھک کر آداب بجالائے - زمین سے ابتدا کرتے ہوئے سر تک پھر منہ کے پاس، پھر سینہ تک ہاتھ لاکر سلام کی رسم ادا کی اور جیسا کہ انھیں سکھلایا گیا تھا، سلطان کی طرف رخ اور دروازہ کی طرف پیٹھ کیے، الٹے قدموں واپس ہوئے - اس لعنت سے صرف ایک عالم بچا رہا یعنی شیخ حسن العدوی

---

[۱] - ایضاً

انھوں نے دنیا پر لات ماری، دین کو یاد رکھا، اور اپنے دل میں یہ شعور بیدار رکھا کہ ساری قوت اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ آزاد انسانوں کی طرح سر اٹھائے اندر داخل ہوئے اور سلطان کے بالمقابل آکر اسلامی طریقے کے مطابق "السلام علیکم یا امیر المومنین" کہہ کر سلام کیا۔ پھر جیسا کہ حاکم سے ملاقات کرتے وقت عالم کو کرنا چاہیے، اس کو اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے، اس کے عذاب سے ڈرنے اور اپنی رعایا کے ساتھ عدل و رحمت سے پیش آنے کی نصیحت کی۔ جب بات پوری کر چکے تو سلام کیا اور اس آزادانہ شان کے ساتھ سر اونچا کیے باہر چلے آئے۔

اب تو دربار کے منتظمین اور خدیو کے ہوش اڑ گئے۔ انھوں نے سمجھا کہ معاملہ بگڑ گیا، اور اب سلطان کے غیظ و غضب کا کوئی ٹھکانا نہ ہوگا۔ انھوں نے جو کوششیں کی تھیں وہ سب رائگاں گئیں اور امیدوں کے جو تانے بانے بُنے تھے وہ سب بکھر گئے۔

مگر ایمانی کلمۂ حق بھلا کب رائگاں جاتا۔ وہ جس حرارت اور قوت کے ساتھ دل سے نکلتا ہے اسی قوت اور حرارت کے ساتھ دلوں میں اتر جاتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سلطان بے اختیار بول اٹھا کہ تمہارے یہاں صرف یہی ایک عالم ہے۔ سلطان نے صرف آپ کو خلعت سے نوازا اور باقی سارے "علماء" کو محروم رکھا۔

دوسرا واقعہ خدیو توفیق پاشا اور شیخ حسن الطویل کے درمیان "دار العلوم" میں پیش آیا۔

شیخ حسن الطویل دار العلوم میں استاد تھے اور ایک جلباب اور بغیر گریبان کا جبہ پہنا کرتے تھے۔ ایک دن ناظم دار العلوم کو یہ اطلاع ملی کہ خدیو عنقریب اس مدرسہ کو دیکھنے آنے والا ہے۔ انھوں نے مدرسہ کی صفائی، نیز آراستگی اور دیگر ساز و سامان کی درستی شروع کر دی۔ اسی اہتمام کا ایک جزو یہ بھی تھا کہ شیخ حسن الطویل اپنا لباس بدل دیں اور ایک قفطان اور ایک گریبان دار جبہ حاصل کر لیں تاکہ ان کا لباس حکام کے سامنے پہن کر آنے کے لائق ہو جائے۔

شیخ کو جب ناظم صاحب کے اس مطالبہ کا علم ہوا تو انھوں نے اشارۃً رضامندی کا اظہار کر دیا۔ اس دن بھی شیخ اپنے معمول کے مطابق پرانی وضع میں آئے البتہ ان کے ہاتھ میں ایک رومال تھا جس میں کپڑوں کی ایک گٹھری سی بندھی ہوئی تھی۔ انھیں اس لباس میں دیکھ کر ناظم کا چہرہ بگڑ گیا اور رنج و غصہ کی نمایاں کیفیت کے ساتھ اس نے آپ سے پوچھا کہ شیخ، جبہ و قفطان کہاں ہے؟ انھوں نے رومال کی طرف اشارہ کر کے بتا دیا کہ یہاں ہے۔ ناظم صاحب

نے سمجھا کہ جب معزز مہمان کی آمد کا وقت قریب ہوگا تو شیخ کپڑے بدل لیں گے۔ اُسے یہ پروگرام کچھ عجیب معلوم ہوا لیکن وہ خاموش رہا۔

تھوڑی دیر بعد وہ مہمان آہی گیا جس کے سب منتظر تھے۔ مدرسہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ناظم مدرسہ، دوسرے اساتذہ، اور سارے حاضرین کے لیے غیر متوقع اور انوکھا تھا۔ شیخ حسن الطویل ہاتھ میں گٹھری لیے خدیو کے سامنے آئے اور بڑی جمعیت خاطر کے ساتھ کہا کہ مجھ سے لوگوں نے کہا ہے کہ مجھے لازماً جبّہ وقفطان کے ساتھ حاضر ہونا ہوگا، چنانچہ میں جبّہ وقفطان کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ اگر آپ کو جبّہ وقفطان چاہیے تو وہ یہ رہا، اور اگر "حسن الطویل" چاہیے تو یہ ہے حسن الطویل۔

قدرتی طور پر خدیو نے یہ جواب دیا کہ اُسے حسن الطویل چاہیے!

یہ مومن بندے ہیں جن کو اسلام کی عزت کے سوا کوئی اور عزت نہیں مطلوب۔ جن کے وجدان اور ضمیر پست اور کھوکھلی قدروں اور عارضی مفادات کے لحاظ سے بری ہیں۔ جنھوں نے اسلام کو اس کی اصل حقیقت کے ساتھ سمجھ لیا اور اسے پورے کا پورا اپنا لیا۔ جن کو اسلام کی حقیقی بلند مرتبہ اور طاقت ور روح کا ادراک حاصل کر لینے کے بعد پھر کبھی اس کی ضرورت نہ پڑی کہ کسی انسان کو خوش کرنے کی فکر کریں۔ حقیقی اسلام یہی ہے۔

ممالک مفتوحہ کے ساتھ برتاؤ

انسانی مساوات، وجدان کی آزادی، اور عدلِ مطلق سے قریبی تعلق کے پیش نظر مناسب ہوگا کہ اب ہم اُس طرزِ عمل کا مطالعہ کریں جو ممالک مفتوحہ اور اسلامی ممالک میں غیر مسلم اقلیتوں کے ساتھ اختیار کیا گیا تھا، عدل و مساوات کی یہ قسم افراد کے دائرہ سے نکل کر گروہوں اور اسلام کی حدود سے آگے بڑھ کر ساری انسانیت سے تعلق رکھتی ہے۔

ممالک مفتوحہ پر گفتگو فطری طور پر ہمارے سامنے اسلامی فتوحات کی حقیقی نوعیت اور اس کے اسباب و غایات کا موضوع لاتی ہے۔ یہ ایک تفصیل طلب موضوع ہے اور ہم اس سے صرف اس حد تک تعرض کریں گے جو ناگزیر ہو، اور جس کا تعلق انسانیت کے وسیع دائرہ میں اجتماعی عدل سے ہو۔

دعوت اسلامی عقل اور وجدان کو مخاطب کرتی ہے اور قہر کے عناصر سے بالکل پاک ہے۔ اس نے اس نفسیاتی قہر کو بھی ذریعہ نہیں بنایا جو انسان کو عاجز کر دینے والے خوارق عادات کی شکل میں ادیان سابقہ کے ساتھ وابستہ رہا ہے۔ اسلام وہ اوّلین دین ہے جس نے انسان کے حس و شعور کا احترام کرتے ہوئے اسے

طبعی خوارق کے ذریعہ عاجز کر دکھانے اور نفسیاتی طور پر اس کو مرعوب کرنے کی بجائے صرف اسے مخاطب کرنے پر اکتفا کیا۔ تلوار کی مادّی طاقت کے سہارے اپنی بات منوانے کے طریقے کو اس نے بدرجہ اولیٰ نہیں اپنایا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ : ۲۵۶) دین کے معاملہ میں کوئی زور زبردستی نہیں۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ (النحل : ۱۲۵) اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔

لیکن قریش اوّل روز سے مادّی طاقت سے مسلّح ہو کر اس نئے دین کی راہ میں حائل ہو گئے، جس فرد کو بھی اللہ نے اسلام لانے کی توفیق دی اس کو انھوں نے ستایا۔ کتنے ہی مسلمانوں کو انھوں نے گھر بار، بیوی بچوں سے جدا کر کے باہر نکال دیا۔ انھوں نے ان کے خلاف یہ سازش بھی کی کہ ان کو گھاٹی میں قید کر کے ان کا مقاطعہ کریں تاآنکہ یہ بھوک کے مارے ہلاک ہو جائیں۔ غرض یہ کہ مادّی طاقت کے استعمال کا کوئی طریقہ نہ تھا جسے انھوں نے اس نئے دین سے لوگوں کو دور رکھنے کے لیے نہ استعمال کیا ہو۔

اب اسلام کے پاس اس کے سوا کوئی چارا نہ رہا کہ وہ اپنا دفاع کرے اور اپنے پیرؤں کو اس ظلم سے بچائے۔

اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ۔ (الحج : ۳۹) جن لوگوں سے (کفّار) جنگ کر رہے ہیں ان کو (جنگ کرنے کا) حکم دیا گیا، کیوں کہ ان پر ظلم ہوا ہے اور اللہ ان کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ (البقرہ : ۱۹۰) اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو کہ اللہ زیادتی کرنے والوں کو نہیں پسند کرتا۔

پس یہ دفاعی جنگ تھی جس کا منشا عقیدہ کی آزادی کو بحال کرنا اور مسلمانوں کو ایذا، سے بچانا تھا نہ کہ کسی کو اسلام لانے پر مجبور کرنا۔

پھر وہ وقت آیا کہ پورا جزیرۂ عرب اسلام کی آغوش میں آگیا اور فتوحات کے سلسلہ نے عرب کے باہر قدم رکھا۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فتوحات کی غرض و غایت کیا تھی۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، اسلام خود کو ایک عالمگیر نظریہ اور آفاقی دین قرار دیتا ہے۔ وہ خود کو کسی جزیرہ کی حدود میں محصور نہیں کر سکتا۔ وہ اپنا فیض دنیا کے ہر گوشہ اور ساری انسانیت تک پہنچانا چاہتا ہے۔ لیکن راستہ میں قیصر و کسریٰ کی دو عظیم سلطنتوں کی قوت حائل نظر آتی ہے، جو اس کو فنا کر دینے کے لیے گھات لگائے ہوئے ہیں۔ یہ قوت دعوت اسلامی کے علمبرداروں کو زمین میں چل پھر کر لوگوں کے سامنے اس دین کی حقیقت واضح کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ اب اسلام کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ حکومت کی جو طاقت ہدایت الہٰی اور انسانیت عامہ کے درمیان حائل تھی اسے ہٹا دے تاکہ اپنی بے لوث بات سب کے کانوں تک پہنچا سکے۔ تاکہ درمیان سے حکومت کی مادی طاقت کے ہٹ جانے کے بعد جو چاہے ارادہ و اختیار کی پوری آزادی کے ساتھ اسے سنے اور قبول کرے اور جو چاہے نہ قبول کرے، اس کو ایسا کرنے کا پورا حق ہوگا۔

اس وضاحت کی روشنی میں ظاہر ہے کہ ان اسلامی فتوحات کی نوعیت ان جنگوں سے بالکل جدا گانہ ہے جو ایک قوم اپنی طاقت کے نشہ میں دوسری قوم سے کرتی ہے، یا جس طرح کی سامراجی جنگیں گذشتہ صدیوں میں استحصال کی خاطر کی گئی تھیں۔ ان جنگوں کی حقیقت صرف یہ ہے کہ اسلام جس نظریہ کا علمبردار تھا اُس کے اور دوسری قوموں کے درمیان حکومت کی جو مادی طاقت حائل تھی اُسے راہ سے ہٹا دیا گیا۔ قوموں کی نسبت سے یہ خالص نظریاتی جنگیں تھیں، البتہ ان قوموں پر جو حکومتیں مسلط تھیں جو ان قوموں کو اقتدار اور مادی طاقت کے سہارے اس نئے دین سے رُوکے ہوئے تھیں، ان کے لیے یہ جنگیں مادی جنگیں تھیں۔

اسلام خود کو ساری انسانیت کا دین سمجھتا ہے اور اپنے پھیلانے کے لیے مادی یا معنوی دباؤ نہیں استعمال کرتا۔ اپنے اس اصول کے تحت وہ جس ملک پر بھی حملہ کرتا ہے اس کے سامنے تین صورتیں رکھتا ہے، کہ وہ ان میں سے جس کو چاہیں اختیار کر لیں۔ اسلام یا جزیہ یا جنگ۔

"اسلام" کی پیش کش اس لیے حق بجانب ہے کہ یہی واحد راہ ہدایت ہے۔ یہ کائنات، حیات، اور انسان کی بابت جدید ترین اور مکمل ترین نظریہ ہے۔ یہ وہ دروازہ ہے جس میں داخل ہوتے ہی ایک غیر مسلم سارے مسلمانوں کا بھائی بن جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں جیسے حقوق کا مستحق اور ان کے فرائض کا پابند قرار پاتا ہے۔ حسب و نسب اور مال و جاہ کسی اعتبار سے بھی دوسرے مسلمان اس نو مسلم پر برتری کا

دعویٰ نہیں کر سکتے۔ وہ نسل، قوم، خاندان کسی چیز کے سبب بھی دوسروں سے مختلف نہیں قرار پا سکتا۔

یہی حال جزیہ کی پیش کش کا ہے۔ مسلمانوں کو مملکت کے تحفظ کی خاطر اپنا خون تک بہا دینا ہوتا ہے۔ سماج کے تحفظ کے لیے وہ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ ایک غیر مسلم بھی اسلامی مملکت کے زیر سایہ امن و سکون سے فیض یاب ہوتا ہے۔ داخلی اور خارجی تحفظ اور ان تمام سہولتوں سے مستفید ہوتا ہے جو اسلامی مملکت اپنے باشندوں کے لیے فراہم کرتی ہے۔ معذوری یا بڑھاپے میں اسے اجتماعی کفالت کا سہارا بھی ملتا ہے۔ ایسی صورت میں عدل و انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ بھی ان تمام کاموں میں اپنے مال کے ذریعہ شریک ہو۔ زکوٰۃ کی نوعیت چونکہ مالی ٹیکس سے پہلے ایک اسلامی عبادت کی ہے لہذا اسلام نے، جو اسلام نہ قبول کرنے والوں کے احساسات کا بڑا لحاظ کرتا ہے، یہ نہیں پسند کیا کہ ان کو ایک اسلامی عبادت کے اپنانے پر مجبور کرے، چنانچہ اس نے ان سے بجائے زکوٰۃ کے جزیہ کی شکل میں ٹیکس وصول کیا۔ جزیہ عائد کرنے میں یہ حقیقت بھی سامنے رہی ہے کہ مملکت کے لیے جانی قربانی صرف مسلمان ہی پیش کرتے ہیں۔ مزید برآں جزیہ تسلیم و رضا کی علامت ہے اور یہ ظاہر کرتی ہے کہ طاقت کے ذریعہ اسلام کی راہ نہ روکی جائے گی اور اسلام اور عوام کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا، یہی اسلام کا اصل مقصد تھا۔

رہی تیسری صورت، یعنی جنگ، تو حقیقت یہ ہے کہ اسلام اور جزیہ دونوں شکلوں کو ٹھکرا دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ (حکومت) اسلام اور عام انسانوں کے فکر کے درمیان حائل رہنے پر مصر ہے۔ ایسی صورت میں ناگزیر ہو جاتا ہے کہ طاقت کے بل پر کیے جانے والے اس اصرار کو طاقت ہی کے ذریعہ ختم کر دیا جائے، کہ یہی آخری علاج ہے۔

اسلام نے ممالک مفتوحہ میں اپنے انسانی مقاصد کو پوری طرح عمل کا جامہ پہنایا۔ اسلام لانے کی شکل میں اس نے ان باشندوں کو تمام امور میں عرب والوں کے برابر حقوق دیئے، اور جزیہ ادا کرنے کی شکل میں ان کو ہر طرح کے اعلیٰ انسانی حقوق سے نوازا، یہاں تک کہ اس نے جنگ کی شکل میں بھی ان کے ساتھ انصاف اور انسانیت کا سلوک کیا۔

بعض مفتوحہ ممالک میں حکمرانوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد اسلام نے بدستور انہیں لوگوں کو وہاں حکمراں رہنے دیا۔ فارسی النسل بازان کو حضرت ابو بکرؓ نے یمن کا حاکم باقی رکھا، اسی طرح صنعاء کے حاکم فیروز کو اس کے عہدہ پر برقرار رکھا۔ جب عربی النسل قیس بن عبد یغوث نے ان کو وہاں سے نکال دیا تو ابو بکرؓ نے عربی مسلمان کے مقابلہ میں اس فارسی مسلمان کی مدد کی اور اسے دوبارہ وہاں

بحال کیا۔

اسی طرح مسلمانوں نے بلادِ مفتوحہ میں ان غیر مسلم ماتحت افسران اور امارت سے نیچے کے عہدہ داران کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا جو خلوص کے ساتھ مفادِ عامہ کی خدمت کرتے نظر آئے۔

اسلامی قانون اُن محاربین کی تمام املاک پر قبضہ کر لینا فاتح کے لیے جائز قرار دیتا ہے جو نہ اسلام لائیں، نہ جزیہ دینا قبول کریں بلکہ جنگ کر نا طے کریں۔ اس کے باوجود حضرت عمرؓ کے دور میں جب فارس فتح ہوا تو آپ نے روحِ اسلام کا تقاضا محسوس کرتے ہوئے ایک دوسری ہی پالیسی اختیار کی۔ آپ نے زمین کو بدستور زمین والوں کی ملکیت میں رہنے دیا البتہ اس پر خراج عائد کر دیا۔ آپ نے بیک وقت دو مصلحتوں کا خیال رکھا۔ ایک مصلحت تو خود مفتوحہ ممالک کی تھی۔ باوجود اس کے کہ اُنھوں نے مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ کہ اس طرح ان کو اپنا ذریعہ معاش بدستور میسّر رہے اور وہ اس پر محنت کر کے گذر بسر کر سکیں۔ دوسری مصلحت مسلمانوں کی آئندہ نسلوں سے متعلق تھی، آپ نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ ساری زمینیں موجودہ فاتحین کو دے دیں اور آئندہ نسلوں کو اس کے فوائد سے محروم کر دیں، اس سے بہتر یہ تھا کہ ان زمینوں سے خراج وصول کیا جائے اور وہ ہمیشہ مصالح عامہ پر صرف کیا جاتا رہے تا کہ آئندہ بھی مستحقین کو مناسب حصّے ملتے رہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مفتوحہ ممالک کے ساتھ اسلام کا برتاؤ ہمیشہ انسانیت پر مبنی رہا۔ اس نے ہمیشہ انھیں اپنی خوبیوں سے استفادہ کا موقع دیا اور بغیر کسی قید اور شرط کے ان کو اسلام کی خصوصیات کے اپنانے اور اس کے فوائد سے بہرہ یاب ہونے کی اجازت دی۔ اس نے اس بات کی دعوت دینے میں بھی کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا کہ وہ لوگ ان خوبیوں اور خصوصیات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلہ میں اس نے کسی کے لیے بھی اس کے رنگ، نسل، زبان، یا مذہب کو رکاوٹ نہ بننے دیا۔ ہر ایک کو اس بات کا موقع ملا کہ وہ اجتماعی بہبود کی خاطر جو کچھ کر سکتا ہو کرے۔ اوپر ہم دیکھ چکے ہیں کہ کس طرح اسلام کے ایک خاص شعبہ، یعنی فقہ و قانون سازی میں ممالکِ مفتوحہ کے باشندوں اور موالی نے امتیازی مقام حاصل کیا تھا۔ حیاتِ عامّہ کا کوئی قابلِ ذکر شعبہ نہیں جو تمام تر صرف اہلِ عرب کے فکر و عمل کا مرہونِ منّت رہا ہو۔ یہاں تک کہ امارت اور ولایت کے مناصب بھی ان لوگوں کے حصّہ میں آئے ہیں۔ ہر ملک کے محاصل پہلے اس ملک کے مصالح پر خرچ کیے جاتے تھے۔ مرکزی بیت المال کو

اس کا صرف وہ حصہ منتقل ہو جاتا تھا جو فاضل ہوتا - ان مفتوحہ ممالک کی حیثیت نوآبادیات کی نہ تھی کہ فاتحین ان کے باشندوں کے جان و مال کو اپنے عیش و عشرت کا ذریعہ بنائیں -

اتنی ہی واضح حقیقت وہ آزادی ہے جو اسلام نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں کو اپنے مذہبی مراسم کی ادائیگی کے سلسلہ میں عطا کی تھی - اس نے ان کی عبادت گاہوں، کلیساؤں اور خانقاہوں، نیز ان کے علماء اور راہبوں کی حفاظت کا ذمہ خود اپنے سر لیا - اس نے ان سے کیے ہوئے معاہدوں کی اتنی دیانت داری کے ساتھ پابندی کی جس کی مثال بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی - آج بھی اس معاملہ میں اسلام کی ڈالی ہوئی رسم زندہ اور قائم ہے -

جب ہم اسلام کا مقابلہ دورِ حاضر کی مغربی تہذیب اور اس کے اس برتاؤ کے ساتھ کرتے ہیں جو یہ تہذیب ان ممالک کے ساتھ کرتی ہے جو بد قسمتی سے استعمار کے پنجوں میں پھنس جاتے ہیں تو اسلام اپنی تاریخ کے ہر دور میں زیادہ وسیع، بلند اور پاکیزہ نظر آتا ہے - آج ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تعلیم و تربیت اور معاشی تعمیر و ترقی کے باب میں مغربی تہذیب کی خوبیوں سے ان ممالک کو قصداً محروم رکھا جاتا ہے تاکہ جتنی طویل مدت تک ممکن ہو یہ ممالک مغربی استعمار کے لیے ایک دودھاری گائے بنے رہیں - اس کے علاوہ انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کے انسانی شرف و عزت کو ذلیل اور پامال کرنا، قصداً اخلاقی فساد پھیلانا، گروہی اور جماعتی فتنوں کے بیج بونا اور انھیں پروان چڑھانا، اور قوموں، جماعتوں، اور افراد کو ہر ممکن طریقہ سے لوٹنا کھسوٹنا، استعماری طاقتوں کا شیوہ بن گیا ہے -

اہل مغرب آج جس مذہبی آزادی کا دم بھرتے ہیں اس سے پہلے ان کے یہاں وہ دور بھی گذر چکا ہے جس میں اُندلس کی "تحقیقاتی عدالتوں" کی بہیمانہ سزائیں اور مشرق میں صلیبی جنگوں کی سفاکیاں ملتی ہیں - آج بھی یہ مذہبی آزادی محض ایک دکھاوا ہے - چنانچہ جنوبی سوڈان میں مسیحی مشنریوں کو سلطنت کی ساری قوتوں کی تائید حاصل ہے لیکن مسلمانوں کا داخلہ بھی ممنوع ہے - وہ تجارت کی غرض سے بھی وہاں نہیں جا سکتے - گذشتہ جنگِ عظیم میں ایک انگریز کمانڈر ایلن بی (ALLENBY) نے بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت یہ کہہ کر یورپ کے ہر فرد کا ذہن کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیا تھا کہ: "صلیبی جنگیں درحقیقت آج ختم ہوئی ہیں"۔ فرانسیسی جنرل کا ترو ۱۹۲۰ء میں دمشق کے گذشتہ انقلاب کے موقع پر وہاں کھڑا ہو کر یہ کہتا ہے "ہم صلیبی مجاہدین کے پوتے ہیں، جسے ہماری حکومت نہ پسند ہو وہ یہاں سے نکل جائے"،

اس سے ملتی جلتی ایک بات اُس کے ایک ہم مشرب نے ۱۹۴۵ء میں الجزائر میں کہی تھی۔ رہا کمیونسٹ بلاک تو وہاں مسلمانوں کو مٹا دینے کی کوشش ہو رہی ہے۔ چوتھائی صدی کے مختصر سے عرصہ میں روس میں مسلمانوں کی تعداد چار کروڑ دو لاکھ سے گھٹ کر دو کروڑ چھ لاکھ رہ گئی ہے۔ آج کل انھیں ان راشن کارڈوں سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے جن کے بغیر وہاں اشیا ضرورت کی فراہمی محال ہے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ تم جب چاہو تمھیں نماز پڑھنے کا حق حاصل ہے مگر حکومت تم کو کھانا نہیں دے گی، تم اپنے خدا سے کھانا مانگو۔ یہی سلوک ان کے ساتھ یوگوسلاویا اور دوسری جگہوں پر بھی کیا جاتا ہے۔

اسلام ہمہ گیر انسانی عدل اجتماعی کی وہ بلند چوٹی رہا ہے جس تک یورپین تہذیب نہ پہنچی ہے نہ پہنچ سکے گی۔ کیونکہ یہ جابر مادہ کی تہذیب ہے جو قتل وغارت گری، خونریزی اور زبردستی پر مبنی ہے۔

باہمی کفالت اور تعاون

معذور اور ذی استطاعت، غریب اور امیر، فرد اور جماعت، محکوم اور حاکم، اور اسی طرح تمام بنی نوع انسان کے درمیان رحم وکرم، نیکی وخیر خواہی، اور باہمی تعاون کی جو صفات اسلام کو مطلوب ہیں ان پر ہم اوپر گفتگو کر چکے ہیں۔ اب ہم تاریخ سے اس کے چند عملی نمونے پیش کریں گے۔ اسلام کی طویل تاریخ ایسے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔

اسلام لاتے وقت حضرت ابو بکرؓ کے پاس تجارتی نفع کی آمدنی سے چالیس ہزار درہم جمع تھے۔ اسلام کے بعد بھی انھوں نے تجارت کے ذریعہ کافی نفع کمایا۔ مگر جس دن انھوں نے اپنے رفیق، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ کو ہجرت کی ہے اس دن اس ساری پونجی میں سے صرف پانچ ہزار درہم باقی رہ گئے تھے۔ اپنا سارا سرمایہ آپ ان کمزور مسلمانوں کا فدیہ ادا کرنے میں صرف کر چکے تھے جو غلام تھے اور جنھیں اپنے آقاؤں کے ہاتھ ہر طرح کا عذاب سہنا ہوتا تھا۔ اسی مال میں سے آپ نے فقراء اور مساکین کی امداد بھی کی تھی۔

حضرت عمر بن الخطابؓ ایک غریب آدمی تھے۔ انھیں خیبر میں ایک زمین ملتی ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر فرماتے ہیں "مجھے خیبر میں ایک زمین ملی ہے، اتنا قیمتی مال مجھے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ آپ اس کے سلسلہ میں کیا حکم دیتے ہیں؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جواب دیتے ہیں "تمہارا جی چاہے تو اصل جائداد کو اپنی ملکیت

میں باقی رکھتے ہوئے اس (کے منافع) کو صدقہ کردو۔" چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے فقراء اور قرابت مندوں کے لیے، غلاموں کے آزاد کرانے، کمزوروں کی مدد، اور فی سبیل اللہ کاموں کے لیے وقف کر دیا۔ یہ شرط لگادی کہ اس کا ولی (نگراں) معروف کے مطابق اس میں سے خود کھانے اور اس سے بے جا فائدہ اٹھائے بغیر کسی دوست کو کھلانے کا مجاز ہوگا۔ اس طرح آپ نے اپنے عزیز ترین مال کو راہ خدا میں دے کر اللہ تعالیٰ کے اس قول کا منشا پورا کر دیا کہ:

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ — تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنھیں تم عزیز رکھتے ہو۔

(آل عمران: ۹۲)

خلافت سے قبل حضرت عثمانؓ کے پاس شام سے ایک تجارتی قافلہ آتا ہے۔ یہ گیہوں، روغن زیتون اور منقّٰی سے لدے ہوئے ایک ہزار اونٹوں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب کہ قحط کی وجہ سے مسلمانوں پر بہت سخت دن گذر رہے تھے۔ بہت سے تاجر آپ کے پاس آکر یہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کی ضرورت مندی سے بخوبی واقف ہیں، یہ مال ہمارے ہاتھ فروخت کر دیجیے، آپ فرماتے ہیں بڑی خوشی کے ساتھ، یہ بتاؤ کہ مجھے قیمت خرید پر کتنا نفع دوگے۔ تاجروں نے کہا کہ دوگنے دام لے لیجیے۔ آپ فرماتے ہیں کہ مجھے تو اس سے زیادہ کی پیش کش کی جاچکی ہے! وہ لوگ بھونچکے ہوکر پوچھتے ہیں کہ ابو عمرو! مدینہ کے سارے تاجر تو اس وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔ کوئی دوسرا آدمی ہم سے پہلے آپ سے نہیں ملا ہے، آخر یہ کون ہے جس نے آپ کو یہ پیشکش کی ہے؟ آپ جواب دیتے ہیں، اللہ نے مجھے ایک کے دس دینے کا وعدہ کیا ہے، کیا تم اس سے زیادہ دے سکتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ نہیں، عثمانؓ نے اللہ کو گواہ ٹھہرا کر اعلان کر دیا کہ اس قافلہ کا سارا مال اللہ کی راہ میں فقراء اور مساکین کے لیے صدقہ ہے۔

علیؓ اور ان کے گھر والوں کے پاس ایک دن ستّو کی بنی ہوئی تین روٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ روٹیاں انھوں نے ایک مسکین، ایک یتیم اور ایک قیدی پر صدقہ کر دیں۔ مسکین، یتیم اور قیدی شکم سیر ہوگئے اور یہ خود فاقہ کرکے سو رہے۔

حسینؓ پر قرض کا بار بڑھ گیا ہے۔ ابی نیزر کا چشمہ آپ کی ملک ہے مگر آپ اسے اس لیے نہیں فروخت کرتے کہ اس سے غریب مسلمان سینچائی کا کام لیتے ہیں۔ وہ ان غریبوں کے استعمال میں آئے اور آپ ہوشم

کے اعلیٰ ترین خاندان کے چشم و چراغ ہوتے ہوئے قرض کا بار اٹھائے رہیں۔

مدینہ میں انصار نے مہاجرین کو اپنے مال اور مکان ہر چیز میں شریک ٹھہرالیا۔ ان کو اپنا بھائی بنالیا۔ ان کی طرف سے دیت ادا کی، ان کے قیدیوں کا فدیہ دیا۔ غرض یہ کہ ان کو بالکل اپنا بنالیا۔ جیسا کہ قرآن خود فرماتا ہے۔

وَلَا يَجِدُونَ فِي صُدُورِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا أُوتُوا وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (الحشر: ۹)

جو کچھ مہاجرین کو دیا جائے اس پر لوگ اپنے دل میں تنگی نہیں پاتے، اور انہیں اپنے اوپر مقدم رکھتے ہیں خواہ خود فاقہ کشی میں مبتلا ہوں۔

جب تک اسلامی ممالک مغرب کی مادی تہذیب کے اثرات سے پاک رہتے ہیں زندگی کے اس رشتہ میں اسلام کی روح کارفرما رہتی ہے۔ استاذ عبدالرحمٰن عزام اپنی کتاب "الرسالۃ الخالدۃ" میں لکھتے ہیں

"میں نے شمالی افریقہ کے طوارق نامی قبائل کو باہمی تعاون اور تکافل کی یہ مبارک زندگی بسر کرتے دیکھا ہے۔ ان میں کوئی فرد بھی صرف اپنی ذات کے لیے نہیں بلکہ پوری جماعت کے لیے زندہ رہتا ہے۔ اس کو سب سے زیادہ فخر ان باتوں پر ہوتا ہے جو وہ جماعت کے لیے کرتا ہے۔ میری توجہ ان کے حالات کی طرف اس طرح مبذول ہوئی کہ ایک شہری باشندہ فرانسیسیوں کے یہاں سے ہجرت کرکے ان لوگوں کے درمیان فزان میں اقامت گزیں ہوا۔ وہ ان کے ساتھ رہا اور ان کی مہربانی کے سہارے زندگی گذارتا رہا۔ پھر وہ طلب رزق کے لیے باہر نکلا تاکہ اس احسان کا بدلہ ادا کرسکے۔ اس نے اپنے گھر والوں کو اس اسلامی گروہ کے پاس چھوڑ دیا۔ قسمت نے ساتھ نہ دیا اور وہ کچھ کما نہیں سکا۔ وہ ہمارے پاس مصراتہ میں امداد کا طالب ہوکر آیا۔ ہم نے اس کی اتنی مدد کی کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس جاسکے۔ لیکن وہ تقریباً ایک سال کے بعد پھر میرے پاس آیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ اپنے گھر والوں کے پاس سے آرہا ہے لیکن اس نے تردید کی، اور کہا کہ میں اب اس قابل ہوگیا ہوں کہ اپنے گھر والوں کے پاس جاسکوں۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ اس نے بتایا کہ گذشتہ ملاقات کے وقت مجھے جو کچھ ملا تھا اس سے میں نے کاروبار کیا اور اب میرے پاس اتنا جمع ہوگیا ہے کہ میں طوارق کے پاس واپس جاسکوں۔ ...... میں نے پوچھا کہ تم اپنے بال بچوں کے پاس واپس جاؤگے کہ طوارق کے پاس اس نے کہا کہ میں پہلے طوارق کے پاس جاؤں گا، کیونکہ انھوں نے میری غیر حاضری کے دوران میرے بال بچوں کو ٹھکانا دیا۔ اب میں جاکر ان لوگوں کے بچوں کی کفالت

کروں گا جو غیر حاضر ہوں اور مجھے اللہ نے جو کچھ دیا ہے اسے اپنے اور اپنے پڑوسیوں کے بچوں کے درمیان تقسیم کردوں گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے سماج میں پڑوسیوں کے باہمی تعلقات اُسی نوعیت کے ہیں جس طرح کے تم اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رکھتے ہو۔ اس نے کہا کہ ہم سب اچھے بُرے ہر حال میں ایک دوسرے کے برابر کے شریک رہتے ہیں، جو ضروریات سے فاضل ہوتا ہے وہ (کمانے والے) مالک کا حق ہوتا ہے۔ ہم میں سے کسی کو اس بات سے بڑی شرم آتی ہے کہ وہ خالی ہاتھوں گھر واپس جائے۔ اپنے گھر والوں سے شرم نہیں آتی بلکہ ان پڑوسیوں سے جو ہمارا اسی طرح انتظار کرتے ہیں جس طرح کہ گھر والے۔"

اپنا یہ مشاہدہ بیان کرنے کے بعد مصنّف اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حقیقت واقعہ کی بہت صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

" یہ اجتماعی اسپرٹ طوارق کی اس جماعت یا انہی جیسے بدوؤں اور صحرائی باشندوں تک محدود نہیں۔ نہ یہ ان کی گروہی عصبیت کا ثمرہ ہے۔ یہی وہ اسلامی اسپرٹ ہے جو آج ان گروہوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے جو جدید مادیّت کی فضا سے دور رہتے ہیں۔ میں نے اس روح کو ان قصبات اور شہروں میں بھی فعّال اور کارفرما پایا جو آج اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، خواہ ان کے باشندے عربی ہوں یا عجمی، گورے ہوں یا کالے اور خواہ یہ مقامات مشرق میں ہوں یا مغرب میں۔ میں نے بہت سے مقامات پر مسلمانوں کو اب بھی تعاون باہمی اور ایک دوسرے کی ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانے والی بھلی زندگی گذارتے دیکھا ہے۔ ان کروروں انسانوں کی بہ نسبت جو مغرب کی مادّی تہذیب پر فریفتہ ہیں، یہ لوگ اب بھی اس صالح سماج سے بہت قریب ہیں جو داعی اوّل (صلّی اللہ علیہ وسلم) کو مطلوب تھا۔ مغرب زدہ لوگ صرف اپنے مطلب سے غرض رکھتے ہیں، چاہے جماعت کا شیرازہ بکھر جائے۔ یہ اپنی ہوس کی تکمیل کو خود اپنے گھر والوں کے ساتھ حسن سلوک پر مقدم رکھتے ہیں، پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

یہ باہمی کفالت جس کا مطالبہ اسلامی اسپرٹ کرتی ہے، صرف انفرادی اور اجتماعی وجدان کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ دی گئی تھی حکومت بھی اسے نافذ کرنے اور عملی جامہ پہنانے کا اہتمام کرتی تھی۔ چنانچہ عمر بن خطابؓ نے بیت المال سے دودھ چھڑائے بچّوں، بوڑھوں، اور بیماروں کے لیے وظائف مقرر کیے۔ واضح رہے کہ یہ اخراجات زکوٰۃ کے معروف مصارف کے علاوہ ہیں، اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسے اس دور کے لیے سماجی تحفظ (social security) کا نظام قرار دیا جا سکتا ہے۔ آپ نے

عام الرّمادہ میں، جب لوگ بھوک کا شکار ہو رہے تھے،

چوری کی سزا معطّل کر دی تھی، کیونکہ اس بات کا شبہ تھا کہ چوری پر بھوک نے مجبور کر دیا ہو، اور اسلام میں شبہ کی بنا پر حدود ٹال دی جاتی ہیں۔

ذیل کا واقعہ اجتماعی تکافل کی عملی تطبیق کے باب میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انفرادی ملکیت کے حق کی اصل نوعیت کیا ہے اور وہ سماج میں کن حدود کا پابند ہے۔

روایت ہے کہ ابن حاطب بن ابی بلتعہ کے چند غلاموں نے مزینہ کے ایک آدمی کی اونٹنی چرالی۔ ان کو پکڑ کر حضرت عمرؓ کی خدمت میں لایا گیا۔ انھوں نے اس کا اعتراف کر لیا۔ حضرت عمرؓ نے کثیر بن الصلت کو ان کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ جب وہ تعمیل کے لیے چلے تو آپ نے ان کو روک دیا۔ اور فرمایا۔ "سنو! خدا کی قسم اگر مجھے یہ نہ معلوم ہوتا کہ تم ان غلاموں سے خوب کام لیتے ہو مگر انھیں بھوکا رکھتے ہو۔ یہاں تک کہ یہ اس حال کو پہنچ جاتے ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی حرام کھالے تو بھی جائز ہوگا، تو میں ضرور ان کے ہاتھ کٹوا دیتا۔" پھر آپ نے عبدالرحمٰن ابن حاطب بن ابی بلتعہ کو مخاطب کر کے فرمایا "خدا کی قسم میں نے ایسا (یعنی قطع ید) تو نہیں کیا مگر تیرے اوپر ایسا تاوان عائد کروں گا کہ تو چیخ اُٹھے۔ پھر آپ نے مزینہ والے آدمی سے دریافت فرمایا کہ تیری اونٹنی کے کیا دام لگ رہے تھے" اس نے کہا: چار سو۔ عمر نے ابن حاطب سے کہا "جاؤ اور اسے آٹھ سو ادا کرو" آپ نے چوری کے مجرم غلاموں کو سزا سے معاف رکھا۔ کیونکہ ان کے آقا نے اُنھیں بھوکا رکھ کر چوری کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ سدّ رمق کے محتاج تھے۔

اس طور پر عملی تاریخ میں بھی اسلام کا یہ فضل و کمال ثابت ہے کہ وہ زندہ رہنے اور ناگزیر ضروریات کی تکمیل کے حق کو انفرادی ملکیت کے حق پر مقدم رکھتا ہے۔ وہ اس اصول کو عملاً نافذ کر کے دکھاتا ہے کہ اہل استطاعت اور اہلِ حاجت کو ایک دوسرے کی ذمّہ داریوں میں ہاتھ بٹاتے ہوئے زندگی گذارنی چاہیے۔

اسلام کی تاریخ میں اجتماعی تکافل کی شان کو جو چیز دوبالا کرتی ہے وہ اس کا اسلامی دائرہ سے نکل کر پوری انسانیت کے لیے عام ہونا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے نابینا کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا۔ دریافت کرنے پر

معلوم ہوا کہ وہ یہودی ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا "تمھیں کس چیز نے اس حالت تک پہنچایا؟" اس نے جواب دیا: جزیہ، ضرورت، اور بڑھاپا۔ عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور اتنا کچھ دیا جو اس وقت کی ضروریات کے لیے کافی تھا، پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو کہلا بھیجا کہ: اس شخص اور اس جیسے دوسرے اشخاص کی طرف توجہ کرو۔ خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہیں کہ ہم اس کی جوانی (کی کمائی) کھائیں اور بڑھاپے میں اسے دھتکار دیں۔ زکوٰۃ فقراء اور مساکین کے لیے ہے، اور یہ اہل کتاب کے مساکین میں سے ہے۔ آپ نے اس فرد اور اس جیسے دوسرے افراد کو جزیہ سے بری قرار دے دیا۔

جب آپ نے دمشق کا سفر کیا تو ایک ایسی بستی سے گذرے جہاں کچھ جذام کے مریض عیسائی بستے تھے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کو زکوٰۃ کی مد سے امداد دی جائے اور ان کے لیے راشن جاری کیے جائیں۔

تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گذرا جب کہ اسلام کی روح نے عمرؓ کو انسانیت کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا تھا کہ انھوں نے سماجی تحفظ کو ایک انسانی حق قرار دے دیا، جو کسی مخصوص مذہب یا فرقہ کے ساتھ مشروط نہ تھا، جس پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا کہ محتاج کا عقیدہ کیا ہے اور وہ کس شریعت کا پابند ہے۔

یہ وہ مقام بلند ہے جس کی طرف اقدام میں آج انسانیت کے قدم تھک چکے ہیں، اور وہ اب بھی بہت دور ہے۔

سیاسی نظام

ریاست کے باضابطہ سیاسی اور معاشی نظام کے سلسلہ میں اسلام کی زندگی میں ایک مثالی دور گذرا ہے جس پر تاریخ گواہ ہے۔ افسوس صد افسوس کہ یہ دور زیادہ طویل نہ تھا۔ آئندہ ہم یہ سمجھنے کی کوشش کریں گے کہ اس کا سبب کیا تھا۔ تاکہ ہم جان سکیں کہ یہ اسباب اسلام کے سیاسی اور معاشی نظام کی عین فطرت میں داخل ہیں یا ان کا شمار ان خارجی اتفاقات میں ہے جس کا اس نظام کے مزاج سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے ہم سیاسی نظام پر گفتگو کریں گے کیونکہ مالی پالیسی عملاً ہمیشہ اس کے تحت، اور اس کے مزاج کے تابع رہی ہے۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ نے حضرت ابو بکرؓ کو بلا بھیجا کہ وہ نماز میں امامت کریں۔ جب حضرت عائشہؓ نے یہ عذر پیش کرتے ہوئے نظر ثانی کی درخواست کی کہ ابو بکرؓ

رقیق القلب آدمی ہیں، نماز پڑھنے کھڑے ہوں گے تو لوگ ان کی آواز نہ سن سکیں گے..... تو آپ کو غصہ آگیا، آپ نے حضرت یوسف (کو بہکانے والی) عورتوں کا ذکر کیا اور حضرت ابو بکرؓ کو امامت کے لیے بلانے پر اصرار کیا۔

کیا اس کا مطلب یہ تھا کہ رسول اللہ نے اپنے رفیقِ غار کو خلیفہ مقرر کر دیا؟ کیا مسلمانوں نے اس سے صراحتہً یہی سمجھا تھا۔

ہمارے نزدیک یہ دونوں مفروضے دور از قیاس ہیں۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خلیفہ مقرر کرنا ہوتا، اور اگر خلیفہ بنا کر جانا اس دین میں فرض ہوتا، تو جس طرح آپ نے اپنے دین کے دوسرے فرائض کو علی الاعلان بنا دیا تھا اسی طرح خلیفہ بنانے کا کام بھی علی الاعلان کرتے۔ اگر مسلمانوں نے صاف طور پر یہ سمجھ لیا ہوتا کہ آپ ابو بکرؓ کو خلیفہ مقرر فرما رہے ہیں تو سقیفہ میں مہاجرین اور انصار کے درمیان کیسی بحث کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیونکہ انصار ایسے نہ تھے کہ رسول اللہ کے فیصلہ پر اعتراض کرتے۔

درحقیقت یہ معاملہ مسلمانوں کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ تاکہ لوگ خود اطمینان حاصل کرلیں اور دوسروں کو بھی مطمئن کرلیں کہ خلافت کا سب سے زیادہ مستحق کون فرد ہے۔ اگر سقیفہ کے موقع پر بحث اس نتیجہ تک پہنچی کہ خلیفہ مہاجرین میں سے ہو تو یہ اسلام میں فرض نہیں تھا، بلکہ مسلمانوں کی جماعت میں کسر و انکسار کے بعد اتفاق رائے سے طے پانے والا ایک فیصلہ تھا۔ انصار اس فیصلہ کو رد کرسکتے تھے، ان پر کوئی اعتراض نہیں کرسکتا تھا۔ لیکن عملاً یہ ہوا کہ انصار حضرت ابو بکرؓ کی خلافت پر راضی ہوگئے، کیونکہ آپ خلافت کے لیے دوسروں سے زیادہ اہل تھے۔ ان کے سامنے وہ مقامی عوامل بھی تھے جو اوس و خزرج کے مابین کام کر رہے تھے، ان میں سے کسی فریق کو یہ گوارا نہ تھا کہ خلافت دوسرے فریق کے ہاتھ میں چلی جائے۔ البتہ دونوں متفقہ طور پر راضی ہوگئے کہ خلیفہ مہاجرین میں سے ہو۔

اس موقع پر اس متفقہ فیصلہ کا، کہ خلافت مہاجرین میں رہے گی، یہ مطلب نہیں تھا کہ خلافت لازماً صرف قریش کے اندر رہے، اگر معاملہ کی نوعیت یہ ہوتی تو حضرت عمر اصحاب شوریٰ کا تقرر عمل میں لاتے وقت یہ نہ فرماتے کہ "اگر ابو حذیفہ کے مولیٰ، سالم زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ مقرر کر جاتا"، ظاہر ہے کہ سالم قریشی نہیں تھے پھر اسلام کی روح بھی اس بات سے اِبا کرتی ہے کہ قریش کو محض اس وجہ سے دوسر

مسلمانوں سے برتر قرار دے دیا جائے کہ وہ "قریش" ہیں اور رسول اللہ انہیں کے نسب سے ہیں۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود یہ فرمایا ہے کہ :

من ابطأ به عمله لم يسرع به نسبه ۔ (مسلم، ابو داؤد، ترمذی)

جس کو اس کے عمل نے پیچھے رکھا اُسے اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکے گا۔

حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کو خلیفہ مقرر فرما گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے مسلمانوں کو پابند کر دیا تھا۔ ان کو پورا حق حاصل تھا کہ اس تقرر کو رد کر دیں۔ حضرت عمر اس بنا پر خلیفہ نہیں ہو گئے کہ ابو بکرؓ ان کو نامزد کر گئے تھے بلکہ آپ کی خلافت لوگوں کے آپ کے ہاتھ بیعت کرنے پر منعقد ہوئی۔ اسی طرح حضرت عمرؓ نے اپنے بعد چھ افراد کی ایک شوریٰ مقرر فرما دی جو خلافت کے لیے اپنے اندر سے ایک فرد کا انتخاب کرنے کی ذمہ دار تھی۔ مسلمان اس کے پابند نہ تھے کہ لازماً انہیں چھ میں سے کسی ایک کو منتخب کریں، بلکہ انھوں نے خود سے یہی فیصلہ کیا کیونکہ حقیقت واقعہ گواہ تھی کہ یہ چھ افراد بہترین افراد تھے اور عمر کا انتخاب اس حقیقت کے مطابق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے انہی چھ کے اندر سے کسی کا انتخاب مناسب سمجھا۔

حضرت علیؓ کے لیے بیعت میں ایسا ہوا کہ کچھ لوگ اس پر راضی تھے اور کچھ لوگ اس کے خلاف ہو گئے اس کے نتیجہ میں پہلی بار مسلمانوں میں آپس میں جنگ ہوئی۔ اس کے بعد وہ المیئے رونما ہوئے جنھوں نے اسلام کی روح، اس کے سیاسی اور اقتصادی اصولوں، اور دوسرے شعبوں میں اس کے تصوّرات کو بُری طرح مجروح کر دیا۔

اس سرسری جائزہ سے حکومت کے بارے میں اسلام کا اصل نظریہ ہمارے سامنے آجاتا ہے، یعنی یہ کہ مسلمانوں کا آزادانہ انتخاب وہ واحد چیز ہے جو کسی کو حکمراں بنا سکتی ہے۔ حضرت علیؓ کو جو رسول اللہ کے چچا کے لڑکے، ان کے داماد، اور ان کے سب سے قریبی رشتہ دار تھے، خلافت کے معاملہ میں موخّر کرتے وقت مسلمان اس حقیقت کو خوب سمجھ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ علیؓ کو موخّر کرنا، بالخصوص عمرؓ کے بعد، ان کی حق تلفی رہا ہو ——— اور ہماری ذاتی رائے یہ ہے کہ یہ اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا سوء اتفاق تھا کہ عمر کے بعد ان کو خلیفہ نہیں بنایا گیا۔ لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس تاخیر کو اسلام کے نظریہ حکومت کی صحیح ترجمانی کے باب میں بہت اہمیت حاصل ہے

اس میں یہ مصلحت مضمر تھی کہ وراثت کا شائبہ بھی اس منصب کے قریب نہ آئے کیونکہ یہ تصوّر اسلام کی روح اور اس کے بنیادی اصولوں سے بعید ترین تصوّر ہے۔ حضرت امام کی ذات کے ساتھ جو حق تلفی بھی ہوئی ہو، اس نظریہ کا عملی مظاہرہ بہرحال اس سے زیادہ اہم تھا۔

اس کے بعد بنو امیّہ کا دور آیا اور انھوں نے اسلامی خلافت کو بنو امیّہ کے اندر محصور رہنے والی منتبذانہ بادشاہت میں تبدیل کر دیا۔ یہ اسلامی تعلیمات کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ "جاہلیت" کا اثر تھا جس نے روح اسلامی کو معطل کر دیا تھا۔

یہاں یزید کی بیعت کا ایک منظر سامنے لانا کافی ہوگا تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ یہ بیعت کس بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ معاویہ نے یزید کے حق میں بیعت لینے کے لیے جو اجتماع منعقد کیا تھا اس میں مختلف وفود کو اظہار خیال کی دعوت دی۔ یزید ابن مقفع آگے بڑھا اس نے معاویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "امیر المومنین یہ ہیں"

پھر یزید کی طرف اشارہ کر کے کہا ۔ "وہ مر جائیں تو یہ ہوں گے"۔

پھر تلوار کی طرف اشارہ کیا اور کہا ـــــ "جو نہیں مانے گا اس کے لیے یہ ہے"۔

معاویہ نے کہا، بیٹھ جاؤ، تم خطیبوں کے سردار ہو!!

شام میں یزید کے لیے بیعت لینے کے بعد معاویہ نے سعید ابن العاص کو یہ ذمہ داری سپرد کی تھی کہ کسی ترکیب سے اہل حجاز کو اس کا قائل کر دیں، وہ اس کوشش میں ناکام رہے، پھر معاویہ خود مال و دولت اور لاؤ لشکر سمیت مکّہ گئے اور اکابر مسلمین کو بلا کر ان سے کہا:

"تمہارے ساتھ میرا جو برتاؤ رہا ہے اور جس طرح میں نے تمہارے رشتوں اور تعلّقات کا لحاظ رکھا ہے اس سے تم بخوبی واقف ہو۔ یزید تمہارا بھائی ہے اور تمہارے چچا کا لڑکا ہے۔ میری خواہش ہے کہ جہاں تک خلافت کے نام کا تعلّق ہے تم یزید کو آگے بڑھا دو عملاً سارا عزل و نصب، جمع محاصل اور تقسیم مال تم خود انجام دینا"۔

عبد اللہ ابن الزبیر نے ان کو جواب دیا کہ ان کے لیے مناسب یہی ہے کہ یا تو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اختیار کریں کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کے حق میں وصیت کی جو ان کے خاندان سے نہ تھا۔ یا وہ کریں جو عمرؓ نے کیا تھا کہ معاملہ کو چھ ایسے افراد کے باہمی مشورہ پر چھوڑ دیا جن میں ان کا کوئی لڑکا یا رشتہ دار نہ شامل تھا۔ معاویہ مارے غصّے کے بھڑک اٹھے اور کہا "تمہارے سامنے کوئی اور شکل بھی ہے"۔ ابن الزبیر نے کہا کہ

نہیں۔ معاویہ نے دوسرے لوگوں کی طرف مڑ کر پوچھا کہ تم کیا کہتے ہو؟ ان لوگوں نے کہا کہ ہم سب ابن زبیر سے متفق ہیں۔
پھر معاویہ نے ان لوگوں کو دھمکی دیتے ہوئے کہا:

"جس نے متنبہ کر دیا اُس نے اپنے لیے عذر فراہم کر لیا۔ میں نے تم کو خطاب کیا تو تم میں سے ایک شخص نے اٹھ کر سب کے سامنے میری تردید کر دی۔ میں اسے برداشت کر لیتا ہوں، اور معاف کر دیتا ہوں لیکن اب میں ایک ایسی بات کہنے کھڑا ہوں کہ خدا کی قسم اگر تم میں سے کسی نے اس کے جواب میں ایک جملہ بھی کہا تو قبل اس کے کہ اُسے کوئی دوسرا جملہ سنائی دے تلوار اس کا سر تن سے جدا کر چکی ہوگی۔ اب ہر شخص اپنی جان بچانے کی فکر کرے۔"

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ یہ ہے کہ معاویہ کے حفاظتی دستہ کے سالار نے حجاز کے ان تمام عمائدین کے سر پر دو، دو آدمی مسلط کر دیے جو اس تجویز کے خلاف تھے۔ معاویہ نے سالار کو حکم دے دیا تھا کہ اگر ان میں سے کوئی فرد میری تصدیق یا تکذیب میں ایک جملہ بھی منہ سے نکالے تو اس کو یہ دونوں آدمی تلوار کا نشانہ بنا دیں۔

پھر معاویہ منبر پر آئے اور یہ کہا:

"یہ لوگ مسلمانوں کے سردار اور ان میں کے بہترین افراد ہیں۔ ان کی رائے کے بغیر کوئی معاملہ نہیں طے کیا جاتا، نہ ان کے مشورہ کے خلاف کوئی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں نے یزید کی خلافت پر راضی ہو کر بیعت کر لی، تم لوگ بھی اللہ کا نام لے کر بیعت کر لو۔"

چنانچہ عوام نے بیعت کر لی!!

یزید کی حکومت اس بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ وہ بنیاد جسے اسلام کبھی بھی نہیں تسلیم کر سکتا۔ اور خود یزید کون ہے؟ یہ وہی شخص ہے جس کے بارے میں عبداللہ ابن حنظلہ کہتے ہیں:۔

"خدا کی قسم ہم یزید کے خلاف اس وقت کھڑے ہوئے جب ہمیں یہ اندیشہ ہو چلا کہ ایسا نہ ہو کہ ہم پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں ——— یہ شخص ماؤں، بہنوں، بیٹیوں سے (ایک ساتھ) نکاح کرتا ہے۔ شراب پیتا ہے، اور نمازیں ترک کرتا ہے۔ خدا کی قسم اگر اور لوگ میرے ساتھ نہ ہوتے تو بھی میں اللہ کی راہ میں ضرور قربانی دیتا۔"

ہو سکتا ہے کہ یہ یزید کے ایک دشمن کی مبالغہ آمیزی ہو۔ لیکن بعد میں یزید نے عملاً جو کچھ کیا، مثلاً حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو اتنے بُرے طریقہ سے قتل کرنا .... بیت اللہ کا محاصرہ اور اس پر سنگ باری

...... وغیرہ، وہ اس بات پر گواہ ہے کہ یزید کے دشمنوں نے ذرا بھی مبالغہ سے کام نہیں لیا۔
صحیح صورت حال جو کچھ بھی رہی ہو، کسی کو یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں میں صحابہ کرام اور تابعین کے ہوتے ہوئے خلافت کے لیے موزوں ترین فرد یزید تھا۔ اصل غرض یہ تھی کہ حکومت اموی خاندان میں آجائے اور وراثتی نظام اختیار کرلے۔ یہ رجحان اسلام، اسلامی نظام، اور اسلامی رجحان کے دل میں چھرا بھونک دینے کے مترادف تھا۔

اسلام کی روح اور بنیادی تصوّرات کو معاویہ کے قائم کیے ہوئے وراثتی نظام سے بڑی ثابت کرنے کی خاطر ہم اپنے موضوع سے ہٹ کر معاویہ اور اُمیّہ کے سلسلہ میں کچھ عرض کریں گے اس گریز کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

جس چیز نے اس المیہ کو زیادہ المناک بنا دیا وہ یہ کہ راہ اسلام سے یہ انحراف اسلام کے ابتدائی دور میں بھی رونما ہو گیا۔ ابھی اس کی اعلیٰ روایات کیے لیے گنتی کے تیس سال نصیب ہوئے تھے۔ ابھی اسے پوری طرح جڑ پکڑنے اور قدم جمانے کے مواقع نہیں مل سکے تھے۔ ابھی ایسے مستحکم رواج اور ایسی ٹھوس روایات ختم نہ ہوسکی تھیں جن سے بغاوت مشکل ہو............ لیکن دراصل یہ پہلا حادثہ نہ تھا۔
اس سے بدتر واقعہ حضرت علی کو موخّر کرکے ضعیف العمری کے زمانہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا خلیفہ بنایا جانا ہے، جس کے نتیجہ میں سلطنت کی کنجیاں مروان ابن حکم کے قبضہ میں چلی گئیں۔

طرز حکمرانی کے نمونے :۔

اس حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم طرز حکمرانی کے کچھ نمونے مختلف ادوار، مثلاً حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے دور، پھر حضرت عثمانؓ اور مروان کے عہد اور پھر حضرت علیؓ کے عہد اور اسی طرح شاہان بنو امیّہ اور ان کے بعد بنو عبّاس کے دور سے سامنے لائیں، جو اُس وقت آئے جب کہ

اسلامی روح کا گلا گھونٹا جا چکا تھا۔

جب مسلمانوں نے حضرت ابو بکرؓ کو خلافت کا منصب سنبھالنے کو کہا تو ان کی نظر میں اپنا کام اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ مسلمانوں میں اللہ کے دین اور اس کی شریعت کو نافذ کرنے کی ذمہ داری ادا کریں۔ اس طرح کا کوئی خیال ان کے پاس بھی نہیں پھٹکا کہ یہ منصب ان کے لیے کچھ ایسی چیزوں کو مباح کرتا ہے جو کل، جب کہ وہ رعیت کے ایک عام فرد تھے، مباح نہیں تھیں، یا انھیں کوئی نیا حق دیتا ہے جو کل تک نہیں حاصل تھا، یا ان ذمہ داریوں میں سے کسی ذمہ داری کو ساقط کرتا ہے جو کل تک ان کے سر پر تھیں، چاہے ان ذمہ داریوں کا تعلق آپ کی اپنی ذات سے ہو، یا خاندان والوں سے ہو، یا اللہ تعالےٰ سے ہو۔

سقیفہ میں جب آپ کے ہاتھوں پر بیعت ہو چکی تو کھڑے ہو کر فرمایا:

"اما بعد، اے لوگو! میں تمہارا والی بنا دیا گیا۔ اگرچہ میں تم سب سے بہتر آدمی نہیں ہوں۔ اگر میں اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دوں تو میری مدد کرنا اور کج روی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت ہے، تم میں جو کمزور ہے وہی میرے نزدیک طاقت ور ہے تا آنکہ میں اس کا حق اسے پہنچا دوں۔ انشاء اللہ۔ اور جو طاقت ور ہے وہی میرے نزدیک کمزور شمار ہوگا تا آنکہ میں اس سے حق وصول کر لوں۔ انشاء اللہ۔ جب بھی کسی قوم نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے جی چرایا اللہ نے اسے ذلیل و خوار کر دیا۔ جب بھی کسی قوم میں فحش کا دور دورہ ہوا اللہ نے بلا استثناء سب پر مصیبت نازل کر دی۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں تم لوگ میری اطاعت کرنا، اگر اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت کی ذمہ داری نہیں۔"

حضرت ابو بکرؓ کا مکان مدینہ سے قریب سنح میں تھا۔ یہ ایک چھوٹا سا معمولی مکان تھا جب آپ خلیفہ ہو گئے تب بھی آپ نے نہ مکان بدلا نہ خود اس مکان میں کوئی تبدیلی عمل میں لائے۔ سنح میں اپنے مکان سے مدینہ تک صبح و شام پیدل آتے اور جاتے تھے۔ کبھی کبھی ایک گھوڑا سواری میں ہوتا مگر وہ گھوڑا بیت المال کا نہ تھا۔ بلکہ آپ کا تھا۔ جب کام کا بار بڑھ گیا تو آپ مدینہ منتقل ہو گئے۔

تجارت کر کے اپنی روزی کماتے تھے (خلیفہ منتخب ہونے کے بعد) صبح ہوئی تو چاہا کہ کاروبار کے لیے جائیں، مسلمانوں نے روک لیا اور کہا۔ یہ ذمہ داری تجارت کے ساتھ پوری طرح نہیں ادا کی جا سکے گی۔

اس پر آپ نے پوچھا، ایسے انداز میں جیسے کہ رزق ملنے کے کسی دوسرے طریقے سے بالکل ناآشنا ہوں! پھر میں کیسے گذارا کروں گا؟ لوگوں نے معاملہ پر غور کیا اور ان کے کاروبار نہ کر سکنے اور فرائضِ منصبی کے لیے وقف ہو جانے کے عوض بیت المال سے ان کی اور ان کے اہل و عیال کی خوراک کے لیے بقدر کفایت وظیفہ مقرر کر دیا۔

اس کے باوجود جب آپ کی وفات کا وقت آیا تو آپ نے مسلمانوں کے مال سے بری رہنے کی خاطر تورعاً یہ حکم دیا کہ آپ نے بیت المال سے جو کچھ لیا ہے اس کا حساب کیا جائے اور اتنا آپ کی زمین اور دوسرے اموال سے لے کر بیت المال کو واپس کر دیا جائے۔ اسلام نے حاکم و محکوم کے ضمیر کو جس ہمہ دم بیداری کا مکلّف بنایا ہے اور ہر فرد کو جو حسّاس شعور عطا کیا ہے اس کے زیرِ اثر آپ کا حال یہ تھا کہ رعایا کے ہر فرد کی ضروریات کے بارے میں خود کو جواب دہ اور ذمّہ دار سمجھتے تھے۔ اس معاملہ میں آپ اس حد کو جا پہنچے تھے کہ سنح میں آپ کے پڑوس میں جو ضعیف اور بے سہارا لوگ رہا کرتے تھے ان کی بکریوں کو دوہنا آپ نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ جب آپ نے خلافت کا منصب سنبھالا تو ایک لڑکی کو یہ کہتے سنا: "اب تو تم ہمارے لیے بکریاں نہ دوہا کرو گے!" آپ نے فرمایا کیوں نہیں، اپنی جان کی قسم میں تمہاری خاطر انہیں دوہا کروں گا۔ چنانچہ آپ ان کو دوہتے رہے۔ کبھی کبھی بکری کی مالکہ سے پوچھتے: اے لڑکی، مکھن نکال دوں یا خالص دودھ رہنے دوں، کبھی وہ کہتی کہ مکھن نکال دو، کبھی کہتی صرف دودھ دودھ دو۔ وہ جو کہتی آپ کر دیتے۔

حضرت ابو بکر کی خلافت کے زمانہ میں حضرت عمر مدینہ کی ایک اندھی عورت کی خبر گیری کیا کرتے تھے۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ جب بھی آپ پہنچتے یہ دیکھتے کہ اس عورت کی ضروریات پوری ہو چکی ہیں، ایک دن یہ چھپ کر بیٹھ رہے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ابو بکرؓ آ کر اس کے کام کر جاتے ہیں۔ خلافت اور اس کی ذمہ داریاں بھی آپ کو اس کام سے نہ روک سکیں۔ ان کو دیکھ کر حضرت عمرؓ پکار اٹھے: "آپ ہی ہیں، میری جان کی قسم آپ ہی ہیں!"

یہ ابو بکرؓ کے تصوّرِ حکمرانی کی ایک ہلکی سی جھلک تھی۔ آپ کی جگہ حضرت عمرؓ نے لی تو بھی یہی تصوّر باقی رہا۔ عمرؓ نے کبھی یہ نہیں سمجھا کہ ان کا یہ نیا منصب ان کے حقوق میں کوئی اضافہ کر دیتا ہے البتہ اس نے آپ کی ذمّہ داریوں میں اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کی ذمہ داری کا اضافہ ضرور کر دیا۔

بیعت کے بعد آپ نے خطبہ دیا، فرمایا: "لوگو میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر مجھے خلیفۂ رسول اللہ کی بات ٹھکرانا ناپسند نہ ہوتا تو میں ہرگز تمہارے معاملات کی ذمہ داری قبول کرتا۔"

آپ نے اپنے دوسرے خطبہ میں فرمایا: "میرے اوپر تمہارے سلسلہ میں کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کا میں ذکر کرتا ہوں، تم مجھ سے ان کا مواخذہ کرتے رہنا - میری ذمہ داری ہے کہ تمہارے خراج اور فئے کو ضابطہ کے مطابق وصول کروں اور جو مال میرے پاس آئے وہ حق کے مطابق صرف ہو - میری ذمہ داری ہے کہ تمہیں ہلاکت کے منہ میں نہ ڈالوں اور تمہیں زیادہ عرصہ سرحدوں پر نہ تعینات رکھوں اور جب تم جنگ کے سلسلہ میں گھر سے دور رہو تو میں تمہارے گھر والوں کا سرپرست ہوں گا"

آپ فرمایا کرتے تھے کہ "میں نے اللہ کے مال کو اپنے لیے یتیم کے مال کی حیثیت دے رکھی ہے، اگر مجھے ضرورت نہ پڑی تو اس سے مستغنی رہوں گا، اور اگر ضرورت پڑی تو معروف کے مطابق اس میں سے کھاؤں گا۔"

ایک بار آپ سے دریافت کیا گیا کہ اللہ کے مال میں سے آپ کے لیے کتنا لینا حلال ہے آپ نے فرمایا، "میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں اپنے لیے اس میں سے کتنا حلال سمجھتا ہوں - میرے لیے دو کپڑے لینا حلال ہے - ایک جاڑے کے لیے، ایک گرمی کے لیے - اور حج اور عمرہ کرنے کے لیے سواری نیز میرے اور میرے گھر والوں کی خوراک وہ ہوگی جو قریش کے کسی متوسط الحال فرد کی ہوتی ہے - اس کے بعد میں عام مسلمانوں کی طرح ایک مسلمان ہوں، جو ان کو ملے گا، مجھے بھی ملے گا۔"

آپ نے اسی طرح زندگی گذاری مگر اکثر آپ نے ان چیزوں کے معاملہ میں بھی شدت برتی جن کو اپنے لیے حلال قرار دے چکے تھے - ایک دن بیمار پڑ گئے - علاجاً شہد تجویز کیا گیا - بیت المال میں شہد کا ایک کپا موجود تھا - جب منبر پر تشریف لائے تو فرمایا "تم لوگ اجازت دو تو اسے استعمال کر لوں، ورنہ وہ میرے لیے حرام ہے۔" لوگوں نے اجازت دے دی -

مسلمانوں نے یہ شدت پسندی دیکھی تو کچھ لوگ آپ کی صاحبزادی، ام المومنین حضرت حفصہؓ کے پاس گئے اور یہ کہا: عمرؓ نے اپنے اوپر شدت اور تنگی کی حد کر رکھی ہے اب اللہ تعالےٰ نے رزق میں فراخی عطا کر دی ہے، ان کو چاہیے کہ اس فئے میں سے حسب خواہش فراخی کے ساتھ لے لیا کریں۔ مسلمانوں کی طرف سے ان کو ایسا کرنے کی پوری اجازت ہے، جب حضرت حفصہ نے آپ سے اس بارے میں گفتگو کی تو جواب دیا: "اے عمر کی بیٹی حفصہ! تو نے اپنی قوم کا ساتھ دیا مگر اپنے باپ کے ساتھ بدخواہی کی - میرے گھر والوں کا میرے جان و مال پر حق ہے مگر دین اور امانت پر نہیں ہے۔"

آپ اپنے اور اپنی رعیت کے درمیان مساوات کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ جب عام الرمادہ کا مشہور قحط پڑا اور لوگ بھوک کا شکار ہوئے تو آپ نے قسم کھالی کہ جب تک لوگ بحال نہ ہو جائیں گے گھی اور گوشت زبان پر نہ رکھیں گے۔ آپ نے ایسا ہی کیا یہاں تک کہ تیل کھاتے کھاتے بدن کی جلد سوکھ کر سیاہ ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد بازار میں گھی کا ایک کپّا اور دودھ کا ایک مشکیزہ فروخت ہو رہا تھا تو آپ کا ایک غلام اسے چالیس درہم میں خرید لایا۔ اس نے واپس آکر آپ کو بتایا کہ اب اللہ نے آپ کی قسم پوری کر دی۔ کیونکہ بازار میں گھی کا ایک کپّا اور دودھ کا ایک مشکیزہ بکنے کو آیا تھا اور میں نے اسے آپ کے لیے خرید بھی لیا۔ مگر جب آپ کو دام معلوم ہوئے تو فرمایا کہ بہت گراں خریدا ہے۔ دونوں چیزیں صدقہ کر دو مجھے اسراف کر کے کھانا نہیں پسند ہے۔ سر جھکا کر تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر فرمایا: "جو کچھ رعیت پر گزرتی ہے اگر وہی مجھ پر نہ گزرے تو مجھے ان کے مسائل کی صحیح اہمیت کیسے محسوس ہو گی۔؟"

آپ کا نظریہ یہ تھا کہ جس چیز سے رعایا محروم ہو اس سے خود کو بھی محروم کر لیں تاکہ اس کے مسائل کا صحیح اندازہ ہو سکے، جیسا کہ آپ نے خود فرمایا۔ دراصل آپ کے ذہن کے کسی گوشہ میں بھی یہ خیال نہیں تھا کہ حکومت کی ذمہ داریاں اٹھا لینے کی وجہ سے آپ کو کچھ ایسے امتیازی حقوق بھی مل جاتے ہیں جن سے دوسرے محروم ہیں۔ آپ سمجھتے تھے کہ اگر اس معاملہ میں عدل پر نہیں قائم رہ سکے تو لوگوں کی اطاعت کے مستحق نہیں رہ جائیں گے۔ اس سے پہلے ہم یمنی چادروں کا قصہ بیان کر چکے ہیں اور یہ بتا چکے ہیں کہ کس طرح آپ نے خود یہ فرما دیا تھا کہ آپ عدل پر نہ قائم رہ جائیں تو آپ کی اطاعت کی ذمہ داری ساقط ہو جائے گی۔ یہ بات اسلام کے نظام حکمرانی کا ایک اہم اصول واضح کرتی ہے۔ یعنی یہ کہ امام غیر عادل اطاعت کا مستحق نہیں۔

آپ کے ذہن میں یہ اسلامی شعور بہت راسخ تھا۔ ہر آن آپ کو اس کا احساس رہتا تھا۔ چنانچہ ایک بار آپ نے ایک آدمی سے ایک گھوڑے کا مول بھاؤ کیا۔ پھر آزما کر دیکھنے کی خاطر اس پر سواری کرنے لگے۔ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور زخمی ہو گیا۔ آپ نے چاہا کہ اُسے اُس کے مالک کو واپس کر دیں، لیکن اس نے واپس لینے سے انکار کر دیا۔ دونوں یہ مقدمہ لے کر قاضی شریح کی عدالت میں گئے۔ انھوں نے دونوں فریق کے دلائل سننے کے بعد کہا۔ "امیر المومنین جو چیز آپ نے خریدی تھی اسے لے لیجیے، ورنہ جس حال میں اسے لیا تھا اُسی حال میں واپس کر دیجیے۔" عمرؓ بول اُٹھے۔ اسے کہتے ہیں فیصلہ کرنا! پھر آپ نے شریح کو عدل و انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنے کے بدلے کوفہ کا قاضی بنا دیا۔

جب سیاست وحکمرانی کے باب میں حضرت عمرؓ کا تصوّر یہ تھا تو اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ حکمران کے اعزا واقربا کو رعیّت کے دوسرے افراد کے مقابلہ میں کوئی امتیازی مقام حاصل ہو۔ چنانچہ جب آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن نے شراب پی تو حد جاری کرنا لازمی ہوگیا، اس سلسلہ میں آپ کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ اسی طرح جب عمروبن العاص کے لڑکے نے ایک مصری پر زیادتی کی تو قصاص ضروری قرار پایا۔ مال کے بارے میں آپ کی پالیسی یہ رہی کہ عمّال حکومت ہر اس اضافہ کے بارے میں جواب دہ قرار پائے جو ان کے اموال میں منصب پر آنے کے بعد ہوا ہو۔ ایسا اس اندیشہ کے تحت کیا گیا کہ یہ اضافے مسلمانوں کے مال کو نقصان پہنچا کر یا اپنے منصب سے بے جا فائدہ اٹھا کر تو نہیں کیے گئے " یہ سوال کہ کہاں سے حاصل ہوا؟" وہ بنیادی اصول ہے جس کے تحت آپ نے، جب بھی معقول وجوہ پائے اپنے ایک ایک عامل پر گرفت کی۔ چنانچہ والی مصر عمروؓ ابن العاص کے مال میں سے اسی اصول کے تحت آدھا حصّہ بیت المال میں لے لیا گیا۔ یہی سلوک آپ نے کوفہ میں اپنے والی سعدؓ ابن ابی وقاص کے ساتھ برتا۔ اسی طرح آپ نے ابوہریرہؓ کا مال ضبط کر لیا جو بحرین میں آپ کے والی تھے۔

حضرت عمرؓ کے تصوّر حکمرانی کا خلاصہ یہ ہے کہ رعیّت دین کی حدود میں رہتے ہوئے اطاعت، وفاداری اور خیر خواہی کرے اور راعی عدل اور بہی خواہی کرے۔ چنانچہ آپ نے اپنی رعایا کے ایک فرد کی اس بات کو بجا تسلیم کیا کہ: "اگر ہم نے تیرے اندر کجی دیکھی تو اسے اپنی تلواروں سے سیدھا کر دیں گے۔" گویا آپ نے یہ اصول تسلیم کیا کہ رعیت کو حاکم کی اصلاح و درستگی کا حق حاصل ہے۔ ایک دن آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"میں نے تم پر اپنے عمّال کا تقرر اس لیے نہیں کیا ہے کہ تمہارے منہ پر طمانچے ماریں، تمہاری عزّت وآبرو پر حرف رکھیں، اور تمہارے اموال غصب کرتے پھریں۔ میں نے انھیں اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ تمہیں تمہارے رب کی کتاب اور تمہارے نبی کی سنت سکھائیں۔ اب اگر کسی شخص پر کوئی عامل ظلم کرتا ہے تو اس کو میری طرف سے اس کی مطلق اجازت نہیں، اس شخص کو چاہیے کہ معاملہ کو میرے سامنے رکھے تاکہ میں اس عامل سے بدلہ لوں۔"

اس طرح آپ نے حاکم کے ان حدود واختیار کی نشاندھی فرما دی جن سے تجاوز صحیح نہیں۔

حاکم کی ذمہ داریوں کی گرانباری کا بھی شدید احساس تھا جس کی وجہ سے آپ نے یہ نہیں گوارا کیا کہ خطاب کے خاندان میں سے اس بار کو اٹھانے والے ایک سے دو ہوں۔ چنانچہ آپ نے صاف صاف منع کر دیا کہ آپ کے بیٹے عبداللہ کو اس کے لیے نہ چنا جائے، اگرچہ آپ نے انھیں اصحاب شوریٰ میں شامل رکھا تھا۔

اس موقع پر آپ نے وہ مشہور جملہ کہا جو آپ کے تصوّر خلافت کی بہت صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

"ہم کو تمہارے معاملات کی ذمہ داری اپنے سر لینے کا ذرا بھی شوق نہیں۔ میں نے خود اسے اچھا نہیں پایا کہ اب اپنے خاندان میں سے کسی اور کے لیے اس کی تمنا کروں۔ اگر یہ واقعی خیر ہے تو ہم اس میں سے اپنا حصہ پا چکے، اور اگر یہ شر ہے تو آل عمر کے لیے یہی کافی ہے کہ ان میں سے ایک آدمی سے اس کا محاسبہ ہو۔"

حضرت عثمان کا طرز حکمرانی

بے شک حکمرانی کی حقیقت کے بارے میں یہ تصوّر حضرت عثمانؓ کے عہد میں کچھ بدل گیا تھا۔

خلافت کا بار حضرت عثمان کے سر اس وقت آیا جب آپ کافی بوڑھے ہو چکے تھے۔ اسلام کے بلند اور سخت اصولوں کی نسبت سے آپ کی عزیمت ضعف کا شکار ہو چکی تھی اور آپ کی قوت ارادی مروان اور اس کی پشت پر امیہ کی چالبازیوں کا پوری طرح مقابلہ نہ کر سکی۔

حضرت عثمانؓ نے، اللہ آپ پر رحم فرمائے، یہ سمجھا تھا کہ ان کا امام ہونا ان کو مسلمانوں کے مال میں سے ہبہ اور عطیہ دینے کی بھی کھلی آزادی دے دیتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ اس پالیسی پر تنقید کرتے ان کو آپ کا جواب اکثر و بیشتر یہ ہوتا کہ: "اگر یہی نہیں تو میں امام کس معاملہ میں ہوا؟" آپ کا خیال تھا کہ منصب امامت اس بات کی بھی آزادی دیتا ہے کہ، صرف اس بنا پر کہ آپ کو فطری طور پر اپنے اعزّا و اقرباء کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کرنے کا حق حاصل تھا، بنو معیط اور بنو امیہ کو عوام کی گردنوں پر مسلّط کر دیں۔ انہی رشتہ داروں میں حکم بھی تھا جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کا راندۂ درگاہ تھا۔

حضرت عثمانؓ نے اپنے داماد حارث ابن حکم کو ان کی شادی کے دن بیت المال سے دو لاکھ درہم عطا کیے۔ صبح ہوئی تو مسلمانوں کے مال کے خزانچی زید ابن ارقم غمگین چہرہ اور اشک آلود آنکھیں لیے آپ کے پاس آئے اور یہ درخواست کی کہ ان کو ان کی ذمہ داری سے سبک دوش کر دیا جائے، جب آپ نے ان سے سبب معلوم کیا اور یہ پتا چلا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے اپنے داماد کو مسلمانوں کے مال میں سے عطیہ دیا ہے تو تعجب کے ساتھ کہا: ابن ارقم! تم اس بات پر رو رہے ہو کہ میں نے صلہ رحمی کی؟ روح اسلام کا جاندار شعور رکھنے والے اس شخص نے اس کا جواب یہ دیا کہ "نہیں، امیر المومنین، یہ بات نہیں۔ بلکہ میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ ایسا تو نہیں کہ آپ نے یہ مال اس انفاق کے عوض لیا ہو جو رسول اللہ (صلّی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی میں آپ کیا کرتے

تھے۔ خدا کی قسم آپ اُسے سَو درہم بھی دیتے تو بہت ہوتا۔" حضرت عثمانؓ کو اس شخص پر غصہ آ گیا جس کا ضمیر خلیفۃ المسلمین کے رشتہ داروں کے خاطر مسلمانوں کے مال میں اتنے تصرف کی بھی گنجائش نہیں پاتا تھا۔ انھوں نے زید ابن ارقم سے کہا: "ابن ارقم، تم کنجیاں رکھ دو۔ ہم کو دوسرا آدمی مل جائے گا۔"

اس طرح کے توسّع کی مثالیں حضرت عثمان کے یہاں بہت ملتی ہیں: آپ نے ایک دن زبیر کو چھ لاکھ عطا کیا، طلحہ کو دو لاکھ دیا اور مروان ابن حکم کو افریقہ کا ⅕ خراج عطا کر دیا، اس پر صحابہ کی ایک جماعت نے جس کے لیڈر حضرت علی تھے آپ پر اعتراض کیا تو آپ نے جواب دیا کہ "میرے بھی کچھ عزیز اور رشتہ دار ہیں (جن کے ساتھ مجھے حسن سلوک کرنا چاہیے)"۔ لوگوں نے اس جواب کو قابل اعتراض قرار دیتے ہوئے سوال کیا، "کیا ابوبکر و عمر کے عزیز اور رشتہ دار نہ تھے۔" آپ کا جواب یہ تھا کہ "ابوبکر اور عمر اپنے رشتہ داروں کو محروم رکھ کر اللہ سے اجر کے متوقع ہوتے تھے اور میں ان کو عطایا دے کر اجر کی توقع کرتا ہوں"۔ اس پر یہ لوگ غصہ ہو کر یہ کہتے ہوئے ان کے پاس سے اُٹھ کر چلے آئے کہ: "خدا کی قسم اگر یہ بات ہے تو ان دونوں کی روش ہمیں آپ کی روش سے زیادہ محبوب ہے۔"

بجا کہا! اسلام کو بھی وہی روش زیادہ محبوب ہے اور وہی اسلام کی حقیقت سے زیادہ قریب بھی ہے۔

مال کے علاوہ منصب و ولایت کا حال یہ تھا کہ عثمانؓ کے اعزہ پر اس کی بارش ہو رہی تھی۔ انہی لوگوں میں معاویہ بھی شامل ہیں جن کی سلطنت میں اضافہ کرنے میں حضرت عثمان نے خوب فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ان کے حدود میں فلسطین اور حمص کا اضافہ کیا۔ ان کو چاروں فوجوں کا کمانڈر بنا دیا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس بات کے لیے راہ ہموار کر دی کہ مال اور فوجیں جمع کر چکنے کے بعد حضرت علی کی خلافت کے زمانہ میں سلطنت کے دعوے دار بن کر کھڑے ہو سکیں۔ انہی لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رد کردہ حکم ابن عاص بھی شامل تھا اور اس کا رضاعی بھائی عبد اللہ ابن سعد ابن ابی السرح بھی۔

صحابۂ کرام اسلام کی روح سے اس انحراف کو دیکھ رہے تھے۔ وہ لوگ دوڑ دوڑ کر مدینہ آتے تاکہ اسلام اور خلیفۃ المسلمین کو اس آزمائش سے بچا لیں۔ مگر خلیفہ کا حال یہ تھا کہ بڑھاپے اور ضعیف العمری کے سبب مروان پر ان کا کوئی کنٹرول نہیں باقی رہا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اندر صحیح اسلامی اسپرٹ کے کارفرما ہونے کا سوال ہے ان پر الزام رکھنا یا شبہ کرنا بہت مشکل ہے لیکن یہ بات بھی اس سے کچھ کم دشوار نہیں کہ ہم ان کو خطا سے پاک قرار دیں۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔

ایک بار لوگوں نے جمع ہو کر حضرت علی ابن ابی طالب کے سر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ حضرت عثمانؓ کے پاس جاکر ان سے گفتگو کریں۔ آپ ان کے پاس گئے اور یہ فرمایا۔

"میرے پیچھے عوام ہیں، جنھوں نے مجھ سے آپ کی بابت گفتگو کی ہے۔ مگر خدا کی قسم میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ سے کیا کہوں۔ میں کوئی ایسی بات نہیں جانتا جس سے آپ ناواقف ہوں، نہ آپ کو کوئی ایسی بات سمجھا سکتا ہوں جس پر خود آپ کی نظر نہ ہو۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں اسے آپ بھی جانتے ہیں۔ کسی بات تک ہماری رسائی آپ سے پہلے نہیں ہوئی کہ ہم آپ کو اس سے آگاہ کر سکیں نہ کوئی بات ایسی ہے جس سے صرف ہم ہی واقف ہوں اور اب اسے آپ تک پہنچائیں کوئی بات ایسی نہیں جو آپ سے چھپا کر صرف ہمیں بتائی گئی ہو۔ آپ نے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھا، ان کی باتیں سنیں، ان کی صحبت میں رہے۔ ان سے رشتہ قائم کیا۔ نہ تو ابو قحافہ رشتہ داری میں آپ سے بڑھ کر تھے نہ ابن خطاب آپ کی بہ نسبت خیر سے، زیادہ قریب تھے۔ رحمی قرابت کے اعتبار سے بھی آپ رسول اللہ سے زیادہ قریب ہیں اور سسرالی رشتہ میں بھی آپ کا حصہ ان دونوں سے زیادہ ہے۔ کسی معاملہ میں بھی وہ آپ سے آگے نہ تھے۔ لہذا اپنے نفس کے معاملہ میں اللہ سے ڈریئے، کیونکہ آپ کو نہ تو اندھیرے سے روشنی کی طرف لانے کی ضرورت ہے نہ ناواقفیت سے علم کی طرف۔ صحیح راہ بالکل واضح اور کھلی ہوئی ہے۔ دین کے نشانات اب بھی قائم ہیں۔ عثمانؓ! جان لو کہ اللہ کے نزدیک سب سے افضل بندہ وہ امام عادل ہے جس کو خود بھی ہدایت پر چلنا نصیب ہوا اور اس نے دوسروں کو بھی ہدایت کی راہ دکھلائی کسی معلوم سنّت کو قائم کیا یا کسی قابل ترک بدعت کو مٹایا۔ خدا کی قسم! ہر چیز واضح ہے۔ سنتیں قائم ہیں، ان کے پرچم بلند ہیں۔ اللہ کے نزدیک بدترین آدمی وہ ہے جو خود بھی راہ سے بے راہ ہوا اور دوسرے بھی اس کے سبب گمراہ ہوئے۔ کسی جانی پہچانی سنت کو مٹا دیا اور کسی قابل ترک بدعت کو زندہ کر کے رواج دیا۔ میں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ: قیامت کے دن ظلم وجور کرنے والے امام کو اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کا نہ تو کوئی مددگار ہو گا۔ نہ کوئی عذر سننے والا چنانچہ وہ جہنّم میں جھونک دیا جائے گا۔" [1]

---

[1] طبری نے اس کو ۳۴ھ کے واقعات میں بیان کیا ہے۔

حضرت عثمان نے جواب دیا:-

"خدا کی قسم میں خوب جانتا تھا کہ لوگ یہی کچھ کہیں گے جو تم نے کہا سنو! خدا کی قسم، اگر میری جگہ تم ہوتے تو نہ میں تم پر سخت گیری کرتا، نہ عیب نکالتا، نہ (ہدف طعن بننے کے لیے) اکیلا چھوڑ دیتا۔ میں یہ اعتراض لے کر نہ کھڑا ہوتا کہ تم نے صلہ رحمی کیوں کی؟ کسی حاجتمند کی حاجت روائی کیوں کی؟ کیوں کسی خستہ حال بے گھر کو ٹھکانا دیا؟ اور کیوں ایسے لوگوں کو ولایت کا منصب دیا جس قسم کے لوگوں کو عمرؓ بھی یہ منصب دیا کرتے تھے۔ علی! میں تمہیں خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں کیا تم نہیں جانتے کہ مغیرہ بن شعبہ اس منصب پر فائز ہے"۔

انھوں نے کہا: "ہاں (خوب جانتا ہوں)"

عثمانؓ: "جانتے ہو نا کہ اُسے عمرؓ نے والی بنایا تھا"۔

علیؓ: "ہاں"۔

عثمانؓ: "پھر اگر میں نے رشتہ داری اور قرابت کی وجہ سے ابن عامر کو والی بنایا تو تم اس پر مجھے کیوں ملامت کرتے ہو؟"

علیؓ:- "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ حقیقت حال کیا ہے، عمرؓ جس کو والی بناتے تھے اُن کا جوتا اُس کے سر پر ہوتا تھا۔ اس کے خلاف ایک حرف بھی ان تک پہنچتا تو اسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیتے اور پھر معاملہ کو آخری حد تک پہنچا کر دم لیتے۔ یہی چیز ہے جو آپ نہیں کرتے۔ آپ خود کمزور پڑ گئے اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ نرمی برتنے لگے"۔

عثمانؓ:- "اور تمہارے قرابت داروں کے ساتھ بھی تو!"

علیؓ:- "بلاشبہ اُن کا مجھ سے قریبی رشتہ ہے لیکن دوسرے اُن سے افضل ہیں"۔

عثمانؓ:- "تم جانتے ہو کہ عمرؓ نے اپنی خلافت کے پورے عرصہ معاویہ کو والی بنائے رکھا۔ پھر میں نے بھی انھیں والی برقرار رکھا"۔

علیؓ:- "میں آپ کو خدا کی قسم دلا کر پوچھتا ہوں، آپ جانتے ہیں نا کہ معاویہ عمرؓ سے اس سے زیادہ ڈرتے تھے جتنا عمرؓ کا غلام یرفأ اُن سے ڈرتا تھا"۔

عثمانؓ:- "ہاں"

علیؓ :- "اب صورت حال یہ ہے کہ معاویہ آپ سے رائے لیے بغیر فیصلے کرتے رہتے ہیں اور آپ کو خبر بھی نہیں ہوتی - وہ لوگوں سے یہ کہتے پھرتے ہیں کہ یہ عثمان کا حکم ہے - یہ بات آپ تک پہنچتی ہے مگر آپ معاویہ کی تردید نہیں کرتے"

بالآخر حضرت عثمانؓ کے خلاف ایک فتنہ اُٹھ کھڑا ہوا جس میں حق و باطل اور خیر و شر دونوں کی آمیزش تھی - اس فتنہ نے اسلام اور مسلمانوں کو بدترین مصیبتیں اور سخت ترین صدمے پہنچائے ....

....

....

حضرت عثمان رحمہ اللہ کے حق میں ہم نے یہ عذر پیش کیا ہے کہ حالات نے خلافت کو ان کے پاس دیر سے پہنچایا - اس وقت اُن کا حال یہ تھا کہ اُموی لوگ ان کے گرد جمع تھے - عمر اسّی سال کے لگ بھگ تھی - قویٰ ضعیف ہو چکے تھے اور بڑھاپا چھا چکا تھا - ان کی پوزیشن بعینہ وہ تھی جو ان کے رفیق، حضرت علیؓ بن ابی طالب نے بیان کی ہے کہ "اگر میں اپنے گھر میں بیٹھ رہوں تو وہ کہیں گے کہ تو نے مجھے، میرے رشتہ کو اور میرے حقوق کو فراموش کر دیا - اور اگر میں ان سے گفتگو کرتا ہوں تو وہ کرتے وہی ہیں جو خود چاہتے ہیں - مروان ان سے جو چاہتا ہے کراتا رہتا ہے - رسول اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھانے اور بوڑھے ہو چکنے کے بعد اب وہ پوری طرح اس کے قابو میں چلے گئے ہیں، جدھر چاہے انھیں لے جائے"

درحقیقت حالات خراب تھے - خلیفہ ثالث کے بڑھاپے کے زمانہ میں اس ابھرتے ہوئے دین کے اُموی گروہ کے ہاتھ میں چلے جانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے ماحول میں اس کی عملی روایات اتنے طویل عرصہ اس کی حقیقی نظری تعلیمات پر نہیں قائم رہ سکیں - کہ پھر ان کا بدلنا مشکل ہو جاتا -

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

یہ رائے تاریخ میں فرد کے عمل (Role) کے بارے میں کسی مبالغہ آمیز تصور پر مبنی نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ خلیفۂ ثالث نے اموال کی تقسیم، مروان سے مشورے لینے اور بڑے بڑے عہدوں پر بنو امیہ کے افراد کا تقرر عمل میں لانے کا جو طریقہ اختیار کر رکھا تھا ...... اس نے عام حالات پر دور رس اثرات مرتب کیے، جس سے تاریخ کا رخ بدل گیا۔ لہٰذا معاملہ صرف کسی فرد کے عمل کا نہیں، بلکہ ایسے حالات پیدا کر دینے کا ہے جو اپنا وزن رکھتے تھے اور جنھوں نے تاریخ پر ایک خاص اثر ڈالا۔

حضرت عثمانؓ کے بعد

حضرت عثمانؓ اپنے پروردگار کی آغوش رحمت میں جا بسے، وہ گئے تو اموی سلطنت عملاً قائم ہو چکی تھی۔ اور اس کے اسباب خود انھوں نے فراہم کیے تھے۔ ساری مملکت بالخصوص شام میں ان کو قدم جمانے کا موقع دیا۔ آپ نے بنو امیہ کے اپنے اصولوں کو جو اسلامی روح کے منافی تھے، مثلاً، غنیمت، منافع اور دوسری طرح کے اموال کو اپنی ذات کے لیے مخصوص کر لینا بھائی چارہ، ایثار، اور کفالت باہمی سے بے پروائی برتنا وغیرہ ...... کار فرما ہونے کا موقع دیا۔ اس چیز نے ملت اسلامیہ کے اندر دینی روح کو بہت کمزور کر دیا۔ وہ جذبات بھی کم اہم نہیں جو رعیت کے دل میں کبھی بجا طور پر اور کبھی بے جا طور پر ان باتوں کے رد عمل میں پیدا ہوئے کہ خلیفہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھتا ہے، انھیں لاکھوں کی رقمیں انعام میں دیتا ہے، رسول اللہ کے دشمنوں کو والی مقرر کرنے کے لیے آپؐ کے صحابیوں کو معزول کر دیتا ہے، اور ابو ذر جیسے لوگوں پر صرف اس لیے سختی کرتا ہے کہ وہ مال کو جمع کر کے خزانوں میں رکھنے کی اور اس عیش پرستی کی مخالفت کرتے تھے جس میں اہل ثروت ڈوبے ہوئے تھے۔ ابو ذر نے اس انفاق، حسن سلوک، اور پاکبازی کی دعوت بلند کی جس کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت دی تھی۔ اس قسم کے جذبات جب عام ہو جاتے ہیں تو ان کا قدرتی نتیجہ، صحیح یا غلط، بہر حال یہی ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں کے اندر بغاوت کا مادہ ابھرنے لگے اور کچھ کے اندر انحطاط پیدا ہو جائے۔ جن لوگوں کے دلوں میں دین کی روح گھر کر چکی ہوتی ہے وہ ان باتوں پر خاموشی کو گناہ سمجھنے لگتے ہیں اور ان کے خلاف جذبات ان کو بغاوت پر ابھارتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے اسلام کو محض ایک لبادہ کے طور پر

اوڑھ رکھا ہوتا ہے، جن کو دنیا کی ہوس اپنے پیچھے دوڑاتی رہتی ہے، جو ہر وقت ہوا کے رُخ کے ساتھ اپنا رُخ بدلنے کے لیے تیار رہتے ہیں، ان کے مزاج بگڑ جاتے ہیں اور بدعنوانیوں کی طرف جھک جاتے ہیں۔ حضرت عثمان کے آخری زمانہ میں یہی صورت حال پیش آچکی تھی۔

جب حضرت علیؓ مسند خلافت پر آئے تو اصلاح حال کوئی آسان کام نہ رہ گیا تھا۔ عثمانؓ کے عہد میں جن لوگوں نے نفع اندوزیاں کی تھیں، خاص کر بنو اُمیہ نے اچھی طرح یہ جان لیا تھا کہ علیؓ ان کے معاملہ میں چپکے نہ بیٹھیں گے۔ اپنے مصالح کے تحت وہ قدرتی طور پر معاویہ کی طرف مائل ہو گئے۔ اگر علیؓ، عمرؓ کے بعد ہی آگے ہوتے تو ان لوگوں کے اس طرح چالنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اس وقت معاویہ کی طاقت نہ تو خلافت کے مقابلہ میں ٹھیر سکتی تھی نہ اس دینی روح کے مقابلہ میں جو دلوں میں موجود تھی۔ اس وقت معاویہ کو خلیفہ کے خلاف خروج کے خطرناک اقدام کی جرأت ہی نہ ہوتی۔ دراصل یہ خلافت عثمانی کے تیرہ سال تھے جنھوں نے ان کے لیے مال و دولت، فوج، اور شام کے چاروں علاقوں میں حکومت کی طاقتوں کو یکجا کر کے معاویہ کو معاویہ بنا دیا۔

علیؓ یہ مشن لے کر اُٹھے کہ حکام اور عامۃ الناس کو ایک بار پھر اسلام کے اصلِ تصور حکمرانی کا حامل بنائیں۔ آپ کا حال یہ تھا کہ آپ کی بیوی اپنے ہاتھوں سے جو پیستی تھیں اور وہی آپ کی غذا تھی۔ ایک بار جو کی ایک بوری پر مہر کر رہے تھے، فرمایا: "میں اپنے پیٹ میں صرف وہی چیز داخل کرنا پسند کرتا ہوں جسے میں جانتا ہوں (کہ حلال و طیب ہے)" کبھی ایسا بھی ہوا کہ آپ کو کپڑا اور کھانا خریدنے کے لیے اپنی تلوار فروخت کر دینی پڑی۔ کوفہ میں قصر ابیض میں قیام کرنا نہیں پسند فرمایا بلکہ ان جھونپڑوں کو ترجیح دی جن میں غریب لوگ رہا کرتے تھے۔ آپ کی طرزِ معیشت کا اندازہ اس روایت سے ہو سکتا ہے جو آپ کی بابت نصر بن منصور نے عقبہ بن علقمہ سے روایت کرتے ہوئے بیان کی ہے، کہا ہے: "میں علی علیہ السلام کے پاس گیا تو ان کے سامنے کھٹا دودھ جس کی بُو سے مجھے تکلیف ہو رہی تھی، اور روٹی کا سوکھا ٹکڑا رکھا ہوا تھا۔ میں نے کہا: "امیر المومنین! کیا آپ ایسی چیزیں کھاتے ہیں؟" آپ نے جواب دیا: ابوالجنوب، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ روکھا سوکھا کھاتے اور اس سے موٹا کپڑا پہنتے تھے (آپ نے اپنے لباس کی طرف اشارہ کیا)

اگر میں ان کی روش پر نہ چلوں تو اندیشہ ہے کہ ان کا ساتھ نہ نصیب ہو۔ اسی طرح ہارون ابن عنترہ نے اپنے باپ سے آپ کے بارے میں روایت کی ہے کہ: میں خورنق میں علیؓ کے پاس گیا۔ جاڑے کا موسم تھا اور ان کے بدن پر صرف ایک پھٹا پرانا قطیفہ (مخملی لبادہ) تھا جس میں وہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ میں نے عرض کیا: امیرالمومنین، اللہ نے آپ اور آپ کے گھروالوں کے لیے اس مال میں کچھ حق مقرر کیا ہے اور آپ اپنے ساتھ یہ برتاؤ کر رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: "واللہ میں تمھارا کوئی نقصان نہیں کروں گا، یہ میرا وہی قطیفہ جسے میں مدینہ سے لایا تھا۔"

ایسا نہیں تھا کہ حضرت علی اپنے اور اپنے گھروالوں کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے وقت اس حقیقت سے ناآشنا رہے ہوں کہ دین اس سے بہت زیادہ کی اجازت دیتا ہے۔ وہ یہ ضروری نہیں قرار دیتا کہ اپنے کو ہر طرح کی آسائش سے محروم رکھ کر روکھے سوکھے اور موٹے جھوٹے پر قناعت کرتے ہوئے ایک اہدانہ زندگی گذار دی جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت بھی مسلمانوں کے ایک عام فرد کی حیثیت میں بیت المال سے ان کا حصہ اِس سے کئی گنا زیادہ تھا جو وہ لے رہے تھے۔ نیز یہ بھی کہ بحیثیت ایک حاکم کے جو عوام کی خدمت کے لیے وقف ہو ان کا حصہ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ وہ چاہتے تو اتنا لے سکتے تھے جتنا کہ عمرؓ نے بعض ممالک کے والیوں کے لیے مقرر کیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے جب عمار ابن یاسر کو کوفہ کا والی بنایا تو ان کے اور ان کے معاونین کے لیے چھ سو درہم ماہانہ مقرر کیے، عام افراد کی طرح جو عطا ان کے حصہ میں آتی تھی وہ علیحدہ، نیز روزانہ آدھی بکری اور آدھی بوری آٹا دیا جاتا تھا۔ اس طرح آپ نے عبداللہ ابن مسعود کو کوفہ میں لوگوں کی تعلیم اور بیت المال کی نگرانی پر مامور کیا تو سو درہم ماہانہ اور چوتھائی بکری روزانہ مقرر کیا۔ عثمان ابن حنیف کے لیے، اس سالانہ عطا کے علاوہ جو پانچ ہزار درہم کے بقدر تھی، چوتھائی بکری روزانہ اور ڈیڑھ سو درہم ماہانہ مقرر کیا۔

علیؓ نے اپنے ساتھ جو کچھ کیا وہ ان باتوں سے ناواقف رہتے ہوئے نہیں کیا۔ دراصل وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ حاکم نمونہ بنتا ہے، اور اس پر شک کی بھی بہت گنجائش ہوتی ہے۔ چونکہ خزانہ عامہ اس کے تحت ہوتا ہے لہٰذا اس پر اس میں خرد برد کا شبہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنے والیوں اور عام رعایا کے لیے احتیاط و پرہیزگاری میں نمونہ بنتا ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے نفس کو ابوبکرؓ اور عمرؓ کی عزیمتوں کا پابند بنایا عثمانؓ بن عفان کی رخصتوں کا خوگر نہیں بنایا۔ یہ ابھرتا ہوا دین اور یہ نیا نظام ان عزیمتوں کے محتاج تھے جن کو (اطاعت دینی کے جذبہ سے) لوگ بطور خود اختیار کر لیں، انہیں ان رخصتوں کی ضرورت نہ تھی جن کو دین نے

مباح قرار دیا ہے۔ جو لوگ اللہ کے دین پر رسول اللہ کے نائب مقرر ہوئے تھے ان کے لیے یہ اونچا معیار ہی موزوں تھا۔ رخصتوں کی طرف تو عوام خود بخود جاتے ہیں ان کو قوانین کے ذریعہ نافذ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی البتہ عزیمتوں کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے، کہ نمونے سامنے لائے جائیں اور مثالیں قائم کی جائیں کیوں کہ وہ اپنے اپنانے والوں پر مشقت اور کشمکش کا بار ڈالتی ہیں۔

حضرت علیؓ اس بات کی کوشش کرتے رہے کہ نظام حکومت کو دوبارہ اُس سانچے میں ڈھالیں جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آنے والے دونوں خلفاء نے اسے ڈھالا تھا۔ انہوں نے اپنی زرہ ایک عیسائی کے پاس پائی۔ اُسے لے کر اپنے قاضی شریح کے پاس گئے اور رعایا کے ایک عام فرد کی طرح اس کے خلاف مقدمہ پیش کیا۔ فرمایا "یہ زرہ میری ہے اور میں نے نہ اسے فروخت کیا ہے نہ ہبہ کیا ہے۔" شریح نے عیسائی سے دریافت کیا کہ امیر المومنین جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی بابت تمہیں کیا کہنا ہے اس عیسائی نے کہا: "زرہ تو یقیناً میری ہے، مگر امیر المومنیں بھی میرے نزدیک جھوٹے آدمی نہیں ہیں شریح نے علیؓ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا: امیر المومنین! کوئی ثبوت ہے؟" حضرت علیؓ ہنس دیے۔ اور فرمایا: شریح نے ٹھیک کہا: میرے پاس ثبوت تو ہے نہیں۔ چنانچہ قاضی نے یہ فیصلہ کیا کہ زرہ عیسائی کو دے دی جائے۔ وہ اسے لے کر جانے لگا اور "امیر المومنین" اسے دیکھتے رہے ---- چند قدم جا کر وہ عیسائی واپس آیا اور کہنے لگا: میں تو اب یہ گواہی دیتا ہوں کہ یہ انبیاء کے احکام ہیں۔ امیر المومنین مجھے اپنے قاضی کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ اُن کے خلاف فیصلہ دیتا ہے! اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ امیر المومنین خدا کی قسم یہ زرہ آپ کی ہے۔ جب آپ نے صفین کی طرف کوچ کیا تو میں لشکر کے پیچھے ہو لیا۔ یہ زرہ آپ کے بادامی رنگ والے اونٹ پر سے نکلی ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا کہ جب تم ایمان لے آئے تو اب یہ تمہاری ہے۔" [1]

آپ نے جو دستور مقرر کیا تھا وہ وہی تھا جسے آپ نے بیعت کے بعد اپنے خطبہ میں بیان کیا تھا:۔

"لوگو! میں تم ہی میں کا ایک آدمی ہوں۔ جو حقوق تمہارے لیے ہیں وہی میرے لیے بھی ہیں، اور جو ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں وہ مجھ پر بھی عائد ہوتی ہیں، میں تمہیں تمہارے نبی کے طریقہ پر چلاؤں گا اور مجھے جن باتوں کے نفاذ کا حکم دیا گیا ہے انھیں تم پر نافذ کر دوں گا۔

---

[1] عبقریۃ الامام - استاذ عباس محمود عقاد۔

سن لو، عثمانؓ نے جتنی جاگیریں عطا کی ہیں اور اللہ کے مال میں سے جتنا مال بھی لوگوں کو انعام واکرام کے طور پر دیا ہے وہ بیت المال میں واپس لایا جائے گا کیونکہ حقیقت کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی۔ اگر میں نے یہ دیکھا کہ اس مال کے ذریعہ عورتوں سے شادی کی جاچکی ہے یا لونڈیاں خریدی جاچکی ہیں یا اس مال کو مختلف ملکوں میں پھیلایا جاچکا ہے تو بھی میں اسے واپس لاؤں گا کیونکہ عدل میں بڑی وسعت ہے اور جس کے لیے حق تنگ ثابت ہوا اس کے لیے ظلم وجور اور زیادہ تنگ ہوگا۔

"لوگو! آگاہ رہو، ایسا نہ ہو کہ کل کو تم میں سے وہ لوگ جن پر دُنیا چھاگئی، اور وہ عمارتوں کے مالک بنے، جن لوگوں نے نہریں نکالیں، گھوڑوں پر سواری کی، غلام چھوکروں کو خدمت گار بنایا، انہیں جب میں اس عیش وعشرت سے محروم کردوں اور ان کے اصل حقوق کی حدوں میں واپس لاؤں تو وہ کہنے لگیں کہ ابن ابی طالب نے ہمیں ہمارے حقوق سے محروم کردیا۔ سنو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی مہاجرین وانصار میں سے جو کوئی بھی یہ سمجھتا ہے کہ صحبت رسول کی وجہ سے اس کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہے وہ جان لے کہ یہ فضیلت کل کو اللہ کے حضور کام آئے گی اور وہی اس کا اجر وثواب عطا کرے گا۔ آگاہ رہو کہ جس شخص نے بھی خدا اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہی، ہماری ملت کی تصدیق کی، ہمارے دین میں داخل ہوا، اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا وہ اسلام کے دیئے ہوئے حقوق کا مستحق اور اس کی مقرر کردہ حدود کا پابند ہوگیا۔ تم سب اللہ کے بندے ہو، اور یہ مال اللہ کا مال ہے، یہ تمہارے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔ اس کے سلسلہ میں کسی کو کسی پر کوئی فضیلت نہیں حاصل ہے۔ متقی لوگوں کے لیے اللہ کے پاس بہترین جزا ہے۔"

یہ بات بالکل فطری تھی کہ نفع اندوز لوگ حضرت علی سے خوش نہ رہیں اور مساوات کے قانون سے ان لوگوں کو تشفی نہ ہو جو امتیازی سلوک کے عادی اور خود کو دوسروں پر ترجیح دینے کے خوگر ہوچکے تھے یہ لوگ بالآخر دوسرے کیمپ سے جا ملے۔ یہ اُمیّہ کا کیمپ تھا جہاں اُن کو اپنی اغراض کی تکمیل، اور انفرادی بہتری اور حکمرانی دونوں میں عدل، حق پرستی، اور پاکیٔ ضمیر کے ہر عنصر کی پامالی کے مواقع مل سکتے تھے۔

جن لوگوں کو معاویہ کے اندر ایسی ڈپلومیسی، ہوشیاری اور مہارت نظر آتی ہے جو علیؓ کے اندر نہیں پائی جاتی، اور جو اس بات کو معاویہ کے بالآخر فتح یاب ہونے کی اصل وجہ قرار دیتے ہیں وہ حالات کا مطالعہ کرتے ہیں غلطی کرتے ہیں اور حضرت علیؓ کی حقیقی قدر اور ان کے اصل فرض کا صحیح اندازہ نہیں کرپاتے۔

حضرت علیؓ کا پہلا اور آخری فریضہ یہ تھا کہ اسلامی روایات کو ان کی حقیقی قوت واپس دلائیں اور دین میں اس کی اصل روح دوبارہ پھونکیں، اس میل کچیل سے اس روح کو پاک کریں جو اس پر عثمانؓ کے بڑھاپے اور کمزوری کے زمانہ میں اُمیہ کے ہاتھوں آگیا تھا۔

اگر وہ معاویہ کے طور و طریق اختیار کرتے تو ان کا مشن ہی ناکام رہتا اور اس دین میں فی نفسہ اس بات کو کوئی قیمت حاصل نہ ہوتی کہ انھوں نے خلافت کی جنگ اپنے لیے جیت لی - ایک معاویہ کی جگہ دوسرے معاویہ کے آجانے کا حاصل کیا ہوتا؟ علیؓ یا تو علیؓ باقی رہیں یا خلافت ان کے پاس سے چلی جائے۔ بلکہ اس کے ساتھ ان کی جان بھی چلی جائے تو کیا پروا - یہ وہ صحیح فہم تھا جو ان کے ذہن سے ایک لمحہ کے لیے بھی غائب نہیں ہوا - کرم اللہ وجہہ - فرماتے ہیں" خدا کی قسم معاویہ مجھ سے زیادہ چالاک نہیں مگر وہ دھوکے دیتے ہیں اور کھلی کھلی نافرمانیاں کرتے ہیں - اگر دھوکہ دہی ناپسند نہ ہوتی تو میں سب سے زیادہ چالاک ہوتا"

علیؓ اپنے رب کو پیارے ہوئے اور بنو اُمیہ کا دور آیا - اگر امیہ کے آگے عثمان رضی اللہ عنہ کا ایمان ان کی پرہیزگاری اور ان کی رقیق القلبی ایک روک بن کر کھڑی تھی تو اب یہ دیوار ڈھ گئی -

نتیجتاً وہ المیہ رونما ہوا جس نے اسلام کی کمر توڑ دی -

اس کے بعد اسلام زمین پر پھیلتا رہا مگر اس سے کسی کو اختلاف نہیں اس کی روح ٹھٹھر کر رہ گئی جب روح کمزور پڑ گئی تو اس خطۂ زمین کی کیا وقعت - اگر خود اس دین کے مزاج میں ایک قوت نہ پوشیدہ ہوتی اور اس کی روحانی طاقت میں فیض رسانی کی بے پناہ صلاحیت نہ ہوتی تو امیہ کا دور اس کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینے کے لیے کافی تھا - مگر اس کی روح مقابلہ کرتی رہی اور قوت پکڑتی رہی، اور آج بھی اس میں کشمکش اور فتح یابی کی مخفی قوت باقی ہے۔

امیہ کے زمانہ سے مسلمانوں کے بیت المال کے حدود بہت وسیع ہو گئے اور وہ بادشاہوں ان کے خوشامدیوں اور حاشیہ نشینوں کے لیے مال غنیمت بن کر رہ گیا - اسلامی عدل کی بنیادیں منہدم ہو گئیں حکمراں طبقہ مخصوص امتیازات کا مالک بن بیٹھا، اس کے متوسلین کو منافع ملنے لگے اور اس کے حاشیہ نشینوں کو نذرانے، غرض یہ کہ خلافت بادشاہت اور وہ بھی جابر بادشاہت میں بدل گئی جیسا کہ اس کی بابت صفائے روحانی کے ایک دور رس لمحہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا -

اب ہم خوشامدیوں، گویوں، اور لہو ولعب کرنے والوں کو انعام واکرام دینے کی خبریں سننے لگے، چنانچہ ایک اموی بادشاہ نے معبد کو بارہ ہزار دینار دیئے۔ اور ایک عباسی بادشاہ ہارون الرشید نے اسمٰعیل بن جامع نامی مغنی کو محض ایک راگ پر چار ہزار دینار عطا کیے اور ساتھ ہی ایک عمدہ ساز وسامان اور نقش ونگار والا مکان بھی دیا..... حالات کا بہاؤ اسی رُخ پر جاری رہا، کبھی کبھی تھوری دیر کے لیے یہ دھارا رکتا اور پھر بہنے لگتا۔

عمر ابن عبد العزیز

اب عمر بن عبد العزیز کے عہد کا ذکر ضروری ہے۔ یہ عہد عہدِ خلافت کا بقیہ تھا۔ یہ ایسی تیز روشنی تھی جس نے پورا راستہ روشن کر دیا۔ آپ نے اپنے عہد کا افتتاح غصب کردہ حکومت کو اس کے اوّلین حق دار یعنی امت اسلامیہ کو واپس کر کے کیا۔ کیونکہ ضروری ہے کہ اُمت اسلامیہ آزادانہ طور پر راضی خوشی اپنا امام منتخب کرے نہ کہ فوج کے طاقت یا وراثت کے ذریعہ ..... آپ منبر پر آئے اور یہ فرمایا۔

"لوگو مجھے اس ذمہ داری کی آزمائش میں میری رائے لیے بغیر، بلا طلب اور بغیر مسلمانوں سے مشورہ کیے ہوئے مبتلا کر دیا گیا۔ میری بیعت کا جو قلادہ تمھاری گردنوں میں پڑا ہوا ہے اُسے میں خود الگ کرتا ہوں اور تم خود کسی کا انتخاب کر لو۔"

لوگ پکار اٹھے: امیر المؤمنین ہم آپ ہی کو منتخب کرتے ہیں۔ آپ کی امارت پر ہم سب راضی ہیں۔ اللہ آپ کی امارت کو مبارک کرے، آپ صاحب امر رہیے۔ اس طرح آپ نے امارت کے معاملہ میں اصل طریقہ کو پھر سے جاری کیا کیونکہ بغیر مشورے اور رضامندی کے امارت نہیں منعقد ہو سکتی۔

پھر آپ نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"لوگو! مجھ سے پہلے کچھ حکمراں ایسے گذرے ہیں جن کی محبت کو تم نے صرف اس لیے نباہا کہ اس ظلم کو دفع کر سکو جو بصورت دیگر وہ تم پر کرتے۔ آگاہ رہو کہ جب خالق کی نافرمانی ہو رہی ہو تو مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیے۔ جس نے خود اللہ کی اطاعت کی اس کی اطاعت کرنا واجب ہو گیا۔ مگر جس نے اللہ کی نافرمانی کی اس کی اطاعت نہیں کی جانی چاہیے جب تک میں تمہارے معاملہ میں اللہ کی اطاعت کرتا رہوں تم بھی میری اطاعت کرو مگر جب میں اللہ کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت نہیں واجب۔"

عنان اقتدار سنبھالتے ہی انھوں نے ظلماً لی ہوئی املاک کی واپسی کی طرف توجہ کی۔ اس کی ابتداء خود

اپنی ذات سے کی۔ فرمایا: مناسب ہے کہ اپنے پہلے کسی اور سے اس کی ابتدا نہ کروں، چنانچہ آپ نے اپنے تحت جو اراضی اور دوسرے سامان تھے ان کا جائزہ لیا تو سب کے سب آپ کے قبضہ سے نکل گئے، یہاں تک کہ ہاتھ میں ایک انگوٹھی تھی، اس کے نگ کو دیکھا تو کہا: اسے ولید نے مغربی علاقوں سے آنے والے اموال میں سے بغیر کسی حق کے مجھے دے دیا تھا، چنانچہ اسے واپس کر دیا۔ آپ کے پاس خلفی جاگیریں تھیں وہ سب آپ نے واپس کر دیں۔ آپ کے پاس یمامہ میں چند جاگیریں، یمن میں مکیدس اور جبل الورس اور فدک تھے۔ ان سب کو آپ نے چھوڑ دیا اور مسلمانوں کو واپس کر دیا، صرف سویداء میں ایک چشمہ کو اپنے پاس باقی رکھا جسے آپ نے اپنی عطاء کی رقم سے کھدوایا تھا۔ اس کے منافع ہر سال آپ کے پاس آتے رہتے تھے، جو کم و بیش ڈیڑھ سو دینار رہتے تھے۔

جب آپ نے طے کر لیا کہ آپ کے پاس جو کچھ ہے اسے واپس کر دیں گے تو حکم دیا اور لوگوں میں منادی کر دی گئی کہ "الصلاۃ جامعۃ" آپ منبر پر تشریف لائے، اللہ کی حمد و ثنا بیان کی پھر فرمایا:۔

"امابعد! ان لوگوں نے ہمیں ایسی چیزیں عطا کی تھیں جن کا لینا ہمارے لیے چنداں مناسب نہ تھا نہ ہی اُن کا دینا مناسب تھا۔ یہ اموال میرے قبضہ میں آچکے تھے اور اللہ کے سوا کوئی مجھ سے اُن کا محاسبہ کرنے والا نہ تھا۔ آگاہ رہو کہ میں نے اس طرح کے سارے عطایا کی واپسی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی ابتداء میں اپنی ذات اور اپنے گھر والوں سے کرتا ہوں۔

مزاحم! تم پڑھنا شروع کر دو۔"

اس سے قبل ایک تھیلی حاضر کی جا چکی تھی جس میں متعلقہ کاغذات تھے۔ مزاحم نے ایک ایک تحریر پڑھنا شروع کی پھر عمر اسے لے لیتے، ان کے ہاتھ میں ایک قینچی تھی جس سے وہ اسے تراشتے جاتے یہاں تک کہ ایک کاغذ بھی ایسا نہ بچا جسے آپ نے چاک نہ کر ڈالا ہو اس کے بعد اپنی بیوی فاطمہ بنت عبد الملک بن مروان کا معاملہ ہاتھ میں لیا۔ ان کے پاس ایک نادر ہیرا تھا جو ان کو ان کے باپ نے دلوایا تھا۔ آپ نے ان سے کہا: تم اپنا زیور بیت المال میں واپس کر دو ورنہ مجھے اپنے سے جدا ہو جانے کی اجازت دو، دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لو۔ مجھے یہ بات نہیں گوارا کہ میں اور وہ ایک گھر میں رہیں۔ انھوں نے کہا: "امیر المومنین، میں آپ کا انتخاب کرتی ہوں، اس ایک ہیرے کی کیا حقیقت، اس سے کئی گنا زیور ہوتا تو بھی میں آپ ہی کو ترجیح دیتی۔" چنانچہ آپ کے حکم سے اسے بیت المال میں داخل

کر دیا گیا ۔ جب عمر کا انتقال ہو گیا اور یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا تو اس نے اپنی بہن فاطمہ سے کہا کہ اگر تم چاہو تو میں وہ ہیرا تمہیں واپس کر دوں ۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نہیں چاہتی ۔ عمر کی زندگی میں تو میں نے اسے خوشی خوشی دے دیا اور اب ان کی وفات کے بعد اسے واپس لے لوں ، خدا کی قسم ایسا نہیں ہوگا ۔ جب اس نے یہ اصرار دیکھا تو تو اسے ان کے گھر والوں اور بچوں میں تقسیم کر دیا ۔

عمر نے صرف یہی نہیں کیا کہ اپنے پاس جتنا ناحق کا مال تھا وہ واپس کر دیا بلکہ مورخین لکھتے ہیں کہ وہ بیت المال سے اپنے لیے کچھ بھی نہ لیتے تھے اور فئے کے مال میں سے اپنی ذات پر ایک درہم بھی نہیں خرچ کرتے تھے ، حالانکہ عمر بن الخطاب رضؓ نے اس میں سے اپنے لیے دو درہم روزانہ مقرر کیا تھا ۔ چنانچہ عمر بن عبد العزیز سے کہا گیا کہ آپ اتنا ہی لے لیا کریں جتنا عمرؓ لیتے تھے تو بھی مناسب ہوتا مگر انھوں نے کہا کہ عمر بن الخطاب کے پاس ذاتی مال کچھ نہیں تھا اور میرا حال یہ ہے کہ میرا ذاتی مال ہی میرے لیے کافی ہو جاتا ہے ۔"

آپ نے بنی مروان کو اس بات پر آمادہ کیا کہ ان کے پاس جو اموال ناحق تھے انھیں ان کے اصل مالکوں کو واپس کر دیں ، روایت ہے کہ حمص کا ایک ذمی آیا تھا اور اس نے کہا امیر المومنین ، میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں ۔ آپ نے کہا کس معاملہ میں ، اس نے بتایا کہ عباس ابن ولید بن عبد الملک نے میری زمین غصب کر لی ہے ۔ عباس وہیں پر بیٹھا ہوا تھا ۔ آپ اس سے کہا ، عباس کیا کہتے ہو ؟ ذمی ایک کیا کہتے ہو ؟ اس نے کہا امیر المومنین میں آپ سے کتاب اللہ عزوجل کے مطابق فیصلہ کا مطالبہ کرتا ہوں ۔ عمر نے کہا : " ہاں " ولید ابن عبد الملک کی تحریر کے مقابلہ میں اللہ کا فرمان زیادہ واجب العمل ہے ۔ عباس ! تم اِس کو اِس کی چیز واپس کر دو " چنانچہ انھوں نے وہ زمین اسے واپس کر دی ۔"

ولید بن عبد الملک کا ایک لڑکا تھا جس کا نام رَوح تھا ۔ اس نے بادیہ میں پرورش پائی تھی اور بالکل اعرابی معلوم ہوتا تھا ۔ کچھ لوگ عمر کے پاس حمص میں واقع چند دوکانوں کی بابت مقدمہ لے کر آئے ۔ یہ دوکانیں دراصل ان لوگوں کی تھیں مگر روح کے باپ ولید نے اُس کے نام لکھ دی تھیں ۔ عمر نے اس سے کہا کہ ان کی دوکانیں واپس کر دو ۔ رَوح نے جواب دیا کہ دوکانیں ولید کی دستاویز کے مطابق میری ملکیت ہیں ، آپ نے جواب دیا کہ ولید کی دستاویز تمہارے کام نہیں آئے گی ، دوکانیں ان لوگوں کی ہیں ، اس بات پر ثبوت فراہم ہو چکا ہے اب تم ان کی دوکانیں ان کے حوالے کر دو ۔ پھر روح اور حمص کا ایک آدمی اٹھ کر وہاں سے واپس آنے لگے ۔ راستہ میں رَوح نے حمصی کو دھمکی دی ، وہ لوٹ کر

عمرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ امیر المومنین، خدا کی قسم وہ مجھے دھمکی دے رہا ہے۔ عمرؓ نے کعب ابن حامد سے جوان کے محافظ دستوں کے سالار تھے حکم دیا کہ روح کے پاس جاؤ اگر وہ دوکانیں اس کے حوالے کردے تو خیر ورنہ اس کا سر کاٹ کر میرے پاس لاؤ۔ یہ بات سن کر روح کا ایک بہی خواہ دربار سے باہر آیا اور روح کو عمرؓ کے حکم سے باخبر کر دیا۔ روح کے ہوش اُڑ گئے۔ کعب اس کے پاس اس حال میں گئے کہ تلوار کو ایک بالشت کے بقدر نیام سے باہر کھینچ چکے تھے۔ انھوں نے اس سے کہا کہ چلو اور دوکانیں خالی کردو۔ اس نے کہا: ہاں اور جاکر اس کی دوکانیں خالی کرکے اس کے حوالہ کردیں۔

لوگ پے درپے ان کے سامنے ظلم و غصب کے معاملات پیش کرتے رہے۔ ظلماً لی ہوئی املاک سے متعلق کوئی معاملہ ایسا نہ تھا جس کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہو اور آپ نے جائداد واپس نہ دلوائی ہو۔ خواہ وہ آپ کے قبضہ میں ہی ہو یا کسی دوسرے کے قبضہ میں۔ آپ نے بنی مروان وغیرہ سے وہ سارے اموال واپس لے لیے جو ظلم وجور کے ذریعہ ان کو منتقل ہوئے تھے۔ آپ بغیر قطعی ثبوت کے بھی ان مظالم کی تلافی کر دیتے۔ اس سلسلہ میں آپ معمولی ثبوت کو بھی کافی سمجھتے۔ جب آپ کو اندازہ ہو جاتا کہ کسی آدمی کے ساتھ زیادتی کی گئی ہے تو اس کی ملکیت واپس دلوانے کا فیصلہ کر دیتے۔ آپ ان لوگوں پر پختہ ثبوت فراہم کرنے کی ذمہ داری اس لیے نہیں ڈالتے تھے کہ آپ کو بخوبی معلوم تھا کہ آپ سے پہلے حکمراں لوگوں کے ساتھ یہ زیادتیاں کرتے رہے ہیں۔ روایت کی جاتی ہے کہ ظلماً لیے ہوئے اموال کی واپسی میں آپ نے عراق کا بیت المال خالی کر دیا یہاں تک کہ شام سے وہاں مال لے جانے کی ضرورت پڑ گئی۔

سلیمان بن عبد الملک نے عنبسہ بن سعید ابن العاص کو، جو اموی خاندان کے ایک فرد تھے بیس ہزار دینار عطا کرنے کا حکم دیا۔ حکمنامہ مختلف دفاتر میں گھومتا ہوا بالآخر دفتر مُہر میں پہنچا اور اب صرف قبضہ باقی رہ گیا۔ مگر قبل اس کے کہ یہ اسے عملاً وصول کرسکیں سلیمان کا انتقال ہو گیا۔ عنبسہ عمر بن عبد العزیز کے دوست تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ روانہ ہوئے کہ عمرؓ سے سلیمان کے عطیہ کے بارے میں بات کرلیں۔ آئے تو دیکھا کہ ان کے دروازہ پر بنو امیہ حاضر ہیں اور اپنے معاملات پر گفتگو کی خاطر داخلہ کی اجازت کے منتظر ہیں۔ جب انھوں نے عنبسہ کو دیکھا تو بولے کہ بہتر ہوگا کہ ہم خود گفتگو کرنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ وہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ عنبسہ آپ کے پاس گئے اور کہا کہ امیر المومنین! امیر المومنین سلیمان نے مجھے بیس ہزار

دینار دینے کا حکم جاری کیا تھا، یہ حکم مہر کے دفتر میں پہنچ گیا تھا اور صرف وصولی باقی رہ گئی تھی کہ ان کا انتقال ہو گیا اور میرے خیال میں آپ اس کارِ احسان کی تکمیل بدرجۂ اولیٰ فرما دیں گے کیونکہ میرے اور آپ کے درمیان اس سے زیادہ قریبی تعلق ہے جتنا کہ میرے اور امیر المومنین سلیمان کے درمیان تھا۔ عمرؓ نے پوچھا کہ وہ رقم کتنی ہے؟ انھوں نے بتایا کہ بیس ہزار دینار۔ عمر ابن عبد العزیز نے کہا کہ بیس ہزار دینار نو مسلمانوں کے چار ہزار خاندانوں کے لیے کافی ہوگا، اور میں اسے ایک فرد کو دے دوں؟ خدا کی قسم مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ عنبسہ کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے وہ تحریر اٹھا کر پھینک دی جس میں چک مرقوم تھا۔ عمر نے کہا کہ تحریر اپنے پاس رکھنے میں حرج نہیں، ممکن ہے تم پر کوئی ایسا حکمراں آئے جو اس مال کے سلسلہ میں مجھ سے زیادہ جری ہو اور اس چک کی تعمیل کرادے، چنانچہ میں نے اسے اُٹھا لیا اور باہر نکل کر بنو امیہ کے پاس آیا، میں نے انھیں بتایا کہ اس سلسلہ میں کیا ہوا۔ وہ بول اُٹھے کہ اس کے بعد تو کوئی اُمید باقی نہیں رہ جاتی، تم جاکر ان سے درخواست کرو کہ ہمیں دوسرے علاقوں میں جا بسنے کی اجازت دے دیں۔ میں آپ کے پاس واپس گیا اور کہا: امیر المومنین، آپ کی قوم کے لوگ دروازے پر کھڑے آپ سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کو جو وظائف پہلے ملا کرتے تھے وہی اب بھی ملتے رہیں۔ عمر نے جواب دیا، بخدا یہ مال میری ملکیت نہیں ہے اور نہ مجھے ایسا کرنے کی کوئی گنجائش نظر آتی ہے۔ میں نے کہا: امیر المومنین ایسی شکل میں وہ آپ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ ان کو مختلف ممالک میں جاکر قسمت آزمائی کرنے کی اجازت دیجیے، آپ نے فرمایا کہ وہ جو چاہیں کریں، میری طرف سے اجازت ہے۔ میں نے کہا، میں بھی یہی کرنے والا ہوں۔ آپ نے کہا، ہاں، تمھیں بھی اجازت ہے مگر میری رائے یہ ہے کہ تم ٹھہرو۔ تمھارے پاس نقد سرمایہ بہت ہے اور میں سلیمان کا ترکہ فروخت کرنے والا ہوں ہو سکتا ہے اس میں سے تم کوئی ایسی چیز خرید سکو جس کے منافع سے تمھارے اس نقصان کی تلافی ہو جائے۔ عنبسہ کہتے ہیں کہ چنانچہ میں وہیں مقیم رہا اور میں نے سلیمان کے ترکہ میں سے ایک لاکھ کا مال خریدا اور اسے عراق لے جاکر دو لاکھ دینار میں فروخت کیا۔ وہ چک بھی میں نے محفوظ رکھا اور عمر کی وفات کے بعد جب یزید بن عبد الملک حکمراں ہوئے تو میں سلیمان کی تحریر ان کے پاس لے گیا اور انھوں نے اس کی تعمیل کرادی۔"

"حضرت عمر بن عبد العزیز نے بنو مروان کو جمع کرکے یہ کہا کہ تمھیں شرف و عزت اور مال و دولت

سب کچھ نصیب ہوا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس اُمّت کی مجموعی دولت کا نصف یا دو تہائی تمہارے ہاتھ میں ہے لہٰذا لوگوں کے جو حقوق تمہارے قبضہ میں ہیں ان کو انھیں واپس کر دو اور مجھے اس بات پر نہ مجبور کرو کہ میں بتمام ناپسندیدگی تم کو ایسی باتوں پر مجبور کروں جو تمہیں ناگوار گذریں، لیکن کسی نے بھی اس کا جواب نہیں دیا۔ آپ نے مطالبہ کیا کہ مجھے جواب دو تو ان میں سے ایک شخص نے کہا، خدا کی قسم ہم ان اموال سے دستبردار نہیں ہوں گے جو کہ ہمیں اپنے آباء سے ملے ہیں۔ ہم اس طرح اپنے بیٹوں کو مفلس بنانا اور اپنے آباء کی ناشکری کرنا نہیں گوارا کر سکتے، تا آنکہ ہمارے سر تن سے جدا ہو جائیں۔ عمر نے کہا: خدا کی قسم اگر مجھے اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ تم میرے خلاف انہی عوام کو ساتھ کر لو گے جن کے لیے میں ان حقوق کا مطالبہ کر رہا ہوں تو میں بہت جلد تم کو کچل کر رکھ دیتا۔ مگر مجھے فتنہ کا خطرہ ہے۔ اگر اللہ نے مجھے باقی رکھا تو انشاء اللہ میں ہر حق دار کو اس کا حق دلا کر دم لوں گا۔" [1]

لیکن آپ اپنی خواہش کے مطابق اتنی زندگی نہ پاسکے کہ سب کے حقوق واپس دلوا سکتے۔ آپ کے بعد وہ لوگ آئے جو اسلام کے طریقہ کو چھوڑ کر اُمیّہ کے طریقہ پر چلے۔ جب بنو عبّاس آئے تو وہ بھی بادشاہ بن کر آئے۔ وہ آئے تو زمین میں فساد عام ہو چکا تھا، لوگ دینی طور طریق سے بہت دور جا چکے تھے، کیونکہ اُمیّہ نے ایک طویل عرصہ تک انھیں دین سے دور رکھا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ عبّاسی حکمران اموی حکمرانوں سے چنداں بہتر نہ تھے۔ وہ بھی اسی طرح کی جابرانہ شہنشاہی تھی۔

بادشاہت

چونکہ یہاں ہم اسلامی حکومت کی نہیں بلکہ حکمرانی کے باب میں اسلامی اسپرٹ کی تاریخ بیان کر رہے ہیں لہٰذا ہم اس روح میں تبدیلی و اضمحلال کے مظاہر سامنے لانے کے لیے بادشاہوں کے عہد کے تین خطبے پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔ خلفاء کے عہد کے جو تین خطبے اوپر گذر چکے ہیں ان سے ان کا موازنہ ان دونوں کے درمیان فرق عظیم کو بخوبی واضح کر دے گا۔

صلح کے بعد معاویہ نے کوفہ میں عوام کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"کوفہ کے باشندو! کیا تمہارا خیال ہے کہ میں نے نماز و زکوٰۃ اور حج کی خاطر تم سے جنگ کی ہے دریں حالیکہ میں بخوبی جانتا تھا کہ تم نماز پڑھتے ہو، زکوٰۃ دیتے ہو، اور حج بھی کرتے ہو۔ نہیں، میں نے تم سے

---

[1] عمر بن عبد العزیز: مصنّفہ استاذ احمد ذکی صفوت۔

اس لیے جنگ کی کہ تم پر اور تمہاری گردنوں پر اپنا حکم چلاؤں۔ اللہ نے تمہاری ناپسندیدگی کے باوجود میری مراد پوری کی۔ آگاہ رہو کہ اس فتنہ میں جو کچھ جانی اور مالی نقصان ہوا اس کا کوئی بدلہ یا معاوضہ نہیں دلوایا جائے گا۔ اور میں نے جتنی شرطیں بھی طے کی تھیں وہ میرے ان دونوں قدموں تلے پامال ہو رہی ہیں"......

.... درایں حالیکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان یہ ہے کہ " وَاَوْفُوا بِالْعَهْدِ، اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا (عہد کی پابندی کرو، بے شک عہد کے بارے میں تم کو جواب دہی کرنی ہوگی) اور وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ (اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو) اللہ تعالیٰ معاہد مشرکین سے کیے جانے والے وعدوں کی تکمیل کو اس پر ترجیح دیتا ہے کہ مسلمان اپنے دینی بھائیوں کی مدد کریں۔

اسی طرح انھوں نے مدینہ والوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"امابعد! خدا کی قسم میں نے امارت تمہاری کسی محبت کے نتیجہ میں نہیں پائی جس کا مجھے علم ہو، نہ تم کو اس پر کوئی خوشی ہوئی، بلکہ میں نے تم سے اس تلوار کے ذریعہ کشمکش کی ہے، تمہاری خاطر میں نے اپنی طبیعت کو ابن ابی قحافہ کے طرز عمل پر آمادہ کرنا چاہا، چاہا کہ وہ عمر کی روش اختیار کرلے، مگر اس نے شدت کے ساتھ ابا کیا، پھر میں نے چاہا کہ وہ عثمان کی توسعات پر ہی راضی ہو جائے مگر وہ اس پر بھی نہیں آمادہ ہوئی۔ لہذا میں نے اسے ایک ایسی راہ پر ڈالا ہے جس میں میرا بھی بھلا ہے اور تمہارا بھی۔ خوش اسلوبی کے ساتھ مل جل کر کھانا پینا ہوگا۔ اگر تم مجھے اپنے میں سب سے بہتر نہیں پاتے تو بھی حکومت کرنے کے لیے تمہارے لیے بہتر ہوں"

منصور عباسی نے ذیل کا خطبہ اس وقت دیا ہے جب کہ اموی سلسلہ حکمرانی کے تصور کو جو شکل دے سکتا تھا دے چکا تھا یہاں تک کہ عباسیوں کے عہد میں یہ تصور بادشاہت کے ایک مقدس اور منجانب اللہ حق ہونے کے تصور میں بدل چکا تھا۔ اس نے کہا:۔

"لوگو! میں اللہ کی زمین پر اس کا سلطان ہوں۔ اس کی تائید اور توفیق سے تم پر حکومت کروں گا۔ میں اس کے مال پر اس کی طرف سے مقرر کیا ہوا محافظ ہوں۔ اس کی مشیت اور اس کے مطابق اس میں تصرف کرتا ہوں اور اس کے اذن کے تحت اس میں سے عطائیں دیتا ہوں، اللہ نے

مجھے اس (خزانے) کا قفل بنایا ہے، اگر وہ مجھے کھولنا چاہتا ہے تو تم کو عطا دینے یا تمہارے درمیان رزق تقسیم کرنے کے لیے کھول دیتا ہے، اور بند کرنا چاہتا ہے تو بند کر دیتا ہے۔"
اس طرح بالآخر حکمرانی کا طرز اسلام اور اسلامی تعلیمات کے دائرہ سے باہر نکل گیا۔

مالی نظام

مالی نظام نظام حکمرانی کے تابع تھا۔ حکّام حکمرانی کا جو تصوّر رکھتے تھے اور راعی اور رعیت کے حقوق کے بارے میں جس طرح سوچتے تھے، ان کی مالی پالیسی بھی اسی طرح کی ہوتی تھی۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، شیخین اور علی ابن ابی طالب، رضی اللہ عنہم، کے ادوار میں اسلامی نظریہ کارفرما رہا یعنی یہ کہ مال اصلاً جماعت کا ہے۔ حاکم اپنی ذات اور عزیز و اقارب کے لیے اس میں سے کچھ لینے کا اسی وقت مجاز ہے جب اس کا حق ثابت ہو جائے۔ اس طرح حاکم اس بات کا پابند تھا کہ ہر شخص کو اتنا ہی دے جتنا کہ اس کا واقعی حق ہو، کہ اس معاملہ میں حاکم اور دوسرے لوگ یکساں ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جب اس تصوّر میں تھوڑا سا بگاڑ پیدا ہوا تو بھی عام لوگوں کو اپنے حقوق پورے کے پورے ملتے تھے، البتہ — غالباً مال کی اتنی فراوانی کے سبب کہ لوگوں کے مقررہ وظائف دینے کے بعد بھی کافی بچ رہتا تھا — خلیفہ کا یہ خیال تھا کہ اپنے اعزّا اور دوسرے جن لوگوں کو وہ چاہے ان کے ساتھ حسن سلوک کا اسے پورا پورا اختیار تھا۔ اس کے بعد جب حکمرانی جابر شہنشاہوں کے ہاتھ میں چلی گئی تو سارے حدود و قیود اٹھ گئے اور حاکم عوام کو محروم کر دینے یا عطا کرنے کے باب میں خود کو بالکل آزاد سمجھنے لگا، ایسا اگر کبھی کبھی حق کے مطابق ہوتا تو اکثر و بیشتر علی ناحق ہوتا۔ مسلمانوں کے مال میں حکّام، ان کی اولاد، اور ان کے خوشامدیوں اور حاشیہ برداروں کے لیے عیش و عشرت کی بے حدّ و حساب گنجائش نکل آئی۔ آخر کار حکام اس طرح مال کے معاملہ میں اسلام کی مقرر کی ہوئی تمام حدود کو پھاندتے چلے گئے۔

یہ ہے صورت حال کا اجمالی نقشہ۔ اب ہم چند تاریخی نظائر کے ذریعہ اس کی تفصیلات سامنے لائیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ کے زمانہ سے بیت المال کے جو ذرائع آمدنی چلے آرہے تھے وہ یہ تھے۔

فریضۂ زکوٰۃ، جو مسلمانوں پر اُن کے اموال کی مختلف قسموں میں عائد کیا گیا ہے مثلاً سونا، چاندی، زرعی اجناس، پھل، مویشی، سامان تجارت، دفینے، اور خزانے وغیرہ۔ عام طور پر

اس محصول کی اوسط شرح چالیسواں حصّہ ہے - یہ محاصل اپنی آٹھ معروف مدّات میں صرف کیے جاتے ہیں۔

جو ذمی جزیہ ادا کرنے کی شرط پر صلح کرلیں اُن سے جزیہ جو اس زکوٰۃ اور جانی قربانی کے بالمقابل ہے جو مسلمان ادا کرتے ہیں۔

فئے، یعنی وہ مال جو مسلمانوں کو مشرکین سے لڑائی کیے بغیر بلا محنت مشقت اٹھائے مل جائے۔ قرآن کی نصّ صریح کے مطابق یہ سارا مال اللہ اور اس کے رسول، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے۔

مالِ غنیمت جو مشرکین سے جنگ کے نتیجہ میں مسلمانوں کے ہاتھ آتا ہے اس کا ⅘ حصہ جنگ کرنے والوں کے لیے ہے اور باقی ⅕ فئے کی طرح ہے اور انہی مدّات میں صرف ہوتا ہے۔

یا غنیمت کی جگہ پر خراج، جو ان زمینوں پر عائد کیے جانے والے محصول کا نام ہے جو مشرکین کے قبضہ میں تھیں اور مسلمان جنگ کے ذریعہ ان پر قابض ہوگئے۔ یا جن کو مشرکین کے قبضہ میں باقی رکھتے ہوئے ان پر اُن سے صلح کرلی گئی ہو، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فارس کی زمینوں کے سلسلہ میں کیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بیت المال کی آمدنی بہت زیادہ نہ تھی۔ مہاجر اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آئے تھے اور انصار نے انھیں خوش آمدید کہتے ہوئے اپنے مال و متاع میں شریک کرکے بھائی بنا لیا تھا۔ مسلمانوں کی تعداد بھی محدود تھی۔ غزوات سے پہلے بیت المال کا واحد ذریعہ آمدنی زکوٰۃ تھی جو بذاتِ خود ایک محدود ذریعہ ہے اور آبادی کم ہو تو اس کی آمدنی اور کم ہو جاتی ہے۔ پھر یہ آمدنی بھی ان آٹھ قسم کے مستحقین کے درمیان تقسیم ہو جاتی تھی جن کا بیان آیۂ کریمہ "انما الصدقات ..... الخ" میں آیا ہے۔

جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ذریعہ آمدنی "غنیمت" کا اضافہ ہوا جس کا ⅘ لڑنے والوں کو دے دیا جاتا تھا۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم پیدل کو ایک حصہ اور سوار کو دو حصہ، یا ایک روایت کے مطابق تین حصّہ دیا کرتے تھے، گویا آپ نے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ "ہر ایک کا حصّہ اس کی محنت کے مطابق" اسی طرح آپ تنہا آدمی کو ایک حصّہ اور بیوی والے کو دو حصّے دیتے تھے۔ اس طور پر آپ نے دوسرا اصول یہ بنایا کہ: ہر ایک کا حصّہ اس کی ضرورت کے مطابق۔ غنیمت کا باقی ⅕ ان مدّات میں صرف ہوتا جن کا ذکر اوپر گذر چکا ہے۔

پھر ایک نئی بات یہ ہوئی کہ غزوہ بنی نضیر میں پہلی بار فئے حاصل ہوئی۔ اس کو رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین کے لیے مخصوص کر دیا۔ انصار میں سے آپ نے صرف دو غریب آدمیوں کو اس میں سے حصہ دیا۔ اس کے بعد قرآن نے ایک آیت میں اس بنیادی اسلامی اصول کا اعلان کیا کہ: کی لا یکون دولۃً بین الاغنیاء منکم "

بیت المال کی آمدنی پے در پے فتوحات اور زمین پر اسلام کی حدود میں وسعت کے ساتھ بڑھتی رہی۔ فراخی اور خوشحالی رفتہ رفتہ مسلمانوں کے تمام گروہوں میں یکساں طور پر عام ہوگئی کیونکہ اسلام کی مقرر کردہ شرحوں کے مطابق وہ سب بیت المال کی آمدنی میں برابر کے شریک تھے۔

جب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم رفیق اعلیٰ سے جا ملے اور کچھ لوگ مرتد ہوگئے اور زکوٰۃ دینے سے انکار کر بیٹھے تو ابوبکرؓ نے وہ موقف اختیار کیا جو تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ آپ نے یہ نہ بھلائی جا سکنے والی بات کہی۔

واللہ لو منعونی عقالاً کانوا یؤدونہ الیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لقاتلتھم علیٰ منعہ۔

خدا کی قسم اگر یہ لوگ مجھے اونٹ کے پاؤں میں باندھی جانے والی ایک رسی بھی جسے یہ رسول اللہ کو ادا کرتے رہے ہیں، دینے سے انکار کر دیں گے تو میں اس انکار کی بنا پر ان سے جنگ کروں گا۔

اس معاملہ میں آپ نے عمر ابن الخطابؓ کی رائے کے خلاف موقف اختیار کیا۔ وہ کچھ نرمی اور ڈھیل دینے کی طرف مائل تھے کیوں کہ اسلام ابھی نوزائیدہ تھا، اور جزیرہ عرب کے ہر چہار طرف اس کے دشمن گھات لگائے موقع کے منتظر تھے۔ خود مرتدین بھی ایک قابل لحاظ قوت بن چکے تھے۔ ان کے اختلاف کے بارے میں روایت ہے کہ انھوں قدرے تیز لہجہ میں یہ کہا کہ: ہم ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما گئے ہیں۔

امرت ان اقاتل الناس حتیٰ یقولوا! لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ۔ فمن قالھا فقد عصم منی مالہ ودمہ الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں جب تک وہ یہ نہ کہہ دیں کہ: لا الٰہ الا اللہ اور یہ کہ محمدؐ رسول اللہ۔ جس نے یہ کہہ دیا اس نے اپنی جان مال کو میری طرف سے محفوظ کر لیا۔ بجز اس کے کہ اسلام کی رو سے (اس کے جان یا مال پر) حق ثابت ہو جائے ان (کی نیتوں) کا حساب اللہ کے ذمہ ہوگا۔

اس پر حضرت ابوبکرؓ نے پورے اعتماد کے ساتھ ان کو یہ جواب دیا کہ "خدا کی قسم جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کرے گا اس سے میں ضرور جنگ کروں گا، کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہونے والا حق ہے۔"

حضرت عمرؓ اسی وقت پکار اٹھے: "خدا کی قسم میں نے محسوس کر لیا کہ اللہ نے ابوبکر کے دل کو جنگ کرنے پر پوری طرح مطمئن کر دیا ہے، اب میں نے بھی سمجھ لیا کہ یہی صحیح ہے۔"

اس لافانی موقف کو اختیار کر کے آپ نے تاریخ میں عملی طور پر اسلام کی مالی پالیسی کے ایک اہم اصول کو نافذ کر دکھایا، یعنی یہ کہ: مال میں سے جماعت کا حق حاصل کرنے کی خاطر قتل اور جنگ کرنا حق بجانب ہے۔

ابوبکرؓ زکوٰۃ کی آمدنی کو اس کی مقررہ مدات میں صرف کرنے کے سلسلہ میں، اور اسی طرح خمس اور دوسری آمدنیوں کے صرف کرنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر چلتے رہے۔ خود اپنے لیے آپ وہی معمولی سی رقم لیتے جو مسلمانوں نے آپ کے لیے مقرر کر دی تھی —— کہا گیا ہے کہ یہ رقم صرف دو درہم یومیہ تھی۔ اس کے بعد آپ لوگوں کو ان کے مقررہ وظائف دیتے۔ پھر بیت المال میں جو کچھ بچ رہتا اسے جہاد کی خاطر فوجیں تیار کرنے میں صرف کرتے۔

حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک نیا مسئلہ پیدا ہوا، جس پر آپ اور حضرت عمرؓ کے درمیان اختلاف ہو گیا۔ حضرت ابوبکر کی رائے یہ تھی کہ تقسیم اموال میں سابقین اولین اور بعد میں اسلام لانے والوں، آزاد افراد اور موالی، مردوں اور عورتوں، سب کو مساوی قرار دیا جائے۔ حضرت عمرؓ اور صحابہ کی ایک جماعت کا اصرار تھا کہ جن لوگوں نے اسلام کے سلسلہ میں پیش قدمی کی ہو ان کو حسب مراتب مقدم رکھا جائے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے یہ فرمایا کہ: "تم نے جس اوّلیت اور افضلیت کا ذکر کیا ہے اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ مگر یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا ثواب اللہ جلّ ثناؤہ عطا فرمائے گا۔ یہ معاش کا معاملہ ہے اس میں مساوات برتنا ترجیحی سلوک کرنے سے بہتر ہے۔"

اس مساوات پر عمل ہوتا رہا اور جیسے جیسے آمدنی بڑھتی گئی فراخی اور خوش حالی سارے مسلمانوں کو یکساں فیض یاب کرتی رہی، یہاں تک کہ عمر بن خطابؓ کا دور آیا۔ وہ اب بھی اپنی سابق رائے پر قائم تھے یعنی یہ کہ "جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کی ہے اُسے میں ان لوگوں کے مساوی نہیں قرار دوں گا جو آپ کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں۔"

ایک دن بحرین میں آپ کے گورنر ابوہریرہؓ بہت سا مال لے کر آئے۔ ان کی روایت ہے کہ

میں بحرین سے پانچ لاکھ درہم لے کر آیا میں شام کے وقت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور میں نے کہا امیر المومنین یہ مال لیجیے - آپ نے دریافت کیا: کتنا مال ہے؟ میں نے جواب دیا، پانچ لاکھ درہم - فرمایا: جانتے ہو پانچ لاکھ کتنا ہوتا ہے؟ میں نے کہا ہاں، سو ہزار، سو ہزار...... پانچ بار یہی کہا مگر آپ نے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم عالم غنودگی میں ہو - آج کی رات تم جاؤ اور صبح تک آرام کرو پھر آنا چنانچہ صبح ہوئی تو میں آپ کے پاس پھر گیا اور کہا کہ یہ مال مجھ سے لے لیجیے، آپ نے پھر پوچھا کہ کتنا ہے، میں نے جواب دیا کہ پانچ لاکھ درہم، آپ نے پوچھا کیا یہ پاکیزہ طریقے سے وصول ہوا ہے میں نے کہا کہ مجھے تو یہی معلوم ہے پھر حضرت عمر نے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "لوگو! ہمارے پاس بہت سا مال آگیا ہے - اگر تم چاہتے ہو کہ پیمانوں سے ناپ ناپ کر تمھیں دیں تو ایسا کریں، شمار کر کے لینا پسند کرو تو شمار کر کے دیں - اور وزن کر کے لینا چاہو تو وزن کر کے دیں" - اس پر لوگوں میں سے ایک شخص نے اٹھ کر یہ کہا: امیر المومنین: لوگوں کے لیے باقاعدہ رجسٹر مرتب کر لیجیے، جس کے (اندراج) کے مطابق ان کو دیا جایا کرے، حضرت عمر کو یہ تجویز پسند آئی - چنانچہ آپ نے مہاجرین کے لیے فی کس پانچ ہزار، انصار کے لیے فی کس تین ہزار اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے لیے فی کس بارہ ہزار مقرر فرمایا......" یہاں ہم نے یہ روایت اس لیے نقل کی ہے کہ یہ بعض افراد کو بعض پر ترجیح دینے کی اس رائے کی وضاحت کرتی ہے جو حضرت عمر رکھتے تھے - نیز یہ اس وقت کے معیار فراوانی کا پتہ دیتی ہے جب کہ نصف ملین رقم کو ایک ایسا خواب سمجھا جائے جسے صرف سونے والے بیان کر سکتے ہوں! آگے چل کر بڑی بڑی فتوحات کے بعد صورت حال بالکل بدل گئی -

ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں - مجھ سے مدینہ کے ایک استاذ نے اسماعیل ابن محمد السائب سے، انھوں نے زید سے، اور انہوں نے اپنے والد سے روایت کرتے ہوئے یہ حدیث بیان کی ہے کہ انھوں نے کہا: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ: اس خدا کی قسم جس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، کوئی فرد ایسا نہیں جس کا اس مال میں کچھ حق نہ ہو چاہے وہ اسے (عملاً) ملے یا نہ ملے - اس میں کسی فرد کا حق دوسرے سے زیادہ نہیں بجز غلام کے - اس کے سلسلہ میں میری حیثیت بھی وہی ہے جو تم میں سے کسی فرد کی ہے - لیکن ہمارے درجات کا تعین اللہ کی کتاب کی روشنی میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کے پیش نظر ہوگا - اسلام کی راہ میں آدمی جن آزمائشوں سے گذرا اور وہ اسلام میں جتنے پہلے داخل ہوا، اس کا لحاظ کیا جائے گا - اسلام کی حالت میں آدمی کے مال دار ہونے یا ضرورت مند ہونے کا بھی لحاظ رکھا جائے گا - خدا کی قسم

اگر میں زندہ رہا تو صنعا کی پہاڑی پر مویشی چرانے والے چرواہے کو بھی اس مال میں سے اس کا حصہ اسی جگہ پر پہنچ جائے گا، قبل اس کے کہ (اس کے لیے دوڑ بھاگ کرنے میں) اس کا چہرہ تمتما اٹھے؛

"آپ نے ہر اس شخص کے لیے جو جنگ بدر میں شریک تھا پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔ ان تمام لوگوں کے لیے جن کا اسلام اہل بدر کے اسلام جیسا تھا، مثلاً حبشہ کو ہجرت کرنے والوں اور جنگ احد میں شرکت کرنے والوں کے لیے چار ہزار درہم سالانہ، اہل بدر کے لڑکوں کے لیے آپ نے فی کس دو ہزار مقرر کیے۔ البتہ حضرت حسن اور حضرت حسین کو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کی قرابت کے سبب ان کے والد کے بقدر وظیفہ دیا۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر کیا۔ ہر اس شخص کے لیے جس نے فتح سے قبل ہجرت کی تھی آپ نے تین ہزار درہم سالانہ مقرر کیے اور جو لوگ فتح ہونے پر ایمان لائے تھے ان کے لیے فی کس دو ہزار مہاجرین و انصار کے نوعمر لڑکوں کو بھی آپ نے اتنا ہی دیا۔ عام لوگوں کے لیے عطایا کی تعیین میں آپ نے ان کے رتبہ، علم قرآن، اور راہ اسلام میں جہاد کو معیار بنایا۔ باقی تمام لوگوں کو آپ نے ایک صف میں رکھا۔ چنانچہ جو مسلمان مدینہ آتے اور وہاں قیام کرتے ان کے لیے پچیس[25] دینار مقرر کر دیا تھا اہل یمن کے لیے جیسے شام اور عراق کے مانند قرار دیا گیا تھا، دو ہزار، ہزار، نو سو، پانچ سو، اور تین سو کے عطایا مقرر کیے گئے تھے۔ تین سو سے کم کسی کو نہ ملتا تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ اگر مال میں اور فراوانی ہوئی تو میں ہر ایک کے لیے چار ہزار درہم مقرر کر دوں گا، ایک ہزار اس کے سفر کے لیے، ایک ہزار اسلحہ کے لیے ایک ہزار گھر والوں کے اخراجات کے لیے چھوڑ جانے کی خاطر، اور ایک ہزار اس کے گھوڑے اور خچر کے لیے۔" [1]

عطایا کی تقسیم کے سلسلہ میں حضرت عمرؓ نے جو اصول مقرر کیا تھا اس کی پابندی بعض افراد کے سلسلہ میں ضروری نہیں سمجھی۔ ان افراد کو آپ نے انہی کے درجہ کے دوسرے افراد سے زیادہ عطا کیا۔ عمر ابن ابی سلمہ کے لیے آپ نے چار ہزار درہم مقرر کیے۔ یہ عمر ام المومنین ام سلمہ کے صاحبزادے تھے، محمد بن عبداللہ ابن جحش نے اس پر اعتراض کیا اور امیر المومنین سے کہا: آپ کس بنا پر عمر کو ہم سے زیادہ دے رہے ہیں، کیونکہ ہمارے باپوں نے بھی ہجرت کی تھی اور وہ بھی جنگ بدر میں شریک تھے۔ ابن خطاب نے ان کو یہ جواب دیا کہ "میں ان کو اس مقام کی بنا پر زیادہ دے رہا ہوں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] الفاروق عمر۔ جلد دوم۔ ڈاکٹر ہیکل۔

کے نزدیک ان کو حاصل تھا۔ جو شخص اس سلسلہ میں مجھ پر اعتراض کر رہا ہے وہ ام سلمہ جیسی ماں لائے، میں اس کی بات مان لوں گا" آپ نے اسامہ ابن زید کے لیے چار ہزار درہم مقرر کیے۔ اس پر عبداللہ ابن عمرؓ نے کہا "آپ نے میرے لیے تو تین ہزار مقرر کیے، اور اسامہ کے لیے چار ہزار حالانکہ میں ایسے معرکوں میں بھی شریک رہا ہوں جن میں اسامہ نہیں شریک ہو سکے تھے" حضرت عمرؓ نے ان کو جواب دیا "میں نے انھیں اس لیے زیادہ دیا ہے کہ وہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک تم سے زیادہ محبوب تھے۔ آپ کے باپ بھی آپ کو تمھارے باپ سے زیادہ محبوب تھے" آپ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیوی اسماء بنت عمیس کے لیے ایک ہزار درہم، اُم کلثوم بنت عقبہ کے لیے ایک ہزار درہم، اور عبداللہ ابن مسعود کی ماں کے لیے بھی ایک ہزار درہم کی رقمیں مقرر فرمائیں، ان کی عورتوں کو آپ نے ان کی مخصوص پوزیشن کے باعث انہی جیسی دوسری عورتوں سے زیادہ عطا کیا کیوں کہ یہ ان مردوں کی بیویاں یا مائیں تھیں جن کو دوسروں پر فضیلت حاصل تھی۔

گویا مال کی تقسیم کے سلسلہ میں یہ دو رائیں بنیں۔ ابوبکرؓ کی رائے اور عمرؓ کی رائے، عمر کی رائے اپنی پشت پر ایک سند رکھتی تھی، "جن لوگوں نے رسول اللہ کے خلاف جنگ کی ہے ان کو میں ان لوگوں کے مثل نہیں قرار دوں گا جنھوں نے آپ کے ساتھ ہو کر جنگ کی ہے" یہ اصول کہ جو شخص اسلام کی راہ میں جن آزمائشوں سے گذرا ہے اس کا لحاظ کیا جائے گا .... اسلام میں اس رائے کے لیے ایک بنیاد موجود ہے اور وہ ہے محنت اور اس کے بدلہ میں مساوات کا اصول۔ اسی طرح ابوبکر کی رائے بھی اپنی سند رکھتی ہے "لوگ اللہ کے لیے اسلام لائے ہیں اور ان کے اجر بھی اسی کے ذمہ ہیں، وہ قیامت کے دن انھیں پورا پورا اجر عطا کرے گا، یہ دنیا قدر کفایت سے زیادہ نہیں"

لیکن ہم بلا کسی تامّل اور تردد کے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کو ترجیح دیں گے، کیونکہ یہ اسلام کی روح سے زیادہ قریب اور مسلمانوں کے مابین مساوات پیدا کرنے کی خاطر زیادہ موزوں ہے۔ ظاہر ہے کہ مساوات اس دین کے اصولوں میں سے ایک اہم اصول ہے یہی پالیسی ان بُرے نتائج سے بچنے کے لیے بھی زیادہ مفید اور موثر ہے جو اس تفاوت کے نتیجہ میں رونما ہوئے۔ مثلاً ایک طبقہ کی دولت کا بہت بڑھ جانا اور سال بہ سال منافع کے ذریعہ بڑھتے چلے جانا۔ اقتصادیات کی رو سے یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ نفع میں اضافہ راس المال میں اضافہ کے تناسب سے کہیں زیادہ ہوتا ہے، اس پالیسی کے یہی وہ

نتائج تھے جن کو حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں خود دیکھ لیا تھا اور قسم کھالی تھی کہ اگر وہ اگلے سال زندہ رہے تو سب کے عطایا مساوی کریں گے ، اس موقع پر آپ نے یہ بات کہی جو کافی مشہور ہے ۔

لو استقبلت من امری ما استدبرت	جو فیصلے میں پہلے کرچکا ہوں انھیں اگر اب پھر سے کرنے
..... لاخذت من الاغنیاء فضول	کا موقع ملتا تو میں اغنیاء سے زائد از ضرورت مال لے کر
اموالھم فرددتھا علی الفقراء ۔	اسے فقراء کے درمیان تقسیم کر دیتا ۔

مگر افسوس ! وقت گذر گیا اور زمانہ عمر سے آگے نکل گیا ، اور وہ المناک نتائج رونما ہوئے جنھوں نے اسلامی سماج کا توازن درہم برہم کر دیا ۔ اس کے بعد جب اُمیّہ کے تصرفات شروع ہوئے جن کو عثمان گوارا کرتے جاتے تھے تو انہی نتائج نے فتنہ کا دروازہ کھول دیا ۔

گویا حضرت عمر نے اپنی اس رائے سے کہ مسلمانوں کے درمیان تقسیم عطایا میں امتیازی سلوک برتا جائے ، اس کے بُرے نتائج دیکھنے کے بعد ، رجوع کر کے حضرت ابوبکرؓ کی رائے اختیار کر لی تھی ، حضرت علیؓ کی رائے بھی خلیفہ اوّل کی رائے کے مطابق تھی ـــــــ واضح رہے کہ ہم حضرت علیؓ کی خلافت کو شیخین کی خلافت کا ایک فطری تسلسل قرار دے کر حضرت عثمان کے عہد کو ایک خلا سمجھتے ہیں جو ان کے درمیان حائل ہو گیا تھا ـــــــ اس وجہ سے ہم اب حضرت علی کے عہد پر گفتگو کریں گے اور اس کے بعد حضرت عثمان کے عہد کے حالات پر روشنی ڈالیں گے ۔

حضرت علیؓ نے تقسیم عطایا کے باب میں مساوات کا اصول اختیار کیا ۔ آپ نے اپنے پہلے ہی خطبہ میں اس کی صراحت کر دی تھی ، فرمایا :-

"سنو ! رسول اللہ کے صحابیوں میں سے ، مہاجر یا انصاری ، جو شخص بھی یہ رائے رکھتا ہو کہ صحبت کی بنا پر اسے دوسرے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ فضیلت کل کو اللہ کے یہاں کام آئے گی اور اس کا اجر و ثواب بھی وہی دے گا ۔ خوب سمجھ لو کہ جس شخص نے بھی اللہ اور اس کے رسول کی دعوت پر لبیک کہی ، ہماری ملت کی تصدیق کی ، ہمارے دین میں داخل ہوا ، اور ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کیا اس نے اپنے اوپر اسلام کے حقوق و فرائض عائد کر لیے ۔ دراصل تم سب اللہ کے بندے ہو اور یہ مال اللہ کا ہے ، تمہارے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا ۔ اس کے معاملہ میں کسی دوسرے

پر کوئی فضیلت نہیں حاصل، البتہ متقی لوگوں کے لیے اللہ کے پاس بہترین جزا ہے"۔

یہی صحیح اسلامی اصول ہے جو اسلامی مساوات کی روح سے پوری طرح ہم آہنگ ہے جو اسلامی سوسائٹی میں توازن قائم رکھنے کا ضامن ہے اور دولت کی افزائش کے اسی قدر مواقع باقی رکھتا ہے جس قدر کہ محنت مشقت کے ذریعہ ممکن ہے۔ یہ کسی کو نفع آور کاموں کے لیے دوسروں سے زائد مال فراہم کرکے اسے دوسروں سے زیادہ مواقع نہیں دیتا۔

حضرت عمر اپنے آخری دنوں میں اس اصول کی طرف رجوع کرنے والے تھے لیکن ان کی قضا سبقت کر گئی، اسلام کی بدقسمتی سے آپ کی شہادت واقع ہو گئی اور آپ اپنا یہ ارادہ، بلکہ اپنے دو ایسے ارادے نہ پورے کر سکے جن کے حق میں فیصلہ کر چکے تھے۔ ایک ارادہ اس بات کا تھا کہ مال داروں سے ان کا فاضل مال لے کر غربا میں تقسیم کر دیں گے، کیونکہ یہ فاضل مال زیادہ تر تقسیم عطایا میں عدم مساوات برتنے کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔ دوسرا ارادہ یہ تھا کہ تقسیم عطایا کے باب میں مساوات کا اصول اختیار کر لیں گے تاکہ یہ تفاوت دوبارہ نہ رونما ہو سکے اور اسلامی سماج میں انتشار کا جو عمل شروع ہو گیا تھا وہ شرمندۂ تکمیل نہ ہو۔

جب عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے ان دونوں فیصلوں میں سے ایک کو بھی قابل عمل نہیں سمجھا۔ فاضل مال کو مال داروں کے پاس رہنے دیا، اسے واپس نہیں لیا۔ اور عطایا میں تفاوت کو بھی برقرار رکھا، یہی نہیں بلکہ آپ نے لوگوں کو عطائیں دینے میں خوب فراخ دلی کا ثبوت دیا، نتیجۃً مال دار لوگ اور زیادہ مال دار ہو گئے۔ غربا کو بھی کبھی کبھی کچھ فراخی نصیب ہو جاتی تھی۔ آپ نے ان لوگوں کو بڑی بڑی رقمیں عطا کرنا شروع کر دیا جن کے پاس دولت کی کوئی کمی نہ تھی، پھر آپ نے قریش کو اس کی کھلی چھٹی دے دی کہ اپنے جمع کردہ سرمایہ کے ذریعہ زمین کے گوشہ گوشہ میں تجارت کرتے پھریں اور اس طرح اسے کئی گنا بڑھا لیں۔ آپ نے بڑے بڑے مال داروں کے لیے یہ بات بھی روا رکھی کہ سواد کے علاقہ میں، یا دوسرے ممالک میں خوب عمارتیں اور زمینیں خریدیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ آپ کے دور خلافت کے آخری زمانہ میں پورے اسلامی سماج میں عدم توازن پیدا ہو گیا۔ اللہ آپ پر رحم فرمائے۔

حضرت ابو بکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ اس پالیسی پر شدت کے ساتھ عمل کرتے تھے کہ اکابر

قریش کی ایک معتدبہ جماعت کو مدینہ میں مستقلاً مقیم رہنے پر مجبور کریں۔ یہ حضرات ان لوگوں کو مفتوحہ ممالک میں آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت اس لیے نہیں دیتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ جب ان کے گرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی قرابت، اسلام کی راہ میں ان کی قربانیوں، اور جہادمیں ان کی پیش قدمی کے باعث اعوان و انصار جمع ہو جائیں تو ان سرداروں کی نظریں مال و دولت اور اقتدار و حکومت کی طرف اٹھنے لگیں، واضح رہے کہ آزادی کے اسلامی تصوّر کے تحت ایسا کرنے کو کسی طرح بھی انفرادی آزادی کو پامال کرنے کے ہم معنیٰ نہیں قرار دیا جاسکتا، کیونکہ اسلام میں یہ آزادی اجتماعی مصالح اور سماجی خیرخواہی کے حدود کی پابند ہے۔ جب حضرت عثمان کا دور آیا تو آپ نے ان لوگوں کو زمین میں نقل و حرکت کی کھلی آزادی دے دی۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ نے انھیں اس بات کے مواقع فراہم کیے اور اس پر ابھارا کہ اپنے سرمایہ کو ممالک مفتوحہ میں مکانات اور زمین خریدنے میں لگائیں، کب؟ جب کہ آپ ان میں سے بعض لوگوں کو لاکھوں کی رقمیں عطا کر چکے تھے۔

بلاشبہ یہ سب مسلمانوں اور بالخصوص ان کے اکابر کے ساتھ حسن سلوک اور مہربانی کے طور پر کیا گیا تھا لیکن اس پالیسی نے ایسے مفاسد کو جنم دیا جو ابوبکر و عمر کی دوربین نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھے۔ اس نے اسلامی جماعت میں زبردست معاشی تفاوت اور سماجی امتیازات پیدا کر دیے، نیز اس نے ایک ایسے طبقۂ اشراف (Aristocrats) کو جنم دیا جو خود بے عمل رہتا اور بغیر کسی محنت مشقت کے اس کو اس کا رزق ہر چہار جانب سے آ کر ملتا رہتا۔ اس طرح وہ شرف ایک بار پھر رونما ہو گیا جس کے خلاف اسلام اپنی ہدایات اور اپنے قوانین دونوں کے ذریعہ مسلسل اعلان جنگ کرتا رہا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قبل کے دونوں خلفا بھی اس سے برسرپیکار رہے اور کوشش کرتے رہے کہ اسے سر اٹھانے کا ذرا بھی موقع نہ ملے۔

جب نوبت یہاں تک پہنچ گئی تو بعض لوگوں کے اندر روح اسلامی نے جوش کیا۔ ان میں نمائندہ شخصیت ابوذر کی ہے جو ان میں سب سے زیادہ تیز اور انقلابی تھے۔ یہ وہی جلیل القدر صحابی ہیں جن پر حال ہی میں مصر کے دار الافتاء نے برسرِ غلط ہونے کا فتویٰ صادر کرنے کی ضرورت محسوس کی اور یہ دعوےٰ کیا کہ وہ دین میں ابوذر سے زیادہ بصیرت رکھتا ہے۔

ابوذر نے عیش پرستوں کو ان کی اس عیش پرستی پر چیلنج کیا جو اسلام کے لیے یکسر ناقابلِ تسلیم تھی۔

انھوں نے خاص طور پر بنو اُمیہ اور معاویہ کی اس پالیسی پر تنقید کی کہ وہ اس عیش پرستی کو نہ صرف گوارا کر رہے تھے بلکہ اس کو فروغ دیتے تھے اور اس میں خود بھی بری طرح ملوث تھے۔ آپ نے خود حضرت عثمان کے اس طریقہ کو قابل اعتراض قرار دیا کہ وہ بیت المال سے ہزاروں لاکھوں کی رقمیں انعام میں دیں اور اس طرح دولت مندوں کی دولت اور عیش کوشوں کی عیش کوشی میں اضافہ کریں۔

ان کو معلوم ہوا کہ عثمان رضؓ نے مروان ابن حکم کو افریقہ کے خراج کا پانچواں حصہ، حارث ابن حکم کو دو لاکھ درہم اور زید بن ثابت کو ایک لاکھ درہم عطا کیے ہیں۔۔۔۔ ابوذر کے ضمیر کے لیے یہ باتیں ناقابل برداشت تھیں وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور لوگوں سے کہنے لگے۔

"اب ایسے کام کیے جانے لگے ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آتے۔ خدا کی قسم نہ تو اللہ کی کتاب میں اُن کی کوئی سند ہے نہ اس کے نبی کی سنّت میں۔ خدا کی قسم میں دیکھ رہا ہوں کہ حق پامال کیا جا رہا ہے، باطل کو از سر نو زندگی بخشی جا رہی ہے، سچے آدمی کو جھٹلایا جا رہا ہے، اور بغیر تقویٰ کے لوگوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔۔۔۔۔۔ اے دولت مندو، غریبوں کے ساتھ بھائی چارہ کرو۔۔۔۔۔۔ اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں نہیں خرچ کرتے ان کو، اے مال جمع کرنے والے جان لے کہ مال میں تین شرکاء ہیں: اولاً تقدیر ہے، جو تجھ سے اجازت نہیں لے گی کہ تباہی یا موت کے ذریعہ تیرے مال کا اچھا حصّہ لے جائے یا بُرا حصّہ۔ ثانیاً وارث ہے، جو منتظر ہے کہ تیری آنکھیں بند ہوں اور وہ مال پر قبضہ کرلے، اور تو خود مفلس رہ جائے گا۔ تیسرے نمبر پر تیرا حق ہے۔ اگر یہ ممکن ہو کہ تو تینوں میں سے سب سے کمزور شریک بن کر نہ رہے تو ضرور اس کا اہتمام کر۔۔۔۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ۔ — تم نیکی کے درجہ کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے جب تک ان چیزوں کو (راہ خدا میں) نہ خرچ کرو گے جو تمھیں محبوب ہیں۔

"لوگو تم اب ریشمی پردے اور دیباج کے گاؤ تکیے استعمال کرنے لگے ہو اور اب تمھیں آذربیجان کے بنے ہوئے (عمدہ) نمدے پر سونے میں تکلیف محسوس ہوتی ہے جب کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم چٹائی پر سویا کرتے تھے۔ تمہارے یہاں اب طرح طرح کے کھانوں کا

دور چلتا ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جَو کی روٹی بھی اتنی نہ میسر ہوتی تھی کہ شکم سیر ہو کر کھاتے ...."

مالک ابن عبداللہ الزیادی ابو ذر سے روایت کرتے ہیں کہ: ایک بار انھوں نے عثمان بن عفانؓ کے یہاں اذن باریابی چاہا۔ انھوں نے ان کو بلایا، اُن کے ہاتھ میں ایک ڈنڈا بھی تھا۔ عثمان نے کہا: کعب! عبدالرحمن کا انتقال ہو گیا اور اُنھوں نے (کافی) مال چھوڑا ہے۔ ان کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے۔ انھوں نے کہا: اگر وہ اس میں سے اللہ کا حق ادا کرتے رہے ہیں تو ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سن کر ابوذر نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور کعب کو رسید کیا۔ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ:

ما احبّ لو ان لی ھذا الجبل ذھباً	اگر میرے پاس اس پہاڑ کے برابر سونا ہوتا
انفقہ ویتقبّل منی، اذر خلفی منہ	جسے میں راہِ خدا میں خرچ کرتا اور اللہ اسے قبول فرما رہا
ستّ اواق۔	تو میں اس میں سے چھ اوقیہ بھی پیچھے چھوڑ جانا پسند نہیں کرتا۔

(یہ حدیث سنا کر) انھوں نے تین بار عثمانؓ کو قسم دلا کر پوچھا کہ کیا تم نے اسے سنا ہے؟ وہ بولے ہاں۔[1]

اس طرح کی دعوت کو برداشت کرنا معاویہ اور مروان ابن حکم کے بس کی بات نہ تھی۔ چنانچہ وہ اس بات پر برابر عثمانؓ کو ان کے خلاف اُکساتے رہے یہاں تک کہ ابوذر کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کا یا فساد فی الارض کا ارتکاب کیے بغیر جس پر کہ شریعتِ اسلام کی رو سے مجرم کو مُلک بدر کیا جا سکتا ہے، ملک بدر ہو کر ربذہ چلے جانا پڑا۔

یہ پکار ایسے ضمیر کی بیداری کا مظہر تھی جسے دولت کی بے حد فراوانی کے باوجود خواہشات مغلوب نہ کر سکی تھیں۔ دولت کا تمرکز اتنا بڑھ گیا تھا کہ اب اس نے اسلامی جماعت کو مختلف طبقات میں تقسیم کر دیا تھا، اور ان بنیادوں کو مٹا رہا تھا جنھیں یہ دین لوگوں کے درمیان قائم کرنے آیا تھا۔ ہمارے لیے یہ کافی ہو گا کہ دولت کی اس فراوانی کے کچھ نمونے دیکھ لیں جن کا ذکر مسعودی نے کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"عثمانؓ کے زمانہ میں صحابہ نے خوب مال وجائداد جمع کیا۔ چنانچہ جس دن حضرت عثمانؓ کی شہادت واقع ہوئی ان کے خزانچی کے پاس ان کا ڈیڑھ لاکھ دینار اور دس لاکھ درہم

---

[1] حدیث نمبر ۵۳۴۔ المسند جلد اول۔ مؤلفہ استاذ احمد محمد شاکر۔

نقد جمع تھا وادی القریٰ اور حنین وغیرہ میں ان کی جائدادوں کی قیمت ایک لاکھ دینار تھی، اس کے علاوہ آپ نے بکثرت گھوڑے اور اونٹ چھوڑے تھے، زبیر کی وفات کے بعد ان کی چھوڑی ہوئی صرف ایک جائداد کی قیمت تقریباً پچاس ہزار دینار تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے ہزار گھوڑے اور ہزار لونڈیاں چھوڑی تھیں۔ طلحہ کو عراق سے ایک ہزار دینار یومیہ کی آمدنی ہوتی تھی، اور سراۃ کی جانب سے اس سے بھی زیادہ رقم آتی تھی۔ عبد الرحمٰن ابن عوف کے اصطبل میں ایک ہزار گھوڑے تھے۔ ان کے پاس ایک ہزار اونٹ اور دس ہزار بھیڑ بکریاں بھی تھیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ترکہ کا ایک چوتھائی چوراسی ہزار کے بقدر تھا۔ زید ابن ثابت نے اس قدر سونا چاندی چھوڑا تھا کہ جو کلہاڑیوں سے کاٹا جاتا تھا۔ جو مال وجائداد انھوں نے چھوڑا وہ اس کے علاوہ ہے، زبیر نے ایک محل بصرہ میں، ایک مصر میں، ایک کوفہ میں اور ایک اسکندریہ میں تعمیر کرایا تھا۔ اسی طرح طلحہ نے کوفہ میں ایک عالی شان مکان تعمیر کروایا اور مدینہ میں ایک محل تعمیر کیا جس میں چونا، پختہ اور ساگون کی لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ سعید ابن ابی وقاص نے عقیق میں ایک عالیشان مکان بنوایا جس کی چھتیں بہت اونچی اور صحن بہت وسیع تھے اور اس کے بالائی حصہ پر برجیاں بھی تھیں۔ مقداد نے مدینہ میں ایک محل تعمیر کرایا جس کے اندر باہر دونوں طرف گچ کاری کروائی۔ یعلیٰ ابن منیہ نے پچاس ہزار دینار اور اس کے علاوہ تین لاکھ درہم کی قیمت کی جائدادیں اور دوسرے سامان چھوڑے۔" [۵]

یہ تھی دولت کی وہ فراوانی جس کی ابتداء بہت چھوٹے پیمانہ پر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں عطایا کی تقسیم میں بعض مسلمانوں کو بعض سے زیادہ دینے کی پالیسی کے نتیجہ میں ہوئی تھی۔ یہ وہی پالیسی ہے جسے ختم کرنے اور اس کے بُرے اثرات کا ازالہ کرنے کا حضرت عمرؓ تہیہ کر چکے تھے۔ آپ نے ایسا کر کے دکھا دیا ہوتا اگر اس سے قبل آپ کو خنجر کے اس وار نے نشانہ نہ بنا لیا ہوتا جو صرف عمرؓ کے دل میں نہیں بلکہ خود اسلام کے دل میں پیوست ہو گیا۔ پھر یہ فراوانی دن بدن فزوں تر ہوتی گئی۔ حضرت عثمانؓ نے اس پالیسی کو باقی رکھا اور اس سے اس فراوانی میں اور اضافہ ہوا۔ حضرت عثمانؓ نے اس کے علاوہ جو انعام واکرام دیے اور جاگیریں عطا کیں وہ علیحدہ ہیں۔ اس کے بعد کچھ ایسے اسباب رونما ہوتے رہے کہ دولت کی یہ بہتات

---

[۵] عثمانؓ مصنفہ استاذ صادق عرجون۔

بہت تیزی سے بڑھی، خاص طور پر متفرق اور مختلف املاک اور جائدادوں کو یکجا کرنا اور نفع آور کاروبار کے مختلف ذرائع کو اپنے قبضہ میں لے آنا، کیونکہ حضرت عثمانؓ نے ممالک مفتوحہ میں زمینیں خریدنے اور بڑی بڑی املاک حاصل کرنے کی پوری آزادی دے رکھی تھی۔ ابوذرؓ کے دل سے جو گہری اور مخلصانہ پکار بلند ہوئی تھی اس کی مخالفت بھی اس کی ایک اہم وجہ بن گئی۔ اگر یہ دعوت اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی اور صدرِ مملکت کو ہم نوا بنا سکتی تو اس میں اتنی صلاحیت موجود تھی کہ صورت حال کی اصلاح کر دے اور حضرت عمرؓ نے اپنے آخری دنوں میں مال داروں کی فاضل دولت لے کر غرباء میں تقسیم کر دینے کا جو فیصلہ کیا تھا اسے عملاً نافذ کر دکھائے، امام کے لیے اپنے اختیارات کی رو سے یہ بالکل جائز ہوتا کہ وہ امت کو ان نقصانات سے بچانے کے لیے ایسا کرے، بلکہ سماجی مصالح کے حصول کے لیے اس پر ایسا کرنا فرض تھا۔

اگر ایک طرف دولت کا تمرکز اور اس کی فراوانی تھی تو دوسری طرف اسی نسبت سے فقر و فاقہ اور خستہ حالی کا ظہور لازمی تھا۔ قدرتی طور پر غیظ و غضب اور انتقامی جذبات بھی پیدا ہو رہے تھے یہ سارا مواد جمع ہوتا رہا اور پکتا رہا تا آنکہ اس نے ایک ہیجان انگیز فتنہ کو جنم دے کر چھوڑا جس سے اسلام کے دشمنوں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ بالآخر اس فتنہ نے عثمانؓ کی جان لے لی اور اس کے ساتھ ہی امت اسلامیہ کے امن و سلامتی کو بھی لے اڑا اور اسے انتشار اور ہیجان کے الاؤ میں جھونک دیا۔ اس فتنہ کی آگ اس وقت تک نہ دبی جب تک اس نے خود روح اسلام کو اپنے مہیب دھوئیں سے نہ ڈھک لیا اور امت کو سلطنتِ جبر کے چنگل میں نہ دے دیا۔

کوئی غیر متوقع بات نہ تھی کہ عثمانؓ کے بعد علیؓ نے عدل و مساوات کی جو پالیسی اختیار کی اس پر سرمایہ دار طبقہ اور وہ لوگ جو تقسیم عطایا میں ترجیحی سلوک سے مستفید ہو رہے تھے بھڑک اٹھیں۔ انھوں نے اس پالیسی کے ترک کا مشورہ دیا، اور ظاہر کیا کہ اس مشورہ کا محرک یہ اندیشہ ہے کہ آپ کے خلاف بغاوت نہ ہو جائے ——
آپ کے زندہ ضمیر میں اسلام کی جو روح کارفرما تھی اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا جو آپ نے دیا کہ "کیا تم مجھے یہ مشورہ دے رہے ہو کہ مجھے جن لوگوں کے معاملات کا سربراہ کار بنایا گیا ہے ان پر ظلم کر کے کسی کی مدد حاصل کروں؟ یہ مال میرا ہوتا تو بھی میں ان کے درمیان مساوات برتتا، پھر جب یہ خدا کا مال ہے تو (اس کے خلاف کیسے کر سکتا ہوں) اچھی طرح سمجھ لو کہ مال کو غلط ناحق عطا کرنا تبذیر و اسراف کے تحت آتا ہے۔ دنیا میں بلاشبہ ایسا کرنا

کرنیوالے کو کچھ اوپر اٹھا سکتا ہے مگر آخرت میں یہ روش اُسے یقیناً ذلیل کر کے رہے گی "

بنو اُمیہ نے مالی نظام کے سلسلہ میں ایک مختلف روش اختیار کی تا آنکہ عمر بن عبد العزیز کا دور آیا اور آپنے ظلماً حاصل کی ہوئی املاک کی واپسی اور مسلمانوں کے مال کے بے جا صرف سے احتراز کی وہ پالیسی اختیار کی جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں - اب بنی امیہ کو بھی وہی کچھ مل سکتا تھا جو سارے مسلمانوں کو مل سکتا تھا - اب خوشامدیوں اور قصیدہ خوانوں کا اِس مال میں کوئی حصہ نہ تھا کیونکہ خلیفہ نے قصیدہ گو شعراُ سے قطع تعلّق کر لیا اور انہیں بیت المال سے کوئی انعام نہیں دیا -

جریر کے ساتھ آپ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ جریر نے ان کی شان میں ایک قصیدہ کہا تو عمر نے اس سے کہا: " ابن خطفی! کیا تو مہاجرین کی اولاد میں سے ہے کہ ہم جو ان کو دیتے ہیں وہی تجھ کو بھی عطا کر دیں، یا انصار کی اولاد میں سے ہے کہ جو ان کا حق ہوتا ہے وہی تیرا حق قرار پائے - یا پھر یہ بتا کہ کیا تو غریب مسلمانوں میں سے ہے کہ ہم تیری قوم کے صدقات کے ذمہ دار کو حکم دے دیں کہ تیری قوم کے دوسرے لوگوں کو جو کچھ دیا کرتا ہے وہی تجھے بھی دیا کرے؟" اس نے جواب دیا:

" امیر المومنین! میں ان گروہوں میں سے کسی سے بھی نہیں تعلق رکھتا بلکہ اپنی قوم کے سب سے زیادہ مال دار اور خوش حال لوگوں میں سے ہوں - لیکن آپ سے میں اس (انعام) کا طالب ہوں جس کا مجھے (سابق) خلفاء نے عادی بنا دیا ہے، یعنی چار ہزار درہم اور کپڑے اور سواریاں جو اس کے ساتھ ملا کرتی ہیں۔" عمرؓ نے جواب دیا: " اپنا کیا ہر ایک کے سامنے آئے گا - جہاں تک میرا تعلق ہے میرے خیال میں اللہ کے مال میں تیرا کوئی حق نہیں نکلتا البتہ میری ذاتی عطا ملنے تک انتظار کر تا کہ میں دیکھوں کہ میرے اہل وعیال کے واسطے سال بھر کے لیے کتنا کافی ہو گا، اتنا محفوظ کر لوں اور اگر کچھ فاضل بچ رہے تو وہ تجھے دے دوں۔"

جریر نے کہا: نہیں اللہ امیر المومنین کو اور زیادہ عطا کرے اور ان کی تعریف کی جائے، میں راضی خوشی جاتا ہوں" آپ نے فرمایا " یہ مجھے زیادہ پسند ہے" چنانچہ جریر وہاں سے چلا آیا تو عمر نے کہا کہ اس کے شر سے بچنا چاہیے، اسے میرے پاس پھر بلا لاؤ - لوگ اسے بلا لائے تو آپ نے اس سے کہا - میرے پاس چالیس دینار اور دو جوڑے کپڑے ہیں جب ان میں سے ایک کو دھوتا ہوں تو دوسرے کو پہن لیتا ہوں میں ان چیزوں کو اپنے اور تمہارے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر لیتا ہوں، اگرچہ اللہ تعالٰے خوب جانتا ہے کہ عمر کو اس کی ضرورت تجھ سے زیادہ ہے۔" جریر نے کہا: امیر المومنین کو اور زیادہ عطا کرے، خدا کی قسم میں بالکل راضی

ہوں (مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں) آپ نے فرمایا کہ اچھا، جب تو نے قسم کھالی تو ہم تجھے بتائیں کہ تیری اس دعا اور (ہمارا عطیہ نہ قبول کرکے) ہمیں تنگی سے محفوظ رکھنے نے مجھے تیری تعریف سے زیادہ متاثر کیا ہے، اب تو ہمارا دوست بن کر جا۔"

جب مسلمانوں کے مال کا اس طرح تحفظ کیا جائے اور اسے اس کے واقعی مستحقین تک پہنچایا جائے تب راویوں کا یہ بیان چنداں موجب حیرت نہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کے دور میں لوگوں کو اتنی فراخی نصیب ہوگئی تھی کہ بعض علاقوں میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملتا تھا، کیونکہ عام طور پر لوگ اپنے دوسرے حقوق کے باعث مالِ زکوٰۃ سے مستغنی ہو چکے تھے یحییٰ ابن سعد اس سلسلہ میں لکھتا ہے کہ "مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ کے صدقات کا عامل بنا کر بھیجا۔ میں نے اسے جمع کیا اور ایسے غریبوں کی تلاش کی جنھیں وہ مال دے سکوں۔ مگر مجھے وہاں کوئی غریب نہ ملا، نہ کوئی ایسا شخص ملا جو یہ مال لینا چاہتا ہو، کیونکہ عمر بن عبدالعزیز نے لوگوں کو غنی کر دیا تھا۔ میں نے اس رقم سے غلام خریدے اور انھیں آزاد کر دیا۔"

حقیقت یہ ہے کہ فقر و حاجت مندی صرف مال کے ارتکاز کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ہر زمانہ میں فقراء اغنیاء کے ظلم و جور کا نشانہ ہوتے ہیں اور اغنیاء عموماً بڑے بڑے انعامات اور جاگیروں بخشش لوٹ کھسوٹ ظلم اور بے جا نفع اندوزی کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔

بنو امیہ اور ان کے بعد بنو عباس کے زمانہ میں بیت المال بادشاہوں کے لیے اس طرح مباح تھا جیسے کہ ان کی ملک خاص ہو۔ حالانکہ اس زمانہ میں دو الگ الگ بیت المال ہوتے تھے۔ ایک عام اور ایک خاص۔ پہلے کے بارے میں یہ تصور تھا کہ اس کی آمدنیاں اور مصارف جماعت سے متعلق ہیں اور دوسرے کے بارے میں یہ تصور تھا کہ اس کی آمدنیاں اور مصارف سلطان کے لیے مخصوص ہیں لیکن یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض عام اموال بیت المال خاص میں داخل کر دیئے جاتے ہیں اور بعض خاص مصارف عام بیت المال سے پورے کیے جاتے ہیں۔

استاذ آدم میز (ADAM MEZ) کی کتاب اسلامی تہذیب چوتھی صدی ہجری میں (جس کا عربی ترجمہ استاذ محمد عبدالہادی ابوریدہ نے کیا ہے) آیا ہے کہ:

"عطایا اور وہ ساری رقمیں جو دار الخلافہ کے اخراجات سے متعلق ہوتی تھیں بیت المال عام سے

حاصل کی جاتی تھیں۔ ہمارے پاس چوتھی صدی ہجری کے اوائل کی ایک تاریخی دستاویز ہے جو مال کی قسموں کی تفصیل پر مشتمل ہے جو بیت المال خاص میں داخل کی جاتی تھیں۔

۱۔ وہ متروکہ اموال جو باپ اپنے بیٹوں کے لیے اس بیت المال میں چھوڑ جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ مال رشید نے چھوڑا یعنی چار کروڑ آٹھ لاکھ دینار۔ معتضد (۲۷۹ - ۲۸۹ھ) اپنے دور خلافت میں ہر سال اخراجات کے بعد مال خاص کی آمدنی میں سے دس لاکھ دینار بچا لیتا تھا، یہاں تک کہ نوے (۹۰) لاکھ دینار جمع ہو گئے، اس کی خواہش تھی کہ ایک کروڑ پورا کرے تو اسے گلا کر ایک سلّی میں تبدیل کر دے۔ اس نے نذر مانی کہ جب یہ تمنّا پوری ہو جائے گی تو اس سال رعیت پر سے تہائی محصول معاف کر دے گا اس کا ارادہ تھا کہ یہ سلّی بابِ عامہ پر رکھ دی جائے گی تاکہ ہر کس و ناکس کو اطلاع ہو جائے کہ اس کے پاس ایک کروڑ دینار ہیں اور وہ اس سے مستغنی ہے۔ مگر تمنّا کی تکمیل سے پہلے اسے موت نے آلیا۔ معتضد کے بعد مُکتفی (۲۸۹ - ۲۹۵ھ) کا دور آیا۔ اس نے خزانہ کو ایک کروڑ چالیس لاکھ تک پہنچا دیا۔

۲۔ خراج اور سرکاری املاک سے حاصل شدہ رقوم جو فارس اور کرمان سے (اخراجات وضع کرنے کے بعد) حاصل ہوتی تھیں۔ ۲۹۹ھ سے ۳۲۰ھ (۹۱۱ء سے ۹۳۲ء) تک ان رقوم کی سالانہ مقدار دو کروڑ تیس لاکھ رہی ہے۔ ان میں سے چالیس لاکھ بیت المال عام میں اور باقی ایک کروڑ نوّے لاکھ بیت المال خاص میں داخل کیے جاتے تھے۔ البتہ اس میں سے ان ہنگامی اخراجات کو وضع کر دینا ضروری ہے جن کی ان ممالک میں ضرورت پڑ جاتی تھی۔ چنانچہ ۳۰۳ھ (۹۱۵ء) میں خلیفہ نے ان ممالک کی فتح پر ستر لاکھ سے اندر صرف کیا تھا۔

۳۔ مصر اور شام کے اموال۔ مثلاً اہل ذمہ سے وصول ہونے والا جزیہ عوام کے بیت المال میں داخل کرنے کی بجائے خلیفہ کے بیت المال میں داخل کیا جاتا تھا جو امیر المومنین ہونے کے سبب اصولی طور پر اس کا حق دار تھا (!)

۴۔ وہ مال جو برطرف کیے ہوئے وزراء، سکرٹری اور افسران کے اموال اور ان کی جائدادوں کی ضبطی کے ذریعہ حاصل ہوتا تھا۔ اسی طرح وہ مال جو ترکوں سے حاصل کیا جاتا۔ [۱]

۵۔ خراج، اور املاک سے حاصل ہونے والی وہ رقمیں جو سواد اھواز اور مشرقی اور مغربی علاقوں سے

---

[۱] خلیفہ اپنے خادموں اور خاندان خلافت کے ان موالی کے مال ورثہ میں پاتا تھا جو صاحب اولاد نہیں ہوتے تھے۔ چونکہ یہ عموماً اعلیٰ عہدے دار ہوتے تھے جن کی آمدنی بہت زیادہ تھی لہذا اس ذریعہ سے خلیفہ کے خزانہ میں بہت سا مال آجاتا تھا۔

بیت المال خاص میں لائی جاتی تھیں۔

۶۔ وہ اموال جو خلفاء باقی بچا لیتے تھے۔ چنانچہ تیسری صدی ہجری کے دونوں آخری خلفاء (معتضد و مکتفی) دس لاکھ سالانہ بچاتے تھے۔ مقتدر بھی اتنا ہی بچا لیتا تھا۔ اس طور پر پندرہ سال کی بچت ایک کروڑ پچاس لاکھ ہوتی ہے یعنی اس رقم کا تقریباً نصف جو خلیفہ رشید نے چھوڑی تھی۔"

اس بیان سے واضح ہو جاتا ہے کہ 'خلیفہ' کہلانے والے بادشاہوں نے عام مسلمانوں کے اموال پر کتنی دست درازیاں کی تھیں، مالیات کا نقشہ اسلامی اصولوں سے کتنا مختلف ہو چکا تھا، ایک طرف دولت اور عیش پرستی کتنی زیادہ تھی اور دوسری طرف محرومی اور فقر و فاقہ کتنا شدید ہو چکا تھا، اور اسلامی سماج اسلامی طور طریق سے دور اور اسلامی اصولوں سے منحرف ہو جانے کے سبب کتنے انحطاط کا شکار ہو چکا تھا۔

چند بنیادی اصول

لیکن ان باتوں کے باوجود اسلام کی عملی تاریخ نے اتنا ضرور کر دکھایا کہ مالی پالیسی کے ضمن میں بہت سے بنیادی اصول طے کر جائے۔ باوجود اس رجعت کے جس سے انسانیت کی بدقسمتی سے اسے اپنے ابتدائی عہد ہی میں بنی امیّہ کی وجہ سے دوچار ہونا پڑا، اسلامی تاریخ نے اسلام کے بہت سے نظریات کو عمل کا جامہ پہنا کر دکھا دیا۔

عملی تاریخ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ :-

۱۔ غریب لوگ اسلام میں پیش قدمی کرنے والوں کے مقابلہ میں مالِ عام کے زیادہ حق دار ہیں۔ مسند احمد ابن حنبل میں آیا ہے کہ: ہم سے بکر بن عیسیٰ نے حدیث بیان کی ہے کہ ہم سے ابو عوانہ نے بروایت مغیرہ، بروایت شعبی، بروایت عدی بن حاتم، یہ روایت کی ہے کہ انھوں نے کہا ہے: میں اپنی قوم کے کچھ افراد کے ہمراہ عمر بن الخطاب رضؓ کے پاس گیا وہ طے کے بعض افراد کے لیے دو ہزار کے وظیفے مقرر کرنے لگے اور مجھ کو نظر انداز کرتے رہے۔ عدی ابن حاتم کہتے ہیں کہ میں آپ کے سامنے آ کھڑا ہوا، پھر بھی انھوں نے اعراض کیا، میں پھر ان کے سامنے آیا مگر پھر بھی اُنھوں نے نظریں پھیر لیں۔ میں نے عرض کیا، امیر المومنین، کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ حضرت عمر یہ سُن کر ہنسنے لگے، یہاں تک کہ ہنستے ہنستے پیٹھ کے بل چت لیٹ گئے۔ پھر آپ نے فرمایا، ہاں، بخدا میں تمھیں خوب پہچانتا ہوں۔ تم اس وقت ایمان لائے جب دوسروں نے کفر پر اصرار کیا، تم اس وقت آگے بڑھے جب دوسروں نے پیٹھ دکھائی تم نے ان حالات میں وفاداری کا ثبوت دیا جب دوسرے دھوکہ دے گئے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ زکوٰۃ کی وہ پہلی رقم جس سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کا چہرہ دمک اٹھا تھا، بنو طے کی

زکوٰۃ کی رقم تھی - جسے میں رسول اللہ کی خدمت میں لایا تھا۔۔۔۔" پھر حضرت عمرؓ نے عذر پیش کرنے شروع کر دیے اور فرمایا: میں نے اس مال میں سے صرف ایسے لوگوں کے لیے وظائف مقرر کیے ہیں جن پر عائد ہونے والی ذمہ داریوں نے ان کو فاقوں سے نڈھال کر رکھا ہے کیونکہ وہ لوگ اپنے اپنے قبیلہ کے اکابر ہیں -

اُن حضرت عمرؓ کا یہ قول جنھوں نے عطایا کی تقسیم میں اسلام میں پیش قدمی کرنے والوں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا تھا، بڑی اہمیت کا حامل ہے اور اس سے بہت کچھ ثابت ہوتا ہے - درحقیقت اسلامی سماج میں "ضرورت" اوّلین بنائے استحقاق ہے - یہ اصول بتاتا ہے کہ اسلام ضرورت مندی اور فقر و فاقہ کو کتنا ناپسند کرتا ہے اور اس کے ازالہ کو تمام دوسرے امور کے لحاظ پر مقدم رکھتا ہے -

۲ - یہ کہ اسلام کے لیے یہ بات بالکل ناقابل برداشت ہے کہ ایک طرف تو دولت کی بے انتہا فراوانی ہو اور دوسری طرف اس سے یکسر محرومی، وہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے صاحب امر کو اس بات کی پوری آزادی دیتا ہے کہ موجودہ حالات کے مطابق مناسب اقدامات کرے - یہ ایک ایسا اصول ہے جو تاریخی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے - آپ نے بنی نضیر کی فئے کو تمام تر صرف فقراءِ مہاجرین میں تقسیم کیا تاکہ پہلی فرصت میں اسلامی سماج میں یک گونہ توازن پیدا کر سکیں - اس سے صرف دو غریب انصاری مستثنیٰ تھے، (جنھیں آپ نے اس موقعہ پر حصہ دیا تھا) پھر قرآن نے آکر اس تاریخی نظیر پر مہر تصدیق ثبت کر دی" - کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" تاکہ (مال و دولت) صرف تمھارے مال دار لوگوں کے درمیان گردش کرتا نہ رہ جائے -

یہ نظیر بڑی معنی خیز، پختہ اور اہم ہے - اس کی رو سے صاحب امر ہر وقت اس بات کا اختیار رکھتا ہے کہ خزانۂ عامہ میں سے اہل حاجت کی اتنی مدد کرے جس سے اسلامی جماعت میں توازن بحال ہو جائے اور اسلام کی یہ خواہش پوری ہو جائے کہ مختلف طبقوں کے درمیان ایسا تفاوت نہ پایا جائے جو اس عام توازن کو درہم برہم کر دے -

۳ - استطاعت اور عدم استطاعت کی مناسبت سے محصول کی مختلف شرحیں مقرر کرنے کا اصول چنانچہ جب ذمیوں پر ٹیکس لگایا گیا تو ان کے مختلف گروہوں کے لیے ذیل کی شرحیں مقرر کی گئیں -

ا - مال دار لوگ - ان سے فی کس ۴۸ درہم سالانہ لیا جائے گا -

ب - متوسط الحال لوگ - ان سے فی کس ۲۴ درہم سالانہ لیا جائے گا -

ج - غرباء جو کسی پیشہ کے ذریعہ کما رہے ہوں - ان سے ۱۲ درہم سالانہ لیا جائے گا - طے کر دیا گیا کہ کسی ایسے غریب آدمی سے جزیہ نہیں وصول کیا جائے گا جو خود صدقہ کا مستحق ہو۔ کسی بے روزگار، اندھے، اپاہج، پاگل یا کسی بھی آفت رسیدہ سے جزیہ نہیں لیا جائے گا، جزیہ صرف آزاد اور سمجھ دار مردوں سے لیا جاسکتا ہے، عورتوں اور بچوں پر جزیہ نہیں۔

قحط کی وجہ سے جب عام الرمادہ میں عام طور پر فاقہ کشی کی نوبت آگئی تو حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے محصّل نہیں روانہ کیے بلکہ قحط ختم ہونے تک لوگوں کو معاف رکھا۔ جب لوگوں کو پھر اطمینان نصیب ہوا اور خوش حالی لوٹ آئی تو آپ نے اپنے محصّلین کو بھیجا۔ انھوں نے ذی استطاعت افراد سے دو حصوں کا مطالبہ کیا۔ ایک حصّہ عام الرمادہ کا اور ایک حصّہ سال رواں کا، اور غیر مستطیع افراد کو معاف رکھا۔ پھر آپ نے یہ حکم دیا کہ ایک حصّہ ان غیر مستطیع افراد کے درمیان تقسیم کر دیا جائے اور عامل آپ کے پاس صرف دوسرا حصّہ لے کر آئیں۔

۴۔ یہ اصول کہ محاصل کی وصولی کی خاطر کسی کو ضروریاتِ زندگی سے نہ محروم کیا جائے اور نہ وصولی میں قوّت سے کام لیا جائے۔ علی ابن ابی طالب نے اپنے ایک عامل سے کہا۔ جب تم اُن کے پاس جاؤ تو (محاصل وصول کرنے کی خاطر) ان کے گرمی یا جاڑے کے کپڑے، یا کھانے کی چیزیں یا سواری کا جانور نہ فروخت کرنا۔ وصولی کے لیے کسی کو ایک کوڑا بھی نہ مارنا، نہ کسی کو ایک پاؤں پر کھڑا کرنا چاہے کتنا ہی خراج کیوں نہ باقی ہو، کیونکہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی ضروریات سے فاضل مال وصول کریں۔"

۵۔ "ہر شخص کو اس کے کام کے مطابق" کے اصول کے پہلو بہ پہلو یہ اصول کہ "ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق"۔ نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلم نے مالِ غنیمت میں سے اکیلے آدمی کے لیے ایک حصہ اور شادی شدہ کے لیے دو حصّے مقرر کیا تھا۔ اس سے یہ ثابت ہوا کہ وظائف کی تعیین میں محنت کے ساتھ حاجت کا بھی لحاظ رکھا جانا چاہیے، ورنہ جہاد میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ دونوں کو یکساں مشقت اُٹھانی پڑتی ہے۔ البتہ شادی شدہ .... کی ضرورت دوچند ہے لہذا اس کا حصّہ بھی دوگنا کر دیا گیا۔ معلوم ہوا کہ صرف ضرورت بھی اسلام میں حصولِ ملکیت کا ایک مستقل بالذات ذریعہ ہے۔ اس اصول کو اجتماعی تحفظ (Social security) کے باب میں بہت اہمیت حاصل ہے۔

۶- ہر مجبور اور ضرورت مند کے لیے اجتماعی تحفظ کا اصول۔ حضرت عمرؓ نے نوزائیدہ بچے کے لیے سو درہم مقرر کیے تھے جب بچہ کچھ بڑا ہو جائے تو دو سو درہم اور جب بالغ ہو جائے تو اس سے بھی زیادہ دیے جاتے تھے۔ جو بچے پھینکے ہوئے ملتے تھے ان کے لیے سو درہم مقرر ہوتا تھا اور اس کی سرپرستی قبول کرنے والے کو بچہ کی پرورش کی خاطر مزید وظیفہ دیا جاتا تھا۔ بچہ کی دودھ پلائی اور دیگر اخراجات بیت المال سے ادا کیے جاتے تھے اور جب وہ بڑا ہو جاتا تھا تو اسے دوسرے بچوں کے برابر حصہ ملتا تھا۔

حضرت عمرؓ کی یہ فراخ دلی اسلام کی فراخ دلی کا پرتو ہے کیونکہ پھینکا ہوا بچہ اپنی جگہ بالکل معصوم ہے اور اپنے مجرم ماں باپ کے گناہ کا قطعاً ذمہ دار نہیں، اس سے قبل ہم بتا چکے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اندھے، بہودی اور کوڑھ کے مریض عیسائیوں کے لیے بیت المال سے رقمیں مقرر کر دی تھیں، عمرؓ کے مزاج میں یہ اسلامی فراخ دلی یکساں طور پر سارے انسانوں کے لیے تھی نہ کہ صرف مسلمانوں کے لیے یہ ضرورت، مجبوری، اور محرومی کے خلاف اجتماعی تحفظ ہے۔

۷- یہ اصولی سوال کہ "کہاں سے حاصل ہوا؟" ——— کیونکہ حاکم کو کوئی ایسا خصوصی تحفظ نہیں حاصل کہ جماعت اس کے کمائے ہوئے مال کے بارے میں اس سے محاسبہ نہ کر سکے، تاکہ اسے معلوم ہو کہ یہ مال اُسی کا مال ہے یا جماعت کا ہے۔ اس اصول کی تعیین اس بات کی ضامن ہے کہ کوئی حاکم مال عام پر دست درازی سے پہلے کئی بار سوچے گا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے سارے والیوں کے ساتھ اس اصول پر عمل کیا، پھر حضرت علیؓ نے بھی بعض والیوں کے ساتھ ایسا کیا۔

۸- اصول زکوٰۃ، جو ان تاریک ترین ادوار میں بھی نہیں معطل ہوا جو روح دین سے دور ہو گئے تھے۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے عہد کے شروع میں اہل ردّہ سے جنگ کے بعد ایک شخص نے بھی نظری یا عملی طور پر اس کا انکار نہیں کیا، تا آنکہ ہمارے زمانہ میں مغربی تہذیب کو غلبہ نصیب ہوا اور اس کے نتیجہ میں اسلامی اصولوں میں سے آخری زندہ اصول بھی پامال ہو گیا۔

۹- عام اجتماعی کفالت کا اصول، جو ہر بستی کے لوگوں کو ہر اس فرد کے بارے میں جواب دہ قرار دیتا ہے جو وہاں بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہو جائے۔ یہ جواب دہی فوجداری قانون کے تحت آتی ہے۔ ہر بستی والوں پر اس طرح مر جانے والے فرد کی دیت دینی واجب ہوتی ہے۔ وہ اس فرد کے قاتل قرار پاتے ہیں جو ان کے درمیان رہتے ہوئے بھوک کی وجہ سے موت کا شکار ہو گیا۔ یہ اصول ایک طرح کی مالی اشتراکیت (اسود زمہ ...)

قائم کرتا ہے۔ اس اصول کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ بھوکے یا پیاسے کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ اگر اسے بھوک یا پیاس کے سبب اپنی جان جانے کا اندیشہ ہو تو وہ کھانا یا پانی رکھنے والے سے جنگ کر سکتا ہے اور اگر یہ اُسے قتل کر دے تو اس پر نہ دیت لازم آئے گی نہ اُخروی عذاب ہوگا۔

۱۰۔ حرمتِ سود، اور تنگ دستی کی شکل میں قرض دار کو مہلت دینے کا اصول۔ سود کی حرمت بھی برابر قائم رہی تا آنکہ جدید تہذیب نے آکر اسے مباح کر دیا۔ یہ بلا فرانسیسی قانون کے ذریعہ ہمارے سر آئی اور اس نے اِسے ہماری عام اقتصادی زندگی کی ایک اہم بنیاد بنا دیا حالانکہ اس کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ اس کے رواج کی اصل وجہ صرف یہ تھی کہ عملی زندگی سے اخلاقی قدروں کا اثر مٹ گیا تھا اور لوگوں کے دلوں سے نیکی اور باہمی تعاون کی اسپرٹ رخصت ہو چکی تھی۔ در ایں حالیکہ اسلام اس اسپرٹ کو سماج کی بنیاد اور لوگوں کے باہمی معاملات کی اصل قرار دیتا ہے۔

یہ باتیں بر و مواساۃ اور اجتماعی تکافل کی ان قدروں کے علاوہ ہیں جو قانون کے ذریعہ نافذ کرنے کی چیزیں نہیں۔ خود ہمارا ماضی قریب جسے ہمارے اجداد نے نہیں ہمارے آباء نے ہر اسلامی دیہی علاقے میں دیکھا ہے، جو عالم اسلامی پر مغرب کی مادی تہذیب کے استیلاء کے باوجود اب بھی کسی قدر باقی ہے، اسلامی معاشروں پر اسلامی اسپرٹ کے اثرات کی گواہی دیتا ہے۔ وہاں اس اسپرٹ کے فیض سے قانون اور جبر کی کوئی ضرورت نہیں باقی رہ گئی تھی۔ یہ بے شمار اوقاف جو آج اپنے اصل مقاصد کے خلاف استعمال کیے جا رہے ہیں اور جن پر مختلف لٹیروں نے مختلف ناموں کے تحت مختلف بہانوں سے قبضہ کر رکھا ہے، یہ سب ماضی قریب و بعید کے اُن مسلمانوں کے دلوں میں موج زن رحمت، نیکی، کفالت باہمی اور اجتماعی تحفظ کے جذبات پر گواہ ہیں۔ ان کے دلوں کو مغرب کی سنگ دل، مردہ شعور، جامد مادی تہذیب نے نہیں بگاڑا تھا۔

کمزوروں کے اجتماعی تحفظ کا یہ خیال اتنا بڑھ گیا تھا کہ انسانوں کے علاوہ حیوان بھی اس سے فیض یاب ہوئے۔ چنانچہ کمزور جانوروں کی پناہ گاہ بنانے کے لیے بھی بعض وقف کیے گئے ہیں جہاں آکر وہ بھوک اور پریشاں حالی سے بچ سکتے ہیں۔

ابتدائی مرحلہ میں چند غلط تصورات کے غالب آجانے کی وجہ سے اسے جو نقصان پہنچا ہے اس کے باوجود حقیقی اسلام یہی ہے۔

یہ ہے اسلام اپنی اُس عملی تاریخ میں جو واقعات کے پیکر میں سامنے آچکی ہے۔ جہاں تک اس کے عام اصولوں کا سوال ہے اسلام میں ہمیشہ یہ استعداد موجود رہی ہے اور رہے گی کہ وہ عدل کی خاطر نئی تنظیمیں عمل میں لائے اور نئے قوانین بنائے۔ آج وہ یہ کر سکتا ہے کہ :

- املاک عامہ (Public Property) کی ایسی تقسیم عمل میں لائے کہ اجتماعی توازن بحال ہو سکے اور جو لوگ بھی پیدائش دولت پر قادر ہوں ان کو وسائل پیدائش فراہم کیے جا سکیں۔
- مال داروں کی دولت، یعنی سرمایہ، پر بیت المال کے لیے اتنا ٹیکس عائد کرے جتنا کہ بیرونی جنگوں میں امت کے دفاع کے لیے یا اس کی تیاری اور دوسرے ناگہانی امور کے لیے امت کو تیار رکھنے کے لیے ناگزیر ہو۔
- مفاد عامہ سے متعلق ساری چیزوں کو ان نفع اندوزوں اور سٹہ بازوں کے ہاتھ سے لے کر قوم کے ہاتھ میں دے دے جو قومی مفاد کا ذرا بھی پاس و لحاظ نہیں کرتے۔
- اجرت کی کم سے کم شرح مقرر کر دے تاکہ محنت اور اس کے اجر کے درمیان عدل قائم ہو اور محنت و سرمایہ کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہو، اور ہر فرد کو ایک ایسے معیار زندگی کی ضمانت دی جا سکے جو مقام انسانیت کے مطابق ہو۔

بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام اصولوں اور تاریخی نظائر کے پیش نظر اسلام میں ان قوانین کی، اور اس طرح کے دوسرے قوانین کی، پوری گنجائش ہے۔

اسلام اپنی لچک اور جامعیت کے سبب انسانیت کے ان تمام تجربات کو اپنے اندر سمو لینے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے جو انسانی سماج کے لیے مفید اور موزوں ہوں، اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے کسی اصول سے نہ ٹکراتے ہوں اور اس کے منصوص ضوابط میں سے کسی کے خلاف نہ جاتے ہوں، اور ساتھ ہی اُس کے ان بلند مقاصد سے ہم آہنگ ہوں جو وہ زندگی کی نمو اور ترقی کے لیے اپنے سامنے رکھتا ہے۔

اس کتاب کا منشا یہ نہیں کہ ان مخصوص سماجی ضوابط کا تفصیلی مطالعہ کرے جو ان بنیادی اصولوں کی روشنی میں بنائے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب کا کام صرف یہ ہے کہ اسلام میں اجتماعی عدل کی عام بنیادوں کی وضاحت کر دے۔

آٹھواں باب

اسلام کا حال اور مستقبل

ہم ایک ایسی اسلامی زندگی کے از سرِ نو شروع کرنے کی طرف دعوت دیتے ہیں جس پر اسلامی اسپرٹ اور اسلامی قانون کی حکمرانی ہو اور جو ہمارے نام نہاد اسلام اور حقیقی اسلام کے عملی نمونوں میں مطابقت پیدا کر سکے ہم نے قرآن و سنّت کی روشنی میں اس سماج کی نظریاتی بنیادوں کو واضح کیا پھر تاریخ سے اسلامی معاشرہ کی چند جھلکیاں دکھلائیں۔ اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ، کیا یہ ممکن ہے کہ ہم آج یا کل، اس قسم کی اسلامی زندگی کا کوئی نمونہ سامنے لا سکیں ؟

درحقیقت صرف یہ بات کافی نہیں کہ اسلام ماضی میں زندہ رہا ہے اور عہد نبوت اور عہد خلافت میں ایک مکمل، مستحکم، اور صحت مند سماج کی تعمیر عمل میں لا چکا ہے۔ اس زمانہ کے بعد زندگی میں عظیم فکری، اقتصادی، سیاسی، اور معاشرتی تغیرات رونما ہو چکے ہیں، بلکہ، انسان کے نقطۂ نظر سے، خود زمین اور اس کی قوتوں میں بھی مادّی تغیرات رونما ہو چکے ہیں۔ ..... لہٰذا مندرجہ بالا سوال کا جواب دینے سے پہلے ہمیں ان باتوں پر غور کرنا اور ان کی پوری پوری رعایت محفوظ رکھنا ہوگا۔

اس بحث میں ہم صرف نظریاتی دلیلوں پر اکتفا نہیں کر سکتے بلکہ ہمیں حقیقت پسندی کے ساتھ تاریخ پر بھی نظر رکھنی ہوگی۔ چنانچہ ضروری ہے کہ ہم معاملہ کے اس پہلو پر غور کریں کہ کیا وجہ ہے کہ سیاسی اور معاشی نظام میں اسلامی اسپرٹ کی فرمانروائی عہد نبوی کے بعد ایک مختصر عرصہ سے زیادہ نہیں قائم رہ سکی ؟ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کے اندر پنہاں قوتِ حیات اور اس کے داخلی وسائل اسے زیادہ سے زیادہ اتنی مدّت تک باقی رکھ سکتے تھے ؟

ان دونوں سوالات پر غور کرنے سے قبل ذیل کی دو حقیقتیں سامنے لانا ضروری ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ اسلامی معاشرہ کو کسی طرح بھی " اسلامی " نہیں قرار دیا جا سکتا ۔ اوپر ہم قرآن کی نص سامنے لا چکے ہیں جس کی کوئی تاویل نہیں کی جا سکتی ۔ اِلّا یہ کہ دھاندلی سے کام لیا جائے ۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۔ (المائدہ : ۴۴)

جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں ۔

ظاہر ہے کہ موجودہ سماج میں ہم اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ۔ اس حقیقت کے سامنے اُس اسراف اور عیش پرستی کا تو ذکر ہی کیا جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے ، یا وہ بھوک اور محرومی جس کی بابت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ :

ایما اھل عرصۃ اصبح فیھم امرؤ جائعاً فقد برئت منھم ذمۃ اللّٰہ تبارک وتعالیٰ ۔

جس بستی میں کوئی آدمی رات بھر بھوکا رہ کر صبح کرے اس کے باشندوں کی حفاظت سے اللہ تبارک وتعالیٰ بری ہو جاتا ہے ۔

اور جس کے بارے میں امام احمد ابن حزم کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کسی بستی میں کوئی آدمی بھوک سے مر جائے تو اس کے باشندے اس فرد کے قاتل قرار پائیں گے اور ان سے مقتول کی دیت وصول کی جائے گی ۔ اسے اور اس جیسی دوسری باتوں کو اس لیے ہٹائیے کہ بعض کٹ حجت لوگ ان پر خواہ مخواہ کی بحثیں کرنے لگتے ہیں ..... مذکورہ بالا نص قرآنی اس طرح کی مثالوں کے بغیر بھی ہم پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے ۔ آج کی سوسائٹی میں جو قوانین رائج ہیں وہ اس کے انطباق کے لیے کافی دلیل ہیں ۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں کہ اسلامی سماج اسلام سے پوری طرح وابستہ رہا ہو اور اس کے باوجود وہ کمزور پڑ گیا ہو ، یا انسانیت کے قافلہ سے پیچھے رہ گیا ہو ۔ کمزور پڑ جانا اور پیچھے رہ جانا اسلام کو ترک کر دینے کے بعد کی بات ہے ۔ اس حقیقت کے تسلیم کر لینے کے بعد ان تمام جھوٹے الزامات کا پول کھل جاتا ہے جو اہل مغرب اس دین کے خلاف عائد کرتے ہیں اور جن کی نظیر کے طور پر وہ مسلمانوں کی تاریخ سے ثبوت پیش کرتے ہیں ، ہمارے یہاں کے بعض فریب خوردہ یا تنخواہ دار مصنفین ان باتوں کو لے اڑتے ہیں اور چٹخارے لے لے کر انھیں دہراتے ہیں ۔ بسا اوقات وہ سیکڑوں صفحات انہی باتوں سے سیاہ کر ڈالتے ہیں ۔ یہ لوگ آزادی فکر اور باریک بینی کے دعویدار ہیں لیکن درحقیقت یہ سارے الزامات محض بے بنیاد ہیں جنھیں کچھ فریب خوردہ ، کچھ تنخواہ دار ، اور کچھ دھوکہ باز لوگ دہراتے رہتے ہیں ۔

اب ہم اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹیں گے اور پہلے مذکورہ بالا دونوں سوالوں میں سے دوسرے سوال

کا جواب دیں گے، یعنی یہ کہ: روح اسلامی کی بڑھتی ہوئی حکمرانی عہد نبوی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کیوں موقوف ہو کر رہ گئی؟

اس سلسلہ میں ذیل کے تاریخی حقائق قابلِ غور ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ روح اسلامی کی فرماں روائی صرف جزئی طور پر ختم ہوئی تھی، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ یہ فرمانروائی بالکل ختم ہو گئی ہو۔ اسلامی اسپرٹ صرف سرکاری امور، یعنی حکومت کی حد تک معطل ہوئی تھی، خادم انسانیت خلافت ظلم و جبر کی فرماں روائی میں تبدیل ہو گئی۔ خزانۂ عامہ حکّام، ان کے رشتہ داروں، ان کے حوالی موالی، اور خوشامدی لوگوں کے لیے مباح ہو گیا اور وہ لوگ محروم کر دیے گئے جو اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کی رو سے اس کے اصل مستحق تھے۔ مگر سماج میں اسلام کی باقی ساری تعلیمات رائج رہیں۔ مثلاً: نیکی، رحم و کرم، تعاون و تکافل، حسن سلوک اور رواداری، آزادیٔ ضمیر، انسانی مساوات، زکوٰۃ و صدقات کی ادائیگی، اور بہت سی دوسری ایجابی اور سلبی صفات حسنہ جن کو اسلام نے لوگوں کے اندر عملاً پیدا کر دیا تھا۔ آج بھی یہ تعلیمات کسی نہ کسی حد تک بہت سی اسلامی سوسائٹیوں میں جاری و ساری ہیں۔ یہی نہیں بلکہ گذشتہ صدی تک شریعت اسلامی پر قانون ملکی کے طور پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اس کے بعد ہم نے فرانسیسی قانون کا سہارا لیا اور اس آخری مظہر کو بھی ختم کر دیا جو عقیدۂ اسلامی سے ہمارا تعلّق جوڑے ہوئے تھا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سیاسی نظام اور طرز حکمرانی میں جو تغیّر رونما ہوا وہ محض ناساز گار حالات کا نتیجہ تھا جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں یہ تغیّر بھی جزئی تغیر تھا۔ سوءِ اتفاق یہ ہوا کہ حکومت اُمیّہ کے ہاتھ میں چلی گئی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں یہ لوگ پسِ پردہ رہے اور معاویہ کے وقت سے علی الاعلان اُن کی حکومت ہو گئی۔

مجھے پورا یقین ہے کہ اگر عمرؓ کا دور چند سال اور باقی رہ جاتا، یا شیخین کے بعد تیسرے خلیفہ حضرت علیؓ ہوتے، بلکہ اگر مسند خلافت پر آتے وقت حضرت عثمانؓ کی عمر جتنی تھی اس سے بیس سال کم ہوتی تو بڑی حد تک اسلامی تاریخ کا رُخ بدل جاتا۔ حضرت عمرؓ فیصلہ کر چکے تھے کہ مال داروں کے فاضل اموال لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیں گے اور آئندہ تقسیم عطایا میں حضرت ابو بکرؓ کی طرح مساویانہ تقسیم کی پالیسی اختیار کر لیں گے۔ اگر حضرت عمرؓ ایسا کر گذرتے تو کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے خلاف آواز اٹھاتا۔ اور ایک ایسی پالیسی کے سلسلہ میں ان کی مخالفت کرتا جو خود اسلام نے طے کر دی ہے۔ حضرت عمرؓ کا ضمیر اور دین کے ساتھ ان کی خیر خواہی اور ان کا لگاؤ ہر شبہ سے بلند تھا۔

حضرت عمرؓ کا رعب داب، خاص کر جب کہ دین بھی ان کی تائید کر رہا ہو، کسی کی خواہشات یا اغراض کو خاطر میں لانے والا نہ تھا۔ اگر عمرؓ کے ہاتھوں یہ مہم انجام پا جاتی تو عالم اسلامی میں اقتصادی اور معاشرتی توازن پوری طرح بحال ہو جاتا اور فتنہ آغاز ہی میں دب کر رہ جاتا، یا کم از کم عرصہ دراز تک کے لیے ملتوی ہو جاتا۔

حضرت عمرؓ کے بعد اگر حضرت علیؓ خلیفہ ہوئے ہوتے تو وہ بھی عمرؓ ہی جیسی پالیسیاں اختیار کرتے۔ آپ کی طرف سے قریش کا جو بھی رویہ ہوتا، اور اگرچہ آپ کے خلاف ان کی شوریدہ سری اس سے کہیں زیادہ ہوتی جتنی حضرت عمرؓ کے سلسلہ میں ممکن تھی، لیکن نوبت فتنہ اور نافرمانی تک نہ پہنچتی کیونکہ اس وقت امیہ سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ ان کے اکابر کو نہ تو اسلام میں کوئی خاص اولیت حاصل تھی نہ انھوں نے جہاد میں کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔ یہ لوگ ان بخشے ہوئے لوگوں میں سے تھے جو فتح کے دن اسلام لائے ہوئے تھے جب کہ اسلام کا غلبہ مکمل ہو چکا تھا فوج اور ممالک مفتوحہ کے دوسرے افسران کی طرح بنو امیہ بھی افسروں اور سرکاری ملازمین کی پوزیشن رکھتے تھے انھیں اس وقت تک کوئی خصوصی حیثیت یا قوت نہیں حاصل ہوئی تھی جو انھوں نے حضرت عثمان کے تیرہ سالہ دور خلافت میں حاصل کر لی۔

پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ اسلام کے عین دور عروج میں بنو امیہ کو یہ تغیرات برپا کرنے کا موقع کیسے مل گیا؟ کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں کہ اسلامی نظام کا مزاج ہی ڈھیلا اور بقاء کی صلاحیتوں سے محروم ہے، یا کم از کم اس بات کا کہ وہ اپنے اندر ایسے تحفظات نہیں رکھتا جو اسے تغیرات سے بچا سکیں۔

یہ اعتراض بہت وزنی ہے مگر مبنی بر انصاف نہیں۔ ضروری ہے کہ ہم اُس دور میں اسلامی حکومت کی حالت کا جائزہ لیں اور ظاہری قوت و شوکت کے پہلو بہ پہلو ضعف و انتشار کے پوشیدہ اسباب کا پتہ چلانے کی کوشش کریں۔

بلاشبہ وہ زمانہ اسلام کے جوش و خروش کے ساتھ اُبھرنے کا زمانہ تھا، اور اس اعتبار سے یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ اُمیہ کو اس کی یہ گت بنانے کا موقع کیسے مل گیا۔ لیکن یہ حقیقت بھی اس سے کچھ کم اہم نہیں کہ ایک تیز رفتار فتح نے جس کی انسانی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی، اسلامی معاشرہ میں آناً فاناً انسانوں کی ایک کثیر آبادی کو شامل کر دیا تھا۔ یہ لوگ نسل، تہذیب، زبان، ذہنی معیار، رسوم و رواج، اور روایات، ہر اعتبار سے مختلف گروہوں پر مشتمل تھے، اسلامی روح کی قوت اور ان رسوم و روایات پر اس کی اثر اندازی کتنی زیادہ

کیوں نہ رہی ہو اس نئی روح کو پوری طرح قدم جمانے کے لیے بہرحال وقت درکار تھا پھر اس وجدانی احساس کو اجتماعی قدروں، زندہ عملی اداروں، اور رسوم و روایات کی شکل اختیار کرنے کے لیے بھی کافی عرصہ درکار تھا۔ ایسی نازک گھڑی میں روح اسلامی پر اُمیہ کا حملہ بڑا ناوقت ثابت ہوا۔ اگر اس میں کچھ عرصہ اور تاخیر ہوتی تو یہ اسلام کی وہ گت نہ بنا سکتے جو اُنھوں نے بنائی۔

اور پھر ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ معاویہ کے زیادہ تر مددگار شام کے مفتوحہ علاقہ کے تھے نہ کہ خاص جزیرۂ عرب کے۔

رہی یہ بات کہ اسلامی نظام اپنے اندر ایسے تحفظات نہیں رکھتا جو اسے انقلاب سے بچا سکیں تو اس حقیقت کے پہلو بہ پہلو کہ اس نظام کو جڑ پکڑنے سے پہلے انقلاب سے دوچار ہو جانا پڑا، یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کوئی بھی نظام یقینی تحفظات کا حامل نہیں ہوتا۔ اگر یہ حقیقت نہیں تو بتائیے کہ یورپ میں جمہوری نظام کن داخلی تحفظات کا حامل ہے جب کہ یہ جمہوری نظام پوری طرح قدم جما چکا ہے اور اسے اتنا موقع مل چکا ہے کہ اپنے مزاج کے مطابق اداروں اور رسوم و رواج کی شکل عمل میں لا سکے۔ ایک طویل زمانہ تک حکمراں رہنے کے سبب یہ نظام زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ پر اثرانداز ہو چکا ہے۔ نازی انقلاب فسطائی انقلاب اور اسپین کے انقلاب کی کامیابی کے وقت نظام جمہوری کے داخلی تحفظات کہاں رکھے گئے تھے؟ وہ ممالک متحدہ امریکہ (U.S.A)، جس کو لوگوں نے یورپ سے ہجرت کر کے ایک آزاد سماج کی تعمیر کے لیے آباد کیا، وہاں آزادیِ رائے کی کیا ضمانت کام آئی جب کہ نشر و اشاعت کی چند کمپنیاں رائے بنانے اور رہنمائی کرنے میں مختار کل کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ کسی مخالف فکر کو عوام کے کانوں یا آنکھوں تک پہنچنے اور ان کے ذہن و فکر کو متاثر کرنے کا ذرا بھی موقع نہیں دیتیں۔

اسلامی نظام پر داخلی ضمانتوں سے عاری ہونے کا الزام تحفظ کے ان عملی امکانات کو بالکل نظرانداز کر کے لگایا جاتا ہے جو دنیا میں کسی نظام کو میسر آ سکتے ہیں۔ مزید براں، اُن تاریخی حقائق کو بھی نظرانداز کر دیا جاتا ہے جو حضرت عثمانؓ پر تنقید، یزید کے خلاف حجاز کی بغاوت، پھر قرامطہ اور دوسرے گروہوں کے استحصال، استبداد اور طبقاتی امتیاز کے خلاف عملی احتجاج اور بغاوت کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ تیرہ سو سال تک اسلام پر پے در پے جو حملے ہوتے رہے ان کے علی الرغم، روح اسلام آج بھی غیر اسلامی عناصر اور غیر اسلامی معیاروں کے خلاف برسرپیکار رہے۔

اب یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اسلامی روح کی اثراندازی کا اس طرح رک جانا اس روح کی کسی

کمزوری یا زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کی رعایت ملحوظ رکھنے کی صلاحیت کی کمی کی دلیل ہرگز نہیں بلکہ دراصل یہ ایک سوء اتفاق کے ناوقت پیش آجانے کا نتیجہ تھا ـــــ اگرچہ آگے ہم یہ دیکھیں گے کہ اسلامی اسپرٹ زندگی کے بہت سے شعبوں میں کارفرما رہی اور اس نے اجتماعی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو برابر متاثر کیا اور آج بھی متاثر کر رہی ہے۔ آگے چل کر جب حسن اتفاق نے اسلام کو پھر عمر بن عبدالعزیز جیسا ایک خلیفہ فراہم کر دیا، جس میں خلافت راشدہ کی روح کام کر رہی تھی، تو ایک بار پھر اسلام کا دور دورہ ہو گیا اور حقیقی اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ مگر اس خلیفہ کو بھی زمانہ نے اتنی مہلت نہ دی کہ وہ بگاڑ کو پوری طرح دور کر سکتا اور نظام مملکت میں اسلامی طور طریق کو پھر پوری طرح نافذ کر دیتا۔

عمر بن عبدالعزیزؒ کا تجربہ اس حقیقت کے حق میں ایک قوی دلیل ہے کہ اسلام میں جو طاقت پنہاں ہے وہ حقیقی طاقت ہے اور اس سے ہر زمانہ میں کام لیا جا سکتا ہے۔ چونکہ یہ تجربہ اُمیہ کے ظلم و جور کے تاریک دور کے بعد ہوا تھا لہٰذا آج بھی اسلامی حکومت کا دوبارہ قائم کر لینا عین ممکن ہے۔ کل جو کام عمر بن عبدالعزیز کے لیے ممکن تھا وہ آج جمہور مسلمین کے لیے بھی یقیناً ممکن ہے۔

ایک بار پھر ہم اس حقیقت پر زور دیں گے کہ اگرچہ نظام حکمرانی میں ـــــ بلکہ اس کے بعض شعبوں میں ـــــ اسلامی روح کی فرماں روائی معطل ہو گئی تھی لیکن فرد و اجتماع کی زندگی کے مختلف دوسرے پہلوؤں کو وہ برابر اپنا فیض پہنچاتی رہی۔ اس نے بہت سی اعلیٰ اقدار کو عمل کا جامہ پہنایا اور بہت سے اچھے نمونے پیش کیے۔ زندگی کے جو شعبے حکومت سے آزاد ہیں ان میں آج بھی یہ روح کارفرما ہے۔

فرانسیسی مؤرخ گوئی (A. Le Chatelier) اپنی کتاب "جدید مملکتوں کے درمیان اسلام کا مقام"[1] میں لکھتا ہے:

"مدغاسکر میں کم از کم ساڑھے سات لاکھ مسلمان ہیں۔ یورپ کے اکثر مورخین نے سیاہ فام برّاعظم میں اسلام کے پھیلنے کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ دین توحید حبشیوں کو عدل و مساوات جیسی نعمتیں عطا کرتا ہے جو انھیں بڑی محبوب ہیں، نیز یہ کہ وہ انھیں کاہنوں اور جادوگروں کے تسلّط سے نکالتا اور بدروحوں کے کابوس سے نجات دلاتا ہے۔"

---

[1] L'ISLAM DEVANT LE MONDE MODERNE. مترجم

گب صاحب اپنی کتاب WITHER ISLAM (اسلام کدھر؟) میں لکھتے ہیں [1]

"انسانیت کی ایک عظیم الشان خدمت ایسی ہے جسے بجا لانے پر اسلام ہر وقت قادر رہا ہے اس کے سوا کوئی دوسرا نظام نہیں جو مختلف انسانی نسلوں کو، جو ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکی ہیں، مساوات کے اصول کے تحت ایک کر دے۔ افریقہ، ہندوستان، اور انڈونیشیا کے عظیم اسلامی معاشرے، بلکہ چین کا نسبتاً کم تعداد معاشرہ اور جاپان کی مختصر سی اسلامی جماعت، سب اس بات پر شاہد ہیں کہ اسلام کے پاس آج بھی ایسی قوت موجود ہے جو نسل، رنگ اور طبقہ کے اختلاف پر قابو پا سکتی ہے۔ چنانچہ جب بھی مغرب و مشرق کی بڑی طاقتوں کی باہمی کشمکش موضوع بحث و تحقیق ہوگی ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کشمکش کے ازالہ کے لیے اسلام کی طرف رجوع کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

صلیبی جنگوں میں مسلمانوں کا طرز عمل اسلام کی طاقت و روح سے پوری طرح متاثر تھا۔ یہ طرز عمل پست حرکتوں، غدر و فریب، اور سنگ دلی سے پاک اور انسانیت کی وحدت میں کامل یقین پر مبنی تھا۔ اسے اس بات کا پورا شعور تھا کہ مذہب کے اختلاف اور عارضی دشمنی کے باوجود انسان اور انسان کے درمیان ایک مستقل رشتہ ہے۔ صلیبی جنگوں کی تاریخ صرف صلاح الدین کی بلند اسلامی اسپرٹ پر نہیں بلکہ ان تمام اسلامی فوجوں کی انسانیت اور شرافت پر گواہ ہے جنھوں نے ان طویل اور سخت جنگوں میں حصہ لیا تھا۔ حالانکہ خود صلیبیوں نے بہت سے وحشیانہ مظالم ڈھائے تھے۔ مثال کے طور پر ہم وہ واقعہ سامنے لاتے ہیں جو پہلی صلیبی جنگ میں ۱۵ جولائی ۱۰۹۹ء (۴۹۲ھ) کو بیت المقدس میں پیش آیا تھا۔ مسلمانوں نے مسجد مقدس میں پناہ لی تھی مگر صلیبیوں نے وہاں بھی ان کا پیچھا کیا، ان پر خوب تلواریں چلائیں اور حرم شریف میں خوب خون بہایا یہاں تک کہ وہاں خون کا دریا بہنے لگا۔ خود ان کے کمانڈر نے عربوں کے ایک گروہ سے امان دینے کا عہد کیا تھا مگر ان لوگوں نے اس عہد کو بھی پامال کر دیا۔[2] یہ صلیبیوں کی بربریت کا صرف ایک نمونہ تھا۔ آبرو ریزی، زندہ افراد کی اعضا تراشی، اور بچوں اور بوڑھوں پر ستم ڈھانے کے واقعات کا کوئی شمار نہیں۔

---

[1] صفحہ ۳۷۹ - مترجم۔ [2] "پہلی صلیبی جنگیں" مصنفہ استاذ حسن جبش۔

اس کے باوجود جب مسلمانوں کو ان وحشیوں کے خلاف غلبہ نصیب ہوا تو انھوں نے ان کے ساتھ بالکل اسلامی سلوک کیا۔ روح اسلامی میں اتنی طاقت تھی کہ اس نے ان کے جذبۂ انتقام کو دبا دیا اور انہیں انسانیت اور دین کے حدود میں رکھا۔

جب ہم اسلام میں مضمر قوّت حیات کا ذکر کریں تو ہمیں ان داخلی اور خارجی حملوں اور صدمات کو نہ بھولنا چاہیے جن کا اسے اپنی طویل تاریخ میں مقابلہ کرنا پڑا ہے اور جن کے مقابلہ میں یہ ہمیشہ ثابت قدم رہا ہے۔ اسی ثابت قدمی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اسلام انسانیت کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن عنصر بنا ہوا ہے۔ انسانیت کو اس کی موجودہ پیچ در پیچ الجھنوں سے نکالنے کے لیے آج بہت سے مغربی مفکّرین کی نظر انتخاب بھی اسی پر پڑ رہی ہے جیسا کہ ہم اوپر گوبِ ئی اور گبؔ کے بارے میں نقل کر چکے ہیں ——— اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں مصنّفین اسلام کی اصل روح کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہیں اور ان کی نگاہیں اس نظام کی گہری روحانیت کی جگہ اس کے افادی پہلو پر اٹک کر رہ جاتی ہیں۔ جیسا کہ ہم آگے قدرے تفصیل سے بتائیں گے، ایک خالصتہً مادّہ پرست تہذیب کی آغوش میں پروان چڑھنے کے باعث مغرب والوں کے لیے اس پاکیزہ روحانی عنصر کو پالینا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔

اوپر ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ اسلام کو داخلی طور پر سب سے پہلے جس حادثہ سے دوچار ہونا پڑا وہ امیّہ کے ہاتھوں رونما ہوا۔ یہ المیہ ایسے وقت پیش آیا کہ اسلام ابھی تازہ نمودار ہوا تھا، اس کے اصول عملی زندگی میں گہری جڑ نہ پکڑ سکے تھے، اس کی روحانی تعلیمات اور قانونی ہدایات نے مستقل اجتماعی رسوم اور حقیقی اور پائدار اداروں کی شکل نہ اختیار کی تھی۔

اب ہم اختصار کے ساتھ ان اہم صدمات کی طرف اشارہ کریں گے جو اس دین کو وقتاً فوقتاً پہنچتے رہے اور جن کے مقابلہ پر یہ اس طویل عرصہ ثابت قدمی کے ساتھ جما رہا۔

سب سے پہلا صدمہ عبّاسی حکومت کے قیام اور اس کے ایسے عناصر پر بھروسہ کر لینے سے پہنچا جو اسلام میں نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ ابھی یہ عناصر اسلام کے حق میں پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے۔ قومی تعصب ان کے مزاج میں راسخ تھا۔ اور ان کا اسلام اس عصبیت سے بُری طرح متاثر ہوتا رہتا تھا۔ آگے چل کر عبّاسی حکومت نے ان لوگوں کو چھوڑ دیا جن کے سہارے وہ اب تک قائم تھی اور جو اب کچھ کچھ اسلام کے رنگ میں رنگتے چلے جا رہے

تھے۔ ان کو چھوڑ کر اس نے ترک، تراک، ویلم اور دوسری قوموں پر اعتماد کیا حالانکہ یہ لوگ حقیقی اسلام سے یکسر نابلد تھے۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہو گیا کہ حکومت نے بالکل خلاف اسلام عناصر پر بھروسہ کر لیا اور اس کے نتیجہ میں خود ان لوگوں کا اثر قبول کرنے لگی۔ ان عناصر اور خود حکومت کا مقابلہ کرنے والی اور ان کے علی الرغم اسلام کو باقی اور زندہ رکھنے والی اگر کوئی چیز تھی تو روح اسلام تھی کیونکہ وہ زبردست قوت حیات اور مخفی طاقت کی حامل ہے۔

اس کے بعد تاتاریوں کے تباہ کن حملے ہوئے جنھوں نے پورے عالم اسلامی کو انگریزی درخشندگی سے تاراج کر دیا۔ بالآخر اسلام نے خود تاتاریوں کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس طرح جذب کر لیا کہ وہ اس کی قوت و استحکام کا ذریعہ بن گئے۔ مگر قبل اس کے کہ یہ عمل تکمیل کو پہنچتا ان حملوں نے اسلامی اسپرٹ کو شدید صدمہ پہنچا دیا اور اسلام کے اداروں اور رسوم پر گہرے اثرات مرتب کر دیئے۔ اگرچہ اسلامی حکومت تاتاریوں کے حملہ کے سامنے نہ ٹھہر سکی، لیکن خود امت اسلامیہ باہم مربوط اور طاقت ور رہی۔ امت بعض مخصوص قوانین کے سلسلہ میں دینی حدود سے دور چلی گئی مگر فی الجملہ دین کی بنیادوں پر قائم رہی۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رومن امپائر جس کو بنیادیں مستحکم کرنے اور ترقی کرنے کے لیے تقریباً ایک ہزار سال کا موقع ملا تھا، ہن اور گوتھ (GOTH) قوموں کے حملوں کے سامنے ایک صدی بھی نہ ٹھہر سکی اور اس طرح برباد ہوئی کہ چند علامات و آثار کے سوا کچھ بھی نہ باقی بچا۔ اس کے برعکس اسلامی حکومت کو دیکھیے کہ اسے جڑیں پکڑنے اور استحکام کے لیے بمشکل نصف صدی سے کچھ زائد وقت ملا تھا مگر وہ حکمراں خاندانوں کے باہمی جھگڑوں اور تاتاریوں اور دوسری اقوام کے حملوں کے علی الرغم ایک وسیع خطۂ زمین پر مسلسل قائم رہی۔ اسلام نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کی کتنی زبردست صلاحیت رکھتا ہے، یہ اس بات کا بیّن ثبوت ہے۔

آگے بڑھیئے تو مغرب میں طرابلس کی ٹریجڈی اور مشرق میں صلیبی جنگوں کا المیہ نظر آتا ہے۔ اسلام پہلے صدمہ کو نہ برداشت کر سکا، لیکن دوسرے سے فتح یاب ابھرا اور آج تک صلیبی جنگوں والی ذہنیت کی وحشیانہ دشمنی کا، خواہ وہ پوشیدہ طور پر حملہ آور ہو یا کھلم کھلا مسلسل مقابلہ کرتا چلا آ رہا ہے۔

مگر جس ٹریجڈی نے اسلام کی کمر توڑ دی وہ عہد حاضر میں رونما ہوئی جب یورپ ساری دنیا پر چھا گیا اور استعمار کا منحوس سایہ سارے عالم اسلامی پر پڑنے لگا۔ اس نے اسلامی اسپرٹ کو فنا کر دینے کے

لیے اپنی ساری قوتیں اکٹھا کرلیں۔ جو دشمنی اس نے صلیبی جنگوں سے ورثہ میں پائی تھی اس سے تحریک اور جذبہ حاصل کیا، مادی طاقت اور تمدنی ترقی کو ساتھ لیا، اور دوسری طرف اُمّتِ مسلمہ جس داخلی ضعف و انتشار کا شکار تھی اس نے استعمار کا کام آسان تر بنا دیا، اور اس طویل عرصہ میں یہ اُمت رفتہ رفتہ اپنے دین کی حقیقی تعلیمات و ہدایات سے دور ہوتی چلی گئی۔

اسلام اور مغرب

ہم کو ظاہری باتوں سے صلیبی ذہنیت رکھنے والی اس گہری دشمنی کے بارے میں دھوکہ نہیں ہونا چاہیے جو یورپ کی سرشت میں داخل ہے۔ ہمیں مذہبی آزادی کے احترام کے ڈھونگ سے مغالطہ نہ ہو، نہ ہم اِس خیالِ خام کا شکار رہیں کہ اب گذشتہ زمانہ کی طرح ایسے محرّکات نہیں باقی رہے جو یورپ کو اسلام دشمنی پر ابھاریں۔ لہٰذا آج وہ مسیحیت کے مفاد کی خاطر اس طرح کمربستہ نہیں جس طرح صلیبی جنگوں کے دوران میں تھا۔

یہ سب محض مغالطہ ہے، خالص فریب۔ گذشتہ جنگِ عظیم میں لارڈ ایلن بے (ALIEN BY) نے یہ کہہ کر یورپ کے ضمیر کی بالکل صحیح ترجمانی کی تھی کہ "صلیبی جنگیں درحقیقت آج ختم ہوئی ہیں"۔ سوڈان کا گورنر بھی اس وقت اِسی ضمیر کی ترجمانی کر رہا تھا جب اس نے جنوبی سوڈان میں حکومت کے سارے وسائل اور ساری قوتوں کو مشنریوں کے تابع بنا دیا تھا اور مسلمان تاجروں کو اس علاقہ سے گذرنے سے بھی روک دیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ بڑا معنی خیز ہے۔ ایک سرکاری ملازم نے جو عرصہ سے جنوب میں متعیّن تھا شمال کی طرف تبادلہ کے لیے متعدّد درخواستیں دیں مگر کامیابی نہیں ہوئی، پھر اسے ایک تدبیر سوجھی اور اس نے ایک دن بلند آواز سے نماز کے لیے اذان دی۔ یہ چیز دوسرے ہی دن اس کے تبادلہ کی وجہ بن گئی!

واضح رہے کہ انگلستان دوسرے یورپین ممالک کی بہ نسبت دوسرے مذاہب کے ساتھ اپنی پالیسی میں زیادہ رواداری، اخفاء سے کام لینے والا اور ہوشیار واقع ہوا ہے۔

بعض لوگوں کو واقعۃً تعجب ہوتا ہے کہ اسلام کے خلاف تعصب یورپ کے شعور میں اب اتنی شدت کے ساتھ کیسے باقی رہ سکتا ہے جب کہ یورپ خود مسیحیت سے بے زار ہو چکا اور وہ فضا ہی ختم ہو گئی جب اس کے کانوں میں صرف پادریوں اور یروشلم کی زیارت سے واپس آنے ہی کی آوازیں گونجا کرتی تھیں جیسا کہ صلیبی جنگوں کے زمانہ میں تھا۔ مگر جب ہم ذیل کے دو حقائق پر غور کرتے ہیں تو یہ تعجب ختم ہو جاتا ہے۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ "صلیبیوں نے جو شر پھیلایا تھا وہ صرف تلواروں کی جھنکار تک نہیں محدود تھا بلکہ اصلاً اور اولاً وہ ایک تہذیبی فساد تھا۔ یورپ کی فکر کے مسموم ہونے میں سب سے بڑا دخل اس بات کو حاصل ہے کہ یورپ کے لیڈروں نے اسلامی تعلیمات اور اس کی اعلیٰ اقدار کو مغرب کے جاہل عوام کے سامنے مسخ کر کے پیش کیا۔ اس وقت یورپ والوں کے ذہن میں اس مضحکہ خیز خیال نے جگہ بنالی کہ اسلام حیوانی جذبات اور شہوانیت پر مبنی دین ہے، اس کی عبادات دکھاوے کے مظاہر ہیں، اور قلب کے تزکیہ و تطہیر سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ یہ خیال جس طرح راسخ ہوا تھا اسی طرح باقی رہا۔ اسی دور میں محمدؐ رسول کی توہین "میراکتا" کہہ کر کی گئی تھی"۔ [1]

"بغض و کینہ کے یہ تخم ہر چہار طرف بو دیئے گئے تھے۔ صلیبیوں کی حمیّتِ جاہلیہ نے یورپ کے مختلف علاقوں میں پَر پُرزے نکالے۔ اسی ذہنیت نے اُندلس کے عیسائیوں کو اس بات پر ابھارا کہ اپنے ملک کے کاندھوں کو بُت پرستوں کے جوئے سے آزاد کرنے کے لیے جنگ کریں۔ اسلامی اسپین کی مکمّل تباہی میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ عرصہ دراز تک یہ جنگ بائی کاٹ اور محاصرہ کی شکل میں جاری رہی۔ اس عرصہ میں یورپ میں اسلام دشمنی کی جڑیں گہری ہوتی گئیں اور پھیلتی گئیں۔ جنگ کا انجام یہ ہوا کہ اسپین میں اسلامی دور کو ایسی وحشت و بربریت اور ظلم و ستم کے ذریعہ جڑ سے اکھاڑ پھینکا گیا کہ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ اس کامیابی پر پورا یورپ مسرّت و شادمانی کے غلغلوں سے گونج اٹھا، اگرچہ یہ لوگ یہ جانتے تھے کہ اس کے نتیجہ میں وہاں علم اور تمدّن کو بھی فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اور اس کی جگہ قرونِ وسطیٰ کی جہالت و بربریت کا دور دورہ ہوگیا"۔

"قبل اس کے کہ اسپین میں ان حوادث کا طوفان تھمنے کو آتا اور سکون کے حالات پیدا ہوتے ایک تیسرا واقعہ اتنا زبردست رونما ہوا جس نے مغربی دنیا اور اسلام کے تعلّقات کو بد سے بدتر کر دیا۔ یہ واقعہ قسطنطنیہ کا ترکوں کے ہاتھ میں چلا جانا تھا۔ یورپ کے نزدیک بیزنطیم (قسطنطنیہ) یونان و روما کی قدیمی شان و شوکت

---

[1] "MAHOMED اور MAHOUND دونوں کے مظاہر کا موازنہ کیجیے! .MA متکلّم کی شاہانہ ضمیر ہے اور ہاؤنڈ HOUND جرمن لفظ ہنڈ HUND سے بنا ہے جس کے معنی کتے کے ہیں۔ یہ توہین کرنے والے ان دونوں الفاظ کی صوتی مماثلت سے کھیلا کرتے تھے یعنی ماہومد اور ماھنڈ...." اسلام دوراہے پر: مصنّف محمد اسد لیوپولڈ وئیس۔

کا آخری مظہر تھا۔ وہ اسے ایشیا کی وحشی اقوام کے مقابلہ میں یورپ کا "محفوظ قلعہ" سمجھتے تھے۔ اب قسطنطنیہ کے سقوط سے گویا اسلام کے ریلے کے لیے یورپ کے دروازے کھل گئے۔ اس کے بعد کی صدیوں میں جو جنگ سے پُر رہیں یورپ کی اسلام دشمنی صرف تہذیبی دشمنی نہیں رہی بلکہ اب مسئلہ ایک اہم سیاسی مسئلہ کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ اس نئے عنصر نے اس دشمنی کو شدید تر بنا دیا۔"

"ان تمام باتوں کے پہلو بہ پہلو یہ ایک حقیقت ہے کہ اس نزاع سے یورپ نے بہت فائدہ اٹھایا۔ نشاۃ جدیدہ یعنی یورپ میں علوم و فنون کے احیاء کو اکثر مغرب و مشرق کے درمیان مادّی ربط کا مرہونِ منّت قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس نے اس سلسلہ میں اسلامی، خصوصاً عربی، مآخذ سے بہت استفادہ کیا ہے۔ درحقیقت یورپ نے اس ربط و اتّصال سے اس سے کہیں زیادہ فائدہ اٹھایا ہے جتنا عالمِ اسلامی کو ہوا لیکن یورپ نے اس احسان کا اعتراف نہیں کیا۔ کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ یورپ کی اسلام دشمنی کچھ کم ہو مگر عملاً اس کا الٹا ہوا۔ جتنا زمانہ گذرتا گیا یہ دشمنی بڑھتی گئی اور بالآخر ایک عادت بن گئی۔ لفظ "مسلم" کے ہر ذکر کے ساتھ یورپ کا قومی شعور تمتما اٹھتا۔ یہ چیز ان کے یہاں ضرب المثل میں داخل ہو گئی اور یورپ کے ہر مرد اور عورت کے دل و دماغ میں سما گئی۔ اس سے زیادہ موجبِ حیرت یہ بات ہے کہ تمام تہذیبی تبدیلیوں کے باوجود یہ خصلت باقی رہی۔ آگے چل کر مذہبی اصلاح کا دور آیا یورپ مختلف فرقوں میں تقسیم ہو گیا اور ہر فرقہ دوسرے کے خلاف مسلّح ہو کر میدان میں اتر پڑا لیکن اسلام دشمنی ان تمام فرقوں میں مشترک تھی۔ پھر وہ زمانہ آیا جب خود دینی احساس پر مردنی چھانے لگی مگر اسلام دشمنی اس دور میں بھی جاری رہی۔ اس حقیقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مشہور فرانسیسی فلسفی اور شاعر والٹیر (Voltaire) جو اٹھارویں صدی میں عیسائیت اور اس کے کلیسا کے سخت ترین مخالفین میں سے تھا اسلام اور پیغمبرِ اسلام سے بھی شدید ترین بغض رکھتا تھا۔ اس کے تیس سال بعد وہ دور آیا جب مغربی علماء نے دوسری تہذیبوں کا مطالعہ شروع کیا اور ان کی طرف قدرے ہمدردانہ ذہنیت کے ساتھ متوجہ ہوئے مگر اسلام کے سلسلہ میں جو حقارت آمیز رویّہ ان کو ورثہ میں ملا تھا وہ اب بھی ان کی علمی گفتگوؤں میں غیر معقول تعصّب کی شکل میں جاری رہا۔ تاریخ نے یورپ اور اسلام کے مابین جو خلیج حائل کر دی تھی وہ اب بھی باقی رہی۔ اسلام کی تحقیر یورپ کے فکر کا ایک بنیادی خاصّہ بن گئی حقیقت یہ ہے کہ زمانۂ حال تک مستشرقین میں بیشتر وہ لوگ تھے جو ساتھ ہی اسلامی ممالک میں سرگرمِ عمل عیسائی مبلّغ بھی تھے۔

وہ اسلام کی تعلیمات کی جو مسخ کردہ شکلیں سامنے لاتے تھے ان کو اس انداز پر ڈھالا جاتا تھا کہ "بت پرستوں" کی طرف سے یورپ کے نقطہ نظر کو متاثر کر سکے۔ یہ فکری کجی اب بھی باقی ہے اگرچہ استشراقی علوم (Orientalism) مشنریوں کے اثر سے آزاد ہو گئے اور اب یہ عذر بھی نہیں پیش کیا جا سکتا کہ ان علوم کے غلط مذہبی تعصب کی وجہ مشنریوں سے ان کا تعلق ہے۔ مستشرقین کی اسلام دشمنی ایک موروثی خصلت اور طبعی خاصہ ہے جو صلیبی جنگوں اور ان سے وابستہ دوسرے عوامل کے اُن اثرات کا نتیجہ ہیں جو انھوں نے یورپ کے قدیم باشندوں کے ذہنوں پر مرتب کیے تھے۔"

"بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنی پرانی نفرت، جو اصلاً دینی تھی اور عیسائی کلیسا کے روحانی تسلّط کی وجہ سے اُس زمانہ میں ممکن ہو سکی تھی، اب بھی یورپ کے ذہن پر چھائی رہے، جب کہ مذہب کا مسئلہ اب یورپ کے لیے بجز ایک گذری ہوئی بات کے اور کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔"

"اس طرح کی (نفسیاتی) گرہیں قابل تعجب نہیں، کیوں کہ علم نفسیات کا مسلّمہ مسئلہ ہے کہ انسان ان تمام اعتقادات کو بھول جاتا ہے جو اسے بچپن میں سکھائے جاتے ہیں، مگر بعض مخصوص قصّوں کا اثر کبھی نہیں زائل ہوتا، جو کہ ان بھولے ہوئے اعتقادات سے متعلق تھے۔ یہ قصّے اور روایات اس انسان کی زندگی کے ہر دور میں ہر طرح کے عقلی دلائل کا مقابلہ کرتی رہتی ہیں۔ یہی حال اسلام کے سلسلہ میں یورپ والوں کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو مذہبی احساس اسلام سے نفرت کا باعث بنا تھا وہ ایک مادیّت زدہ زندگی کے غلبہ کی وجہ سے اپنی موت آپ مرگیا لیکن اس کے باوجود وہ قدیم نفرت اب بھی یورپ کی ذہنیت کا ایک جزء لاینفک بنی ہوئی ہے، ہر فرد کے ذہن میں اس نفرت کی شدّت یکساں نہیں لیکن ہر فرد کے ذہن میں اس کا وجود قطعی ہے۔ صلیبی جنگوں کی اسپرٹ، ایک چھوٹے پیمانے پر سہی، ہمیشہ یورپ کے ذہن پر چھائی رہی۔ عالم اسلامی کے سلسلہ میں یورپین تہذیب کا موجودہ موقف بھی اس روایتی "مجاہد" کی یاد تازہ کر دیتا ہے جو جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان جنگ میں اُتر چکا ہو۔" [1]

دوسری حقیقت یہ ہے کہ یورپین امپیریلزم کے لیے اس بات کو نظر انداز کر دینا ناممکن ہے کہ اسلامی روح امپیریلزم کی راہ میں ایک زبردست روڑا ہے جسے پارہ پارہ کر دینے یا اپنی جگہ سے ہٹا دینے کے سوا کوئی چارہ

---

[1] اسلام دوراہے پر: لیوپولڈ ویس محمد اسد۔

نہیں بعض زرخرید یا فریب خوردہ لوگوں کی یہ بات بالکل لغو ہے کہ یورپ دین و مذہب کو کوئی اہمیت نہیں دیتا، اسے کسی طاقت کا منبع نہیں سمجھتا اور اگر وہ عالم اسلامی سے کچھ خطرہ محسوس کرتا ہے تو صرف اس کی مادّی طاقت کے سبب۔ دین دراصل نام ہے، ایک روحانی قوّت کا جس میں مادّی قوتوں کو اکسانے اور ابھارنے کی بے پناہ تاثیر پنہاں ہے۔ پھر اسلام اور مسیحیت میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اسلام ہر طرح کی مادی تیاریاں کرنے، جم کر مقابلہ کرنے، اور ہر طرح کی قربانیاں دینے پر ابھارتا ہے اور کمزوری کا شکار ہوکر ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دینے والوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں برے انجام کی دھمکی دیتا ہے۔

وَ اَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔ (الانفال: ۶۰)	اور تم لوگ، جہاں تک تمہارا بس چلے، زیادہ سے زیادہ طاقت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے ان کے مقابلہ کے لیے تیار رکھو تاکہ اس کے ذریعے سے اللہ کے اور اپنے دشمنوں کو خوف زدہ کر سکو۔
يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِيْنَ اَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (النساء: ۱۴۴)	اے ایمان لانے والو! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔
فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ (النساء: ۷۴)	اللہ کی راہ میں لڑنا چاہیے ان لوگوں کو جو آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی کو فروخت کریں۔
وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ۔ (آل عمران: ۱۳۹، ۱۴۰)	دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب ہوگے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمھیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔

معلوم ہوا کہ دین ایک روحانی قوّت ہے، اور مادّی طاقت بہم پہنچانے کے لیے ایک للکار بھی ہے۔ دین ہر حملہ کے مقابلہ میں خود ایک چٹان ہے اور جم کر مقابلہ کرنے کی تلقین بھی ہے۔ یورپین استعمار کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اس دین کا دشمن بن کر رہے۔ اسلام دشمنی کے مظاہر مختلف قوموں کے طرز استعمار کے ساتھ مختلف ہوتے رہتے ہیں اور احوال و ظروف کے مطابق نئی نئی شکلیں اختیار کرتے رہے ہیں۔

مثلاً فرانس نے مغرب کے سارے عرب ممالک میں اسی دشمنی کے تحت، بربر قوم کی محافظت، یا کسی اور بہانے کے سہارے اسلام کے خلاف کھلّم کھلّا جنگ کا اعلان کر رکھا ہے۔ دمشق میں اس کے نمائندے دن دہاڑے یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ صلیبی مجاہدین کی نسل سے ہیں۔ انگلستان مکر و فریب کی راہ اختیار کرتا ہے اور خاموشی اور اخفا کے ساتھ مصر کے تعلیمی اداروں میں اپنے نفوذ کی راہیں نکالتا ہے تاکہ ایک ایسی ذہنیت پروان چڑھائے جو اسلامی زندگی، بلکہ مشرقی زندگی کی ساری قدروں کو حقارت کی نظر سے دیکھے۔ جب وہ اس ذہنیت کے حامل اساتذہ کی ایک پوری نسل تیار کر چکا تو اس نے ان کو کالجوں اور دوسرے تعلیمی اداروں میں پھیلا دیا تاکہ وہ آئندہ نسلوں کے ذہن کو اس سانچہ میں ڈھالیں اور ایسے نصاب اور لائحہ عمل تیار کریں جو اس ذہنیت کو پروان چڑھائیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے اس بات کا پورا اہتمام کیا کہ وزارت تعلیم کے ان مناصب سے جو رہنمائی اور پالیسی وضع کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں، اسلامی تہذیب کی سچی نمائندگی کرنے والے عناصر کو دور رکھا جائے۔ اس مہم کو ایک ایسے طبقہ کے سپرد کر دینے کے بعد جو مصر کی عام ذہنیت کی تشکیل میں بہت زیادہ مؤثر ہے، انگریزوں کو اس کی ضرورت نہیں باقی رہی کہ دینی رجحانات کے خلاف کھلّم کھلّا جنگ کریں۔ جہاں تک جنوبی سوڈان کا تعلق ہے وہاں اسے ان چالوں کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ وہاں اس کا جو موقف تھا وہ مسیحی مبلّغین اور مسلمان تاجروں کے سلسلہ میں اس پالیسی سے سامنے آتا ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔

تمام استعماری ممالک اس دین کی دشمنی اور تخریب کے سلسلہ میں گذشتہ صدی بلکہ اس سے بھی پہلے سے ایک ہی روش پر چل رہے ہیں۔ آج بھی اس سلسلہ میں ان سب کا طرزِ عمل ایک ہی مقصد کا تابع، اور اس کی خاطر باہمی تعاون پر مبنی نظر آتا ہے۔ اس حقیقت کا مشاہدہ قضیۂ فلسطین اور عالم اسلامی کے دوسرے مسائل کے ضمن میں[1] استعماری طاقتوں کے طرزِ عمل میں کیا جا سکتا ہے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں یہودیوں کا اقتصادی اثر مغرب کو اس سمت میں لے جا رہا ہے، یا جن کے خیال میں انگریزوں کے اغراض اور اینگلو سیکسن اقوام کا مکر و کید انھیں اس روش پر چلا رہا ہے، یا جن کے نزدیک فیصلہ کن چیز مغربی بلاک اور مشرقی بلاک کا باہمی نزاع ہے......

---

[1] یہاں مصنف نے برصغیر ہند سے تعلق رکھنے والے بعض مسائل کا ذکر کیا ہے۔ مترجم

سب کے سب معاملہ کے ایک ایسے پہلو کو نظر انداز کر رہے ہیں جس کا ان تمام عوامل کے ساتھ اضافہ ضروری ہے۔
یہ پہلو وہ صلیبی ذہنیت ہے جو مغرب کی رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے اور اس کی ذہنیت میں راسخ ہو چکی ہے۔
استعمار کو روح اسلام سے جو خطرہ لاحق ہے اس کے تحت اسلام کی قوت کو کچل دینے کی کوشش نے سارے
اہل مغرب کو اسلام کے خلاف متحد کر رکھا ہے۔ اسلام دشمنی نے اشتراکی روس اور سرمایہ دار امریکہ کو ایک
صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ عالمی صیہونی تحریک نے اسلام دشمنی میں اور اس کے خلاف مغرب کی صلیبی استعماری
دنیا نیز مشرق کی اشتراکی مادّی دُنیا دونوں میں اسلام دشمن طاقتوں کو متحد کرنے میں جو حصہ لیا ہے اسے
بھی نہ بھولنا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کرکے مدینہ آنے اور اسلامی حکومت کے قیام
سے آج تک یہودیوں نے مسلسل یہی کام کیا ہے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان تمام طوفانوں کے باوجود جن سے اس کشتی کو شروع سے سابقہ رہا،
ان اثرات کے علی الرغم جو اتنی جلد ان حملوں سے دوچار ہونے کے باعث اس کے نوزائیدہ نظام پر
مرتب ہوئے، پھر دورِ جدید میں مغربی تہذیب کے اپنی مادّی اور ثقافتی طاقتوں سمیت چھا جانے، اور
بہت سے مسلمانوں کو اسلام کی تخریب کے لیے استعمار کا آلۂ کار بنا لینے کے باوجود خود روح اسلام
پوری طرح محفوظ رہی۔ جو قوت اس میں مضمر تھی وہ پوری انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی رہی اور چودہ سو
سال سے ہمارے دور تک عالمی سیاست اور اس کے رُخ پر برابر اثر انداز ہوتی چلی آ رہی ہے۔ دنیا
میں کوئی سیاسی یا عسکری حرکت نہ رہی جس میں اسلام کا کوئی حصّہ نہ رہا ہو۔ یہ بات آج بھی صحیح ہے
اگرچہ دنیائے اسلام کی سماجی، معاشی اور روحانی زندگی بری طرح انتشار و اختلال کا شکار ہے۔

عالم اسلامی کی نشاۃ ثانیہ

درحقیقت پژمردگی اور گوشہ گیری کا دور اب گذر چکا، اور اسلام ایک بار پھر سیلاب کی طرح امنڈ رہا ہے
عرب دنیا مشرق سے مغرب تک ایک بلاک کی شکل میں منظّم ہوتی جا رہی ہے، اور دو بڑے بڑے اسلامی علاقے
پاکستان اور انڈونیشیا کی شکل میں ظہور پذیر ہو چکے ہیں۔ اسلام کے اندر مضمر قوّت حیات کے یہ ایسے مظاہر ہیں جن کو
نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اسلام کے پاس قوّت کا اتنا سرمایہ موجود ہے کہ ایک اسلامی
زندگی کا از سرِ نو آغاز عمل میں لایا جا سکے۔ ایسی زندگی جو صرف آرزوؤں اور فال نیک کے سہارے نہیں بلکہ

ایسی عملی اور ٹھوس بنیادوں پر قائم ہو جن کو آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہو۔ اسلامی زندگی کی تشکیل نو آج بکھرے عناصر کو یکجا کرنے اور تعمیر نو کی دوسری تیاریوں کے مرحلہ سے گذر رہی ہے باوجود ان مشکلات وموانع کے جن کا اسے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اور جن کے سبب کبھی کبھی اسے رک جانے یا چند قدم پیچھے ہٹ جانے پر بھی مجبور ہونا پڑتا ہے۔ لیکن یہ مشکلات وموانع محض حباب بر آب ہیں جو خود فنا ہو جائیں گے، یہ موسم گرما کے بادل ہیں جنھیں ہوائیں اڑا کر لے جائیں گی۔

میں اس بات میں پختہ اور غیر مشروط یقین رکھتا ہوں کہ عالم اسلامی میں اسلامی زندگی کی تجدید ممکن ہے اور مستقبل میں اسلام صرف چند ممالک کا نہیں بلکہ دنیا کا نظام بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ لیکن اس یقین کے باوجود میں یہ نہیں چاہوں گا کہ خیالی جوش وخروش کی رو میں بہہ کر یہ دعویٰ کر بیٹھوں کہ یہ کوئی آسان کام ہے۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ راہ میں متعدد عظیم مشکلات حائل ہیں۔ بہت سے بڑے بڑے کام ایسے ہیں جن کو انجام دیئے بغیر ہم خود اسلامی سوسائٹی میں بھی حقیقی اسلامی زندگی کی تجدید کی توقع نہیں کر سکتے۔ ان عظیم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ اور ان ضروری کاموں کی صحیح نشاندھی ایک اہم کام ہے جس مقصد کو ہم حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی بلندی اور اس مقصد کے لیے کمر بستہ ہونے والوں پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کی عظمت، دونوں کا شعور اس بات کا تقاضا کرتا ہے پھر اتنے اہم مسائل میں رائے قائم کرنے کے لیے جو احساس ذمہ داری درکار ہے وہ بھی یہی چاہتا ہے۔

خواہش کے عمل کا جامہ پہننے اور امید کے عملاً بر آنے کے لیے صرف جوشیلے نعرے نہیں کافی بلکہ ضروری ہے کہ اس راہ کی مشکلات اور ذمہ داریوں کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کر لیا جائے، اور جن لوگوں کو ان نعروں کے ذریعہ جوش دلانا مقصود ہے ان کو اس عظیم جدّوجہد پر کمر بستہ کر دیا جائے جو اس راہ میں کامیابی کے لیے ناگزیر ہے۔

قدرتی طور پر عرصہ دراز تک نظام حکومت اور روح اسلام کے درمیان جو بعد رہا ہے اس کے سبب اب اسلامی طرز حکمرانی کو اپنانا ایک مشکل کام ہو گیا ہے۔ آج سیاسی اور سماجی نظام، زندگی کی مختلف قدریں اور ضابطے، اور نفسیاتی اور ذہنی رجحانات چند متعین بنیادوں پر قائم ہیں جن کو بدلنا عرصہ دراز تک، کافی جدّوجہد کے بعد ہی ممکن ہو سکتا ہے۔ جتنا زیادہ زمانہ گذرتا جائے گا اتنا ہی مشکل بڑھتی جائے گی اور

اتنی ہی زیادہ اتنے ہی طویل عرصہ تک جدّ وجہد کی ضرورت ہوگی۔

زمانی بُعد کے علاوہ ایک دوسرا عامل بھی کام کر رہا ہے۔ اس دنیا میں ہم اکیلے نہیں اور نہ ہم بقیہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر رہتے ہیں، ہمارے بہت سے مسائل و مصالح دنیا کے دوسرے ممالک سے وابستہ ہیں جن پر ایک ایسی تہذیب چھائی ہوئی ہے جو جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے، اسلامی ذہنیت کی بالکل ضد ایک دوسری ذہنیت کی حامل ہے۔ یہ بات سچی اسلامی زندگی کی تجدید نو کے سلسلہ میں ہمارے قدموں کو سست کر دیتی ہے اور ہماری ذمہ داریوں میں بہت سے اضافے کر دیتی ہے۔

یہ حقیقت اس آخری عامل کی اہمیّت میں مزید اضافہ کر دیتی ہے کہ مغربی دنیا جس سے ہمارے بہت سے مفادات وابستہ ہیں اب ہم سے بہت زیادہ طاقت ور ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور کی طرح اب ہم اس پر غالب نہیں ہیں، نہ ہمارے پاس اتنی قوّت ہے کہ ہم اس کا مقابلہ کر سکیں۔ پھر وہ ہماری اور خاص طور پر ہمارے دین کی دشمن بھی ہے۔ وہ یہ کسی طرح بھی گوارا نہیں کر سکتی کہ ہم اسلامی نظام کی از سر نو تعمیر عمل میں لائیں اور حقیقی اسلامی زندگی کا پھر سے آغاز کریں۔ اب ایسا کرنا غیر معمولی جدّ وجہد کے بغیر ممکن نہیں۔ اوسط درجہ کی کوششیں صرف اس شکل میں کارگر ہو سکتی تھیں جب ہم مغرب پر حاوی ہوتے یا کم از کم اس کے برابر طاقت ور ہوتے، یا وہ ہمارا اور اس دین کا جس کی طرف ہم لوٹنا چاہتے ہیں دوست اور خیر خواہ ہوتا۔

لیکن ان باتوں کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی نظام کو دوبارہ اختیار کرنا محال ہے۔ ان کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ ایک بہت عظیم اور دشوار کام ہے اور اس کے لیے غیر معمولی کوششوں کی ضرورت ہوگی، اس کا سب سے اہم تقاضا یہ ہے کہ اس پر پورے جوش و خروش کے ساتھ ایمان لایا جائے۔ اس کی راہ میں جو مصائب جھیلنے ہوں گے ان کو برداشت کرنے کی جرأت پیدا ہو، اس کے لیے جو پُر مشقّت اور ان تھک کوششیں کرنی ہوں گی ان کو جمع کیا جائے، اور اس بات میں گہرا یقین پیدا ہو جائے کہ آج اسلامی دنیا اور ساری انسانیت کو اس نظام کی شدید ضرورت ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ایسی تخلیقی اور عبقری صفت عقلیت کی ضرورت ہے جو موجودہ نظام میں جوڑ پیوند لگا کر کام چلانا چاہے بلکہ از سر نو ایک جدید مکمل نظام قائم کرنے کا عزم رکھتی ہو۔

اس نظام کی بنیادوں کی وضاحت کے بعد ہمیں اس نظام کے برکات اور ان کوششوں اور قربانیوں

کا موازنہ کرنا چاہیے جو اس کو قائم کرنے کے لیے درکار ہوں گی۔ اس موازنہ سے اگر ہمیں یہ اطمینان ہو جائے کہ برکات اور فوائد اتنے زیادہ ہیں کہ ان کی راہ میں یہ قربانیاں بہت حقیر ہوں گی تو ہمیں اس کے لیے جدّوجہد کا فیصلہ کر کے پختہ عزم کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پہ اُٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔

اس ضمن میں اس حقیقت کا ذکر غالباً برمحل ہو گا کہ موجودہ مغربی تہذیب پچیس سال کے مختصر سے عرصہ میں دنیا کو دو بار عالم گیر جنگوں سے دوچار کر چکی ہے۔ دوسری جنگ کے بعد اس نے دنیا کو مغربی اور مشرقی دو مستقل بلاکوں میں تقسیم کر دیا ہے اور اب ہر آن ایک تیسری جنگ کا خطرہ لاحق ہے، ہر جگہ اضطراب و بے چینی عام ہے۔ دنیا کے تین چوتھائی علاقہ میں فقر و فاقہ اور افلاس کا دور دورہ ہے۔ دنیا کا نظم متزلزل ہے اور وہ تعمیر نو کے لیے نئی بنیادیں تلاش کر رہی ہے۔ اس کو کسی ایسی نئی روحانی طاقت کی ضرورت ہے جو ایک بار پھر انسان کو انسانیت کے اصول سکھا دے۔

ان باتوں کے باوجود ہمیں مغربی دنیا کے اسلامی تہذیب کی بنیادوں کو قبول کر سکنے کی صلاحیت کے بارے میں زیادہ خوش گمانی میں نہیں مبتلا ہونا چاہیے۔ یہ معاملہ یکسر مختلف ہے —— بلاشبہ برنارڈشا جیسا آدمی کہتا ہے کہ مغربی دنیا کا رُخ اسی طرف ہے۔ وہ پیشین گوئی کرتا ہے کہ مغربی دنیا اسلام کی طرف آ رہی ہے؛ وہ کہتا ہے:

"میں نے پیشین گوئی کی تھی کہ مستقبل میں محمد کا دیا ہوا دین یورپ میں مقبول ہو کر رہے گا، درحقیقت یہ دین آج بھی یورپ کو پسند آنے لگا ہے۔۔۔۔ قرون وسطیٰ میں عیسائی مذہبی طبقہ نے اپنی ناواقفیت یا گھناؤنے تعصّب کی بنا پر اسلام کی تصویر کو زیادہ سے زیادہ خوفناک بنا کر پیش کیا تھا۔ دراصل وہ محمد اور ان کے دین سے نفرت میں حد سے تجاوز کر رہے تھے۔ وہ ان کو حضرت مسیح کا دشمن سمجھتے تھے۔ میرے نزدیک یہ فرض ہے کہ محمد کو انسانیت کا نجات دہندہ قرار دیا جائے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اگر ان جیسا آدمی آج کی دنیا کی قیادت سنبھال لے تو وہ یقیناً ساری مشکلات کے حل میں کامیاب ہو سکے گا اور دنیا کو امن و فلاح سے بہرہ یاب کر سکے گا۔ آج دنیا ان دونوں چیزوں کی کتنی زیادہ محتاج ہے!"

"انیسویں صدی کے بعض منصف مزاج مفکرین محمد کے لائے ہوئے دین کی اصل

قدر و قیمت کو پوری طرح سمجھ گئے تھے۔ کارلائل۔ گوئٹے اور گبن انہی میں سے چند ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اسلام کے بارے میں یورپ کے نقطۂ نظر میں کچھ خوش گوار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔

بیسویں صدی میں یورپ اس سلسلہ میں کافی آگے بڑھ چکا ہے اور محمد کے عقیدہ کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھنے لگا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آنے والی صدیوں میں وہ اور آگے بڑھے اور اپنی مشکلات کے حل کے لیے اس عقیدہ کی قدر و قیمت کا پوری طرح قائل ہو جائے۔ میری قوم اور یورپ کے بہت سے افراد نے حال میں محمد کا دین قبول کر لیا ہے۔ یہ بات ہمیں اس اعلان میں حق بجانب قرار دیتی ہے کہ: اسلام کی طرف یورپ کا انقلاب شروع ہو چکا ہے!''

لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ برنارڈ شا کی یہ پیشین گوئی پیشین گوئی ہی رہی جاتی ہے ۔۔۔ اگرچہ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ یہ بات مسلمانوں کے شعور و احساس کے لیے افیون کا کام نہ کرے کہ وہ چین سے بیٹھ کر انتظار کرنے لگیں کہ یورپ ان کے دین کو کب قبول کرتا ہے؟ بہر حال، ایسا ہونے کی توقع، کم از کم یہ کہ قبل از وقت ہے۔ اس کے دو خاص اسباب ہیں۔

پہلا سبب وہ موروثی اسلام دشمنی ہے جو یورپ کے مزاج میں گہری جڑیں پکڑ چکی ہے۔ آج کل اس دشمنی میں یہ بات مزید اضافہ کر رہی ہے کہ اس روڑے کا درمیان میں حائل ہونا مشرقی اور مغربی دونوں استعماریوں کے خلاف ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ رومن تہذیب کے دور سے عہد جدید تک یورپ کی ذہنیت مادّی بنیادوں پر قائم رہی ہے اور روحانی نقطۂ نظر کا اثر اس پر بہت خفیف ہے۔ یہ بات قدرے تفصیلی گفتگو چاہتی ہے اس کی افادیت صرف اس موضوع تک نہیں محدود ہے بلکہ یہ اس اہم سوال کا جواب بھی سامنے لاتی ہے کہ کیا اسلامی اور مغربی تہذیب کے درمیان باہم تعاون ممکن ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس کے حدود کیا ہیں۔

پہلے باب میں ہم یہ بتا چکے ہیں کہ یورپ ایک دن کے لیے بھی مسیحی نہیں رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ والوں کے زمین کے ایک مختصر اور کم پیداآور علاقہ میں آباد ہونے کے سبب وہاں جو کشمکش ہمیشہ جاری رہتی تھی اس نے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا کہ مسیحیت کے فراخ دلانہ اصول اس سنگلاخ زمین میں جڑیں پکڑ سکتے۔ خود مسیحیت کے اپنے مزاج میں جو زہد، عملی زندگی سے کنارہ کشی اور مسائل

۱؎ حیاتِ محمد مصنفہ محمد حسین ہیکل۔ ہیکل نے یہ عبارت رسالہ نور الاسلام شمارہ ۔ بہ ۱۹۳۲ء سے نقل کی ہے۔ مترجم

حیات کے حل سے گریز کی جو خصوصیات پائی جاتی ہیں وہ اس پر مستزاد ہیں۔ اب ہم ان دو اسباب پر ایک اور سبب کا اضافہ کرتے ہیں جس کی طرف پہلے باب میں ہم نے صرف ایک ہلکا سا اشارہ کیا تھا۔ وہ سبب یہ ہے کہ مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی رومن ایمپائر بدستور مسیحیت کی راہوں میں حائل رہی اور یورپ کے مسیحیت قبول کرنے کے باوجود رومن ایمپائر کی تعلیمات یورپ کی نئی تہذیب کی بنیادیں بن گئیں، کیونکہ یورپ کی زندگی پر مسیحیت کے اثرات بہت سطحی تھے اور کبھی گہرائی تک نہ پہنچ سکے۔

یہاں ہم "اسلام دوراہے پر" نامی کتاب سے چند فقرے نقل کریں گے جو ہمارے منشا کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گے۔

"رومن ایمپائر جس فکر پر مبنی تھی وہ دوسری قوموں کو بزور قوت تباہ کر دینے یا مادر وطن کی خاطر ان کے استحصال کا فکر تھا۔ ایک مخصوص طبقہ کے آرام و آسائش کی خاطر دوسروں پر ظلم و زیادتی میں رومیوں کو نہ کوئی خرابی نظر آتی تھی نہ وہ اسے اخلاقی انحطاط سمجھتے تھے۔ وہ "عدلِ رومی" جس کا اتنا چرچا ہے صرف رومیوں کے لیے مخصوص تھا۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کا رجحان زندگی اور تہذیب کے خالصۃً مادی تصور کی بنیاد پر ہی پنپ سکتا تھا۔ اس مادی تصور کو اس فلسفیانہ ذوق نے کچھ شائستگی ضرور بخشی تھی جس پر ان کے یہاں زور دیا جاتا تھا، لیکن یہ تصور بہر حال ہر طرح کی روحانی اقدار سے دور تھا۔ درحقیقت رومیوں نے دین کا مزا ہی نہیں چکھا۔ ان کے روایاتی دیوتا یونانی خرافات کی بھونڈی نقالی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے تھے۔ یہ محض خیالی پیکر تھے جنھیں عرف عام کی رعایت کرتے ہوئے گوارا کر لیا جاتا تھا۔ انھیں کبھی بھی زندگی کے عملی مسائل میں مداخلت کی اجازت نہ تھی۔ ان کا کام صرف یہ تھا کہ جب ان سے کچھ دریافت کیا جائے تو اپنے پروہتوں کے واسطہ سے اس کا منظوم جواب دے دیا کریں۔ لیکن ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی تھی کہ وہ انسانیت کو اخلاقی قوانین بھی عطا کریں گے!"

"یہ مٹی تھی جس میں جدید مغربی تہذیب کا پودا پروان چڑھا۔ بلا شبہ اپنی نشو ونما کے دوران اس نے متعدد دوسرے عوامل کا اثر قبول کیا، چنانچہ قدرتی طور پر وہ اس تہذیبی ورثہ میں متعدد تبدیلیاں عمل میں لائی جو اسے روما سے ملا تھا۔ لیکن اس کے باوجود یہ

ایک حقیقت ہے کہ مغرب کے اخلاقی رجحانات اور اس کے مقاصد حیات آج بھی وہی ہیں جو رومن تہذیب نے اسے عطا کیے تھے۔ چونکہ قدیم روما کی اجتماعی اور فکری فضا ہمیشہ ــــ نہ صرف بالفرض بلکہ واقعتہً ــــ خالصتہً افادی تھی نہ کہ دینی، لہٰذا جدید مغرب کی فضا بھی ایسی ہی ہے۔ آج یورپ کے افراد کے پاس دین کے سراسر لغو ہونے کے لیے کوئی دلیل نہیں، نہ ہی وہ کسی ایسی دلیل کی ضرورت محسوس کرتے ہیں لیکن آپ یہ دیکھ رہے ہیں کہ جدید یورپین فکر عموماً مطلق تصورِ اخلاق کو عملی مسائل و مباحث کے دائرہ سے خارج سمجھتا ہے ــــ اگرچہ وہ دین کے ساتھ رواداری برتتا اور کبھی کبھی اس بات پر زور بھی دیتا ہے کہ دین ایک عرف عام بن چکا ہے۔ مغربی تہذیب انکار خدا میں نہ صراحت اختیار کرتی ہے نہ شدّت مگر اس کے نزدیک اس کے موجودہ فکری نظام میں خدا کے تصوّر کا نہ تو کوئی فائدہ ہے نہ اس کی کوئی گنجائش ہے۔ مغرب نے ذہن انسانی کی اس عاجزی کو کہ وہ زندگی کا کلّی ادراک احاطہ کرنے سے قاصر ہے ایک شرف و فضیلت کا درجہ دے دیا ہے۔ چنانچہ جدید یورپین فرد صرف ان خیالات کو کوئی عملی اہمیت دینا چاہتا ہے جو تجربی علوم کے دائرہ میں ہوں یا کم از کم یہ کہ انسان کے سماجی تعلقات کو محسوس حد تک متاثر کرسکتے ہوں۔ چونکہ وجود خدا کا مسئلہ دونوں میں سے کسی قسم میں نہیں آتا لہٰذا یورپ کے ذہن کا میلان شروع ہی سے اس طرف ہوتا ہے کہ "خدا" کو کوئی عملی اہمیت نہ دی جائے۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ رجحان مسیحی طرز فکر سے کس طرح ہم آہنگ ہوسکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسیحیت ــــ جسے مغربی تہذیب کے روحانی نظام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے ــــ اسلام ہی کی طرح ایک مذہب ہے جو اخلاق کے مطلق تصوّر پر مبنی ہے۔ بلاشبہ حقیقت یہی ہے مگر اس سے بڑی غلطی اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ جدید مغربی تہذیب کو مسیحیت کا پروردہ قرار دیا جائے۔ جدید مغرب کی حقیقی فکری بنیادیں ان قدیم رومن تصوّرات میں ملتی ہیں جو زندگی کو مطلق تصوّرات سے عاری، خالصتہً مفادات کا معاملہ قرار دیتے ہیں۔ اس نظریہ کی ترجمانی ان الفاظ کے ذریعہ کی جاسکتی ہے: "چونکہ انسانی زندگی کے آغاز اور جسمانی موت کے بعد اس کے انجام کی بابت

ہمیں کوئی قطعی علم ـــــــ جو علمی تجربہ و تحقیق اور حسابی تخمینہ پر مبنی ہو ـــــــ نہیں حاصل ہے لہذا
بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی ساری قوتیں مادّی اور ذہنی امکانات کی تکمیل پر مرکوز کر دیں ہمیں
ان مطلق اخلاقیات اور آداب زندگی کا پابند ہونے کی چنداں ضرورت نہیں جو علمی ثبوت
سے عاری دعووں پر مبنی ہیں " اس میں ذرّہ برابر شبہ نہیں کہ یہ رجحان جو مغربی تہذیب
کی امتیازی خصوصیت ہے مسیحی مذہبی فکر کے نزدیک بھی اتنا ہی ناقابل قبول ہے جتنا اسلام
یا کسی دوسرے مذہب کے نزدیک۔ کیونکہ یہ رجحان اصلاً لادینی ہے ۔ جدید مغربی تہذیب کے
عملی کارناموں کو مسیحی تعلیمات کی طرف منسوب کرنا ایک زبردست تاریخی غلطی ہے ۔ آج مغرب
کی تہذیب جس سائنٹفک مادّی ترقی میں دوسری تمام تہذیبوں پر فوقیت لے جا چکی ہے اس
میں مسیحیت کا حصّہ بہت کم ہے ۔ یہ ترقی درحقیقت نتیجہ ہے اس طویل کشمکش کا جو یورپ کو
مسیحی کلیسا سے اور زندگی پر اس کی حکمرانی سے کرنی پڑی ہے ..... آج عوام کی اکثریت
کے لیے مسیحیت اسی طرح ایک رسمی چیز بن کر رہ گئی ہے جس طرح قدیم روما کے نزدیک اس کے
دیوتا تھے جن سے عملی زندگی پر کوئی حقیقی اثر مرتب کرنے کی نہ توقع تھی نہ انھیں اس کی اجازت
دی جا سکتی تھی ۔ بلاشبہ آج بھی مغرب میں کچھ افراد ایسے بھی ہیں جو مذہبی طرز پر سوچتے اور
محسوس کرتے ہیں اور اپنے اعتقادات اور اپنی تہذیب کی اسپرٹ میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ان تھک
کوششیں کرتے رہتے ہیں، لیکن یہ افراد مستثنیات میں سے ہیں ۔ اوسط یورپی افراد، خواہ وہ
جمہوریت پسند ہوں یا فسطائی، سرمایہ دار ہوں، یا بالشویک صنعتی مزدور ہوں یا فلسفی،
صرف ایک ایجابی مذہب رکھتے ہیں اور وہ ہے مادّی ترقی کی پرستش ـــــــ یعنی یہ عقیدہ
کہ زندگی کا صرف ایک مقصد ہے : زندگی کو زیادہ سے زیادہ سہل اور خوش گوار بنانا،
یا رائج الوقت محاورہ میں " قدرت کے قہر سے آزاد کرنا " ۔ اس مذہب کے مندر عظیم الشان
کارخانے، سینما گھر، کیمائی تجربہ گاہیں، ناچ گھر اور بجلی گھر ہیں ۔ اس کے مہنت اور پجاری
بینکر، انجینیر، فلمی ستارے، صنعتی لیڈر اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں ۔ اس صورت
حال کا لازمی نتیجہ طاقت اور مسرت کے لیے باہم مسابقت ہے ۔ اس سے ایسے گروہ پیدا ہوتے ہیں

جو سرتاپا مسلّح ہو کر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ جنگ ہیں اور یہ تہیّہ کیے ہوئے ہیں کہ جب بھی ان کے مفادات ٹکرائیں گے وہ ایک دوسرے کو فنا کر کے رکھ دیں گے۔ تہذیبی اعتبار سے اس کا نتیجہ ایک ایسے انسان کی تخلیق ہے جس کا فلسفۂ اخلاق عملی فوائد کا تابع ہے اور جس کے پاس خیر و شر کا اعلیٰ ترین معیار مادّی ترقی ہے۔"

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ آج کا یورپین ضمیر روحِ اسلام کو جذب کرنے اور انسانیت کی مشکلات کے حل میں اس سے مدد لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اگرچہ متعدد انقلابات اور بہت سی تبدیلیوں کے بعد ایسا ہونا ناممکن نہیں رہ جائے گا، بالخصوص جب کہ خود اسلامی دنیا ازسرِنو اسلامی زندگی کی تعمیر کی طرف متوجہ ہو گی ——— ایسی اسلامی زندگی جس کے آثار و مظاہر نمایاں ہوں، بنیادیں مستحکم ہوں، جس میں مغرب کا حقیقت پسند ذہن ایسے حقیقی اور عملی مظاہر کا مشاہدہ کر سکے جو اس کے حواس کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں اور اس کے طرزِ فکر میں اعتدال پیدا کر سکیں۔ لیکن ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ مغرب کے اسلامی روح سے کسی پہلو سے بھی متاثر ہونے کے لیے ابھی ہمیں پشتہا پشت انتظار کرنا ہو گا۔

اوپر کی گفتگو سے یہ حقیقت بھی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ اسلامی طرزِ فکر جو اخلاقی مقاصد کو اعمال کی غرض و غایت قرار دیتا ہے، موجودہ مغربی طرزِ فکر سے میل کھا سکے، جو اخلاق کے افادی مقاصد کو منتہائے نظر بناتا ہے۔ آج جب کہ ہم ایک سچی اور صحت مند اسلامی زندگی کی تعمیر کی مہم لے کر اُٹھے ہیں، ہمیں اس حقیقت کا پورا لحاظ رکھنا چاہیے۔ ہمیں اس زندگی میں خارج سے مستعار لی ہوئی چیز کا جوڑ نہیں لگانا ہے کیوں کہ یہ پیوند ہمارے فکر کی اصل بناوٹ سے ذرا بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

مسلمان جب فکر و نظر اور طریق و مسلک کے باب میں مغربی طریقوں کو مستعار لے کر اپنی زندگی کے احیاء کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں پہلے ہی قدم پر شکست کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ جس زندگی کی تجدید کرنے چلے تھے بالآخر اسی کو فنا کے گھاٹ اتارنے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس واحد فطری طریقہ کار کو پہلے ہی قدم پر چھوڑ دیتے ہیں جس سے اسلامی زندگی کا احیاء ممکن ہے، یعنی یہ کہ اسلامی اصولوں کو اپنا رہنما بنائیں جو کہ زندگی کی عمارت کی بنیاد اخلاق پر رکھتے ہیں۔ اور اخلاق کی آخری غرض و غایت منفعت اور مفاد کو قرار دینے کی بجائے اعمال کے اخلاقی مقاصد کو اپنا مطمحِ نظر بناتے ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اسلام زندگی کے سارے معقول مقاصد کے حصول کا اہتمام کرتا ہے، ساتھ ہی وہ ان تمام امور میں اخلاقی پہلو کے تحفظ کا پورا لحاظ رکھتا ہے۔ یہ بات بھی سامنے آچکی ہے کہ اسلام کی حقیقی قدر اس کی اسی خوبی میں مضمر ہے کہ وہ زندگی کو مختلف خانوں میں نہیں تقسیم کرتا، مقاصد اور ان کے ذرائع کے درمیان میں کوئی تضاد نہیں پیدا ہونے دیتا اور زندگی کے مادّی اور روحانی پہلوؤں کے درمیان، یا انسان اور کائنات کے مزاج میں کسی تعارض کا قائل نہیں۔ اس کے برعکس وہ زندگی کو ایک اکائی قرار دیتا ہے جو کامل توافق اور ہم آہنگی کے ساتھ ان مقاصد کی طرف بڑھتی ہے۔

پس اسلام انسانیت کو زندگی کے بارے میں ایک مکمل نظریہ عطا کرتا ہے۔ یہ نظریہ مختلف حالات پر منطبق ہونے یا فروعی معاملات میں رہنمائی کے سلسلہ میں ہمیشہ ترقی اور نشو ونما کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اپنی بنیادی رجحان کے معاملہ میں مصالحت یا پیوند کاری نہیں برداشت کر سکتا۔

اس جامع فکر کے اپنے فطری نتائج کو پوری طرح بروے کار لانے کے لیے ضروری ہے کہ اسے مکمل طور پر نافذ کیا جائے ورنہ اس کی بنیادی رجحان میں ذرا سی تبدیلی بھی اس میں ایسا خلل پیدا کر دے گی جس کے بعد اس زندگی کی تشکیل ناممکن ہے جس کا نقشہ اسلام پیش کرتا ہے۔

جہاں تک زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ اس کلّی فکر کی بنیاد پر تطبیق و تفریع میں نشو ونما کا سوال ہے یہ ایک فطری امر ہے۔ خود اسلام کا مزاج اسے ضروری قرار دیتا ہے، اس کی ترغیب دیتا ہے اس کے لیے ذرائع و وسائل فراہم کرتا ہے اور اس کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ قیاس، اجتہاد، اور وہ وسیع اختیارات جو صاحب امر کو دیئے گئے ہیں .... یہ سب ہمیشہ عملی زندگی کے ساتھ ساتھ چلنے اور اس کے نت نئے تقاضوں کی تکمیل کے لیے تطبیق و تفریع میں نشو ونما جاری رکھنے کے زندہ اور فعال ذرائع ہیں۔

صرف ایک بات کا اہتمام ضروری ہے۔ یہ تطبیق اور تفریع اسلام کے بنیادی اور اصولی افکار سے بے جوڑ نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ ان کے رجحان کو نظر انداز کر کے کسی دوسرے رُخ پر چل پڑیں

یا روح اسلام کو دغا دے کر اس کی سیدھی، صاف، اور طاقت ور روح کی بجائے کسی دوسری اسپرٹ کو اپنا لیں۔

کسی جزئی مسئلہ میں کسی بات کو رد کر دینے یا قبول کر لینے کے لیے ہمارا معیار یہ ہونا چاہیے کہ ہم اسے اسلام کے بنیادی فکر اور اس کے عام مزاج پر پرکھیں۔ جو چیز اسلام کے بنیادی فکر اور روح کے موافق نظر آئے اُسے قبول کر لیں اور جو چیز ان کے خلاف واقع ہوتی ہو اسے رد کر دیں۔ اس طرح ہم حیات وکائنات اور انسان کی بابت اپنے بنیادی فکر کے دائرہ میں رہتے ہوئے انسانی جدّوجہد اور تجربات کے تمام ثمرات سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔ ہم اپنے اور انسانی تجربات کے درمیان کوئی دیوار نہیں حائل ہونے دیں گے۔ ہم ہمیشہ چلتے رہنے والے قافلۂ انسانیت سے الگ کٹ کر کسی گوشہ میں نہیں کھڑے رہیں گے۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ بات ایمان کی طرح راسخ اور جوش وخروش کے درجہ تک پہنچی ہوئی ہو کہ ہم ایک ایسا نظریہ حیات رکھتے ہیں جو ان تمام نظریہ ہائے حیات سے بہتر و برتر ہے جو دوسرے مذاہب یا تہذیبوں کے متبعین کے پاس رہے ہیں، کیونکہ یہ نظریہ اللہ کا دیا ہوا ہے جو زندگی کا خالق ہے۔

لیکن یہ ایک مجمل بات ہے، اور ضرورت ہے کہ اس عظیم مقصد تک پہنچنے کے لیے جو عملی طریقے اختیار کرنے ہوں گے ان کو وضاحت کے ساتھ سامنے لایا جائے۔ بالخصوص اجتماعی عدل کے ضمن میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ضرورت ہے کیوں کہ یہ اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔ اب ہم اللہ کی مدد پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ گفتگو شروع کریں گے۔

اسلامی فکر کا اِحیاء

ایک اسلامی زندگی کے از سرِ نو آغاز کے لیے یہ کافی نہیں کہ اسلامی فکر کی بنیاد پر نئے قوانین وضوابط بنا دیئے جائیں۔ اور نئے انتظامی ادارے قائم کر دیئے جائیں۔ کیونکہ یہ ان دو بنیادوں میں سے صرف ایک بنیاد ہے جن پر اسلام مطلوبہ زندگی کی تعبیر عمل میں لاتا ہے۔ دوسری بنیاد ایک ایسی ذہنیت کی تخلیق وتربیت ہے جو اسلامی اسپرٹ کے رنگ میں پوری طرح رنگی ہوئی ہو۔ ایسا ہوتے پر ہی اس بات کا انحصار

ہے کہ اس زندگی کی طرف داخل میں ایک قوی رجحان پیدا ہو جائے جو اس خارجی فضا سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جسے قوانین و ضوابط اور انتظامی ہیئتوں کے ذریعہ اسلام بنانا چاہتا ہے۔ اجتماعی عدل اس اسلامی زندگی کا ایک جزو ہے۔ یہ اسی وقت مکمل طور پر شرمندۂ تعبیر ہو سکے گا جب خود یہ زندگی پوری طرح عملی شکل اختیار کرلے۔ اسے بقا کی ضمانت صرف اس صورت میں دی جا سکتی ہے جب اُسے اس کی مضبوط بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ اس کا حال بھی اس ضمن میں دوسرے نظاموں جیسا ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر پوری طرح ایمان ہو اور اس کی صلاحیتوں پر کامل اعتماد ہو۔ ایسا نہ ہوگا تو یہ دین اپنی معنوی بنیادوں سے محروم ہو جائے گا اور صرف قانون کے جبر اور اجتماعی ضابطہ بندی کے دباؤ کے بل پر قائم ہوگا۔ اس جبر کی عمر صرف اس لمحہ تک ہوتی ہے جب کہ اس سے بچ نکلنے کے مواقع مل جائیں۔

اسی لیے اسلامی قانون سازی کو زیادہ آسانی کے ساتھ اتباع و اطاعت بسرّ آجاتی ہے، کیوں کہ وہ ایک دینی عقیدہ پر بھروسہ کرتی ہے۔ ضروری ہے کہ ہم اس عقیدہ کو از سر نو زندہ کرنے کی فکر کریں۔ اور اس کے گرد جو تحریفات، تاویلات، اور شبہات جمع ہو گئے ہیں ان کا ازالہ کریں تاکہ یہ عقیدہ اس قانونی نظام کی پشت پناہی کر سکے جس کی طرف ہم اشارہ کر رہے ہیں۔ اور ایک حقیقی اسلامی زندگی کا قیام ممکن ہو جائے۔ اس طرح یہ زندگی قانون اور ہدایت و ترغیب کی ان دونوں بنیادوں پر قائم ہو سکے گی۔ جن کو اسلام اپنے جملہ مقاصد کے حصول میں ذریعہ بناتا ہے۔

زندگی کی نئی تنظیم عمل میں لانے والی اسلامی قانون سازی کے پہلو بہ پہلو افراد اور جماعتوں کے اندر صحیح اسلامی فکر پیدا کرنے کی کوشش ناگزیر ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا فکر پیدا کرنے کا واحد فطری طریقہ تعلیم و تربیت ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہم ایسی ثقافت، تربیت کے ایسے ذرائع اور فکر بنانے کے ایسے طریقوں سے کام لے کر جو سراسر مغربی، اور اسلامی فکر کے دشمن ہیں، اسلامی فکر کیسے پیدا کر سکتے ہیں، اولاً یہ نظام تعلیم و تربیت مادی بنیادوں پر قائم ہے، جو زندگی کے بارے میں اسلام کے نظریہ کی عین ضد ہے ثانیاً، اسلام دشمنی اس کی سرشت میں داخل ہے خواہ یہ مقصد ظاہر ہو یا پوشیدہ۔

سچی بات تو یہ ہے کہ، جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، اسلامی فکر کے احیاء کے لیے مغربی فکر کو ذریعہ بنا کر

ہم پہلے ہی قدم پر اپنی شکست کا اعلان کر دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اسی مغربی فکر سے نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک خالصۃً اسلامی طرزِ فکر اختیار کرنا ناگزیر ہے تاکہ یہ اطمینان ہو سکے کہ جو چیز اس کے نتیجہ میں جنم لے گی وہ دوغلی نہیں اصلی ہوگی۔

ان باتوں کا منشاء یہ نہیں کہ ہم فکری، علمی، اور ثقافتی اعتبار سے گوشہ گیری کے قائل ہیں۔ یہ ساری چیزیں انسانیت کی مشترکہ میراث ہیں۔ دنیا کی ساری قومیں اس میں یکساں شریک ہیں، بالخصوص ہم تو اس میں بدرجۂ اولیٰ حصّہ دار ہیں کیوں کہ ہم اب بھی اس کی تشکیل میں عملی حصّہ لے رہے ہیں۔ بظاہر ہم اس پر کوئی مثبت اثر نہیں ڈال رہے ہیں لیکن دراصل دنیا کی ساری قوموں کے درمیان عمل اور ردِّ عمل ایک حقیقت ہے اور اس کا سلسلہ برابر جاری رہے۔

ہم انسانیت کے قافلہ سے الگ نہیں رہنا چاہتے۔ بلکہ ایک اسلامی فکر کی تجدید و تشکیل کے خواہاں ہیں۔ ایک ایسے زمانہ میں جب کہ خود مغرب کے اصحاب بصیرت کو صاف نظر آرہا ہے کہ مغرب کی مادّی تہذیب کا فکر نوعِ انسانی کے لیے ایک مہلک فکر ہے۔ جو انسان کو مستقل اضطراب و انتشار، ہمہ دم کشمکش اور دائمی نزاع میں مبتلا کیے ہوئے ہے، اور جس نے انسانی صفات میں زبردست انحطاط پیدا کر دیا ہے۔ اگر انسانی صفات میں یہ انحطاط نہ رونما ہوتا اور زندگی کے بارے میں مغربی فکر کی خالصۃً مادّی بنیاد انسان کو راہِ کمال دکھلانے سے یکسر عاجز نہ ہوتی تو جو علمی انکشافات و اکتشافات ہوئے ہیں وہ یقیناً انسانیت کو فلاح و سعادت سے بہرہ مند کر سکتے، اسے مصیبت سے نجات دلا سکتے اور اس کی جملہ ضروریات کی تکمیل کر سکتے ہیں۔

ان حالات میں اگر ہمیں اسلامی فکر کی تعمیر مقصود ہے تو یہ تمیز کرنی ہوگی کہ مغرب کی کون سی چیزیں لینے کے لائق ہیں اور کون سی ترک کر دینے کے لائق ہے۔ ایسا کرنا اس وقت تک ضروری ہوگا جب تک کہ ایک مضبوط و مستحکم اسلامی معاشرہ کی تعمیر مکمّل نہیں ہو جاتی۔ ایسا ہو جانے کے بعد اس سے متاثر ہونے، اسے متاثر کرنے، اس سے ٹکر لینے یا اس سے کچھ لینے، کچھ دینے میں کوئی خطرہ نہ ہوگا، بالفاظ دیگر، ضروری ہے کہ مدّتِ شیر خواری میں ہم اُس فکر کے تحفظ کا پورا اہتمام کریں جس کی تعمیر مقصود ہے۔ واضح رہے کہ مسئلہ اپنے اندر اس فکر کو پروان چڑھانے کا ہے نہ کہ خود اس فکر کی پرورش کا کیوں کہ اسلامی فکر فی نفسہٖ

اتنا واضح اور قوی ہے کہ اسے کسی دوسرے فکر سے کوئی اندیشہ نہیں۔ یہ تو خود ہم ہیں جنھوں نے اجنبی چھاتی ہیں منہ لگایا، اجنبی غذائیں کھائیں، اور غیروں کی خوشہ چینی کرکے زندگی گذار رہے ہیں۔ ضروری ہے کہ تشکیل فکر کے مرحلہ میں ہم محتاط اور چوکنے رہیں۔

نظام تعلیم

جہاں تک مجرّد علوم (Pure sciences) اور ان کی تطبیق کے مختلف عملی نتائج کا سوال ہے کہ ہم کو مادّی زندگی میں اُن سے اور ان کے اِن نتائج سے استفادہ میں کوئی باک نہ ہونا چاہیے بلا کسی قید اور شرط کے، بلا جھجک اور بغیر کسی سُستی کے ان سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

رہا فلسفہ جو حیات و کائنات کی فکری تعبیر کا نام ہے، اور ادب جو ان کی نفسیاتی اور وجدانی تعبیر ہے، اور تاریخ جو ان کی واقعاتی تفسیر کا نام ہے، اور قانون سازی جو افراد و جماعتوں کے باہمی تعلقات کی تشریح ہے...... تو ان سے استفادہ میں ہمیں بہت زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔

زندگی کے جزئی معاملات میں علوم مجرّدہ سے استفادہ سے کسی نقصان کا اندیشہ نہیں مگر زندگی کی جامع تفسیر و تعبیر ہمارے لیے مضر ہوگی کیونکہ اس کی بنا ہمارے فکر سے بالکل مختلف ایک دوسرے فکر پر ہے۔ یہ تعبیر حیات و کائنات کی ایک ایسی تصویر سامنے لاتی ہے جو اسلام کی پیش کردہ تصویر سے ٹکرا جاتی ہے۔ وہ بالآخر ہمیں اسلام سے ہٹا کر ایک دوسری راہ پر ڈال دیتی ہے۔ یہ راہ وہی ہے جس پر چل کر آج انسانیت واویلا مچا رہی ہے اور اس پر چلنے کا خمیازہ بھگت رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب ایسا ہے تو خود مجرّد علوم بھی پوری طرح محفوظ نہیں کیونکہ وہ بھی مغربی طرز فکر سے آزاد نہیں۔ چنانچہ تجربی طریق تحقیق ایک مخصوص فلسفہ کی بنیاد پر قائم ہے جو روحانی فلسفہ یا عقلی فلسفہ سے مختلف ہے۔ اگر تجربی طریق تحقیق ذہنوں پر چھا نہ گیا ہوتا تو سائنس کا ارتقاء جن خطوط پر ہوا ان سے کچھ مختلف راہیں اختیار کرتا۔ سائنس بحیثیت مجموعی فلسفہ سے بالکل علیحدہ نہیں۔ وہ نہ صرف یہ کہ اس سے متاثر ہوتی ہے بلکہ اُس پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ فلسفہ سائنس کے تجربات اور نتائج سے فائدہ اٹھاتا ہے اور خود اس کے رجحانات اور طریقے اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ علوم مجرّدہ کو لے لینا لازماً یہ معنی رکھتا ہے کہ

جس فلسفہ سے یہ علوم متاثر ہوئے ہیں، اور جس کو انھوں نے متاثر کیا ہے، اس کا بھی کچھ حصہ لیا جا رہا ہے۔ مزید برآں سائنس کے تطبیقی نتائج مادی زندگی، وسائل معیشت، اور تقسیم دولت پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں، یہ ساری چیزیں مل کر نئے سماجوں کو جنم دیتی ہیں جو اپنا ایک نیا اور ممتاز فلسفہ رکھتے ہیں، یا کم از کم زندگی کے بارے میں ایک ایسا نظریہ رکھتے ہیں جو عملی زندگی میں ان تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے۔

یہ بات درست، اور واقعی صورت حال کے عین مطابق ہے۔ لیکن ناگزیر چیز سے بچنا ناممکن ہے سائنس اور اس کے ثمرات سے دست کشی کی کوئی شکل نہیں، اور کنارہ کشی کے نقصانات فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس زندگی میں نہ تو کوئی چیز خالص خیر ہے نہ محض شر۔ اسلام سائنس سے اور اس کے ثمرات سے فائدہ اٹھانے سے نہیں روکتا۔ انسانیت کے باغوں کے علمی ثمرات سے استفادہ بھی روح اسلام کے خلاف نہیں، جب ہم فلسفہ، ادب، تاریخ اور قانون سازی کی دنیا میں اصولی اثرات سے تحفظ کا اہتمام کریں گے، اور ان کی جلو میں آنے والے طریقۂ تربیت اور طرز فکر سے بھی احتیاط برتیں گے اور ان سب کو اسلامی بنیادوں پر قائم کریں گے تو بڑی حد تک سائنس کے نتائج اور اس کے مادی آثار کے اثر سے اپنے اُس فکر کو بچالے جائیں گے جو ہم زندگی اور طرز زندگی کے بارے میں بنانا چاہتے ہیں۔

طریق تربیت کا ذکر آگیا ہے تو اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ یہ کسی قوم کے عام فلسفہ سے الگ کسی چیز کا نام نہیں۔ جب ہم مغرب سے اس کے طریق تربیت، نظام تعلیم اور تعلیمی پروگرام اخذ کرتے ہیں تو ساتھ ہی ان کے پیچھے کام کرنے والے فلسفہ کو بھی درآمد کر لیتے ہیں، خواہ شعوری طور پر چاہیں یا نہ چاہیں۔

یہ خیال کہ یہ خالص فنّ تعلیم (Pedagogy) کے مسائل ہیں، لہٰذا ان کی نوعیت خالصۃً انسانی ہے، اور یہ ہر ملک کے لیے یکساں درست ہیں، ایک خیال خام ہے۔ جس کا منبع نفسیات اور فن تعلیم و تربیت کے علماء کی خود فریبی، اور ان کی یہ ضد ہے کہ اس صدی میں جب یہ علوم فلسفہ سے علیٰحدہ ہو گئے تو اب انھیں دوبارہ فلسفہ سے نہ وابستہ کریں۔

لیکن حقیقت واقعہ کچھ اور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ علم نفسیات آئندہ کبھی ایک علم مجرّد قرار پا جائے جو تجربہ گاہ میں سکھایا جا سکے۔ لیکن طریقۂ تربیت، نصاب تعلیم اور تعلیمی پروگرام مرتب کرنے میں اس سے

استفادہ اور اس کے نتائج کی توجیہ و تعبیر کا کام ہمیشہ فلسفۂ حیات سے متاثر، اس کا تابع اور بالآخر اسی کی طرف لے جانے والا رہے گا۔ علم نفسیات کا تجربہ گاہ کے تابع ہوجانا خود اس تجربی فلسفہ یا تجربی طرز تحقیق کا پرتو ہے جو گذشتہ سالوں میں مغرب کی مادی عقلیت پر چھایا رہا ہے۔ وقت کے چھائے ہوئے فلسفہ سے علم نفسیات کبھی آزاد نہیں ہوسکتا۔ زیادہ سے زیادہ جو چیز اسے میسر آسکتی ہے وہ ظاہری اور نمائشی آزادی ہے جو آخری نتائج پر کوئی اثر نہیں مرتب کرتی۔ تربیت کے طریقوں اور فلسفوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے۔

اس کی مثال ہم کو امریکہ کے نصاب تعلیم اور طرز تربیت و تدریس میں ملتی ہے۔ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ وہ علمی سوجھ بوجھ پیدا کرنے کی بجائے عملی مشق و مہارت پیدا کرنے کی طرف زیادہ متوجہ ہیں۔ ان کا مقصد ہی یہ ہے کہ نظری مباحث پر عملی مہارت کو مقدم رکھا جائے۔ اس رجحان کی اصل وجہ ہمیں فلسفۂ عملیت (Pragmatism) میں ملے گی جس کی بنیاد چارلس پیرس (Charles Pierce) نے ۱۸۷۸ء میں رکھی تھی۔ اسے ولیم جیمس نے مرتب کیا اور عہد حاضر میں نظریہ تعلیم کے مشہور ماہر، جان ڈیوی نے آخری شکل دی۔ یہ طریقہ فکر و تحقیق کے طرز میں ایک انقلاب کا ہم معنیٰ ہے۔ اس میں مجرد افکار، اور نظری معانی سے، نیز اشیاء کی ماہیت و حقیقت کی تلاش و جستجو سے یکسر بے نیاز ہوکر اشیاء کے عملی علامات و آثار کو مرکز تحقیق و گفتگو بنایا جاتا ہے۔

"چارلس پیرس یا فلسفۂ عملیت کے نزدیک تصور (IDEA) صرف عمل اور سرگرمی کا ایک خاکہ یا پروگرام ہے، فی نفسہٖ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مثلاً میں سڑک پر چلنے والے موٹر کے ہارن کا ایک تصور رکھتا ہوں اب یہ بات بالکل بے معنی ہوگی کہ میں اس کی حقیقت، نقطۂ آغاز، اور اصل کی تحقیق کرنے لگوں کہ یہ حقیقی ہے یا عقل کی تراشیدہ، اور یہ کہ کان اور نظام اعصاب اس کے موجب ہیں یا ہارن اور موٹر، یا ان دونوں کے علاوہ کوئی اور شئے؟ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس کا مطلب یہ سمجھا جائے کہ تھوڑا دائیں یا بائیں ہٹ جایا جائے اور موٹر کے لیے راستہ چھوڑ دیا جائے۔ اس کے معنیٰ صرف اتنے ہیں کہ میں فوراً اپنا راستہ بدلنے اور جس سمت میں جا رہا تھا اس سے ذرا مختلف سمت میں جانے کی طرف متوجہ ہوجاؤں۔ اس سے نظریہ عملیت یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تصور صرف ایک نقشۂ عمل اور ماحول پر اثر اندازی کا ایک پروگرام ہوتا ہے۔ وہ عمل کی راہ میں ایک قدم

ہے جو بعد کے قدموں پر اثر انداز ہوتا ہے"۔ [1]

اس نظریہ یا طرزِ فکر کی مقبولیت نے امریکہ کے نظامِ تعلیم و تربیت اور نصابِ تعلیم کو اس کی موجودہ شکل دی ہے اور ایک ایسی ذہنیت بنانے کی کوشش کی ہے جو مختلف چیزوں کی طرف اس نگاہ سے دیکھے اور زندگی کے بارے میں اس انداز پر سوچے۔ بلکہ اسی فکر نے امریکہ کی زندگی کو اس کا موجودہ مزاج عطا کیا ہے اور اسے اضافہ پیداوار کی طرف متوجہ کر کے فنون و نظریات کے باب میں تعلیم و تربیت سے غافل کر دیا ہے۔

طرزِ تعلیم و تربیت اخذ کرتے وقت ہمیں اس کے اندر بنیادی فلسفہ کے دخل کا پوری طرح شعور ہونا چاہیے، کیونکہ ان طریقوں کے پیچھے فلسفہ ہمیشہ مضمر رہتا ہے۔ یہی اس کو جنم دیتا ہے، اور اسے ایک مخصوص راہ پر چلاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فلسفہ نفسیات کے مجرد علم کے نتائجِ تحقیق سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے، اگرچہ خود یہ تحقیقات اپنے طریقہ اور اپنے نتائج دونوں کے باب میں اسی فلسفہ سے برابر متاثر ہوتی رہتی ہے۔

پس ایک آزاد اسلامی فکر کی تعمیر کے لیے ہمارا طریقہ نظری طور پر یہ قرار پایا کہ دوسروں سے فلسفہ اور اسی کے زیر اثر پیدا ہونے والے طرزِ تعلیم و تربیت نصابِ تعلیم، ادب، تاریخ، قانون سازی وغیرہ.... اخذ کرنے میں ہم کو بہت احتیاط اور پوری بیدارئ شعور کے ساتھ آگے بڑھنا چاہیے.... اب ہم ان میں سے ہر ایک کے سلسلہ میں مختصراً کچھ باتیں سامنے لانے کی کوشش کریں گے۔

فلسفہ

فلسفہ کے باب میں ہم کائنات، حیات، اور انسان کے بارے میں اسلام کا کلی فکر پہلے سامنے لا چکے ہیں۔ یہ فکر اپنی اصل کے اعتبار سے یونانی دور سے آج تک کے سارے مغربی افکار کلیہ سے یکسر مختلف مزاج رکھتا ہے فرق کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں، ہمارے لیے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ دونوں کے درمیان گہرا بنیادی اختلاف ہے۔ [2]

اس سلسلہ میں خاص طور پر جامعہ ازہر کو ایک اہم کام کرنا چاہیے تھا جس کی اسے توفیق نہ ہو سکی......

۱۔ پراگ میٹزم یا "فلسفہ الذرائع" مصنفہ ڈاکٹر یعقوب فام۔

۲۔ مصنف عنقریب "اسلام کے نظریہ حیات، کائنات اور انسان" پر ایک جامع کتاب پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

..... اور وہ یہ کہ اسلام کے اس کلّی فکر کی تحقیق کرے اور اسے دقت کی زبان اور وقت کے اسلوب میں مکمّل طور پر اور زور دار طریقہ سے پیش کرے، نیز اس کے اور دوسرے مکاتب فلسفہ کے درمیان موازنہ کرے۔ بجائے اس کے کہ ازہر یہ خدمت انجام دیتا وہ "کلیۃ اصول الدین" میں ان فلسفوں کی تعلیم دیتا رہا جن کو بالکل غلط طور پر اسلامی فلسفہ کہا جاتا ہے یعنی ابن سینا اور ابن رشد کی کتابیں ..... جو یونانی فلسفہ کے عکس ہیں اور اسلام کے کلّی فکر کی حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔ ازہر کے اپنے اصل مشن کو فراموش کر دینے کی یہ انتہائی مثال ہے۔ یہ اسلامی فکر کے اوّلین ادارہ میں روحانی اور فکری شکست کا اعلان ہے۔

حیات کائنات اور انسان کی بابت صحیح اسلامی فکر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے اسکولوں کے ثانوی درجات میں مغربی فلسفہ اور اس کے ساتھ آنے والے اخلاقی اصولوں کی تعلیم بالکل نہ دی جائے۔ یونی ورسٹی میں بھی ان کی تعلیم صرف شعبہ فلسفہ میں دی جائے اور کم از کم ابتدائی دو سال کے بعد شروع کی جائے ازہر سے متعلق کالجوں میں تو ظاہر ہے کہ ان کی تعلیم بالکل آخر میں دی جانی چاہیے۔ جس ادارہ میں بھی ان کی تعلیم دی جاتی ہو وہاں ان سے پہلے ایسی خالص اسلامی تعلیم دی جانی چاہیے جو اسلام کا حقیقی فکر پیدا کرتی ہو اور نام نہاد "اسلامی فلسفہ" سے بالکل مبرّا ہو۔

جب طالب علموں کے ذہن میں اسلام کی روح اور حیات، کائنات اور انسان کے بارے میں اس کے نظریات نیز خیر و شر اور جزاء و عمل کی بابت اس کے تصورات، اور فلسفہ کے میدان میں اسلامی عقیدہ کے دوسرے مباحث اچھی طرح راسخ ہو جائیں تو اعلیٰ تعلیم کے آخری سالوں میں ہم فلسفہ میں اختصاص حاصل کرنے والے طلبہ کو یونانی فلسفہ، اسلامی فلسفہ پر اس کے اثرات، اور جدید یورپین اور امریکی فلسفہ کی بھی تعلیم دیں گے۔ اس کے ساتھ ہم ہر مرحلہ پر ان فلسفوں اور اسلامی فلسفہ کا تقابلی مطالعہ بھی کراتے رہیں گے۔ کسی حد تک ہم اس کا اہتمام کریں گے کہ ان اجنبی فلسفوں کی تعلیم ان کے شعور و وجدان پر اثرانداز نہ ہو بلکہ بحث و مجادلہ اور مسلمانوں کے حقیقی طرز فکر سے مناسبت نہ رکھنے والی باتوں کی تردید کی استعداد پیدا کرنے کے علاوہ ان کا بہت کم اثر پڑے۔ ایسی شکل میں اُن فلسفوں سے واقفیت نقصان دہ نہ ہوگی بلکہ مفید ہوگی کیونکہ یہ سراسر عقلی واقفیت ہوگی جو قلب و ضمیر پر کوئی وجدانی اثر نہ ڈال سکے گی۔ نہ زندگی کے بارے میں انسان کے

نقطۂ نظر اور احساس کو یا اس کے طرز عمل کو زیادہ متاثر کر سکے گی۔

ہم نے ایک مثال کے ذریعہ بتایا ہے کہ فلسفہ عملیت (Pragmatism)
اشیاء کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے لیکن اس مثال سے اس فلسفہ یا طرز فکر کی خطرناکی پوری طرح واضح نہیں
ہوتی لہذا ضروری ہے کہ ہم اس فلسفہ کے دور رس نتائج کا مطالعہ کریں تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ موجود
نسل کی ذہنیت کے ایک ایسے نظریہ کے رنگ میں رنگ جانے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔

"زیادہ تر لوگ خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ تصوّر (iDeA) منطقی اعتبار
سے یا تو صحیح ہوگا یا غلط۔ نظریہ عقلیت کا فیصلہ یہ ہے کہ خدا یقیناً موجود ہے بشرطیکہ منطقی طور پر
اس کا وجود ثابت ہو جائے۔ نظریہ عملیت اس مسئلہ سے بالکل دوسری طرح تعرّض کرتا ہے
وہ اسے ایک بالکل مختلف شکل میں سامنے لاتا ہے۔ اس کے خیال میں اس تصوّر کی صحت کا
مدار منطقی لزوم پر نہیں بلکہ ہماری ٹھوس عملی زندگی، روزمرہ کے کاروبار، اور تجربات میں
اس کی صلاحیت کار پر ہے۔ اگر یہ تصوّر زندگی میں پسندیدہ نتائج سامنے لاتا ہے تو صحیح
اور درست قرار پائے گا اور اس طور پر اللہ موجود قرار پائے گا۔ بغیر اس طریقے کے اولاً
تو ہم اس تصوّر کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے اور ثانیاً اگر فیصلہ کر بھی لیں تو اس پر
بھروسہ نہیں کر سکتے۔" [1]

اسلام کا طریقۂ تحقیق نظریۂ عقلی سے کچھ مختلف ہے کیونکہ وہ مسئلہ کو کلیتاً ذہنی منطق کے حوالہ نہیں کر دیتا
بلکہ اس کے ساتھ الہام پر بھی بھروسہ کرتا ہے۔ لیکن اسلامی نظریہ اور نظریہ عملیت کے درمیان زبردست
تضاد پایا جاتا ہے۔ کیونکہ اگر ہم اس نظریہ کے آخری نتائج کو دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ ایسے حالات میں
جب کہ تصوّرِ خدا مادّی زندگی میں بظاہر کوئی مفید خدمت نہ انجام دے رہا ہو یہ نظریہ اس تصوّر کو جڑ سے
اکھاڑ پھینکتا ہے کیونکہ وہ نہ کوئی اوزار ہلا سکتا ہے۔ نہ کوئی مشین چلا سکتا ہے!

ایک قدم اور آگے بڑھیے تو ظاہری منفعت ہی فیصلہ کن نظر آتی ہے۔ صرف اشیاء کے ردّ و قبول میں

---

[1] پراگ میٹزم یا فلسفہ ذرائع ، یعقوب خام

ہی نہیں بلکہ خود ان کے وجود اور عدم وجود کے بارے میں بھی! یہاں پہنچ کر انسانیت اپنی ساری قدر و قیمت کھو بیٹھتی ہے اور اس کی وقعت اوزار و آلات سے زیادہ نہیں رہ جاتی ۔

زندگی کی عملی روش ان افکار سے بے نیاز نہیں رہ سکتی ۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسئلہ فلسطین میں امریکہ کا طرز عمل، یا وہ پالیسی جو اس نے مصر کے مسئلہ میں حفاظتی کونسل میں اختیار کی بعض دوسرے عوامل کے پہلو بہ پہلو، نظریہ عملیت کی پیدا کردہ ذہنیت کے نتائج تھے ۔ حق اور عدل کے تصورات امریکہ کی مادی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈالتے لہذا ظاہر ہے کہ بین الاقوامی پالیسی کے ضمن میں ان چیزوں کا ذکر یا ان بنیادوں کو تسلیم کرنے کا اعلان کوئی معنیٰ نہیں رکھتا ۔ اس پر فریب پوزیشن کی اتنی وضاحت کافی ہے ۔

اگر ہم یہ نہیں چاہتے کہ اپنے اسلامی معاشرہ میں اس قسم کی ذہنیت پیدا کریں تو ہمارے لیے مغربی فلسفہ کی تعلیم سے پرہیز ضروری ہے تا آنکہ ہم نوجوانوں کے ذہن میں اسلام کے کلّی فکر پر مبنی ایک ٹھوس، طاقت ور، گہرے اور واضح نظریہ کو راسخ کرنے میں نہ کامیاب ہو جائیں ۔ اسی طرح تعلیم و تربیت کے طریقوں اور نصاب تعلیم وغیرہ اخذ کرنے میں بھی پوری احتیاط ضروری ہے کیونکہ یہ چیزیں اپنے ملک کے عمومی فلسفہ کے تابع اور بالواسطہ یا بلاواسطہ انہی مقاصد کی طرف لے جانے والی ہوتی ہیں جن کی تعیین یہ فلسفہ کرتا ہے ۔

اسلامی ادب

ادب زندگی کی وہ تفسیر ہے جو ہمارا جذبہ و ادراک کرتا ہے ، یہ اس منبع سے نکلتا ہے جس میں کسی مخصوص ماحول میں، سارے فلسفے ، مذاہب ، تجربات اور دوسرے عوامل کے دھارے آکر مل جاتے ہیں ۔

زندگی کے بارے میں ایک وجدانی تصوّر کی تشکیل اور انسان کے مزاج کو ایک مخصوص سانچہ میں ڈھالنے کے سلسلہ میں ادب موثر ترین عامل واقع ہوا ہے ۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایسا ادب ہو جو اسلامی فکر سے ابھرا ہو ۔ مناسب ہوگا کہ یہاں ہم اسلامی ادب کے منہاج پر قدرے تفصیلی گفتگو کریں ۔

دوسرے فنون لطیفہ کی طرح ادب بھی ان زندہ قدروں کی، جن سے فن کار کا ضمیر متاثر

ہوتا ہے، ترجمانی کا نام ہے ۔ یہ اقدار مختلف افراد، مختلف حالات اور مختلف زمانوں کے لیے مختلف ہو سکتی ہیں لیکن ان کا منبع بہر صورت زندگی کا کوئی مخصوص تصوّر اور اس تصوّر کی روشنی میں استوار ہونے والے وہ رشتے ہوتے ہیں جو انسان اور کائنات، نیز انسان اور انسان کے درمیان پائے جاتے ہیں ۔

ادب یا کسی بھی فن لطیف کو ان قدروں سے مجرد کر کے دیکھنے کی کوشش لاحاصل ہے جن کی وہ براہ راست ترجمانی کرنے کی، یا ان تاثرات کے اظہار کی کوشش کرتا ہے جو انسان کا احساس ان سے قبول کرتا ہے ۔ اگر ہمیں اس کار محال میں کامیابی ہو سکتی کہ ہم ان فنون کو ان اقدار سے مجرد کر کے دیکھ سکیں تو ہمیں بجز کھوکھلی عبارتوں، خالی خولی خطوط و نقوش، مبہم ولایعنی آوازوں، اور بے ڈول اور گم سم اجسام کے اور کچھ نہ نظر آتا ۔

اسی طرح خود ان اقدار کو زندگی کے بارے میں کلّی فکر اور اس کی روشنی میں استوار ہونے والے ان رشتوں سے جو انسان اور کائنات یا انسان اور انسان کے درمیان پائے جاتے ہیں، علیحدہ کر کے دیکھنے کی کوشش بھی بے سود ہے ۔ یہ بات کہ انسان کو اس کا شعوری احساس ہے کہ نہیں کہ وہ زندگی کا کوئی مخصوص تصوّر رکھتا ہے چنداں اہم نہیں کیونکہ یہ تصوّر بہر حال اس کے داخل میں موجود ہوتا ہے ۔ یہی اس کی نظر میں قدروں کی تعیین کرتا ہے اور وہ تاثرات بھی اس کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے ہیں جو انسان ان قدروں سے قبول کرتا ہے ۔

اسلام زندگی کا ایک مخصوص تصوّر ہے اور اس تصوّر سے چند مخصوص قدریں ابھرتی ہیں ۔ فطری طور پر ان اقدار کی ترجمانی، یا فن کار کے داخل پر ان کے اثر کی ترجمانی، ایک مخصوص مزاج کی حامل ہوگی ۔

اسلام کی اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک عظیم، ٹھوس، فعّال اور تخلیقی قوت رکھنے والا عقیدہ ہے جو فرد کے داخل اور اس کی عملی زندگی پر پوری طرح چھا جاتا ہے اور انسان کی تمام عملی اور جذباتی قوتوں کو اپنا لیتا ہے ۔ اس کے بعد کوئی ایسا خلا نہیں باقی رہتا جس میں اضطراب اور حیرت کو کوئی جگہ مل سکے یا جہاں وہ ناکارہ غور و فکر جاگزیں ہو سکے جس کا نتیجہ بجز تفکّرات اور خیالی شکلوں کے اور کچھ نہیں ہوتا ۔ اسلام میں سب سے نمایاں چیز اس کی ہمہ گیر عملی حقیقت پسندی ہے جو غور و فکر اور میلانات پر بھی حاوی رہتی ہے ۔ اسلام میں ہر غور و فکر انسانی اور کائناتی رشتوں کا ایک ادراک

یا اس ادراک کی ایک کوشش ہوتا ہے ۔ وہ خالق اور مخلوق، یا کائنات کی مختلف اکائیوں کے درمیان پائے جانے والے رشتوں کی تقویت اور استحکام کا باعث بنتا ہے ۔ اس کا ہر میلان ایک ہدف کی تمہید یا کسی ہدف کے حصول کی کوشش ہوتا ہے، خواہ وہ ہدف کتنا ہی بلند ہو۔

اسلام زندگی کو نشو و نما اور ترقی دینے کے لیے آیا ہے، نہ کہ کسی خاص زمانہ اور خاص مقام پر زندگی عملاً جیسی کچھ ہو اس پر قانع کر دینے کے لیے ۔ اسلام کا منشاء صرف اتنا نہیں کہ انسانی زندگی میں عملاً جو محرکات یا مانعات، یا رجحانات دقیو و کسی مخصوص عرصہ یا مدّت طویل میں پائے جاتے ہوں ان کی ایک روئداد پیش کر دی جائے ۔

اسلام ہمیشہ زندگی کو ترقی، نشو و نما اور نئے انداز اختیار کرنے کی طرف لے جاتا ہے ۔ وہ انسانی قوتوں کو آزادی بخشتا ہے، اُبھارتا ہے، اور بلندی کی طرف لے جاتا ہے ۔ اسی وجہ سے اسلامی تصوّرِ حیات سے اُبھرنے والا ادب یا آرٹ انسانی کمزوریوں کی عکاسی کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کرتا، نہ اس کے پیش کرنے میں زیادہ تفصیل سے کام لیتا ہے ۔ وہ ان کمزوریوں کو سندِ جواز عطا کرنے کی کوشش مطلق نہیں کرتا، کجا یہ کہ انھیں اس دلیل کی بنا پر پسندیدہ بنا کر پیش کرے کہ یہ کمزوریاں عملاً موجود ہیں لہٰذا ان کو چھپانے یا ان کے وجود سے انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ۔

اسلام اس حقیقت کا منکر نہیں کہ انسانیت میں کمزوریاں پائی جاتی ہیں لیکن اسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ انسانیت خوبیاں بھی رکھتی ہے ۔ اس کا احساس یہ ہے کہ اس کا اصل کام کمزوریوں پر خوبیوں کو غالب کرنا اور انسانیت کو بلندی کی طرف لے جانا، اس کا نشو و نما اور اسے ترقی دینا ہے، نہ کہ ان کمزوریوں کو سندِ جواز عطا کرنا یا ان کو پسندیدہ بنا کر پیش کرنا ۔

اسلامی تصوّراتِ حیات سے ابھرا ہوا ادب یا آرٹ کبھی کبھی انسان کے کمزور لمحات پر بھی رکتا ہے لیکن وہ ان پر ٹھٹک کر نہیں رہ جاتا بلکہ ان کی طرف اتنی ہی توجہ کرتا ہے جتنی کہ انسانیت کو ان کمزوریوں کے گڑھے سے نکالنے اور مجبوریوں کے پھندے اور دباؤ سے آزاد کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے ۔

اس لیے نہیں کہ اسلامی ادب محدود معنی میں 'اخلاق' کا پابند ہے بلکہ یہ اسلامی تصوّرِ حیات کے مزاج کا اثر ہے

اور اس حقیقت کا کہ اسلام کا منشاء زندگی کو نشو ونما دینا اور ترقی بخشنا ہے۔ وہ کسی لمحہ یا عرصہ میں زندگی کی عملی صورت حال پر قانع ہو جانا نہیں جانتا۔

اسلامی نظریہ اس زمین پر انسان کی کم مائگی اور زندگی کو آگے بڑھانے میں فرد کے حصّہ کی حقیقی تاکا قائل نہیں۔ چنانچہ اسلامی تصوّر سے ابھرنے والے ادب یا آرٹ کا کام یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان کو اس کی کمزوریاں، خامیاں، اور پستی یاد دلاتا رہے اور اس کی زندگی اور جذبات میں جو خلا پائے جاتے ہوں ان کو حسّی لذائذ کے خوابوں اور ایسی آرزوؤں سے پُر کرتا رہے جو اضطراب و حیرت، حسد اور سلبی جذبات کے سوا اور کچھ نہیں عطا کر سکتے۔ وہ انسان کو اس کے ایسے میلانات یاد دلاتا ہے جو بلندی کی طرف لے جاتے یا وسعتوں کی طرف مائل کرتے ہیں۔ وہ اس کی زندگی اور جذبات کے خلاؤں کو ان انسانی مقاصد سے پر کرتا ہے جو زندگی کو آگے بڑھاتے اور ترقی دیتے ہیں۔ یہ مقاصد فرد کے داخل سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور عملی زندگی سے بھی۔

اسلامی فکر سے اُبھرنے والے ادب یا آرٹ کا مظہر پند و مواعظ نہیں۔ ظاہر ہے کہ اظہار خیال کے یہ سادہ طریقہ فن کاری نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

اس ادب یا آرٹ کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ انسانی شخصیت یا سماجی زندگی کو کچھ کا کچھ بنا کر پیش کرے اور انسانی زندگی کی ایسی مثالی تصویر سامنے لائے جو کوئی وجود نہ رکھتی ہو۔ وہ دیانت داری کے ساتھ انسان کی پوشیدہ اور ظاہر دونوں طرح کی صلاحیتوں کو سامنے لاتا ہے۔ وہ زندگی کے ایسے مقاصد کی ٹھیک ٹھیک تصویر کشی کرتا ہے جو انسانوں کی دنیا کے شایان شان ہوں نہ کہ بھیڑیوں کے گلہ کے۔

اسلامی فکر سے اُبھرنے والا ادب یا فن مقصدی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلام زندگی کو مسلسل آگے بڑھاتے رہنے کی ایک تحریک ہے وہ کسی مخصوص دور یا کسی خاص لمحہ میں عملاً جو صورت حال ہو اس پر قانع ہو جانا نہیں جانتا۔ نہ وہ صرف اس لیے اس صورت حال کو سند جواز عطا کرتا یا پسندیدہ بنا کر پیش کرتا ہے کہ وہ عملاً موجود ہے۔ اس کا اصل کام ہی اس عملاً موجود کو بدلنا اور بہتر بنانا ہے۔ اس کا مستقل پیغام

یہ ہے کہ زندگی کی تعمیر نو اور تشکیل جدید کا کام ہر آن جاری رہے۔

اپنی اس خصوصیت کے اعتبار سے وہ اس مقصدی ادب اور آرٹ کی طرح ہے جو تاریخ کی مادی تعبیر سے ابھرتا ہے۔ مگر یہ مماثلت عارضی ہے، پھر دونوں کی راہیں بالکل جدا ہو جاتی ہیں...... کیونکہ اس فن میں زندگی کو آگے بڑھانے والی قوت کا مدار طبقاتی کشمکش ہے۔ اسلام طبقاتی کشمکش کو اتنی اہمیت نہیں دیتا کیونکہ انسانی مقاصد کے بارے میں اس کا تصور اس سے بہت زیادہ بلند اور وسیع ہے۔ وہ سماجی ظلم کو نہ گوارا کرتا ہے نہ جائز قرار دیتا ہے، اور نہ انسانوں کو اس پر راضی رہنے اور اس سے "لطف اندوز" ہونے کی تعلیم دیتا ہے اس ظلم کا مقابلہ کرنا اور اس کے ازالہ کی جدّ و جہد بھی اس کی جملہ مساعی میں شامل ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ اپنی انقلابی تحریک کو طبقاتی حسد کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسان کو اوپر اٹھانے اور ضروریات کی غلامی سے نجات دلا کر شرف و عزت کا مالک بنا دینے کی خواہش پر اٹھاتا ہے۔ اس خواہش پر کہ انسان کی بے نظیر انسانیت کو کھانے پینے اور جسمانی ضروریات کی تکمیل میں انہماک کے پھندے سے آزاد کیا جائے۔

اسلامی تصوّر میں زندگی کو آگے بڑھانے کی تحریک کا مدار ساری انسانیت کو آگے بڑھانے، اوپر اٹھانے، آزاد کرنے، اور نئی تخلیقی سرگرمیوں میں لگا دینے کے عزم پر ہے۔ اس راہ میں یہ فکر مختلف طبقات کے آلام و مصائب اور مشکلات و موانع کی طرف بھی توجہ کرتا ہے تاکہ ان مشکلات کو رفع کرے اور ان مصیبتوں کا ازالہ کرے۔ وہ انسان کی مصیبتوں کو معمولی چیز نہیں سمجھتا۔ لیکن وہ اِن کے ازالہ کے لیے حسد و کینہ کے ذرائع نہیں استعمال کرتا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ حسد خود ایک زنجیر پا ہے جو اکثر انسان کو بلندیوں کی طرف پرواز سے روک دیتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ صرف نظریاتی بحثوں اور پند و نصائح کے میدان میں نہیں بلکہ عملی زندگی میں ان مصائب و آلام کو واقعتہً کس طرح دور کیا جائے تو ہم نے اس موضوع پر دوسری جگہوں پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ یہاں ہم صرف اس بات پر زور دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی ادب یا اسلامی آرٹ مقصدی ادب اور مقصدی آرٹ ہے۔ حیات اور انسانی تعلقات کی بابت اسلامی فکر مزاج کا تقاضا ہے کہ وہ مقصدی ہو۔ یہ مزاج ایک تحریکی مزاج ہے جو تخلیق و تعمیر کی طرف لے جاتا ہے اور بلند پروازی سکھاتا ہے۔ مقصدیت سے میری مراد

یہ نہیں کہ تاریخ کی مادی تعبیر پر یقین رکھنے والوں کی طرح اس مقصد کو جبراً نافذ کیا جائے گا بلکہ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسلامی تصور حیات انسان کے داخل کو ایک خاص کیفیت عطا کردے جس کے طفیل اس سے آرٹ کے ایسے اسالیب جنم لیں گے جو مادی تصور حیات یا کسی دوسرے تصور حیات کے پیدا کردہ آرٹ سے بالکل مختلف ہوں گے۔

اسلام فی نفسہ فنون لطیفہ کا دشمن نہیں، البتہ وہ ان قدروں اور تصورات میں سے بعض کا مخالف ہے جن کی ترجمانی فنون لطیفہ آج کر رہے ہیں۔ وہ ان کی جگہ ——— داخل کی دنیا میں ——— کچھ دوسرے تصورات اور دوسری قدروں کو لاتا ہے جو اس بات کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں کہ جمالیاتی تصور کا فن کارانہ اظہار کریں اور زیادہ آزادی، اور بہتر حسن کاری کے ساتھ آرٹ کے نئے مظاہر سامنے لائیں جو اسلامی تصور کے مزاج سے اُبھرتے ہوں اور اس کی امتیازی خصوصیات کے حامل ہوں۔

اس سے یہ مطلب نہ اخذ کیا جائے کہ نئی پود کے لیے یورپ کا لٹریچر حرام ہے۔ ہم صرف حسن انتخاب اور خذ ما صفا ودع ما کدر کی دعوت دے رہے ہیں۔ کیوں کہ اس لٹریچر میں ایسی چیزیں بھی ملیں گی جو اسلامی اسپرٹ سے ہم آہنگ ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ان میں فضائل اخلاق کی تلقین اور رذائل کی مذمت کی گئی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ زندگی کو مادیت سے بلند ہو کر روحانی زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور زندگی کی معنوی قدروں کو تسلیم کرتا ہے۔ اس قسم کا ادب اپنی روح کے اعتبار سے اسلامی تصور حیات سے ہم آہنگ ہے۔ یہ نئی نسلوں کے وجدان کو نہیں مجروح کرے گا اور نہ ان کے خام اور نازک فکری وجذباتی قویٰ کو فساد آلودہ کر سکے گا۔ ان قویٰ کی یہ نازک اور خام حالت اگر ڈگری کے سال میں نہیں تو کم ازکم شعبۂ ادب کے تیسرے سال تک ضرور باقی رہتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ عین ضروری ہے کہ اختصاصی تعلیم کا نصاب بلا کسی تمیز و استثناء کے ہر قسم کے عالمی ادب پر مشتمل ہو کیوں کہ ایک خاص عمر تک صرف منتخب چیزیں پڑھانے پر اصرار کا مقصد صرف یہ ہے ابتدائی نشو ونما کا زمانہ خارجی اثرات اور انتشار سے پاک رہے۔

تاریخ

تاریخ بھی درحقیقت ادب کی ایک شاخ ہے۔ مگر یہ ایک مخصوص مزاج کی حامل اور خاص اہمیت کی

مالک ہے: تاریخ واقعات حیات کی تشریح وتعبیر کا نام ہے۔ اس کا فلسفہ اور زندگی کے بارے میں عمومی تصور سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ ان بنیادوں پر کی ہوئی تعبیر زندگی کے بارے میں ایک ایسا تصور عطا کرتی ہے جو زندگی اور تاریخ کے رجحان کی بابت اسلامی تصور سے بالکل مختلف ہے۔

مزید برآں چونکہ یہ مورخین زیادہ تر یورپین رہے ہیں لہذا انھوں نے عالمی تاریخ کا محور یورپ کو قرار دے رکھا ہے۔ اگر ہم مغرب کے غرور نفس اور خود پسندی سے چشم پوشی برتیں تو، انسان کی فطری کمزوری کے پیش نظر، انھیں ایسا کرنے میں معذور سمجھیں گے۔ اس روح کی حامل اور ایسا طریقہ اختیار کرنے والی تاریخ کے مطالعے نتیجہ میں ہماری نوخیز نسلیں دو غلط نظریات لے کر آگے بڑھتی ہیں۔

پہلا نظریہ یہ ہے کہ رفتار زمانہ اور تاریخ پر روحانی عوامل کا ذرا بھی اثر نہیں پڑتا، یا اگر پڑتا ہے تو بہت کمزور اور خفیف۔

دوسرا یہ کہ زمانہ کو آگے بڑھانا اور اس کا رُخ متعین کرنا صرف یورپ کا کام ہے، مشرق اور اسلام کو اس میں بہت حقیر اور معمولی سا دخل ہے۔

ان دونوں تصورات کا اثر انتہائی خطرناک اور مہلک ہوتا ہے۔ حیات، کائنات، اور طرز زندگی کے بارے میں ایک ہمہ گیر تصور کی تخلیق پر بھی اور یورپ کے جارحانہ اقدام کے بالمقابل اسلامی عزت نفس کے شعور پر بھی۔

اپنی نوخیز نسلوں کے ذہن کو اس خطرہ سے بچانے کے لیے ذیل کے دو اقدامات ناگزیر ہیں۔

پہلا کام یہ ہے کہ ہم سارے عالم کی عام تاریخ، واقعات وحوادث کی تعبیر کے اسلامی نقطۂ نظر سے مرتب کرنا شروع کر دیں۔ تاکہ یہ عظیم کام صرف یورپین طرز فکر ونظر کا اجارہ ہو کر نہ رہ جائے۔ اس تاریخ میں ہمیں یورپ کو اس کے صحیح مقام پر رکھنا ہوگا، اور اسے مبالغہ آمیز اہمیت نہ دیتے ہوئے تاریخ کی حرکت میں مشرق اور خاص طور پر اسلام نے جو حصّہ لیا ہے اسے نمایاں کر کے سامنے لانا ہوگا۔

دوسرا کام یہ ہے کہ ہم اپنے تعلیمی اداروں میں تاریخ کی تعلیم کا طریقہ بدل دیں پہلے سارے عالم اسلامی کی اسلامی تاریخ کو سامنے لائیں اور اس کی اسلامی نقطۂ نظر سے تعبیر پیش کریں۔ اپنی نئی نسلوں کو مغربی قلموں سے

لکھی ہوئی یا مغربی طرز تعبیر پر مبنی تاریخ اسلام پڑھا دینا کافی نہیں جب وہ اپنے ممالک کی تاریخ اچھی طرح پڑھ لیں تو اعلیٰ تعلیم کے مرحلہ میں ہم اپنے ہاتھوں کی مرتب کردہ تاریخ عالم سامنے لائیں پھر جب وہ اس سے بھی فارغ ہو لیں تو اختصاصی تعلیم کے مراحل میں ان کے سامنے مطالعہ تاریخ کے دوسرے طریقے بھی لائے جائیں۔

یہاں یہ مناسب ہوگا کہ ہم اسلامی تاریخ کی تدوین جدید کے بارے میں چند باتیں سامنے لائیں۔

اسلامی تاریخ کی تدوین جدید

تاریخ واقعات کا نہیں بلکہ ان واقعات کی تعبیر کا نام ہے۔ اس کا کام ان مخفی یا ظاہر رشتوں کی دریافت ہے جو ان مختلف واقعات کو باہم مربوط کر کے ایک ہی سلسلہ کی کڑیوں میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اس سلسلہ کے مختلف اجزاء ایک دوسرے سے متاثر ہوتے اور ان پر اثر ڈالتے ہیں، اور یہ زمانہ اور ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اسی طرح پھیلتے اور بڑھتے رہتے ہیں جس طرح کسی خاص زمان و مکان میں کوئی جسم نامی نشوونما کے مراحل سے گذرتا ہے۔

کسی واقعہ کو سمجھنے، اس کی تعبیر کرنے، اور اسے اس کے ماقبل اور مابعد ہونے والے واقعات سے مربوط کر کے دیکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ آدمی یہ صلاحیت رکھتا ہو کہ انسان کے داخل کی تمام روحانی فکری، اور حیاتیاتی اقدار اور تشکیلی قوتوں کا احاطہ کر سکے، اور انسانی زندگی میں کارفرما معنوی اور مادی تشکیلی قوتوں کو سمجھ سکے۔ اس میں یہ صلاحیت ہونی چاہیے کہ اپنی روح عقلی اور احساسات کے دروازے واقعہ کے اثرات کے لیے کھول دے۔ اُس کا شعور اس واقعہ سے جو تاثرات قبول کرتا ہو ان میں سے کسی کو رد کرنے سے پہلے اسے کافی چھان بین اور احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

اسلامی تاریخ کو بالکل نئے انداز سے اور نئی بنیادوں پر دوبارہ مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی زندگی کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اور بالکل نئی روشنی میں دیکھنا چاہیے تاکہ اس کے تمام راز کھل سکیں، اس کے جملہ انوار طلوع ہو سکیں، اور وہ اپنی تمام عناصر اور تشکیلی قوتوں سمیت واضح ہو سکے۔

اس از سر نو مطالعہ میں اولین اہمیت عربی ماٰخذ کو دینی چاہیے اور مغربی تحقیقات کو ثانوی مرتبہ پر رکھنا چاہیے۔ ان تحقیقات سے اپنے ماخذ کے متون (Texts) کی تصحیح و ترتیب، اور اسناد کے

اعتبار سے مختلف روایات کے موازنہ میں فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ ان سے کوئی اور کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ باقی کام خود کرنا چاہیے۔ اس کام میں ہمیں صرف واقعات کی رہنمائی قبول کرنی چاہیے۔ کام کی تفصیلات میں داخل ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ محقق اپنی عقل، روح اور احساسات کو اس فضا سے پوری طرح مانوس کر لے، اور اسی میں سانس لینے لگے، جو اسلام ایک عقیدہ، ایک فلسفہ اور ایک نظام زندگی کی حیثیت سے رکھتا ہے، اور جو فضا اس اسلامی زندگی کی ہے جو عالم واقعہ میں انسانی زندگی کا ایک باب ہے۔ محقق کا اس فضا میں جا بسنا اس کے فہم و ادراک کے تمام دریچے کھول دینے کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اس زندگی کو نہ صرف سمجھ سکے بلکہ اس کی زندہ ہستی کا ادراک کر سکے اور مختلف حوادث واقعات کو اس ہستی میں جو مقام حاصل ہے اسے پوری طرح سمجھ سکے۔

کسی محقق کے لیے انسانی زندگی کے کسی دور کا گہرا اور حقیقی فہم حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنی پوری شخصیت کو اس کے سپرد کر دے، اس کی فضا میں جا بسے، اس کے ہر اشارہ کو سمجھے اور ہر اثر کو قبول کرے۔ یہ شرط اسلامی زندگی کے مطالعہ کے ساتھ مخصوص نہیں۔ لیکن اسلامی زندگی کے سلسلہ میں یہ ضرورت زیادہ واضح ہے کیونکہ اس زندگی کی قدریں اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے دور جدید بالخصوص یورپ کی قدروں سے بالکل مختلف واقع ہوئی ہیں۔

ہمارے نزدیک اسلامی زندگی کا مکمل مطالعہ اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک کہ اسلامی عقیدہ کی روح اور حیات، کائنات اور انسان کی بابت اسلامی تصور کے مزاج کا صحیح شعور نہ حاصل ہو جائے۔ جب تک یہ بات نہ سمجھ لی جائے کہ اس عقیدہ کا ردّ عمل قلب مومن پر کیا ہوتا ہے، اور اس کے زیر اثر ایک مسلمان زندگی کے مختلف عوامل کے جواب میں کیا روش اختیار کرتا ہے۔ ان خصوصیات کو، عموماً کسی غیر عرب محقق کے اندر تلاش کرنا، اور خاص طور پر کسی غیر مسلم محقق کے یہاں تلاش کرنا بے سود ہے۔ اسلامی تاریخ کی تدوین جدید میں یہ خصوصیات پوری طرح موجود ہونی چاہئیں۔

اس بات کا پتہ لگانا چاہیے کہ تاریخ حیات کے اس اسلامی دور میں لوگوں کی سرگرمیوں کے اصل محرکات کیا تھے اور ان محرکات کا ان واقعات، انقلابات، اور تغیرات سے کیا رشتہ تھا جو اس دور

میں رونما ہوئے۔ یہ چیزیں لازماً اسلامی تصور کے مزاج سے مربوط نظر آئیں گی۔ اسلام میں جو انقلابی روح اس کی خارجی اور عملی زندگی ہی میں نہیں بلکہ انفرادی، اجتماعی، اور کائناتی تعلق کے اندر بھی پائی جاتی ہے، ان سے بھی ان کا ربط ہوگا۔ اسلام نے نظام حکومت، طرز معیشت، قانون سازی کے طریقوں اور قانون کو نافذ کرنے کے ذرائع ...... وغیرہ کے باب میں جو نقشے پیش کئے ہیں ان سے بھی واقعات و تغیرات مربوط ہوں گے۔ یہ ساری چیزیں زندگی کی، لہٰذا اس مخصوص زندگی کی تاریخ بنانے میں حصہ لیتی ہیں۔

جنگیں، سیاسی معاہدے، بین الاقوامی تعلقات وغیرہ جن کو تاریخ دوسرے امور سے زیادہ اہمیت دیتی ہے، چند دوسرے عوامل کے تابع ہیں جن کو تاریخ مرتب کرتے وقت نمایاں کرنا ضروری ہے۔ محققین کے درمیان اختلاف انھیں عوامل کے ادراک اور ان کے اثر کا اندازہ لگانے میں ہوتا ہے۔ ہر ایک اِن کو اس فلسفہ کی عینک سے دیکھتا ہے جو اس کے طرز فکر یعنی زندگی کے بارے میں اس کے زاویۂ نظر پر غالب ہوتا ہے۔ مسلمان محقق کو اسلامی زندگی کے مطالعہ میں ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے کیونکہ زندگی کے بارے میں اس کا زاویۂ نگاہ تاریخ کے عمل پر اثر انداز ہونے والے تمام عوامل سے یک گونہ مناسبت رکھتا ہے۔ اس کی گہرائیوں میں اترنے، اس کے انداز پہچاننے اور اس کا صحیح تاثر قبول کرنے کی صلاحیت وہ غیروں سے زیادہ رکھتا ہے۔

عقیدہ اسلامی کے مزاج اور اس تاثر کے فہم کی روشنی میں جو مسلمان اس سے قبول کرتے ہیں، محقق تاریخ کے اس مخصوص دور میں اسلامی زندگی کے محرکات، اس میں مضمر انسانی قدروں، اور مختلف مراحل پر اس کی فتح و شکست کے اسباب کا صحیح اندازہ لگا سکے گا اور تصور کر سکے گا کہ اسلام کے اولین گہوارہ میں اور ان ملکوں میں جن میں وہ بعد کو پھیلا، انسانی گروہوں کی ظاہری اور باطنی زندگی کیسی رہی ہوگی۔ پھر وہ ظاہری پہلوؤں پر، جن کے علاوہ اکثر مغربی مورخین کو کچھ اور نظر نہیں آتا، ان روحانی پہلوؤں کا اضافہ کر سکے گا جنھیں اسلام حقیقت واقعہ کا ایک جز شمار کرتا ہے۔ وہ یہ دریافت کر سکے گا کہ اس پہلو نے زمانہ کی رفتار متعین کرنے اور مختلف زمان و مکان میں زندگی کی تشکیل میں کیا حصہ لیا ہے۔

اسلامی تاریخ کو انسانی تاریخ سے علٰحدہ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا، کیونکہ اسلامی زندگی انسانی زندگی

کے ایک مخصوص دور کا نام ہے۔ مسلمان مخصوص زمان ومکان میں رہنے والے انسان تھے۔ اور اسلام زمان ومکان کی قیود سے آزاد ایک آفاقی اور انسانی پیغام ہے۔

زندگی کا یہ دور یقیناً سابق ادوار کے انسانی تجربات سے متاثر ہوا، بالخصوص ان عوامل سے جو ظہور اسلام کے وقت پائے جاتے تھے۔ پھر اسلام نے خود بھی انسانی تجربات میں حصہ لے کر ان کو متاثر کیا، خاص کر ان علاقوں میں جہاں اس کے قدم پہنچے یا جن کے یہ قریب جا پہنچا تھا۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اسلامی تاریخ مرتب کرتے وقت یہ بھی بتایا جائے کہ ظہور اسلام سے قبل انسانی تجربات کہاں تک پہنچے تھے۔ دنیا کے مختلف انسانی معاشروں کی حالت کیا تھی؟ خاص طور پر دینی عقائد اور ان سے وابستہ افکار ونظریات کیا تھے۔ مختلف معاشروں کے نظام حکومت، اقتصادیات، اجتماعی رشتے اور اخلاق وعادات سامنے لائے جانے چاہئیں۔ ان امور کی روشنی میں یہ واضح ہو سکے گا کہ اسلام نے تاریخ میں جو عمل انجام دیا اس کی نوعیت اور اصلیت کیا تھی۔ دنیا پر اس نئے نظام کے قبول کرنے یا ٹھکرا دینے کا ردّ عمل کیوں مرتب ہوا۔ کشمکش کے اسباب کیا تھے، اور فتح وشکست کن عوامل کی بنا پر ہوئی۔ ان چیزوں کے پس منظر میں یہ واضح ہو سکے گا کہ زمانہ کے گذرنے کے ساتھ عمل اور ردّ عمل، تاثیر اور تاثر اور تعاون اور کشمکش کا سلسلہ کس طرح جاری رہا۔

اگر اس دور کے عالمی احوال کا بیان ضروری ہے تو جزیرہ عرب کے احوال سامنے لانا اور عرب کے تصوّرِ حیات کے ہر پہلو کی وضاحت اس سے زیادہ ضروری ہے۔ عرب اسلام کا اولین گہوارہ تھا۔ پھر وہ اس کی قوتوں کا مرکز رہا اور اسی مرکز سے اسلام دوسرے ملکوں میں پھیلا۔

کیا یہ ایک اتفاقی امر تھا کہ یہ رسول اس دین کو لے کر زمین کے اس مخصوص علاقہ میں ایک خاص زمانہ میں ظاہر ہوا؟ یا ایسا شروع ہی سے ایک منصوبہ کے تحت، ایک خاص ارادے کے ساتھ، اور ایک باقاعدہ اسکیم کے مطابق ہوا؟ تاکہ یہ سارے عوامل جس طرح یکجا ہوئے اسی طرح یکجا ہو کر تاریخ انسانی میں ایک خاص حصہ ادا کریں جس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ دنیا کا نقشہ صفحہ قرطاس پر بھی اور انسانی ذہنوں میں بھی اس طرح مرتب ہوا جیسا کہ بعد کی تاریخ نے ظاہر کیا۔

یہ بات ہمیں تاریخ کے اس ازلی سیاق میں خود محمدؐ رسول کی شخصیت کے مطالعہ کی طرف لے جاتی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) غالباً آپ کی شخصیت، حسب و نسب، ماحول اور اُس معاشرہ کی روایات میں، اور ان عوامل میں جو بحیثیت ایک فرد کے آپ کے گرد کام کر رہے تھے، پہلے ہی سے ایک مقصد کے تحت سازگاری پیدا کی جا رہی تھی۔ یہ محض اتفاق نہ تھا کہ سارے انسانوں کے درمیان آپ کو اشارہ کیا گیا، اور آپ نے اٹھ کر ایک عظیم آفاقی موقف اختیار کر لیا، جس کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے نہ مستقبل میں مل سکے گی قبل اس کے کہ اس عظیم واقعہ کی بنا پر آنے والی عالمی انقلابات و حوادث کا مطالعہ کیا جائے ہمیں خود اس واقعہ کی نوعیت کا اور اس کلی تصوّر کا مطالعہ کرنا ہو گا جس کا یہ واقعہ حامل ہے۔

اسلامی تاریخ اگر اس طرح مرتّب کی جائے تو اس کے پڑھنے والے کے سامنے ظہور اسلام کے فوراً بعد کے دور کے سارے واقعات کی ایک مکمل اور جامع تصویر آجائے گی، اور وہ ردّ عمل بھی سامنے آجائے گا جو ان احوال و واقعات سے معاشرہ پر مرتب ہوا۔ وہ اس ردّ عمل کی صحیح تعبیر کر سکے گا اور ان کے بارے میں صحیح رائے قائم کر سکے گا۔

اس طرز تحقیق کی رو سے اشیاء و افراد اور واقعات اور زمانہ کی گہرائیوں میں اترنے اور ان کے تاثر قبول کرنے کے عمل کا نام تاریخ قرار پائے گا۔ تاریخ قانون فطرت اور انسانیت کے اقدام سے مربوط ہو کر ایک زندہ ہستی اور زندگی کی ایک قوّت بن جائے گی۔

جب تحقیق کا وہ منہاج اختیار کیا جائے گا جس کی ہم نے اوپر وضاحت کی ہے اور اس کے نتیجے میں چند بنیادی قوتیں اور قدریں سامنے آجائیں گی تو تاریخ کا فہم، اس کے عمل اور ردّ عمل اور اس کے تدریجی ارتقاء کا مطالعہ آسان ہو جائے گا۔ یہ وہ بنیادی قدریں ہیں جو دعوت اسلامی کے مزاج، رسول کے مزاج اور اس ماحول کے مزاج میں پائی جاتی تھیں جس نے اس دعوت کو قبول کیا اور اس رسول کا خیر مقدم کیا۔ یہ وہ قدریں اور تشکیلی قوتیں ہیں جو ظہور اسلام کے وقت انسانی برادری میں کارفرما تھیں، اور ان افکار و عقائد پر حاوی تھیں جو اس وقت انسانوں میں رائج تھے۔ ان قدروں اور قوتوں کی دریافت کے بعد یہ ممکن ہو جائے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دعوت اسلامی کے مختلف مراحل

گذرنے کا ٹھیک ٹھیک نقشہ سامنے لایا جا سکے اور متصور کیا جا سکے۔ یہ مراحل ان تشکیلی قوتوں اور ان کے باہم تاثیر و تاثر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم اور اس دور کے دوسرے انسان یہ معلوم کر سکیں گے کہ رسول نے اپنے کارکنوں کا انتخاب کس طرح کیا؟ یہ افراد کس مٹی کے بنے تھے؟ رسول اللہ نے ان کی تربیت کس طرح کی اور انھیں اس عظیم مشن کی انجام دہی کے لیے کس طرح تیار کیا۔ رسول اللہ نے زندگی کی تعمیر کس طرح کی اور یہ تعمیر کن بنیادوں پر کی گئی تھی۔ کس طرح جزیرۂ عرب اس نئے دین یا نئے نظام کے گہوارہ میں تبدیل ہو گیا۔ اہل عرب کے مزاج، احوال و ظروف، افراد، قبائل، اور خاندانوں میں نیز ان کے اجتماعی رشتوں، معاشی حالات، اور جغرافیائی اور حیاتیاتی ساخت میں کون سے عناصر تھے جنھوں نے انھیں اس نئی بات پر لبیک کہنے یا اس کی مخالفت کرنے پر آمادہ کر دیا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے موضوعات، جن پر روشنی ڈال کر ہم اسلامی زندگی یا تاریخ اسلام کے پہلے دور کی پوری تصویر سامنے لا سکتے ہیں، مذکورہ بالا طرز تحقیق اختیار کرنے کے بعد بآسانی برتے جا سکتے ہیں۔ تاریخ اسلامی کے اس پہلے مرحلہ کو "اسلام عہد رسالت میں" کا نام دینا زیادہ موزوں رہے گا۔

اس مرحلہ کے بعد دوسرا دور آتا ہے جسے "اسلام کے پھیلاؤ" کا مرحلہ کہنا چاہیے۔ یہ وہ دور ہے جس میں اسلام مشرق و مغرب ہر طرف پھیل گیا۔ وہ انوکھا فیض ہر طرف عام ہو گیا جس کی قوت اور سرعت فیضان کی دنیا میں کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ یہ بات صرف فوجی فتوحات پر نہیں صادق آتی بلکہ روحانی، فکری اور سماجی اثرات کے اعتبار سے بھی درست ہے۔ ساری انسانیت نے یہ دیکھ لیا کہ اس نئے دین کے ظہور اور اس کے حیرت انگیز پھیلاؤ کے نتیجہ میں تاریخ کا رُخ بالکل بدل گیا۔

ہمارے تجویز کردہ طریق مطالعہ کی اصل قدر و قیمت اسی سیاق میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے ذریعہ یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ہم ان تعمیری اور تخریبی کاموں کا مطالعہ کر سکیں جو اسلام نے اپنے زیر اثر آ جانے والے وسیع خطۂ زمین میں انجام دیئے۔ ہم یہ دریافت کر سکیں گے کہ زمین کے ان زرخیز ترین علاقوں اور اس زمانہ کے سب سے زیادہ متمدّن ملکوں میں جو افکار و عقائد چھائے ہوئے تھے، جو اجتماعی نظام قائم تھے، جو معاشی حالات پائے جاتے تھے، ماضی کی تاریخ نے ان کو جو ورثے دیئے تھے، اور وہ جن انسانی رشتوں

میں مربوط تھے، ان کے اور اسلام کے درمیان تاثیر و تاثر کا کیا عمل انجام پایا۔

اسلام کا پھیلاؤ انہی حدود تک نہیں محدود رہا جہاں تک اس کی فوجی فتوحات پہنچ سکیں بلکہ اس کی بنائی ہوئی تہذیب اور فکری تحریک اسلامی دنیا کے باہر بھی پہنچی۔ اسلامی مملکت کے باہر اسلام کے پھیلاؤ کے اثرات کی تحقیق بہت اہم ہے۔ ہمیں یہ دریافت کرنا ہوگا کہ ان اثرات نے جوابًا خود عالم اسلامی کی زندگی کو کس طرح متاثر کیا۔ دنیا نے اسلام سے اخذ بھی کیا ہے اور اُسے کچھ دیا بھی ہے۔ اس سے متاثر ہوئی ہے اور اس پر اثر انداز بھی ہوئی ہے۔ ہمارے تجویز کردہ طریقہ پر اس تاثیر و تاثر کا مطالعہ ایک ایسی تاریخ کی ترتیب عمل میں لائے گا جو اب تک نہیں مرتب کی جا سکی ہے۔ اس تاریخ میں ایک خاص جان ہوگی۔ اس کا ایک مخصوص مزاج ہوگا۔ اس کے ذریعہ انسانی دنیا کی اور اس کی زندگی کے مراحل کی ایک نئی تصویر سامنے آئے گی جو اس تصویر سے مختلف ہوگی جسے اہلِ مغرب پیش کرتے رہتے ہیں اور جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں۔

اس کے بعد اسلام کا پھیلاؤ رک جانے کا دور آتا ہے۔ مذکورہ بالا طرز تحقیق اور اسلامی تاریخ کے گذشتہ مراحل کے مطالعہ کی روشنی میں ہمارے لیے یہ ممکن ہوگا کہ ہم اس زوال کے اسباب بیان کر سکیں اور اس کے داخلی اور خارجی عوامل دریافت کر سکیں۔ ان عوامل میں سے کون سے عوامل عقیدہ اسلامی اور نظام اسلامی کے مزاج میں شامل تھے۔ کون سے عوامل مسلمانوں نے خود پیدا کر دیئے تھے۔ اور کون سے عوامل اسلام کے ردّ عمل میں غیر اسلامی دنیا میں اُبھرے تھے۔ یہ زوال ہمہ جہتی تھا کہ جزئی، سطحی تھا یا گہرا۔ اس زوال کا اثر تاریخ انسانی پر کیا پڑا، انسانی امور پر اسلام کی اثر اندازی میں کیا فرق واقع ہوا۔ اس سے فکر و عمل کے طریقوں اور بین الاقوامی تعلقات میں کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان افکار و عقائد اور نظاموں کی قدر و قیمت کیا ہے جو انسانیت نے اسلامی افکار و عقائد اور نظاموں کے بالمقابل تراش لیے۔ اسلامی اثرات کے زوال اور یورپین اثرات کے عروج سے انسانیت نے کیا پایا، کیا کھو دیا۔

قدرتی طور پر اس کے بعد دورِ حاضر کے عالم اسلامی پر گفتگو کی جانی چاہیے۔ یہ مطالعہ جذبات یا تعصب و جانب داری کے ساتھ نہیں بلکہ واقعاتی بنیادوں پر کیا جانا چاہیے۔ ہمارے طرز تحقیق کے نتیجہ میں

انسانی تاریخ مسلسل اور مربوط ہو کر سامنے آئے گی۔ اس تاریخ میں ماضی اور حال میں اسلام کے واقعی حصہ کی نشاندہی کی جائے گی اور اس ماضی اور حال کی روشنی میں اس کے مستقبل پر بھی روشنی پڑے گی۔

قانون

اب قانون کی تعلیم کو لیجیے۔ یہ بھی مغربی نقطۂ نظر، مغربی فلسفہ، مغربی تاریخ، مغربی قانون سازی، اور مغربی سماج سے اسی طرح متاثر ہے جس طرح دوسرے علوم...... قانون سماج کا عکس اور اسی کا ایک نقش ہوتا ہے، اور خود معاشرہ بھی مختلف عوامل کی پیداوار ہے۔

ایک صحیح اسلامی فکر پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم کسی دوسرے نظامِ قانون کا مطالعہ کرنے سے پہلے اسلامی قانون کا وسیع اور مکمل مطالعہ کریں۔ یہ بھی ضروری ہے کہ قانون کی تعلیم مسلمان اساتذہ کے ہاتھ میں ہو اور شریعت اسلامیہ کے مطالعہ میں مغربی نقطۂ نظر صرف اختصاصی تعلیم کے دور میں مخل ہو۔ اسی طرح عالمی قانون کی تعلیم بھی اسی طرح دی جائے۔

اسلامی زندگی کا تقاضا ہے کہ اسلامی قانون کی حکمرانی ہو۔ یہ حکمرانی خود بخود اسلامی قانون کے مطالعہ کے اس طرز کی طرف لے جائے گی جس کا ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ عملی حالات، ضرورت، اور ہمارا رجحان ہمیں یہی راہ دکھلائے گا۔ اس سلسلہ میں شریعت کا درس دینے والوں پر بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو چاہیے کہ وہ ایک بار پھر وہ حیرت انگیز کارنامے انجام دیں جو اسلامی قانون کی ترقی کے لیے ائمہ فقہ اور ان کے شاگردوں نے انجام دی تھیں۔

جدید اسلامی قانون سازی

ایک ایسی زندگی کے احیاء کے سلسلہ میں جس میں سب کو اجتماعی عدل کی ضمانت دی جا سکے فکری رہنمائی کے طریقوں کا جائزہ لینے کے بعد اب قانونی ضابطہ بندی کے طریقوں پر غور کرنا باقی رہ جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بات کسی طرح نہیں جائز ہوگی کہ اسلامی زندگی کے اوّلین دور میں جو کام ہو چکے ہیں ان پر قناعت کر لی جائے۔ ضروری ہے کہ ان تمام ممکن طریقوں سے پورا فائدہ اٹھایا جائے جو اسلام کے عام اصول اور اس کی مجمل بنیادی ہدایات ہمیں دے سکتی ہوں۔ انسانوں کے وضع کیے ہوئے قوانین اور اجتماعی نظام ہوں جو اسلامی اصولوں سے نہ ٹکراتے ہوں اور اسلام کے تصورِ حیات و انسان کے منافی نہ واقع ہوئے ہوں

ان سے ہمیں اپنی قانون سازی میں پورا فائدہ اُٹھانا چاہیے بشرطیکہ ان سے کوئی حقیقی اجتماعی مصلحت پوری ہو رہی ہو یا کسی متوقع مضرت کا ازالہ ہو رہا ہو۔ ہمارے پاس مصالح مرسلہ اور سدّ ذرائع کے دو واضح اسلامی اصول موجود ہیں جو صاحب امر کو ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر مصالح عامہ کی تکمیل کے لیے وسیع اختیارات عطا کرتے ہیں

اسلام میں اجتماعی عدل، پر ایک عمومی تصنیف کے لیے اتنی باتیں کافی ہیں کیونکہ اس کتاب کا اولین مقصد اسلام میں اجتماعی عدل کے تصوّر کی وضاحت ہے نہ کہ ان قوانین وضوابط پر تفصیلی گفتگو جو اس تصوّر کی روشنی میں بنائے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں چند ایسی مثالیں سامنے لاؤں گا جو یہ بتا سکیں کہ حال اور مستقبل میں اسلام اس باب میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔ مجوزہ قوانین ساری سماجی ضروریات کے لیے کافی نہیں بلکہ یہ چند نشانات راہ، اور چند نمونے ہیں جن پر دوسری چیزوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اس حقیقت کا احساس ہے کہ عمومی تصوّر کی وضاحت ایک چیز ہے اور اس کی روشنی میں اجتماعی ضوابط وضع کرنا ایک دوسرا کام ہے۔ لیکن آج میں اتنا ہی کر سکتا ہوں جتنا میرے لیے ممکن ہے۔ بنیادوں کے سامنے آجانے اور رجحان واضح ہو جانے کے بعد مکمل عملی ضوابط وضع کرنا مستقبل کا کام ہے۔

(۱) قانون زکوٰۃ

زکوٰۃ اسلام میں ایک مقررہ فریضہ ہے جس کی شرح مختلف قسم کے اموال میں دسویں حصہ سے چالیسویں حصہ تک رکھی گئی ہے۔ یہ ایک بہت ہلکا سا تناسب ہے اور آدمی یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ اتنی معمولی سی شرح اسلامی سماج کی ضروریات کس طرح پوری کرتی تھی۔ اس سوال کے جواب میں مندرجہ ذیل حقائق کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ا۔ جس نصاب کی ملکیت پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے وہ بہت کم ہے اور اس وجہ سے پوری اُمت زکوٰۃ دینے والوں میں شامل ہو جاتی ہے۔ زکوٰۃ سے مستثنیٰ صرف وہ مال ہے جو تقریباً بارہ گنّی سے کم ہو، چنانچہ قوم کی غالب اکثریت زکوٰۃ ادا کرنے لگی اور اس سبب سے زکوٰۃ کی آمدنی نسبتاً زیادہ ہو گئی۔ خاص کر اس لیے بھی کہ زکوٰۃ سرمایہ پر عائد ہوتی ہے نہ کہ اس کے نفع پر۔

ب۔ زکوٰۃ کی آمدنی چند متعیّن گروہوں کے لیے مخصوص ہے۔ قوم کی غالب اکثریت کی گذر بسر کا انحصا

محنت اور کاروبار پر تھا ۔ جسے اسلام رزق کا اوّلین ذریعہ قرار دیتا ہے ۔

ج ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ سماج کی زندگی صرف زکوٰۃ کی آمدنی پر نہیں قائم تھی بلکہ نصف صدی سے زائد عرصہ تک جاری رہنے والی جنگوں سے بکثرت اموال غنیمت حاصل ہوئے ۔ اس غنیمت میں لڑنے والے بھی حصہ دار تھے جو زیادہ تر غریب لوگ تھے ۔ ان کو غنیمت کا ۴/۵ حصہ ملتا تھا ۔ باقی ۱/۵ حصہ اہل حاجت کے بعض گروہوں کے لیے مخصوص تھا ۔ نبی کے قرابت دار ، یتیم ، مساکین ، اور مسافر ۔ آگے چل کر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کیا کہ ممالک مفتوحہ کی زمینیں لڑنے والوں میں تقسیم کرنے کی بجائے باشندگان ملک کی ملکیت میں باقی رہنے دی جائیں گی اور ان سے خراج وصول کیا جائے گا تو خراج کی آمدنی اتنی زیادہ ہوگئی کہ سارے فقراء کو اس میں سے حصہ ملنے لگا ۔

آج جب کہ یہ اہم ذریعہ آمدنی مسدود ہو چکا ہے تو زکوٰۃ کفایت نہیں کرے گی ۔ ہمیں دوسرے ذرائع تلاش کرنے پڑیں گے جو غنیمت اور رفئے کی مدّات کی جگہ لے سکیں ، تاکہ عام لوگوں کو گذر بسر کے لیے ضروری اشیاء بفراغت میسّر آسکیں ۔

لیکن آمدنی کے ذرائع تلاش کرنے سے پہلے ہمیں مدّ زکوٰۃ سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے کیوں کہ یہ ایک متعیّن فریضہ ہے جس کی ادائیگی معاشرہ کی اسلامیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے ۔ زکوٰۃ کے معاشی فوائد کے پہلو بہ پہلو اس کا روحانی عمل بہت اہم اور معاشرہ کے لیے ناگزیر ہے ۔ ساتھ ہی یہ بھی ناگزیر ہے کہ ہم ان اموال کی فہرست پر نظر ثانی کریں جن پر زکوٰۃ عائد ہو سکتی ہے تاکہ اس میں دولت کی وہ تمام اصناف آجائیں جو سر دست اس لیے نہیں شامل ہیں کہ یہ اصناف قرن اوّل میں نہیں پائی جاتی تھیں ۔

یہاں اس بات پر زور دینا مفید ہوگا کہ قرآن کریم نے اُن اموال کی تفصیل نہیں دی ہے جن پر زکوٰۃ عائد ہوتی ہے ۔ قرآن نے ذیل کی آیت میں ان اموال کا صرف اجمالی ذکر کیا ہے ۔

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَکُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ	اے ایمان لانے والو! جو مال تم نے کمائے ہیں اور جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے نکالا ہے ، اس میں سے بہتر حصہ راہ خدا میں خرچ کرو ۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بُری سے

بِاٰخِذِیۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِیۡهِ ۔ (البقرہ : ۲۶۷)

بری چیز چھانٹنے کی کوشش کرنے لگو، حالانکہ وہی چیز اگر کوئی تمہیں دے تو تم ہرگز اسے لینا گوارا نہ کرو گے، الّا یہ کہ اس کو قبول کرنے میں تم اغماض برت جاؤ۔

اب اگر زکوٰۃ ان تمام اصناف مال پر عائد کی گئی تھی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں معروف تھے تو آج بھی کوئی چیز مانع نہیں کہ ان تمام چیزوں پر زکوٰۃ عائد کر دی جائے جو مال یا آمدنی کہلاتی ہوں اور جن سے کسی نہ کسی نوع کی پیداوار حاصل کی جا سکتی ہو، خواہ وہ مال کی ان اصناف میں نہ شامل ہوں جن پر (قرن اوّل میں) زکوٰۃ فرض کی گئی تھی۔

حضرت عمر کے مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ سے محروم کر دینے پر قیاس کرتے ہوئے مصارف زکوٰۃ میں بھی ترمیم کی جا سکتی ہے۔ زکوٰۃ صرف چند خاص قسم کے لوگوں کو دی جائے جن پر زکوٰۃ صرف کی جائے ان کو نقد یا کسی جنس کی شکل میں دینے کی بجائے اس رقم سے ان کے لیے، مثلاً کارخانے اور فیکٹریاں قائم کر دی جائیں، یا کسی فیکٹری یا جائداد میں ان کے لیے زکوٰۃ کی رقم سے حصے خرید دیئے جائیں تاکہ وہ ان کے لیے روزی کے حصول کا ایک دائمی ذریعہ ثابت ہو۔ اس طرح وقتی اور جلد صرف ہو جانے والے احسان کا تصوّر، جو موجودہ زندگی کے عملی تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رہ گیا ہے، زکوٰۃ سے دور کیا جا سکے گا۔

بہرحال یہ تفصیلی امور ہیں جو اس کتاب کے موضوع سے خارج ہیں۔ جب امّتِ اسلامیہ اپنی اسلامی زندگی کو از سر نو شروع کرنے کی طرف متوجہ ہو گی تو ان امور پر غور و فکر اور ترمیم و اصلاح کے کافی مواقع ملیں گے۔

(۲) اجتماعی تکافل کا قانون۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ایّما اھل عرصۃ اصبح فیھم امرؤ جائعًا فقد برئت منھم ذمۃ اللہ تبارک و تعالٰی۔

جس بستی میں کوئی آدمی رات بھر بھوکا رہ کر صبح کرے اس کے باشندوں کی حفاظت سے اللہ تبارک و تعالیٰ بری ہو جاتا ہے۔

ان مختصر سے الفاظ میں آپ نے اجتماعی تکافل کا وہ بنیادی اصول واضح فرما دیا ہے جس کی تفصیلات اور دلائل ہم کتاب کے ابتدائی ابواب میں پیش کر چکے ہیں۔ اب تک اس اصول پر عمل انفرادی اور اجتماعی ضمیر

کے سپرد رہا ہے۔ چونکہ یہ اسلام کا ایک مسلّمہ اصول ہے۔ لہٰذا اب یہ ضروری ہے کہ موجودہ دور میں اس کا نفاذ قانون ساز اپنے ہاتھ میں لے لے۔

چنانچہ ریاست کے لیے یہ جائز ہوگا کہ اُس بات کو عملی کا جامہ پہنائے جس کے کرنے کا ارادہ حضرت عمرؓ نے ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا۔

لو استقبلت من امری ما استدبرت لاخذت من الاغنیاء فضول اموالھم فرددتھا علی الفقراء۔

اگر مجھے ماضی میں کیے ہوئے کچھ فیصلوں کو پھر سے کرنے کا موقع مل جاتا تو میں مال داروں سے ان کے فاضل مال لے کر انھیں غریبوں کے درمیان تقسیم کر دیتا۔

اس اصول پر عمل کرتے ہوئے سلطان نئے محاصل عائد کر سکتا ہے۔ ان نئے محاصل کی شرحوں کی تحدید اجتماعی زندگی میں توازن کے تقاضے کریں گے، تاکہ عوام کو تنگی اور تکلیف سے نجات دلائی جا سکے اور قوم کے ہر فرد کے لیے کھانے پینے، لباس، مکان، دوا علاج اور تعلیم کا معقول انتظام کیا جا سکے۔ البتہ اس بات کا پورا لحاظ رکھا جائے گا کہ سرمایہ، ان محاصل کا متحمل ہو سکے۔ اس پر اتنا بار نہیں ڈالا جانا چاہیے جو اسے سرگرم رہنے اور نمو پانے سے روک دے۔ کاروباری سرگرمیوں کا جاری رہنا بعض اہم مصالح کے تحفظ کے لیے ضروری ہے اور اجتماعی مفاد کا تقاضا ہے کہ اس طرف سے غفلت نہ برتی جائے۔

ریاست کے لیے یہ بھی جائز ہوگا کہ غریب لوگوں کو مالکان زمین کی زمینوں میں سے کچھ قطعات کاشت اور انتفاع کے لیے اس طرح دلوا دے کہ ان سے کوئی لگان نہ وصول کی جائے یا محض برائے نام لگان لی جائے، تاکہ وہ زندگی گذار سکیں، کیوں کہ یہی ان کا واحد روزگار اور ذریعۂ رزق ہے۔ یہ اقدام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کو عملی شکل دے دے گا کہ

لان یمنح احدکم اخاہ ارضہ خیر لہ من ان یاخذ علیھا خرجا معلوما۔

یہ بات کہ تم میں سے کوئی اپنی زمین اپنے بھائی کو بخش دے اس کے لیے اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ اس سے اس زمین پر ایک مقررہ لگان وصول کرے۔

سلطان کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ کارخانوں اور فارموں پر کام کرنے والے محنت کشوں کی اجرت پیداوار کے کسی خاص تناسب کی شکل میں متعین کر دے۔ اس کی کم سے کم شرح ایسی ہونی چاہیے کہ معقول طریقہ سے

کھانے پینے، لباس، اور دوا علاج کے لیے کافی ہو۔ اس حد کا تعین اس اوسط معیار زندگی کو سامنے رکھ کر کرنا چاہیے جو ملک کی اجتماعی دولت اور آبادی کے پیش نظر ممکن ہو۔ قانون ساز اس سلسلہ میں کسی متعین ضابطہ کا پابند نہیں، کیوں کہ یہ امور مختلف زمانوں پیش آنے والے نو بہ نو حالات سے متعلق ہیں۔

(۳) اجتماعی خدمت کا قانون۔

امت اسلامیہ کا ہر فرد اس بات کا مکلف ہے کہ مملکت کی عام ذمہ داریوں میں بقدر استطاعت ہاتھ بٹائے بیت المال کے خالی ہو جانے یا فوج کی ضروریات میں اضافہ ہو جانے کی صورت میں مالکیہ جو رائے رکھتے ہیں وہ ہم اوپر سامنے لا چکے ہیں، اور یہ واضح کر چکے ہیں کہ سلطان مال داروں کے اموال پر بقدر ضرورت ٹیکس عائد کرنے کا پورا اختیار رکھتا ہے، حکومت کی ساری ضروریات مثلاً مفاد عامہ سے متعلق امور، بے کار زمینوں کو کار آمد بنانا، سارے افراد کی تعلیم، غیر مستطیع لوگوں کا علاج، وغیرہ بھی فوجی ضرورت کی مانند ہیں۔ یہ سب قوم کی قوتیں ہیں جن کی حفاظت اور تجدید اتنی ہی ضروری ہے جتنی فوجی طاقت بحال رکھنے اور سرحدوں اور چھاؤنیوں کے استحکام کی فکر۔ یہ بات موجودہ حالات پر بدرجہ اولیٰ صادق آتی ہے کیونکہ آج جنگ قوم کے تمام ذرائع و وسائل پر اثر انداز ہوتی ہے اور حالت جنگ میں وہ تمام افراد فوجی قرار دے دیئے جاتے ہیں جو حالت امن میں اس کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

(۴) مفاد عام سے متعلق چیزوں، اور اجتماعی ذرائع دولت کو قومی ملکیت بنا لینے کا قانون۔

اسلام نے پانی، گھاس، اور آگ کو زندگی کی اولین ضرورتوں میں سے ہونے کے سبب مشترکہ ملکیت قرار دے دیا ہے۔ زندگی کی اوّلین ضرورتیں ہمیشہ چند مخصوص اشیاء تک ہی محدود نہیں بلکہ زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔ اسلام کا یہ عام اصول اس بات کا متقاضی ہے کہ، دور حاضر کی اصطلاح میں مفاد عامہ سے متعلق اشیاء اور ذرائع و وسائل کو قومی ملکیت قرار دے دیا جائے۔ کانیں، پٹرول کے چشمے، پانی کے

حدیث نمبر ۱۵۴۱ ۲۵ - مسند امام احمد جلد ۲ - مرتبہ شیخ احمد محمد شاکر - مطبوعہ دار المعارف، اس حدیث کو احمد نے عفان سے، انھوں نے حماد بن زید سے، حماد نے عمرو بن دینار سے، انھوں طاؤس سے اور طاؤس نے عبد اللہ ابن عباس سے روایت کیا ہے۔

ذخیرے، جن سے پینے کا پانی یا بجلی حاصل کی جاتی ہو، عام نقل وحمل کے ذرائع، اور شکارگاہیں وغیرہ افراد اور کمپنیوں کے ہاتھ میں نہ رہنے دینا چاہیے یہ لوگ احتکار کرتے ہیں، جمہور سے من مانی قیمتیں وصول کرتے ہیں، اور بدترین قسم کا استحصال عمل میں لاتے ہیں، جس کا ہم آج مشاہدہ کر رہے ہیں چنانچہ مسلمان حکمراں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ ان تمام چیزوں کو مملکت کی ملکیت قرار دے دے اور ان کی قیمتیں اور اجرتیں ایسی رکھے جو غریب افراد کے لیے بھی قابل برداشت ہو۔ ان کو فروخت کرنے یا کرایہ پر دینے میں لاگت کے مساوی معاوضے وصول کیے جائیں اور کوشش کی جائے کہ لاگت میں بے جا اضافے نہ ہوں۔ اس طرح صاحب امر وہ مقاصد حاصل کر سکے گا جنھیں اسلام احتکار کو حرام قرار دے کر حاصل کرنا چاہتا ہے۔

(۵) مصالح مرسلہ اور سدّ ذرائع کے تحت آنے والے قوانین۔

سلطان پر ہر اس قدم کا اٹھانا واجب ہے جو کسی مفاد عامہ کے حصول یا کسی عام مضرّت کے ازالہ کا ذریعہ بن سکتا ہو۔ واجب کا ذریعہ بننے والی ہر چیز واجب ہے۔ اور حرام کا ذریعہ بننے والی چیزیں حرام ہیں۔ اسلام کے ان مسلّمہ اصولوں کی عملی تطبیق کے لیے آج معاشی حالات کی درستی کے مختلف طریقے تجویز کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں سے زائد مال لے لیا جائے۔ ان کے ہاتھوں میں اس فاضل دولت کا وجود بہت سے مفاسد کو جنم دیتا ہے جن میں سرفہرست وہ عیش پرستی ہے جسے اسلام نے حرام قرار دیا ہے عیش و عشرت ایک اضافی چیز ہے جسے ہر زمانہ اور مقام کا عرف عام متعین کرتا ہے۔ بطور ضابطہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس متوسط معیار زندگی سے تجاوز نہ کیا جائے جس کی قومی دولت اور آبادی کے باہمی تناسب کی رو سے گنجائش نکل سکتی ہو۔ عیش وعشرت کا ایک لازمی نتیجہ غیر معمولی گراں باری ہے جو قوم کے ایک طبقہ کے ہاتھوں میں بہت زیادہ قوّت خرید کے تمرکز سے پیدا ہوتی ہے، جب کہ بازار میں آنے والا مال اس مجموعی قوت خرید سے کم ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں وہ تمام اجتماعی خرابیاں رونما ہوتی ہیں جو بعض لوگوں کے ہاتھ میں زائد از ضرورت مال آجانے سے پیدا ہوتی ہیں، یہ لوگ اس مال کو برے

مصارف پر صرف کرتے ہیں اور پست قسم کی شہوت پرستی کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو ان کے جذبات و احساسات میں پستی اور اخلاق میں انحطاط کا باعث بنتی ہے۔ اس انحطاط کی آگ میں جلنا اس غیر متوازن معاشرہ کے غریب و محتاج مردوں اور عورتوں کے حصہ میں آتا ہے۔

ب۔ غیر معمولی غربت کا ازالہ کیا جائے کیونکہ اس سے گوناں گوں مفاسد اور مضرتیں جنم لیتی ہیں بہت سی اجتماعی خرابیاں ایسی ہیں، جو تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی آغوش میں پروان چڑھتی ہیں۔ مثلاً چوری، ذلت خواری، فحاشی اور بے حیائی کی عادت، وغیرہ۔ مزید برآں، اہل ثروت اور مفلسین کے درمیان (ملکیت اور مال کے اعتبار سے) بہت زیادہ فرق کی وجہ سے حسد و کینہ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اجتماعی بے چینی و اضطراب رونما ہو جاتا ہے۔ ان کا سد باب کرنا اور ان کے اسباب کا ازالہ ریاست کا فرض ہے۔

رہا یہ سوال کہ غیر معمولی غربت کو کس طرح دور کیا جائے تو عام طور پر اس کے لیے یہ طریقے اختیار کیے جاتے ہیں کہ ہر قابل کار فرد کے لیے روزگار فراہم کیا جائے اور اسے معقول معاوضہ دیا جائے اور ہر معذور فرد کی کفالت کا اجتماعی طور پر معقول انتظام کیا جائے۔ مزید تفصیلات مرتب کرنا ان تفصیلی قوانین و ضوابط کا کام ہے جو اس غرض کے لیے بنائیں جائیں گے۔

ج۔ مرض اور جہالت کا مقابلہ کیا جائے کیونکہ یہ چیزیں فرد و جماعت دونوں کو نقصان پہنچاتی ہیں یہ خرابیاں جماعت کو کمزور بنا کر دشمنوں کے لیے نرم چارا بنا دیتی ہیں۔ چونکہ ایسی صورت حال پیدا کرنا حرام ہے لہذا جو چیزیں اس کی طرف لے جاتی ہیں وہ بھی حرام قرار پائیں گی۔ ظاہر ہے کہ مرض اور جہل کا مقابلہ اسی شکل میں ہو سکتا ہے جب لوگوں کی نہ صرف ضروریات پوری ہوں بلکہ انھیں اس سے زائد بھی میسر ہو۔ خیر و خیرات کی تلقین اسی سلسلہ میں صرف ایسے مرہم کا کام کرتی ہے جو پھوڑے کو چھپا دیتا ہے مگر اس کا علاج نہیں کرتا۔ حقیقی علاج صرف یہ ہے کہ ہر شخص اپنے کمائے ہوئے مال سے علاج کرانے اور علم حاصل کرنے پر قادر ہو جائے۔ دوسری شکل یہ ہے کہ سارے افراد قوم کے لیے یکساں طور پر اور ایک ہی معیار کے مطابق مفت تعلیم و علاج کا انتظام کیا جائے۔ مال دار لوگ محض مال دار ہونے کی وجہ سے تعلیم گاہوں اور شفاخانوں سے غربا سے زیادہ فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۶) ترکہ کا قانون۔

وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا۔ (النساء: ۸)

اور جب تقسیم کے موقع پر کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین حاضر ہوں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔

یہ نصِّ قرآنی صراحتہً یہ بتاتی ہے کہ میّت کے ترکہ میں عام رشتہ داروں اور یتامیٰ ومساکین کا بھی حق ہے۔ قدرتی طور پر قانون ساز کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس مد کے مصارف میں مناسب ترمیم وتخصیص عمل میں لائے، جیساکہ حضرت عمرؓ نے مولفۃ القلوب کے سلسلہ میں کیا تھا۔ قانون ساز کو اختیار حاصل ہے کہ ترکہ کی مقدار یا سماج کی ضروریات کے لحاظ سے ترکہ پر کوئی مقررہ ٹیکس عائد کردے۔ یہاں ہم یہ بات واضح کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ آیت میں حاضر ہونے سے نظری طور پر حاضر ہونے یعنی وجود کے معنیٰ بھی لیے جا سکتے ہیں۔ سماج میں یتیم اور مسکین بہر حال موجود رہتے ہیں، اور یہ ضروری نہیں کہ وہ ہر ترکہ کی تقسیم کے وقت شخصی طور پر بھی حاضر ہوں۔ زمان ومکان کی قیود میں وہ بہر حال موجود رہتے ہیں۔ قانون ساز کی ذمہ داری ہے کہ ہر اس فریضہ کو جسے لوگ بطور خود نہ ادا کر رہے ہوں قانون کے ذریعہ نافذ کرے۔

(۷) حرمت سود اور تعاون کی ذمہ داری کا قانون۔

اسلام نے سود کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ہے اور یہ لعنت جہاں جس شکل میں بھی پائی جاتی ہے اس کی مخالفت کی ہے۔ ایک حقیقی اسلامی زندگی کے اندر نظم معیشت کا سودی اداروں پر مبنی ہونا ایک ناقابلِ تصوّر بات ہے۔ اس سے قبل ہم ان وجوہ کی وضاحت کر چکے ہیں جن کی بنا پر اسلام کے لیے سود کیسر ناقابلِ گوارا ہے۔ ان وجوہ کا خلاصہ یہ ہے کہ سود اخوت اور تعاون کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس کے ذریعہ صاحب سرمایہ کو بغیر محنت اور بلا اندیشۂ نقصان آمدنی ہوتی رہتی ہے۔

اِن وجوہ کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ اجتماعی زندگی کی تنظیم سود کی بجائے تعاون کی بنیاد پر کی جائے اس سلسلہ میں جو اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کے جواب کے لیے مولانا محمد علی کی کتاب "اسلام اور نیا عالمی نظام"[۱] کافی ہے۔ ہمارے لیے ان باتوں کا دُہرانا ضروری نہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

---

[۱] Islam and the New World Order عربی ترجمہ استاذ احمد جودہ سحار

"کہا جاتا ہے کہ سود کی حرمت کاروبار، تجارتی لین دین، اور حکومتی منصوبوں کی راہ میں رکاوٹ بن جائے گی۔ فرض کیا کہ یہ چیز واقعتہً ان کاموں میں رکاوٹ ڈالے گی، تو بھی حرمت سود اس نقصان کی پوری طرح تلافی کر دے گی کیونکہ اس سے دنیا میں جنگوں کا سدّباب ہو جائے گا، وہ جنگیں جو انسانیت کو تباہی اور بربادی کے سوا کچھ اور نہیں دیتیں۔ ان جنگوں کے شعلے کو بھڑکانے کا باعث سودی قرضے ہیں۔ حقائق کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں (بغیر سود کے بھی) تجارت اپنی فطری روش پر چلتی رہی، پھلی پھولی، اور اسلامی ممالک کی دور دراز حدود تک پھیل گئی۔ ملکی منصوبے بھی کامیاب ہوتے رہے، تا آنکہ یہ ممالک عالمی تمدن کی دوڑ میں دوسری عظیم مملکتوں سے آگے نکل گئے۔"

"آج مغرب کے مادی تمدن نے دنیا میں جو نئے حالات پیدا کر دیئے ہیں ان کے ساتھ حرمت سود بجا طور پر ہم آہنگ نہیں ہے۔ لیکن جو اعلیٰ نظام اسلام کو مقصود ہے وہ ایک عملی نظام ہے جو صدر اسلام میں کئی صدیوں تک کامیابی کے ساتھ عملاً قائم رہا ہے۔ سرمایہ پر جو منافع ملتا ہے وہ عام (سودی) قرضوں سے کچھ ہی مختلف ہے۔ اس شکل میں محنت و سرمایہ دونوں کا اشتراک عمل ہوتا ہے اور یہ اشتراک خالی از اندیشہ نہیں ہوتا۔ اسلامی نظام اجتماعی یہ کہتا ہے کہ سرمایہ اور محنت دونوں کے لیے نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونا ضروری ہے۔ سرمایہ پر متعین نفع ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ ہمیشہ نفع آور ہوتا ہے خواہ کاروبار میں خسارہ ہی کیوں نہ ہو۔

کہا جاتا ہے کہ محنت و سرمایہ دونوں کا نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونا اس لیے ناممکن ہے کہ اس کے لیے ہمیشہ بڑے لمبے چوڑے رجسٹر رکھنے ہوں گے۔ لیکن تفصیلی حسابات رکھنا تجارت کے لیے ناگزیر ضرورتوں میں داخل ہے۔ دوسری ضروریات سے قطع نظر ٹیکس عاید کرنے اور اس کی ادائیگی کے لیے بھی تفصیلی حسابات رکھنا ضروری ہے۔ وہ تمام کمپنیاں جو حصے فروخت کرتی ہیں اور بڑے پیمانہ پر تجارت کرتی ہیں تفصیلی حسابات رکھتی ہیں، یہ طریقہ سرمایہ پر سود لگانے کی نسبت مفاد عامہ کے لیے زیادہ بہتر ہے۔ سرمایہ داری کی ساری خرابیوں کی جڑ یہی طریقہ ہے، اور یہ محنت کے اوپر کھلا ہوا ظلم ہے۔ وہ قرضے جن کو حکومت یا بڑے کاروباری ادارے بڑی بڑی اسکیموں مثلاً ریلوے لائنیں بچھانے یا نہریں کھدوانے

کے لیے لیتی ہیں عموماً (نفع میں شرکت کے) اسی اصول کے تحت لیے جاتے ہیں۔

"جب بینکوں کا نظام عام طور پر اسلام کے نظام اجتماعی کی دی ہوئی بنیاد، تعاون، پر قائم ہو جائے گا تو وہ انسانیت کے لیے ایک عظیم نعمت ثابت ہو گا۔"

یہ باتیں مجمل ہیں، اور چونکہ یہ کتاب صرف عمومی فکر سے بحث کرتی ہے لہٰذا تفصیلات میں دخل ہونا ممکن نہیں۔ پھر بھی مناسب ہو گا کہ چند ایسے اشارے کر دیے جائیں جو ان خطوط پر کی جانے والی قانون سازی کا رجحان واضح کر سکیں۔

فرض کیجیے کہ ریاست ایک قانون کے ذریعہ کمپنیوں، بینکوں، قومی اسکیموں، اور شخصی لین دین میں سرمائے پر سود لینے کو غیر قانونی قرار دیتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟

اس صورت میں سرمایہ داروں کو سرمایہ میں اضافہ کے صرف دو طریقے میسر ہوں گے۔ پہلا یہ کہ وہ خود اسے کسی صنعت، تجارت یا زراعت میں لگا کر نفع آور بنائیں۔ دوسرا طریقہ یہ کہ اس سے نفع کمانے کے لیے ایسی کمپنیوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے تعاون کریں جن کے حصوں پر نفع بھی مل سکتا ہو۔ اور نقصان کا بھی امکان ہو۔ اسلام ان دونوں طریقوں کو درست تسلیم کرتا ہے، ان طریقوں سے اقتصادی زندگی کو بھی کسی مضرّت کا اندیشہ نہیں۔

بعض لوگ یہ اندیشہ ظاہر کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں سرمایہ دار اپنی دولت کو بینکوں میں جمع کرنے سے گریز کرنے لگیں گے، جب کہ یہی بینک عام طور پر بڑی بڑی صنعتی اسکیموں کے لیے سرمایہ فراہم کرتے ہیں۔

درحقیقت یہ اندیشہ محض ایک وہم ہے۔ اس کے واقعی ہونے کا دھوکہ ہمیں صرف اس لیے ہوتا ہے کہ ہم فراہمی سرمایہ کے صرف ان طریقوں سے واقف ہیں جو یورپ میں معروف ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ سرمایہ کی افزائش کی طلب ایک فطری طلب ہے اور ظاہر ہے کہ سرمایہ میں اضافہ اسی وقت ہو سکے گا جب اسے کسی کام میں لگایا جائے۔ یہ فطری طلب اس بات کی ضمانت ہے کہ سرمایہ کو بے کار نہ رکھا جائے گا۔ اب اگر ہم پیمانۂ کبیر پر پیداوار کی خاطر بڑے بڑے کاروباری اداروں کا قیام چاہتے ہوں تو بآسانی بعض بڑی صنعتوں کے ضمن میں یہ قانون بنا سکتے ہیں کہ کوئی کاروباری ادارہ اس وقت تک نہیں قائم کیا جا سکے گا جب تک سرمایہ کی ایک خاص مقدار نہ فراہم ہو جائے یہ سرمایہ شرکت کے

اصول پر جمع ہو گا اور نفع و نقصان دونوں میں شرکت قبول کرے گا۔ اس کے بعد اجراء زر کرنے والے بینکوں کے سوا کسی طرح کے بینکوں کی ضرورت نہیں رہ جائے گی۔ اگر دوسری قسم کے بینک بھی نفع کمانا چاہیں گے تو ان کو اپنے اور جمع کنندگان کے مال کو، ان کے علم اور رضامندی کے ساتھ پیداواری اداروں میں لگانا پڑے گا اور ان کے نفع اور نقصان دونوں میں شرکت قبول کرنی پڑے گی، کیونکہ یقینی نفع، قطعی طور پر سود ہے۔ یہ پابندی کسی طرح بھی ملکی یا غیر ملکی سرمایہ کی فراوانی کے ساتھ فراہمی پر نہیں اثر انداز ہو گی کیونکہ آج بھی زیادہ تر سرمایہ بینکوں میں نہیں جمع کیا جاتا بلکہ براہِ راست کاروبار میں لگایا جاتا ہے۔

انشورنس کمپنیوں کو اسلامی بنیادوں پر منظم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جو سرمایہ ان میں جمع کیا گیا ہو اسے نفع و نقصان میں شرکت، اور اس کے نتیجہ میں اس کے اندر اضافہ یا کمی کے امکان کے تحت لایا جائے۔ یہ کمپنیاں اپنے سرمایہ کو نفع و نقصان میں شرکت کے اصول پر نفع آور پیداوار میں لگا سکیں گی۔ ہر انشورنس کرانے والے کو یہ کمپنیاں ان کے جمع کردہ مال سے کم یا زیادہ واپس کر سکیں گی۔ خسارہ کا بار جمع کرنے والوں پر ان کی رقموں کے تناسب سے ڈال دیا جایا کرے گا۔ اس طرح انشورنس کرانے والے ایک باہم تعاون کرنے والے گروہ میں تبدیل ہو جائیں گے۔ کسی فرد پر مصیبت آئے گی تو یہ لوگ اپنے مال میں سے اسے دے دیا کریں گے۔ ہر فرد کو ایک طرح کی ضمانت حاصل ہو جائے گی جس سے وہ بوقت ضرورت فائدہ اٹھا سکے گا۔ بچت کے بینکوں (Saving Banks) اور اس طرح کے دوسرے اداروں کو بھی اسی اصول پر چلایا جا سکتا ہے۔ اس طرح یہ ادارے تعاون باہمی کے اداروں میں تبدیل ہو جائیں گے جو اپنا سرمایہ پیداآور کاموں میں لگائیں گے، جس میں نفع و نقصان دونوں کا امکان ہو گا۔ کوئی متعین نفع یقینی نہ ہو گا۔ ہمارا معاشی نظام سود کے روگ سے نجات پا جائے گا اور سارا سرمایہ نفع اور افزائش کی طلب میں پیداآور کاموں میں لگنے پر مجبور ہو گا۔

یہ دعوٰی کہ سود اقتصادی نظام کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے خود زمانۂ جدید کی واقعی صورتِ حال کے پیش نظر بھی غلط ہے۔ اشتراکی نظام ایک بالکل مختلف بنیاد پر قائم ہے۔ خود مغرب کے بعض ماہرین اقتصادیات بھی واضح طور پر یہ رائے رکھتے ہیں کہ سود خالص معاشی

نقطۂ نظر سے ایک برائی ہے ۔ یہ لوگ ایک ایسے نظام کی طرف میلان ظاہر کرتے ہیں جو اسلامی نظام سے قریب ہے ۔ ان معاشیئین میں پیش پیش جرمن کے مشہور ماہر معاشیات ڈاکٹر شاخت ہیں ۔

(۸) جوئے کی ممانعت کا قانون ۔

قمار بازی روحانی اعتبار سے انتہائی پست کام ہے ، کیونکہ یہ بغیر محنت کے دولت کمانے کی ترکیب ہے ۔ مزید برآں اس سے قمار بازوں میں باہمی نفرت پیدا ہوتی ہے اور سماج میں اضطراب وانتشار رونما ہوتا ہے ۔ قمار بازی کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں لاٹری بھی شامل ہے ۔ **عوام کو لاٹری** کے ٹکٹ خریدنے پر آمادہ کرنے والی چیز بھلائی کی اسپرٹ نہیں ، نہ اس کا محرک شفاخانوں اور خیراتی اداروں کے قیام میں ہاتھ بٹانے کا جذبہ ہے ، بلکہ اس کے پیچھے بھی بغیر محنت کے دولت کمانے کی ہوس کام کرتی ہے ۔ جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے ۔ یہ ایک انتہائی پست روحانی فعل ہے ۔ یہ رحم وکرم کے جذبات کو مٹاتا اور برے جذبات سے آلودہ کرتا ہے ۔ کار خیر کی مجالس کہلانے والی فحش اور رنگین محفلوں کا ذکر فضول ہے ۔ یہ عیش پرستی اور اس کے پیدا کیے ہوئے داخلی تعفّن ، بھلے کاموں سے گریز ، شہوات کی طرف میلان ، اور مال و دولت کو صرف حیوانی لذتوں اور ناپاک کاموں پر صرف کرنے کی عادت کا نتیجہ ہیں ۔

قمار بازی کو بالکل ممنوع قرار دینا چاہیے ۔ ساتھ ہی اس سے وابستہ لاٹری عیاشانہ دعوتوں ، عریاں سینوں اور گندی رانوں کو بھی روک دینا چاہیے ۔ اسلامی زندگی کو ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں ۔ اسلام لوگوں کے باہمی تعلّقات کو ان بنیادوں پر نہیں استوار کرنا چاہتا نہ اسے یہ منظور ہے کہ نیکی شہوت رانی کی آلائشوں میں نشوونما پائے ۔

(۹) پیشہ ورانہ زناکاری کے انسداد کا قانون ۔

پیشہ ورانہ زناکاری روحانی پستی اور مادی احتیاج کی مظہر ہے ۔ کبھی یہ دونوں اسباب موجود ہوتے ہیں ، کبھی صرف ایک ۔ اسلام نے زنا کی تمام شکلوں کو حرام قرار دیا ہے ۔ پیشہ ورانہ زناکاری اس کی بدترین شکل ہے ۔ یہ بے حیائی غیر متوازن سماج کی علامت ہے ، یہ ایک طرف زائد از ضرورت دولت ، اور دوسری طرف مجبور کن ضرورت ، کے سنگم پر پیدا ہوتی ہے ۔ کبھی مثل بیان کی جاتی تھی کہ آزاد عورت بھوکی رہ جاتی ہے مگر اپنی چھاتی سے کما کر نہیں کھاتی ؛ اب یہ حال ہے کہ وہ چھاتی سے

کما کر کھاتی ہے اور اس طرح موت سے بچتی ہے ۔ یہ بات کسی طرح جائز نہیں کہ ہم ایک طرف تو لوگوں کو ضروریات مندی کی آزمائش میں بتلا کر دیں اور دوسری طرف مال، اور دوسری چیزوں کے لالچ فراہم کر کے ان سے یہ مطالبہ کریں کہ وہ اولوالعزمی، بلکہ انبیاء کا کردار پیش کریں! سدّ ذرائع کا اصول ریاست پر یہ ذمہ داری عائد کرتا ہے کہ پیشہ ورانہ زناکاری کے جملہ اسباب کا ازالہ کرے ۔ ساتھ ہی شریعت واضح طور پر یہ بتاتی ہے کہ فعل زنا کو قانوناً ممنوع قرار دینا ضروری ہے ۔ گویا صورتِ حال یہ ہے کہ پیشہ ورانہ زناکاری کو قانوناً ممنوع قرار دینا نص کی رو سے ضروری ہے، اور اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں، ساتھ ہی اس کے اسباب کا ازالہ سدّ ذرائع کے اصول کی رو سے ضروری ہے۔ اور اس میں بھی کسی شبہ کی گنجائش نہیں ۔

(۱۰) شراب نوشی کی ممانعت کا قانون ۔

اس قانون کے ضمن میں بھی دلائل کی ضرورت نہیں کیوں کہ شراب کی حرمت شبہ سے بالا ہے ۔ اسلامی سماج ایک دن کے لیے بھی اسے مباح کرنا نہیں گوارا کر سکتا ۔ یہ خرابی عموماً زناکاری کے ساتھ آتی ہے ۔ دونوں ایک ہی ماحول کی چیزیں ہیں ۔ یہ عیش پرستی اور اس سے پیدا ہونے والی کاہلی کے ساتھ پروان چڑھتی ہے ۔ اس حالت میں جو نفسیاتی اضمحلال طاری رہتا ہے اسے دور کرنے اور ایک مصنوعی نشاط اور خیالات میں حرکت پیدا کرنے کے لیے کسی نشہ آور چیز کی ضرورت پڑتی ہے ۔

شراب اور دوسری منشّیات اسلامی فکر کی بنیادوں میں سے ایک اہم بنیاد سے متصادم ہیں ۔ اس ہمہ دم بیداری سے جو اسلام نے فرد کی عقل و ضمیر کے لیے لازمی قرار دی ہے ۔ مزید برآں یہ واقعات وحقائق سے فرار کا ذریعہ ہے ۔ اور اسلام کو اس طرح کا فرار نہ پسند ہے نہ گوارا یہ بزدلی ہے اور زندگی کو ناکارہ بنا کر رکھ دینے والی چیز ہے ۔

اسلام ایک لچک دار نظام ہے جو اپنی روح اور بنیادی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے ہر زمانہ میں انسانی زندگی کی رہنمائی کر سکتا ہے، وہ ایک بلند، صحت مند، ترقی پذیر، اور طاقت ور زندگی کا ضامن ہے ۔ وہ ایک ایسے جامع اور ہمہ گیر اجتماعی عدل کا ضامن ہے جو اعلیٰ انسانی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے ۔ وہ چاہتا ہے کہ نہ تو فرد کی نفع بخش سرگرمیوں پر بے جا پابندیاں

حائل کی جائیں نہ اُسے مضرت رساں انانیت کے حوالہ کر دیا جائے بلکہ ایک ایسا نظام قائم ہو جس میں ہر حق دار کو اس کا حق ضرور ملے گا۔

اسلامی نظریۂ حیات وہ کامل ترین نظریہ ہے جس سے دنیا آشنا ہو سکی ہے کیونکہ وہ روحانی اور مادّی عناصر کا جامع ہے اور ان کو ایک اکائی میں سمو کر زندگی کو بلندی کی طرف لے جاتا ہے وہ اپنے سامنے ایک ایسا آدرش رکھتا ہے جس تک عملاً پہنچا جا سکتا ہے، اگرچہ ظاہر بیں نظر کو وہ خیالی معلوم ہوتا ہے۔

وہ انسانیت جس نے اسلام کی پہلی لہر کے دوران اس کے ساتھ ایک عظیم جست لگائی تھی - جس کا اثر عالمِ اسلام تک محدود نہ رہا بلکہ ساری انسانیت پہ پڑا، آج اپنے طویل تجربات کے بعد اسلامی نظام اور اسلامی فکر سے استفادہ کی صلاحیت پہلے سے زیادہ رکھتی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو انسانیت کو اس کی معراج تک پہنچانے آیا تھا - ناگزیر یہ تھا کہ انسانیت تدریجی طور پر اس کی طرف بڑھتی - چنانچہ اس کی ترقی، نئے تجربات، اور سوجھ بوجھ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ اس نظام سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت بھی بڑھتی گئی - آج وہ ماضی کی بہ نسبت اس نظام سے قریب تر ہے، اور کل آج سے بھی زیادہ قریب ہوگی - اس قرب کے درجہ کا انحصار اس کے علم اور ترقی پر، اور اس بات پر ہوگا کہ وہ دوسرے نظاموں کے تحت کتنا دکھ اٹھاتی ہے۔

اس حیران و پریشان، اور لرزاں و ترساں دنیا کو امن و آشتی، اطمینان و سکون، اور عدل و انصاف اسی وقت میسّر آ سکتا ہے جب وہ —— اللہ چاہے تو —— اس نظامِ کامل کو اختیار کر لے گی۔

نواں باب

دوراہے پر

اب سوال یہ ہے کہ ہم کدھر جائیں ؟

ایک لمحہ کے لیے ٹھہر کر ہمیں خود سے اس سوال کا جواب حاصل کر لینا چاہیے اور اپنی زندگی کو اس سمت میں لے جانا چاہیے جدھر ہم جانا چاہتے ہوں ۔

یکے بعد دیگرے دو جنگوں کے بعد آج دنیا دو مستقل بلاکوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ مشرق میں اشتراکی بلاک، اور مغرب میں سرمایہ دارانہ بلاک ۔ بظاہر صورت حال یہی ہے، ہر زبان پر یہی بات ہے، اور ہر ذہن پر یہی نقش مرتب ہو چکا ہے۔ مگر ہمارے نزدیک یہ تقسیم بالکل ظاہری اور سطحی ہے، حقیقی نہیں۔ یہ تقسیم مفادات پر مبنی ہے نہ کہ اصولوں پر۔ یہ سامان تجارت اور بازاروں کے لیے جنگ ہے نہ کہ عقائد و افکار کی۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے امریکہ اور یورپ کا طرز فکر روسی طرز فکر سے ذرا بھی مختلف نہیں دونوں زندگی کے مادّی نقطۂ نظر پر ایمان رکھتے ہیں۔ روس اشتراکی ہو چکا ہے مگر یورپ اور امریکہ بھی اسی راہ پر جا رہے ہیں۔ یہ بات بالکل یقینی ہے کہ اگر کوئی خاص گڑبڑ نہ ہوئی تو وہ بھی اس منزل پہنچیں گے۔

مغرب کو اشتراکیت کی طرف لے جانے والی چیز اس کا فکر اور مزاج ہے۔ اس کا مادّی فکر اخلاق کی بنا منفعت کو قرار دیتا ہے اور مفادات اور تجارتی بازاروں کے لیے ایک دوسرے کا گلا کاٹنا

سکھاتا ہے۔ یہ فکر زندگی سے روحانی عنصر کو بے دخل کر دیتا ہے اور تجربہ گاہوں میں نہ دریافت کیے جا سکنے والے ایمان کا منکر ہے۔ یہ مجرّد اعلیٰ مقاصد کا قائل نہیں اور فلسفۂ عملیت کی طرح، اشیاء کی حقیقت کا وجود نہیں تسلیم کرتا، صرف ان کے عملی وظیفہ (function) پر نگاہ رکھتا ہے۔ اگر مغربی ممالک کے اقتصادی احوال و ظروف کچھ اور بدل جائیں تو یہ فکر ان کو اشتراکیت تک پہنچا کر دم لے گا۔

روس اور امریکہ کے فکر میں کوئی مزاجی فرق نہیں۔ فرق صرف ان کے معاشی اور سماجی حالات میں ہے۔ آج جو چیز ایک عام امریکی کو اشتراکی ہو جانے سے باز رکھتی ہے وہ کوئی ایسا نظریۂ حیات نہیں جو حیات، کائنات اور انسان کی مادّی تعبیر کو غلط قرار دیتا ہو بلکہ صرف یہ بات ہے کہ اس کے سامنے مالدار بننے کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ اور مزدور کی اجرت کی شرح بھی اونچی ہے۔ جب امریکہ میں سرمایہ داری اپنے آخری مراحل میں داخل ہوگی، احتکار کے حلقے اور وسیع ہوں گے، اجارہ داری کی گرفت اور مضبوط ہو جائے گی اور عام آدمی یہ محسوس کرنے لگے گا کہ اسے سرمایہ دار بننے کے مواقع نہیں میسّر ہیں۔ اور ساتھ ہی اجرتوں کی شرح اجارہ داری کی شدّت یا کسی اور سبب سے گرنے لگے گی تو امریکہ کا مزدور قطعی طور پر اشتراکیت کی طرف مائل ہو جائے گا۔ اس وقت اسے مادی فلسفۂ حیات کے سوا زندگی کا کوئی بلند تر نظریہ نہ میسّر ہوگا جو اسے بچا سکے۔ اس کے سامنے کوئی روحانی عقیدہ یا اخلاقی آدرش ایسا نہ ہوگا جو اسے پناہ دے سکے۔

پس مشرقی اور مغربی بلاکوں کے درمیان کشمکش کی شدّت سے ہمیں دھوکہ میں نہیں بتلا ہو جانا چاہیے۔ دونوں مادّی نظریۂ حیات کے حامل ہیں اور یکساں فکری مزاج رکھتے ہیں۔ ان کی کشمکش کسی اصول یا نظریہ پر نہیں بلکہ اصل جنگ دنیا میں نفوذ اور بازار کے منافع کے لیے ہے، اور وہ بازار خود ہم ہیں!

حقیقی اور گہری کشمکش صرف اسلام اور ان دونوں بلاکوں کے درمیان ہے۔ یورپ، امریکہ اور روس جس مادّی فکر پر ایمان رکھتے ہیں اس کے مقابلہ پر آنے والی واحد حقیقی قوّت اسلام ہے۔ اسلام ہی کائنات، حیات اور انسان کے بارے میں ایک ہمہ گیر اور ہم آہنگ فکر کا حامل ہے۔ وہ انسانی معاشرہ میں کشمکش اور نزاع کی جگہ اجتماعی تکافل کی فضا پیدا کرتا ہے۔ وہ زندگی کو ایک روحانی تصور عطا کرتا

ہے جو اسے آسمان پر فرد کش خالق سے جا ملاتا ہے اور ساتھ ہی زمین پر اس کے رجحانات کی تعیین کرتا ہے
یہ تصوّر زندگی کو صرف مادّی اغراض کی تکمیل کی مشین بنا کر نہیں رکھ دیتا ——— اگرچہ پیداواری
سرگرمیاں اسلام کی عبادات میں سے ایک عبادت تسلیم کی گئی ہیں۔

درحقیقت تمام روحانی مذاہب، جن میں مسیحیت پیش پیش ہے - امریکہ اور یورپ کی مادیت کو بھی
اس طرح باطل سمجھتے ہیں جس طرح روس کی اشتراکی مادّیت کو، کیوں کہ دونوں کا مزاج ایک ہے اور زندگی
کے روحانی تصوّر کے منافی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ مسیحیت کو ایسی مثبت قوّت نہیں شمار کیا جاتا
جو جدید مادّی افکار کا مقابلہ کر سکتی ہو۔ مسیحیت ایک انفرادی، گوشہ گیر، اور سلبی مذہب ہے۔ اس کے
زیر سایہ زندگی کو دائمی اور فعّال نشوونما نہیں نصیب ہو سکتا۔ مسیحیت انسانی زندگی میں اپنا محدود عمل
انجام دے چکی، اور بعد کے زمانہ میں عملی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر رہی، کیونکہ مسیحیت یہودیت اور
اسلام کے درمیان ایک محدود وقفہ کو پُر کرنے کے لیے آئی تھی۔ جب مخصوص تاریخی حالات کی بنا پر اسے
یورپ نے اختیار کر لیا تو یہ نت نئے حالات سے دوچار ہونے والی عملی زندگی کا ساتھ نہ دے سکی اور عبادت گاہ
اور افراد کے ضمیر میں جا بیٹھی - وہ عملی زندگی پر حکمرانی نہ کر سکی کیوں کہ اس میں وہ قوت ہی نہ تھی جو نمو،
تسلسل، اور بدلتے ہوئے حالات سے عہدہ برا ہونے، کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

بلا کسی جھجک کے کہا جا سکتا ہے کہ مسیحیت ہر آن متغیر معاشی اور سماجی نظاموں کے قدم بہ قدم نہیں
چل سکتی، کیونکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ عملی زندگی کے بارے میں کوئی جامع نظریہ نہیں ہے اس کے
برعکس اسلام ایک کامل آفاقی نظام ہے، جس میں عقیدہ بھی ہے اور قانون بھی - وہ سماجی اور معاشی
زندگی کی تنظیم ضمیر اور قانون دونوں کے ذریعہ عمل میں لاتا ہے۔ اس کا یہ نظام جزئیات، اور اصولوں
کی تطبیق میں نشوونما کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔

وہ انسانیت کو کائنات، حیات، اور انسان کے بارے میں ایک جامع، ہمہ گیر، اور مکمّل فکر عطا کرتا
ہے، اور اس طرح عقل و فکر کی ساری ضرورتیں پوری کر دیتا ہے۔ پھر وہ انسانیت کو ایک سیدھا سادہ اور
واضح مگر گہرا عقیدہ دے کر اس کی وجدانی ضرورتوں کی تکمیل کرتا ہے۔ ساتھ ہی وہ معاشرہ کے لیے

معاشی اور قانونی بنیادیں پیش کر کے عملی اور تنظیمی ضروریات بھی پوری کرتا ہے۔
اسلام اپنے نظام کی بنیاد ایک ایسے روحانی تصوّر پر رکھتا ہے جو مادّی طرزِ فکر کی یکسر نفی کر دیتا ہے
وہ عمل کی بنیاد روحانی اور اخلاقی عنصر پر رکھتا ہے اور فوری منفعت کے نظریہ کو باطل قرار دیتا ہے۔
اس طرح وہ بہ یک وقت مشرقی اور مغربی دونوں بلاکوں میں چھائی ہوئی مادّی غلبیت کی جڑ کاٹ دیتا
ہے۔ وہ زندگی کو ان پست مقامات کی غلامی سے نکال کر جن کو آج یورپ، امریکہ، اور روس
سب یکساں طور پر اپنا آئیڈیل بناتے ہیں، بلند تر مقامات کی طرف لے جاتا ہے۔
اس سرسری جائزہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ عالم اسلامی کے ہم فرزندوں کو اپنے
موقف پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ ہم ایک ایسے نظریۂ حیات کے حامل ہیں جو ان تمام نظریہ ہائے حیات
سے بلند و برتر ہے جو یورپ، امریکہ، یا روس کے پاس ہیں۔ ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم انسانیت
کے سامنے یہ نظریۂ حیات پیش کر سکیں جو مکمل انسانی تعاون اور صحت مند اجتماعی تکافل کو اپنا ہدف
قرار دیتا ہے، اور زندگی کے مقام کو بلند کر کے اس سطح پر لے جانا چاہتا ہے جو اللہ تعالے
سے صادر ہونے والے عالم کے شایانِ شان ہو۔ پس ہمارا مقام قافلہ کے پیچھے نہیں بلکہ وہاں
ہے جہاں زمامِ قیادت سنبھالی جاتی ہے۔
مگر واضح رہے کہ ہم اپنے اصل مقام تک آسانی سے نہیں پہنچ جائیں گے۔ اس مقام تک رسائی
ان عظیم قربانیوں کے بغیر ممکن نہیں جو ہمیں اپنی اور انسانیت کی خاطر دینی ہوں گی۔ (ہمارے) سرمایہ داروں
اور ان لوگوں پر جو متاعِ دنیا کے دل دادہ ہو چکے ہیں بڑا بار پڑنے والا ہے مگر اس بار سے کوئی مفر
نہیں۔ ہمیں یا تو اسلام کی راہ پر چلنا ہے یا اشتراکیت کی راہ پر، بالآخر انہی دونوں راہوں میں سے
کسی کا انتخاب کرنا ہے۔ یورپ اور امریکہ جن کے نظاموں سے ہم چمٹے ہوئے ہیں اور جنھیں ہم نے
اپنے اسلامی نظام پر ترجیح دے رکھی ہے، جلد یا بدیر قطعی طور پر اشتراکیت کی آغوش میں جا کر رہیں گے۔
ان کا طرزِ فکر وہی ہے جو اشتراکیت کا ہے، ان کا نظریہ حیات وہی ہے، اختلاف صرف ظاہر میں ہے نہ کہ
اصل حقیقت میں۔

سرمایہ دار اور اصحاب نعمت خوب جانتے ہیں کہ اشتراکیت کے معنیٰ کیا ہیں؟ وہ اس نام سے اس طرح ڈرتے ہیں جس طرح کوئی وہمی آدمی بھوت پریت سے ڈرتا ہے۔ ان کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ انھیں کوئی اور چیز پناہ نہیں دے سکتی۔ آج پوری انسانیت کے لیے اسلام کے سوا کوئی پناہ گاہ نہیں —— ہماری مراد اس حقیقی اسلام سے ہے جس کی بنیادیں ہم نے اس کتاب میں واضح کی ہیں اور اس کے نظام، اور ان ذمہ داریوں کے بعض نمونے پیش کیے ہیں جو وہ فرد اور اس کے مال پر ڈالتا ہے۔

واضح رہے کہ آج ہم ایک دوراہے پر کھڑے ہیں۔ یا تو ہم اسی طرح مغرب کے قافلہ کے پیچھے پیچھے چلتے رہیں جو اپنے کو جمہوری کہتا ہے، اور بالآخر اس قافلہ سے جا ملیں جو اشتراکی کہلاتا ہے! یا ہم حقیقی اسلام کی طرف لوٹ آئیں۔ اسے اپنی روحانی اور فکری، اجتماعی اور اقتصادی زندگی میں حکمراں تسلیم کر لیں، اس سے قوت حاصل کریں۔ اس کے فروعات اور تفصیلی قانون سازی کو اس کے جامع کلی فکر کے حدود میں نشو و نما بخشیں، اور ساتھ ہی ان ذمہ داریوں کو پورا کریں جو اس نے ہمارے جان و مال پر عائد کی ہیں۔

ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اگر ہم نے آج یہ کام نہیں کیا تو آئندہ کبھی نہ کر سکیں گے۔ یہ دو متواتر جنگوں کے بعد کی پامال دُنیا جس کا عقیدہ متزلزل ہے اور وجدان پریشان، جو مختلف رجحانات وافکار کے درمیان حیران ہے، آج اس بات کی سب سے زیادہ محتاج ہے کہ ہم اپنا عقیدہ، اپنا نظام، اور زندگی کے بارے میں اپنا عملی اور روحانی نظریہ اس کے سامنے پیش کریں۔ مگر واضح رہے کہ اس نظریہ کو پیش کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ہم اسے خود اپنی زندگی میں نافذ کر لیں، تاکہ دُنیا اسے زمین پر ایک حقیقت واقعہ کے طور پر دیکھ سکے نہ کہ صرف عالم خیال میں ایک نظری فلسفہ کے طور پر۔

اسلام کی طرف رجوع ہمارے لیے اپنی زندگی میں اجتماعی عدل کا قیام ممکن بنا دے گا۔ یہ (ہمارے) اُن مضطرب اور پریشان دلوں کو جو آج نجات کی تلاش میں مختلف اصولوں اور رجحانات کی طرف لپک رہے ہیں

اطمینان وسکون کی نعمت سے مالا مال کر سکے گا۔ لیکن اپنے معاشرہ میں اجتماعی عدل کے قیام کے ساتھ ہمیں خارج میں بھی ایک امتیازی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ ہمیں اقوام عالم کی مجلس میں ایک مخصوص مقام حاصل ہو گا جس کا وزن دونوں برسر کشمکش بلاکوں کو تسلیم کرنا ہو گا۔ انھیں اپنی بین الاقوامی پالیسی میں بھی اس کا لحاظ کرنا ہو گا۔

یہی نہیں، بلکہ یہ دنیا کو امن عطا کرے گا اور اسے سکون کی ایک ایسی مہلت بخشے گا جس میں وہ اطمینان کا سانس لے سکے، اور اس ٹریجڈی سے بچ سکے جو تیسری جنگ کے خطرہ کی شکل میں منھ کھولے خشک وتر سب کو نگل جانے پر آمادہ ہے۔ دونوں بلاکوں سے ممتاز، ایک مستقل نظریہ حیات رکھنے والے ایک تیسرے بلاک کا ظہور اس پریشان حال دنیا میں ان دونوں بلاکوں کے درمیان سیاسی توازن برقرار رکھنے کی واحد شکل ہے۔

آج انڈونیشیا اور پاکستان دو بڑے اسلامی بلاکوں کے ظہور کے بعد حالات اس کام کے لیے سازگار ہو چکے ہیں۔ عرب دنیا بھی مشرق ومغرب دونوں میں بیداری کی کروٹیں لے رہی ہے۔ رہنمائی اللہ کرے گا، ہمارا کام یہ ہے کہ اس پر پورا بھروسہ اور کامل ایمان رکھیں۔

اسلام کا نظامِ عدل

فہرست

اسلام کا نظامِ معیشت

اسلامی نظامِ معیشت سے پوری واقفیت حاصل کرنے کیلئے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی
نظامِ معیشت کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ تقابلی مطالعہ کیلئے حسب ذیل کتابیں ضرور پڑھیے

اسلام کا معاشی مسئلہ اور اس کا اسلامی حل

اسلامی نقطۂ نظر سے معاشی مسئلہ پر بحث کی گئی ہے اور اس کا حل پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں اشتراکیت اور فاشزم کے تجویز کردہ حلوں کا بھی جائزہ لیا گیا ہے
چھ آنے

سرمایہ داری اشتراکیت اور اسلام

ان تینوں معاشی نظاموں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے اور استدلال کی روشنی میں اسلامی نظامِ معیشت کی برتری آپ سے آپ سمجھ میں آجاتی ہے
تین آنے

سود

اس کتاب کا موضوع صرف سود نہیں بلکہ ایک متوازن نظامِ معیشت ہے جس کا ایک رکن حرمتِ سود ہے۔ سود انسانی سوسائٹی کی وہ "خوش نصیب برائی" ہے جو اسلام کے سوا ہر نظامِ زندگی میں ناگزیر سمجھ کر برداشت کی جاتی رہی ہے۔ عقل و استدلال کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ یہ وہ ملعون سسٹم ہے جس کی گنجائش اسلامی نظامِ معیشت میں نہیں ہے

سرمایہ داری اور اشتراکیت

نظامِ سرمایہ داری کا پس منظر، خرابی کے اسباب، اس کے ردِ عمل میں اشتراکیت کا وجود، پھر اشتراکیت کا میزانیۂ نفع و نقصان اور آخر میں اسلامی حل۔ بارہ آنے

مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

مصنف نے دلائل کے ساتھ اس دعوے کو ثابت کیا ہے کہ مارکس کے نظریے کی تردید اب تاریخی حقیقت بن چکی ہے آپ بھی ان دلائل کی روشنی میں غور فرمائیں کہ مصنف کا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند۔ دہلی ۶